۸۹

مجلہ

مکتبہ

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر

محمد عبدالقادر سروری

ایم۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی

مجلۂ مکتبہ

۱- یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲- یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳- بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴- قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عہ/) فی پرچہ ۶

۵- اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (سے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ ½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے اُنکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلۂ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلۂ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کر دیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلۂ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

الف

Checked 1975

مجلہ مکتبہ

جلد (۲) شمارہ (۱)

بابتہ ماہ آذر ۱۳۳۸ف م اکتوبر ۱۹۲۸ء

فہرست

مجلۂ مکتبہ

۱- یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲- یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳- بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴- قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عہ/) فی پرچہ ۶ پائی

۵- اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (سے) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ ½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں بدسہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے اُنکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلۂ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہوجائے وہ رسیدیں "منتظم مجلۂ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ اُنکے نام جاری کردیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہوسکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلۂ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیے۔

الف

Checked 1975

1062

مجلۂ مکتبہ

جلد (۲) شمارہ (۱)

بابتہ ماہ آذر ۱۳۳۸ف مطابق اکتوبر ۱۹۲۸ء

فہرست

شذرات

اس مہینے سے نئے سال کے ساتھ "مجلہ مکتبہ" کی دوسری جلد کا بھی آغاز ہو رہا ہے۔ رسالہ کی ابتدائی حالت کا اندازہ کرتے ہماری یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ دوسری جلد علمی تحریک کی پیدائش میں پہلے سے زیادہ سرگرم رہیگی۔ اس فضا میں کم و بیش وقت پر اعلیٰ اور دلچسپ مضامین کے ساتھ مصور رسالے کا اپنی پہلی جلد کے ابتدائی مرحلہ کا ختم کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لیکن اس کو جس منزل تک پہونچنا ہے وہ بھی خارج از نظر نہیں۔ قلیل مدت میں رسالے نے جو علمی خدمت انجام دی، اسکا اندازہ جلد اول کی فہرست مضامین پر نظر بازگشت ڈالنے سے ہوسکیگا۔ جو اسی غرض کیلئے ہم نے رسالے کے آخر میں شامل رکھی ہے۔ اور ملک میں اس کا جو علمی درجہ قائم ہوا اسکی مظہر وہ رائیں ہیں، جو معاصرین نے تحریر فرمائی ہیں۔ فضا کی عدم مساعدت کے فرسودہ شکوہ کو چھوڑ کر، اور اردو دانوں سے بے حسی کے الزام کو دور کرکے ہم اس ناخوشگوار تذبذب کی حالت کا ضرور ذکر کرینگے جس میں بعض مخاطبین کی مسلسل خاموشی نے ہمیں ڈال رکھا۔

معاصرین کی مخلصانہ تنقیدوں کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں۔ "المعلم" نے ہمیں جس راہ پر گامزن ہونے کی تعلیم دی ہے کہ "مجلہ مکتبہ" کو مصنفین اور مصنفات تک محدود ہو جانا چاہیئے، ہم اسکی قدر کرتے ہیں۔ اور یہ تجویز ہمارے اور بعض اہل بصیرت خصوصاً مولانا مناظر احسن گیلانی کے مشورے پر ابتدا ہی سے ہمارے پیش نظر تھی۔ لیکن مرحوم پروفیسر وحید الدین سلیم، جنہوں نے رسالے کی داغ بیل ڈالنے میں ہماری بڑی معاونت فرمائی تھی، اس تجویز کی تمہیدی دقتوں کیوجہ سے اس کو فی الحال ملتوی رکھنے کے حامی تھے۔ اگر تمام اردو مصنفین، اشاعت خانوں کے مالک اور اداروں کے منتظمین اس تجویز کو کامیاب بنانے کی طرف عملی قدم بڑھائیں تو "مجلہ مکتبہ" اس خدمت کو بطیب خاطر قبول کریگا۔

۲۷ اگست ۱۹۲۸ء کو آکسفورڈ میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کا انعقاد ہوا تھا۔ مولوی غلام یزدانی صاحب ایم اے اور ڈاکٹر عبدالحق بی لٹ۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر عربی کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی طرف سے نمایندگی کیلئے شریک ہوئے تھے جملہ چھ سو سے زیادہ نمایندوں کا مجمع تھا جنمیں صرف جرمنی ہی کے ایک سو دس نمایندے موجود تھے۔

مولوی غلام یزدانی صاحب نے ایلورا کی استرکار نقاشی پر مضمون پڑھا اور ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے "ابو تمام کے دیوان کے مخطوطوں کی کیفیت اور اس کے غیر مطبوعہ کلام کی اہمیت" پر ایک مقالہ سنایا۔ ڈاکٹر صاحب نے

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی مترجمہ کتابوں کی نمائش بھی کرائی ان کتابوں کو مستشرقین نے بے حد پسند کیا اور جامعہ عثمانیہ کی کوششوں کا نہایت گہرا اثر اُن کے دلوں پر بیٹھا۔ ڈاکٹر صاحب نے عربی میں مکمل اور بسیط تاریخی لغت کی تیاری اور مصری حکومت سے یہ درخواست کرنے کی تحریک پیش کی کہ قاہرہ میں مشرقی علماء اور مستشرقین کے اتحاد عمل کی تجویز پر غور کیا جائے خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی دونوں تحریکیں کامیاب ہوئیں۔ قاہرہ یونیورسٹی میں عربی، فرانسیسی اور انگریزی تینوں زبانوں میں اعلےٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ آکسفورڈ جاتے ہوئے مصر کے قیام کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے جامعہ عثمانیہ کو مصر کے علماء، حکومت اور عوام سے روشناس کرانے کی سعی کی۔

اس شمارہ میں دو تصویریں شامل ہیں۔ جن میں سے ایک حیدرآباد دکن کے ایک کہنہ مشق شاعر نواب عزیز جنگ بہادر عزیز کی ہے۔ جن کا ایک بسیط تذکرہ اس رسالے کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ دوسری تصویر اردو کے مشہور انشا پرداز مرحوم پروفیسر وحید الدین سلیم پانی پتی کی ہے۔

مولانا سلیم پانی پت (ضلع کرنال) کے رہنے والے تھے۔ آپ کے دادا ملتان سے آکر پاک پٹن میں رہ گئے تھے۔ یہیں مولانا سلیم کے والد حاجی فرید الدین پیدا ہوئے۔ خود مولانا کی پیدائش پانی پت میں ہوئی تھی۔ ورد بریلوی نے آپ کو شرفائے سادات سے شمار کیا ہے۔ لیکن ہمارے پاس اس کی کوئی قابل اعتماد شہادت موجود نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ مولانا مرحوم نے بھی کبھی اپنے آپ کو سادات میں شمار نہیں کیا۔

حاجی فرید الدین، پانی پت کے بزرگ حضرت بوعلی شاہ قلندر کی مزار کے متولی تھے۔ جب حضرت سید غوث علی شاہ، پانی پت میں وارد ہوئے تو حاجی صاحب نے ان کو اپنے ہی یہاں ٹھہرایا۔ ان کو اُن سے خاص عقیدت تھی۔

مولانا سلیم کی ابتدائی تعلیم مکان ہی پر ہوئی اور اکثر ذاتی شوق سے فارسی کی متداولہ کتابوں کو پڑھا۔ حضرت غوث علی شاہ سے مولانا کو بھی خاص عقیدت تھی۔ چنانچہ چودہ برس کی عمر میں شاہ صاحب کی مدح میں ایک پُرمغز قصیدہ لکھا۔ جو عرفی کے قصیدے پر مبنی تھا۔ یہ قصیدہ "تذکرہ غوثیہ" میں شاہ صاحب کی کرامات کے مظہر کی طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ثانوی درجہ کی تعلیم مدرسہ میں حاصل کرنے کے بعد مولانا لاہور چلے گئے جہاں عربی ادب، تفسیر، حدیث، فقہ، منطق اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ قانون پڑھنے کا بھی ارادہ کیا تھا۔ لیکن اس کی تکمیل کا موقع نصیب نہیں ہوا۔

آپ کی ابتدائی ملازمت ریاست بہاولپور کے محکمہ تعلیمات میں ہوئی۔ یہاں چھ سال کام کرنے کے بعد، مرض تشنج اور اپنے قدردان عظیم الدین صاحب کے انتقال کی وجہ سے اس جگہ سے علیحدہ ہونا پڑا۔

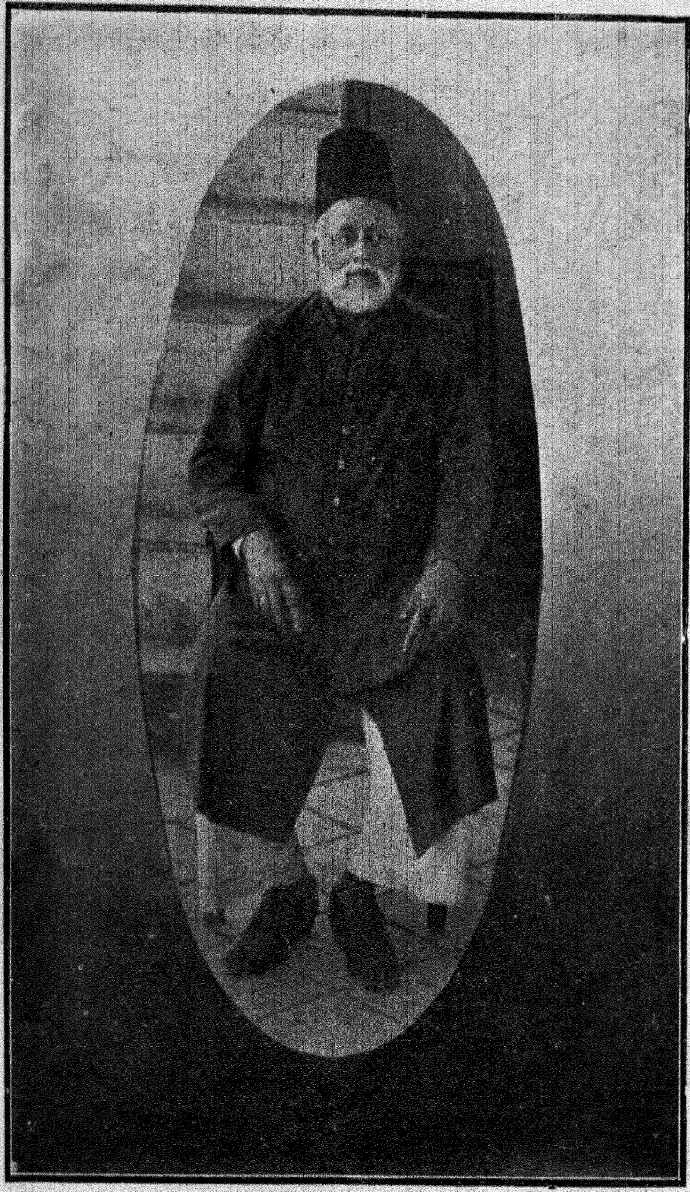
اور جالندھر میں یونانی طب اور ذاتی طور پر ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے پانی پت میں مطب شروع کیا۔ اور عرصہ تک اسی مشغول رہے۔ اسی زمانہ میں حالی نے آپ کو آنریبل سر سید احمد خاں سے ملایا۔ سر سید کی وہ ہستی تھی کہ ان کے گرد و پیش کا ہر ذرہ "آفتاب بن کر چمک اٹھتا تھا۔ مولانا تو مجسم ذہانت تھے۔ سر سید احمد خاں نے ان کو اپنے پاس ہی رکھا۔ اور عرصہ تک اپنے علمی ادارے میں کام لیتے رہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں مولانا کے علمی اور ادبی کردار کا نشو و نما ہوا۔

۱۸۵۷ء کے واقعہ کے بعد سے ہندوستان میں صحافت اور اس کے ساتھ سیاست کا نشو و نما ہونے لگا۔ اس وقت علی گڑھ کالج کا ترجمان "علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" جاری ہوا، اور مولانا اس کے مدیر مقرر کئے گئے۔ چند سال تک اس کام کو نہایت مستعدی سے چلانے کے بعد بیماری کی وجہ سے اس سے مستعفی ہو کر وطن چلے گئے۔ اور اس وقت تک خاموش زندگی بسر کی جب تک "مسلم گزٹ" (لکھنؤ) کی ادارت آپکے تفویض ہوئی۔ اس اہم خدمت کو بھی آپ نے نہایت جوش اور قابلیت سے انجام دیا۔ لیکن آخر کار گورنمنٹ نے اخبار کو ضبط کر لیا۔ مولانا لکھنؤ سے چھپ کر نکل گئے۔ اور "زمیندار" سے اپنے ادارتی خدمات کو متعلق کیا۔ لیکن مولانا کے پرجوش قلم کی یہاں بھی وہ آزادروی باقی رہی۔ اور کسی بات پر بگڑ کر حکومت نے اخبار ضبط کر لیا۔

جب حیدرآباد دکن میں جامعہ عثمانیہ کی داغ بیل پڑ رہی اور دارالترجمہ قائم ہوا تو مولانا کے واقف کاروں نے اصطلاحات پر غور کرنے کے لئے آپ کو یہاں بلایا آپ نے یہاں نہ صرف وضع اصطلاحات کے مشکل کام میں ارکان جامعہ کی مدد کی بلکہ اس کے اصول پر ایک کتاب اسی نام سے لکھی۔ جس میں اصطلاح سازی کے اصول نہایت اپج کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب اردو زبان میں معرکتہ الآرا بن رہی ہے۔

دارالترجمہ کی خدمات کے ساتھ ساتھ کلیہ جامعہ عثمانیہ میں اردو کے مددگار پروفیسری کی خدمت بھی آپکے تفویض ہوئی۔ اور چار سال بعد جامعہ کے اس معمول کا استثناء قرار دیکر کہ ہر پروفیسر کا یوروپی جامعات کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے آپکو اردو ادبیات کا پروفیسر بنادیا گیا ہے۔

مولانا شاعری میں بھی کچھ کم رتبہ نہیں رکھتے تھے۔ ابتدائے عمر ہی سے شعر گوئی کا چسکا تھا۔ لیکن آپکی شاعری کا ایک مخصوص رنگ ہے۔ آپ پر حالی کی تلقینات شعری کا بے حد اثر پڑا تھا۔ اسی لئے آپ اگر غزل کی شکل میں شعر موزوں کرتے تو جدت خیال، جدت تشبیہ یا قومی اصلاح کے مقاصد اس میں خاص طور سے نمایاں رہتے۔ موضوعی نظموں میں اخلاقی اور تمدنی نظمیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ حالی اور دوسرے اردو شاعروں کے برخلاف، حیات اور کائنات کے متعلق آپ کا خیال ہمیشہ رجائی رہا۔ آپ کی نظموں میں بلا کا جوش اور فطرت پنہاں ہوتا ہے آپ کے مخاطب اکثر و بیشتر تعلیم یافتہ نوجوان ہوتے ہیں۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی نہایت پرجوش ہوتا تھا



مرحوم پروفیسر وحید الدین سلیم پانی پتی

C. K. Press, Hyd.-Dn.

آخر دم تک علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ گذشتہ نومبر میں پائیوریا سے بیمار ہوئے۔ علاج کیلئے رانچی جانے سے ایک روز پہلے "مکتبہ" کے پہلے نمبر کے لئے ایک نظم "دعا" کے عنوان سے اور دو غزلیں عنایت کیں۔ نظم پہلے نمبر میں شائع ہو چکی ہے۔

رانچی میں ریڈیم کے علاج سے بھی کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوا۔ جس کا حال مولانا کے ان خطوط سے واضح ہوتا ہے جو رانچی سے ہمیں تحریر کئے گئے تھے۔ ۲۹ جولائی ۱۹۲۶ء کو ملیح آباد (قصبہ لکھنؤ) میں سرسید، حالی اور شبلی کے زمانہ کی یہ یادگار ہمیشہ کیلئے پیوند خاک ہو گئی۔

یہاں ہم مولانا کی تحریر کا عکس بھی شامل کر رہے ہیں۔ تاکہ ناظرین کرام تحریر کے ساتھ تحریر کا بھی مطالعہ فرما سکیں۔

عکس تحریر

آئی ہے نظر آج مسرت سے بھری شام
جلوہ سے مسرت کے منور ہیں در و بام
عثمانیہ کالج کے یہاں جمع ہیں فرزند
تقریب کچھ ایسی ہے کہ دل سب کے ہیں خورسند
کہتے ہیں کہ ہے بزم کی مجلس کا پھر آغاز
قالب ہے نیا اُس کا۔ نئی اُس کی ہے پرواز
سچ یہ ہے کہ مجلس ہے جوانوں کی یہ نادی
مجلس یہ بتاتی ہے اُخوت کے مبادی
رفعت کا سبق ہے یہ عزیزوں کو سکھاتی
مجلس یہی وحشی کو ہے انسان بناتی
جولانگہ اظہار لیاقت اسے کہیے
گہوارۂ تعلیم فصاحت اسے کہیے

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

(از جناب ابو محمد عمر صلاح صاحب یافعی)

(نواب) عزیز الدین خاں (نوائطی) نام، ناموں لقب، عزیز تخلص، عزیز یار جنگ بہادر خطاب، ابن نواب فیاض الدین خاں، شرف جنگ بہادر، آپ کے جد اعلیٰ محمد سلطان الدین خاں ناموں، امرائے نوائط سے ہیں جنھیں پنڈت پر دھان والی پونہ کے دربار سے "ناموں" کا خاص لقب مرحمت ہوا تھا اور اس کی وجہ سے آپ کا رتبہ والی ریاست کے ناموں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ محمد سلطان الدین خاں "ناموں" کے جد محمد ابراہیم الدین خاں بہادر کو مغفرت مآب حضرت آصف جاہ اول (۱۱۰۱ھ تا ۱۱۶۱ھ)[1] کی ہمراہی کا اعزاز حاصل تھا۔ محمد ابراہیم الدین خاں کے نبیرگان محمد بدیع الدین خاں بہادر اور محمد ہاشم الدین خاں بہادر نے اپنے آقائے ولی نعمی کی جان نثاری میں اپنی عزیز جانوں کو نذر تیغ و تیر کردیا۔ محمد سلطان الدین خاں "ناموں" اپنے بھائیوں کی شہادت سے برداشتہ دل ہو کر پونہ چلا گئے تھے لیکن پھر حضرت مغفرت مآب کی ایما پر لوٹ آئے، پانگل اور سرنگ پٹن اور شوراپور کے سفر میں بہ حیثیت سرگردہ سواران شاہی رکاب سعادت میں رہے۔ آپ کی وفات کے بعد محمد قایم الدین خاں بہادر اور محمد دایم الدین خاں بہادر دونوں فرزندوں کو آبائی حقوق اور اعزازات کے ساتھ صوبہ برار میں جاگیرات سرفراز ہوئیں۔ محمد قائم الدین کے فرزند محمد عزیز الدین خاں کے زمانہ میں صرف منصبی معاش قایم رہی[2]۔ عزیز الدین خاں کے صاحب زادے فیاض الدین خاں شرف جنگ ہیں[3]، آپ کی ولادت اور نشو و نما حیدرآباد دکن ہی میں ہوئی۔ مدرسہ دار العلوم میں تعلیم پائی استاد الوقت حضرت فیض علیہ الرحمہ (۱۴ رجب ۱۳۰۳ھ ہجری) سے کتب دینیہ کی تکمیل کی شعر و شاعری کا بچپنے ہی سے ذوق و شوق تھا۔ اپنے زور فطرت سے شعر کہا کرتے تھے۔ مشق سخن بھی حضرت فیض رح ہی سے رہی۔ رفتہ رفتہ حضرت فیض رح کے فیض صحبت اور توجہ کی برکت سے آپ کا اپنے وقت کے اساتذہ میں شمار ہوتا رہا صاحب دیوان تھے مختلف علوم و فنون میں کتابیں لکھیں جن میں سے بعض کے نام غرائب حسابی، کنز اللطائف قواعد کلیہ وغیرہ ہیں، صرف خاص مبارک میں مددگار معتمد کی خدمت تھی، خوش خلق و پاک طینت

---

[1] توثیق کے لئے شاہ تجلی کی تاریخ "تزک آصفیہ" دیکھئے ۱۲

[2] تاریخ النوائط ص ۲۵۱ تزک محبوبیہ، منظر الکرام ۱۲

دیانت و امانت میں بے مثل تھے، مولف شعرائے دکن (عبدالجبار خاں) لکھتے ہیں:-

"مولف فقیر ۱۲۸۶ھ میں طالب علمی کی حالت میں مولوی محمد زماں خاں شہید مرحوم کے مکان پر

فروکش تھا اس وقت آپ کو دیکھا تھا پھر جب ۱۳۰۰ھ میں سیاحت ہند سے شہر حیدر آباد میں

آیا آپ کو دیکھا بجنسہ اسی لباس وصورت میں پایا۔" ص ۸۹۷

حضرت غفراں مکاں میر محبوب علیخاں، آصف جاہ سادس کی تقریب سال گرہ (۱۳۱۶ھ) میں خانی و بہادری کے ساتھ مشرف جنگ بہادر کا خطاب سرفراز ہوا تھا۔ ا ر جمادی الاول ۱۳۲۶ھ کو انتقال ہوا۔

نواب عزیز یار جنگ بہادر کی ولادت حیدر آباد میں بتاریخ ۔۔۔ ۱۲۸۹ھ میں ہوی آپ نواب مشرف جنگ مرحوم کے پہلے صاحب زادے ہیں۔ حکیم راے بجولال تمکین[۱] نے تاریخی قطعے کہے تھے

زفیاضِ مطلق بہ فیاضِ دیں شد　　عطا نورِ چشمے مبارک خصالے

رقم کرد تاریخِ میلاد تمکیں　　ز گلزارِ فیاض اول نہالے
　　　　　　　　　　　　　　۸۹ ۱۲

(۲)

زعنایاتِ خدا فرزندے　　چوں عطا گشت بخانِ فیاض

سالِ میلادِ بمن تمکیں گفت　　گوہرِ نیکوئے کانِ فیاض
　　　　　　　　　　　　　　۸۹ ۱۲

نواب عزیز نے مولوی احمد علی صاحب عصر[۲] مرحوم سے فارسی کی تعلیم پائی۔ مولوی محمد حنیف صاحب مرحوم خلفِ مولوی محمود مرحوم سے فقہ پڑھی۔ تعلیم درسی کے بعد آپ کی طبیعت کو فطری (موروثی) طور پر شعر و سخن سے لگاؤ پیدا ہوگیا اور اس فن میں اپنے قرابت دار بزرگ مولوی حکیم

---

[۱] تمکین خوش نویس تھے، اور اپنے وقت کے اساتذۂ شاعری میں گنے جاتے تھے منشی راجہ باقی متوفی (۲۳ر صفر ۱۳۱۴ھ تلمیذ حضرت فیض رح) کے بزرگ خاندان تھے اسی سال کی مشق سخن تھی، راجہ گوبند بخش (وفات ۱۲۵۰ھ) برادر راجہ چندو لال اور راجہ نریندر بہادر پیشکار (وفات ۱۳۰۶ھ) کی قدردانی کے وابستہ رہے انبا پرشاد حکم (شاگرد تمکین) کے اصرار پر جناب باقی نے تمکین کا جس قدر فارسی کلام ملا اس کو فراہم کرکے "نگارستان تمکین" (۱۳۰۲) کے تاریخی نام سے مطبع مرغوب دکن میں چھپوا دیا ۱۲

[۲] عصر مرحوم اور فراج مرحوم حضرت فیض رح کے بڑے نامور شاگردوں میں سے ہیں، فراج مرحوم نے حضرت فیض رح کے دیوان (مرتبہ مشرف جنگ) کو ۱۳۰۱ھ میں چھپوایا اور اپنے فرزند علاج کے انتقال (۱۲ر محرم ۱۳۱۸ھ) کے بعد اپنا دیوان چھپوا رہے تھے کہ ۱۱ر ذی الحجہ ۱۳۱۸ھ کو خود کا بھی انتقال ہوگیا، دیوان پریس ہی کے قبضہ میں رہ گیا، کوئی خبر لینے والا نہ رہا۔ دیوان کی طباعت (ی) کی ردیف تک آگئی تھی اس کے پروف علاج مرحوم کے نواسے جناب عبدالحلیم صاحب سے مجھے مل گئے ہیں جو اب قلمی دیوان کا حکم رکھتے ہیں، یہ ایک ہی نسخہ تھا جو مجھے دیدیا گیا ہے، اس پر جا بجا تصحیح کی علامتیں ہیں ۱۲

مظفر الدین خاں مزاجؔ مرحوم سے اصلاح سخن کی ابتدا کی اور تخلص بھی عزیزؔ ہی اختیار کیا۔

شمس العلما نواب عزیز جنگ ولاؔ مرحوم (۷ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ) جیسے محتاط شخصیت کے آدمی آپ کے متعلق لکھتے ہیں:۔ "آپ نہایت لایق اور ذی استعداد شخص ہیں فن سخن سے کامل دلچسپی رکھتے ہیں"[1]

نواب آصف نواز الملک مرحوم (۱۱ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ) معتمد صرف خاص مبارک کی صاحبزادی سے ۱۳۰۶ھ آپ کی شادی خانہ آبادی ہوئی یہ تقریب اس دھوم دھام سے رچی تھی کہ لوگ آج تک مثال دیتے ہیں۔ صاحب اولاد ہیں۔

مسٹر سعد الدین خاں بیرسٹرایٹ لا ناظم دوم عدالت دیوانی بلدہ آپ کے فرزند ارجمند ہیں جو نواب اظہر جنگ بہادر (ڈپٹی مبارک) کے داماد ہیں۔

آپ کی صاحبزادی نواب معین الدین حسن اول تعلقدار خلف نواب اقتدار یار جنگ بہادر سے بیاہی گئیں، مولوی فاضل ڈاکٹر نظام الدین صاحب پی، ایچ ڈی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی نواسے داماد ہوتے ہیں، آپ کی ملازمت کا تعلق علاقہ صرف خاص شاہی سے ہے نظامت کی خدمت سے ترقی کرکے اب آپ اول تعلقداری کے عہدہ پر فائز ہیں، صرف خاص مبارک کی جانب سے مجلس وضع قوانین ومحکمہ آرایش بلدہ سرکار عالی کی رکنیت کی خدمت بھی ہے۔ حضرت غفراں مکان کی سالگرہ کی تقریب (۱۳۱۶ھ) میں آبائی اعزاز واکرام کے ساتھ "عزیز یار جنگ بہادر" کے خطاب سے سرفراز ہوے۔ حضرت جہاں استاد نواب مرزا خاں صاحب داغؔ دہلوی مرحوم (۹ ذی حجہ ۱۳۲۲ھ) کے قیام حیدرآباد کے زمانے (۱۳۰۶ھ تا ۱۳۱۲ھ) میں آپ نے شبانہ روز فیض صحبت سے پورا پورا استفادہ اصلاح حاصل کیا ہے اور آپ کا شمار حیدرآباد کے تلامذہ داغؔ کی صف اول میں ہے۔[2] جناب احسنؔ مارہروی نے یادگار داغ اور جلوہ داغ میں آپ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے حضرت داغؔ کے سیکڑوں نہیں بلا مبالغہ ہزاروں شاعر شاگرد ہوے لیکن ایسے شاعر بہت کم ملیں گے جنھوں نے حضرت داغؔ کے رنگ تغزل کی پوری پوری تقلید کی ہو یا با اوقات ترقی کی حد تک بھی پہنچ گئے ہوں؛ شاعری فیضان سخن ہے کسی خاص شخص کا حصہ نہیں نواب عزیزؔ حضرت داغؔ کی تقلید کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں:۔

تقلید داغ باعث شہرت ہوی عزیزؔ! — چرچا مرے کلام کا ہر انجمن میں ہے

بعد استاد داغؔ آج عزیزؔ! — تیری شہرت کو دیکھتے ہیں ہم

یہ ندا آئی دم فکر سخن مجھ کو عزیزؔ! — شاعری میں روش حضرت استاد نہ چھوڑ

[1] تاریخ النوائط صفحہ (۲۵۲) [2] جلوہ داغ ص ۱۳۲

گل ریزیٔ سخن یہ نہیں بے سبب عزیزؔ! — ہیں فیض یاب بلبل ہندوستاں ہی آپ

حیرت ہی کیوں عزیزؔ یہ ہوتا ہی اشتباہ — اُستاد کی زبان کا ہی تیری زبان پر

داغؔ کے بعد لطف شعر عزیزؔ! — ہم نے تیری زبان میں دیکھا

داغؔ کے دم سے تھی ساری گل فشانی اے عزیزؔ — اب تو نقشہ ہے ہمارا البلبل تصویر کا

سونی پڑی ہی بزم سخن آج کل عزیزؔ! — بے شبہ فروغ اہل سخن تھے دکن میں داغؔ

تقلید داغؔ کی تصدیق مولانا سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی نواب حیدر یار جنگ بہادر بھی فرماتے ہیں

ہیں عزیزؔ خوش بیاں تلمیذ داغؔ — ان کا جادہ بھی اسی میداں میں ہے

ہی وہی رنگ تغزل دیکھئے — ان کا نغمہ بھی اسی الحاں میں ہے

شاہد اس دعوی پہ ہے مصراع سال

داغؔ کا انداز اس دیواں میں ہے (ارمغان عزیز ص ۲۲۴)

اُردو کے شاعروں میں میرؔ کے بعد ہندوستان میں ایک داغؔ ہی ایسے شاعر گزرے جنھوں نے اپنے رنگ تغزل کو عام شعرا سے الگ کر لیا تھا اور بالکل صحیح اصول پر رنگ تغزل کی بنیاد ڈالی، اردو شاعری کا ذکر جب تک صفحہ دُنیا پر قائم ہے داغؔ کا رنگ تغزل بھی یادگار رہے گا گو آج جدید رنگ کی شاعری کا چار دانگ عالم میں غلغلہ بلند ہو رہا ہے اور آئے دن اس میں نئی نئی جدتوں سے کام لے کر اردو شاعری سے "غزل" کو ایک دم نکال دینے کی جان ہار توڑ کوشش ہو رہی ہے لیکن ان کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اردو شاعری کی ساری جان غزل ہی اور غزل ہی اردو شاعری کی لچک ہی۔ آج خدائے سخن میرؔ تقی میرؔ کو گزرے ہوے تقریبًا (۱۲۲) سال کا عرصہ ہوتا ہے مگر اردو شاعری کے رنگ تغزل میں شہ کار اول کی حیثیت سے میرؔ ہی کو پیش کرنا پڑتا ہے جس کے کلام کو ہم نئی روشنی میں "الہامی" کلام کے برابر سمجھ رہے ہیں اُس "ملہم غیبی" کی زبان تقلید سے بھی ایک جگہ یہ نکل جاتا ہے کہ ؎

ریختے کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ — سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

یہ سچ ہے کہ کوئی شخص محض داغؔ کی تقلید کر کے داغؔ نہیں بن سکتا یہاں تقلید سے میری مراد داغؔ کے جذبات دلی اور خیالات عالی سے نہیں ہے۔ جذبات دلی اور خیالات عالی کو شگفتہ بنانے والی باتوں کی تقلید ہے جو روزمرہ اور جدت ادا کے ساتھ بیان کی گھلاوٹ ہی اور اس کے ساتھ ساتھ شاعر کا داخلی حال "آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔"

ہونا چاہئے ورنہ یہ خارجی مصالحہ بے کار ہے پھر شاعری کیا ہے ایک الفاظ کا گورکھ دھندا ہی گویا ایک بے جان تصویر سے کہلوایا جا رہا ہے ظاہر ہے کہ ایسی شاعری میں کیا جان آسکتی ہے!

نواب عزیز کی شاعری خارجی حالات کے ساتھ داخلی واردات سے بھی پُر نظر آتی ہے۔ ۱۳۳۳ھ میں "ارمغان عزیز" کے نام سے آپ کے کلام کا مجموعہ چھپ چکا ہے اگرچہ یہ مجموعہ مختصر ہے مگر اس کو مختصر مفید کہا جا سکتا ہے وہ ایک جگہ خود ہی کہتے ہیں:-

نوکری سے آج کل فرصت نہیں ملتی عزیز   اس لئے تعداد بھی کم ہو مرے اشعار کی

یہ کسی پیشہ ور شاعر کا کلام نہیں ہے جس میں سبھی اصناف سخن کا انبار کا انبار لگا ہوا ہو اس میں زیادہ تر خود شاعر ہے اور اس کے بے چین دل کا اضطرار ہے یا یہ الفاظ دیگر "ارمغان عزیز" مصر کا بازار ہے اور اس میں نواب عزیز اور ان کا محبوب مفرح القلوب ہے ارمغان عزیز کو شایع ہو کر ابھی دس سال سے زاید زمانہ نہیں گزرا لیکن ارمغان کی طرح بٹ گیا خود نواب عزیز کے پاس بھی اس کا مطبوعہ نسخہ باقی نہیں رہا میرے پاس ایک نہیں دو نسخے ہیں اور یہی پیش نظر ہیں ارمغان عزیز میں حسب رواج قدیم معاصرین کی تاریخیں بھی ہیں جن میں مولوی لطیف احمد صاحب اختر مینائی (خلف حضرت امیر مینائی رح) نواب اختر یار جنگ بہادر ناظم امور مذہبی سرکار عالی مولوی سید علی احسن صاحب احسن مارہروی تلمیذ داغ پروفیسر اردو اسٹر میڈیٹ کالج علیگڈھ مولوی حافظ جلیل حسن صاحب جلیل مانک پوری مخاطب فصاحت جنگ بہادر جانشین حضرت امیر مینائی رح مستغنی عن الالقاب مہاراجہ سر یمین السلطنت بہادر شاد بالقابہ صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی مولوی محمد نوح صاحب نوح رئیس مارہ ضلع الہ آباد تلمیذ داغ شریک ہیں۔

بعض تاریخوں کا اقتباس ملاحظہ کیجئے تو نواب عزیز کے پایۂ شاعری کا رتبہ اُن کے معاصرین کی زبان سے معلوم ہو جائے گا۔

اختر

یہ رنگ و بوئے معانی سے ہے عیاں اختر   کہ شاعری کا چمن ہے عزیز کا دیواں

تلاش کی تو ملا ایک مصرع تاریخ

عزیز مصر سخن ہے عزیز کا دیواں

احسن

مرے شفیق جناب عزیز ہیں احسن   جو ہیں خدا کی عنایت سے نامی دوراں

معزز ین دکن میں خطاب یافتہ ہیں   عزیز رکھتے ہیں شاہ و وزیر و خود بکلاں

جو صرف خاص میں وہ ناظم عدالت ہیں — تو عرف عام میں ہیں ناظم شگفتہ بیاں
جناب داغ کے ہیں فیض یافتہ شاگرد — سخن کے باغ میں ہیں عندلیب خوش الحاں
جواں طبیعت و پاکیزہ فکر و پختہ خیال — سلیس طبع و فصیح البیان و شستہ زباں

کہی یہ عمدہ زلیخائے طبع نے تاریخ
عزیز مصر سخن ہے عزیز کا دیواں

جلیل

اے خوشا دیوان ذی شان عزیز — اس کو کہتے ہیں کلام انتخاب

مصرع تاریخ موزوں ہے جلیل
شعر ہیں دلچسپ شاعر لاجواب

حضرت شاد بالقابہ

ہے یہ دیوان عزیز مصر فن — آپ ہی اپنی نظیر اپنا جواب
بندشیں چست اور پاکیزہ خیال — حسن معنی میں زلیخا کا جواب
ہیں خریدار اس کے وہ اہل سخن — خلق میں جن کا نہیں پیدا جواب

مصرع تاریخ لکھا شاد نے
ہے کلام بے نظیر و لاجواب
۱۴ ۲۰ ف

نوح

کلام عزیز آج شائع ہوا — نرالا ہے تحفہ انوکھی ہے چیز

لکھو نوح ہجری میں یہ سال طبع
خیالات موزوں کلام عزیز

ان تاریخوں میں مولوی غلام رسول صاحب سرور وکیل ہائی کورٹ حیدرآباد کی پرکیف تاریخ بالکل دیوان کی زبان میں ہے اس لیے میں اس کو بلا اقتباس نقل کر دیتا ہوں کہ تاریخ کیا ہے گویا ارمغان عزیز کی ترجمان ہے :۔

دیکھیے دیکھیے کلام عزیز — انتخاب انتخاب ہے گویا
شعر ایک ایک حسن میں اپنے — آپ اپنا جواب ہے گویا
پردے پردے میں ہیں نکات عجیب — صفحہ صفحہ حجاب ہے گویا

مصرع مصرع ہے قامت شمشاد — نقطہ نقطہ گلاب ہے گویا
اوج پر ہے کمال فکر سخن — شاعری کا شباب ہے گویا
یوں ہے پوشیدہ شاہد معنی — حور زیر نقاب ہے گویا
چہرۂ انورِ عروس سخن — روکشِ ماہتاب ہے گویا
بحر مواج فکر کے آگے — ہفت قلزم حباب ہے گویا
نظم تاباں سے آج دیواں کا — ہر ورق آفتاب ہے گویا
عقدۂ زلفِ یار کا مضموں — نافۂ مشکِ ناب ہے گویا
بندشیں صاف چلبلے مضموں — برق زیر سحاب ہے گویا
حسن کی عشق کی محبت کی — آخری یہ کتاب ہے گویا
اُف رے اُف رے کلام کی گرمی — حاسدوں پہ عذاب ہے گویا
ہائے اندازِ شعرِ مستانہ — ایک جام شراب ہے گویا

منتخب ہے یہ سالِ طبع سرور
ہر غزل لاجواب ہے گویا (۱۳۳۷ھ)

۱۳۴۷ھ میں نواب عزیز کے سلسلہ حیات کی ۵۸ ویں کڑی شروع ہو جاتی ہے اور یہ عمر موجودہ زمانے میں درجہ کہولت سمجھی جاتی ہے، کہتے ہیں "چو شصت آمد نشست آمد بدیوار" لیکن احتیاط اور پابندئ اصول صحت نے آپ کی جسمانی حالت کو نوجوان سا بنا رکھا ہے جسکی شہادت عینی میں اس کے ساتھ جو تصویر شائع کی گئی ہے پیش کی جاسکتی ہے یہ تصویر اب سے دو چار سال پہلے کی ہے "جوانی دیوانی" کی مثل مشہور ہے جوانی میں انسان میٹھی نیند سوتا ہے کچھ دکھائی دیتا ہے نہ سجھائی، بے احتیاطی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ "حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک" ...... بھی کہنا پڑتا ہے اور اس روا روی کے عالم میں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو عالم جوانی کو عمر انسانیت کی ایک نعمت سمجھیں اور اس کی قدر کریں ؎

قدر کے قابل نہ ہو کیونکر جوانی اے عزیزؔ! — پھر دوبارہ کوئی دنیا میں جواں ہوتا نہیں

حمد، نعت، منقبت، مدح کے ضروری نمونوں کے بعد نواب عزیز کے گلزار خیالات کی سیر کیجئے گا۔

حمد

کچھ اس طرح مرے لب پر خدا کا نام آیا — ہوا یہ شور کہ موسیٰ کا ہم کلام آیا

خبر نہیں کہ میں کس بے نشاں کا ہوں شیدا
کہ میرے ذہن میں مضمون نا تمام آیا

کہو کلیم ہوئیں کیا حضور سے باتیں؟
ہمارا ذکر بھی کوئی دم کلام آیا

ترے رسول کے قربان جنکے صدقے میں
مطالعہ میں ہمارے ترا کلام آیا

محمدِ عربی پر ہزار بار درود
خدا کے گھر سے جنھیں ہدیہ سلام آیا

ہوئے بلند صلوٰۃ و سلام کے نعرے
مری زبان پر ایسا یہ کس کا نام آیا

عزیزؔ حشر میں پہنچا تو یہ پکار مچی
کہ لو وہ احمد مختار کا غلام آیا

میرے لیے یہ کم نہیں سرمایہ ناز کا
میں ہوں نیازمند بڑے بے نیاز کا

اٹھ جائے درمیان سے پردہ مجاز کا
ہو جائے انکشاف حقیقت کے راز کا

صانع کو دیکھنا ہو تو صنعت کو دیکھئے
حال آئنے سے کھلتا ہے آئنہ ساز کا

کہتی ہے سربلندی و پستی خیال کی
انساں ہے اک طلسم نشیب و فراز کا

یہ سب نیازمندیٔ عاشق کا ہے اثر
بازار گرم ہے جو ترے کبر و ناز کا

یارب! یہی دعا ہے قناعت نصیب ہو
گھر بن گیا ہے گوشہ دل حرص و آز کا

سرکار حسن کی بھی عجب شان ہے عزیزؔ!
محمود خود غلام بنا تھا ایاز کا

نعت

مداح ہوں میں بھی اسی ممدوح خدا کا
صدقے میں کھنچا جنکے یہ کونین کا خاکا

ہے دھیان دمِ خواب مدینہ کی فضا کا
یہ نیند کا جھونکا ہے کہ جنت کی ہوا کا

جو آپ پہ مرتے ہیں وہ مرتے نہیں ہرگز
ملتا ہے مزا ان کو فنا میں بھی بقا کا

شیرازۂ کونین یہ وابستہ ہے جن سے
اک حلقہ ہے وہ آپ کے گیسوئے رسا کا

ہے ذات بنیٔ باعث تخلیق دو عالم
مضموں یہ کہے دیتا ہے لولاک لما کا

سر پہ ہو مرے گرد رہِ وادی طیبہ
سمجھوں گا میں سایہ اسے کعبہ کی ردا کا

کب تک ملک الموت سے فرقت میں کشاکش
ہو اب تو اشارہ لبِ اعجاز نما کا

میخوارِ محبت ہیں بہت دیر سے پیاسے
ساغر کوئی - صدقہ نگہ ہوش ربا کا

کیا پرسشِ محشر کا عزیزؔ اب مجھے کھٹکا
جب ہاتھ میں دامن ہے شہ عقدہ کشا کا

منقبت

دیا سجدے میں سر شہ نے شہادت ایسی ہوتی ہے
قیامت نے کہا اٹھ کر "قیامت ایسی ہوتی ہے"

علی اکبر کو جس نے رن میں دیکھا مصطفیٰ سمجھا
مشابہ اس کو کہتے ہیں شباہت ایسی ہوتی ہے

فرشتے ہو کے قرباں روئے سرور پہ یہ کہتے تھے
"جو خاصانِ خدا ہیں اُن کی صورت ایسی ہوتی ہے"

امام دو جہاں سرور۔ امام انس و جاں سرور
امامت نام ہے اس کا۔ امامت ایسی ہوتی ہے

وہ نقشہ کربلا کا ہائے جس دم یاد آتا ہے
کلیجہ خون ہو جاتا ہے۔ حالت ایسی ہوتی ہے

دیا شبیر سا حاجت روا آقا غلاموں کو
عزیز اللہ کی ہم پر عنایت ایسی ہوتی ہے

(۲)

تعلق ہے غلامی کا مجھے شبیر و شبّیر سے
گدا ہوں میں اسی در کا۔ بنا ہوں میں اسی گھر سے

دہل جاتے ہیں دشمن دیکھ کر دل بند حیدرؓ کو
لرز جاتے ہیں دشمن نعرۂ اللہُ اکبر سے

گری پھر طور پر بجلی۔ اٹھا پھر نوح کا طوفاں
ہماری آہ سوزاں سے۔ ہمارے دیدۂ تر سے

ملا کر دیکھ لیتا ہوں میں اپنے دل کے داغوں کو
کبھی مہرِ درخشاں سے کبھی ماہِ منور سے

عزیز اک حشر ہوگا حشر میں جب ماجرا اپنا
کہیں گے تشنگانِ کربلا ساقیِ کوثر سے

مدح بادشاہ

بلبل کو ہو مبارک صحنِ چمن مبارک
اور مجھ کو آستانِ شاہِ دکن مبارک

رباعیات

پُر نور ضیا بخش جہاں بانی ہے
کیا دور عزیز! دور عثمانی ہے
دفتر کے ہیں اوراق طبق گردوں کے
یہ مہر فلک بھی مہر سلطانی ہے

حکمت میں معدلت میں افضل تم ہو
دانش میں کمالات میں اکمل تم ہو
گو آصف سابع ہو جہاں میں لیکن
سب شاہوں کی فہرست میں اول تم ہو

(قطعات تہنیت)

خوشا جشنِ طرب افزا خوشا عقد کھلے عقدے ہزاروں جب بندھا عقد
عزیز اک مل گیا مصرع پئے نذر ہمایوں شاہ عثماں کو نیا عقد
۱۳ ھ ۱۳

کیا جوش پہ ہے رنگ گلستانِ دکن آج ہیں مستِ طرب زمزمہ سنجانِ دکن آج
ہر غنچۂ گل کی ہے زباں پر یہ ترانہ ہو عید مبارک تمھیں سلطانِ دکن آج

شانِ جم و سلیماں۔ سرکار ہو مبارک تائیدِ ربِ سبحاں۔ سرکار ہو مبارک
حاضر ہیں تہنیت کو دربار میں فدائی تم کو یہ عید قرباں۔ سرکار ہو مبارک

قدر دانِ علم تو ہی۔ علم تیرا قدر داں اے نظام الملک آصف جاہ خاقانِ علوم
ایک تیری ذات سے سرسبز ہے کشتِ عمل ایک تیرے دم سے تازہ ہی گلستانِ علوم
لطف تیرا ہے شہا گل زارِ عالم کی بہار فیض تیرا ہے بہارِ شمعِ ایوانِ علوم
مصرعِ تاریخ کہہ کر نذر کو لایا عزیز
محسنِ عالم ہے تو اے شاہ سلطانِ علوم
۱۳۰ ن ۱۳

حمایت باغ

اعلیحضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہ نے جس وقت اورنگ آباد میں باغات شاہی کو ملاحظہ فرمانے کے سلسلے میں ایک باغ کو حضرت شاہزادہ ولی عہد بہادر دام اقبالہٗ کے اسم گرامی (حمایت باغ) سے اختصاص فرما کر اپنے قدوم میمنت لزوم سے زمین گل زار کو رشک ارم کا خلعت بخشا تو نواب عزیز نے اس پُرمسرت تقریب پر "حمایت باغ" میں ردیف اختیار کر کے ایک مدحیہ نظم لکھی اور اس میں وہ گل کھلائے ہیں کہ زمین شعر کو بھی گل زار بنا دیا۔

ہو مبارک شاہ کا آنا حمایت باغ میں بلبلوں میں ہے یہی نغما حمایت باغ میں
خیر مقدم کیلئے نرگس کی آنکھیں منتظر سرو قد ہے سر و استادا حمایت باغ میں
کہہ رہی ہی آج کچھ سوسن زبانِ حال سے بے زباں بھی ہو گئی گویا حمایت باغ میں

جھومتا ہے ہر روش پہ بادہ خواروں کی طرح　　ہر شجر پینے ہوئے گہنا حمایت باغ میں
جلوۂ رخسار آصف دیکھنے کو بن گئی　　چشم نرگس دیدۂ موسیٰ حمایت باغ میں
بٹ رہی کشتی گل میں زرِ گل ہر طرف　　بہہ رہا ہے فیض کا دریا حمایت باغ میں
جم رہا ہے بلبل و گل میں وفاداری کا رنگ　　اُڑ رہا ہے عشق کا خاکا حمایت باغ میں
کہہ رہی ہے پتے پتے سے نسیم صبح دم　　دم بھرے میرا دم عیسیٰ حمایت باغ میں
طائر دل کے لیے مرغ تصور کے لیے　　سنبل پیچاں کا ہے پھندا حمایت باغ میں
پھول بھر کر دے رہی ہے ساغر گل میں نسیم　　یہ نئی مے ہے نیا مینا حمایت باغ میں
طائر فکر معیشت کا ٹھکانہ مٹ گیا　　آشیانہ ہو گیا عنقا حمایت باغ میں
یہ شگوفہ کس نے چھوڑا جو شگفتہ ہو گیا　　پھول کی مانند ہر کانٹا حمایت باغ میں
انتساب شاہزادہ سے لگے ہیں چار چاند　　ورنہ پہلے کیا نہیں کچھ تھا حمایت باغ میں
بن پڑی قسمت سے ایسی بے بنائے بن گیا　　سبزۂ بیگانہ بھی اپنا حمایت باغ میں
باڑ مہندی کی ہے یا یہ باڑھ ہے تلوار کی　　کٹ رہی ہے گردن اعدا حمایت باغ میں
حسن برسنے کا نفیس اب جھڑ پہ ہو باد خزاں　　ہو اگر آنا تو یوں آنا حمایت باغ میں
خوشۂ پرویں ہے یا انگور کے خوشے عزیز
خوشہ چیں حیران ہیں کیا کیا حمایت باغ میں

اسی سلسلے میں حضور پرنور کی غزل پر نواب عزیز نے جو تضمین کی ہے وہ بھی پیش کر دی جاتی ہے
کلام الملوک ملک الکلام سے کون واقف نہیں یوں تو حضرت اقدس و اعلیٰ کی غزل مرصع ہے
لیکن جو اعتبار و بہار کے قافیے ہمیشہ یاد رہیں گے زبان فیض ترجمان سے ارشاد ہوتا ہے سہ

ہزار بار تمھیں آزما کے دیکھ لیا　　تمھاری باتوں کا اب اعتبار مشکل ہے
میں اس چمن کا ہوں مرغ ترانہ سنج جہاں　　ترا گزر بھی نسیم بہار مشکل ہے

خمس

کہاں تک آہ کرے بار بار مشکل ہے　　کہاں تک آنکھ سے اشک بار مشکل ہے
کہاں تک اور بڑھے انتظار مشکل ہے　　"نہاں نظر سے ہوا روئے یار مشکل ہے
اب اپنے دل پہ ہمیں اختیار مشکل ہے"
کسی کے طرۂ زلف دراز نے دل پر　　کسی کے عشوۂ جادو طراز نے دل پر

کسی کے شیوۂ راز و نیاز نے دل پر — "کسی کے غمزہ و انداز و ناز نے دل پر
کیے وہ ظلم کہ جس کا شمار مشکل ہے"

نہ اس طرح سے یکایک ہوا ابتانی تھی — ذرا ہماری محبت بھی آزمانی تھی
ابھی امنگ کے دن تھے ابھی جوانی تھی — "غم رقیب میں تم کو نہ خاک اڑانی تھی
ہمارے دل سے یہ جائے غبار مشکل ہے"

ہزاروں گوہر مقصود کے ہیں گنج جہاں — مثال سیب ذقن ہے ہر اک ترنج جہاں
جہاں نہ خوف کسی بات کا نہ رنج جہاں — "میں اس چمن کا ہوں مرغ ترانہ سنج جہاں
ترا گزر بھی نسیم بہار مشکل ہے"

کبھی بلا کے کبھی آپ جا کے دیکھ لیا — گلے لگا کے محبت جتا کے دیکھ لیا
عدو کے سر کی قسم بھی دلا کے دیکھ لیا — "ہزار بار تمھیں آزما کے دیکھ لیا
تمھارے وعدوں کا اب اعتبار مشکل ہے"

چمن بھی ایک قیامت ہے مرغ جاں کیلئے — قدم قدم پہ مصیبت ہے مرغ جاں کیلئے
کہاں نصیب فراغت ہے مرغ جاں کیلئے — "نگاہ ناز اک آفت ہے مرغ جاں کیلئے
یہ تیر وہ ہے کہ جس سے فرار مشکل ہے"

عجیب چیز ہیں دنیا میں حضرت انساں — یہ جس کے ہو گئے پھر اسکو چھوڑتے ہیں کہاں
عزیز بھی ہیں ازل سے مرید پیر مغاں — "پڑی ہے بادۂ ترکی جو چاٹ اے عثماں
بہار گل میں یہ جائے خمار مشکل ہے"

نواب عزیز کو اپنے بادشاہ جم جاہ کے بعد وزیر سلطنت کے ساتھ جو ارادت ہے اس کا اندازہ ذیل کی رباعی سے ہو سکے گا۔ مدح کے ساتھ ذرا چوتھے مصرع کی دلیل کو بھی شاعرانہ نظر سے ملاحظہ فرمائیے

مدح وزیر

آصف سے ملی آج وزارت کی سند — سرکار مبارک ہو بر آیا مقصد
سلطان کے بعد آپ ذی رتبہ ہیں — ہے شاہ سے کم شاد میں صرف ایک عدد

ارمغان عزیز سے حمد، نعت، منقبت، مدح شاہ و وزیر کے بعد تصوف، عقاید، وعظ و پند نیرنگ عالم، حسن و عشق، حسرت و یاس۔ رشک و محبت۔ پابندی وضع، روزمرہ۔ معانی آفرینی مضامین کی شوخی، الفاظ کی کھپت کی تحت مختلف بحور و قوافی کے اشعار درج کیے جاتے ہیں

جن سے غزل میں رنگا رنگی مضامین کا بھی اندازہ ہو جائے،

تصوف

کیوں کر پتا لگائے کوئی پھر قیاس سے
خارج ہیں وہم سے تو ہیں باہر گماں آپ سے

یہ نہ سمجھیں مفت مل جائے گا دل
آپ قادر اور میں مجبور ہوں

وحدت کا راز کھل گیا آئینہ خانے میں
مجھ کو دکھائی دی مری صورت کہاں کہاں

قابل دید ہوتا اُس کا حال
دیکھ لیتا کوئی اگر تم کو

یاد بتاں بھی ہم کو سفر در وطن ہوا
گھر بیٹھے سیر کرنے لگے دور دور کی

تجلیات انوار الٰہی ہم میں مخفی ہیں
تماشاگاہ عالم ہوگئی تصویر مٹی کی

پہلے مرنے سے جو مرے بخدا
خاک کو اُس کی کیمیا کہیئے

چشم پوشی بھی ہے انھیں منظور
میری تقصیر پر نظر بھی ہے

عقائد

اپنی خطا سے بھی بہت بڑھ کے ہے اُسکی مغفرت
تم کو عزیزؔ اس کا لطف روز حساب آئے گا

اجمیر دیکھ آئے مگر دل میں اے عزیزؔ
شوق زیارت شہِ بغدادؒ رہ گیا

وعظ و پند

رند ہو زاہد ہو یا مے خوار ہو
چاہیئے سب کو خیال انجام کا
جس کو دنیا موت کہتی ہے عزیزؔ
دوسرا اک نام ہے آرام کا

بحرِ جہاں میں ہے نفسِ واپسیں کا خوف
مُنہ پھیرتی ہے بادِ مخالف جہاز کا

عزیزؔ! اُٹھو درِ مے خانہ چھوڑ دو
کہیں توبہ کا ہو جائے نہ در بند

یہ حبابِ لبِ ساحل سے بھی نازک تر ہے
کچھ حقیقت بھی بشر کی ہے بشر کچھ بھی نہیں

نیرنگ عالم

کیا جنوں خیز ہے اِس گلشنِ عالم کی ہوا
پھول بھی میری طرح چاک گریباں نکلا

عجب عبرت سرا ہے خطۂ گورِ غریباں بھی
ہزاروں گھر بگڑ کر بن رہے ہیں گھر یہاں کیا کیا

پڑھتے تھے کل تک یہاں جو داستانِ حسن و عشق
جائے عبرت ہے کہ ان کا ذکر ہے افسانہ آج
وقتِ بد میں چھوڑتا ہے ساتھ سایہ بھی عزیزؔ
آشنا جو تھا نظر آنے لگا بیگانہ آج

قرارِ عشق میں تم کو نہ چین ہے ہم کو
پھنسے ہیں گردشِ لیل و نہار میں ہم تم

اپنے دشمن سے بھی ملنا ہو تو جھک کر ملیے
خاکساری نے یہ انداز سکھایا ہے مجھے

حسن و عشق

کرتے ہیں عاشقوں پہ یہ کیا کیا حکومتیں
کہتی ہے ان بتوں کو خدائی خدائے دل
کیا تم نگاہِ شوق کو پہچانتے نہیں؟
کہنے کی بات ہو تو کہوں مدعائے دل

تیری صورت کو دیکھتے ہیں ہم
اپنی قسمت کو دیکھتے ہیں ہم
جس کو تم آئینہ میں دیکھتے ہو
ایسی صورت کو دیکھتے ہیں ہم

کس تمنا سے تم کو دیکھتے ہیں
دیکھنے والوں کی نظر دیکھو

اور کچھ ہو گئی نگاہ تری — اب وہ پہلی سی شرمگیں نہ رہی

شب وصال کے قصے میں ہی اثر کیسا — زباں پر آتے ہی دل کو سرور ہوتا ہی

اُس نے کچھ اس طرح پوچھا دردِ دل — مجھ کو کہنا ہی پڑا آرام ہے

میں روتا ہوں پکڑ کر اُن کا دامن — وہ آنسو پوچھتے ہیں آستیں سے

تماشا ہیں طریقِ عشق میں نیرنگیاں دل کی — یہی کم بخت رہزن ہی یہی کم بخت رہبر ہے

نہو دلِ صاف جب تک لطف ملنے کا نہیں ملتا — ترا یوں کھنچ کے ملنا بھی نہ ملنے کے برابر ہے

دل کی پروا ہی نہ کچھ جان کی پروا ہی مجھے — آزما کر بھی کبھی آپ نے دیکھا ہے مجھے

بدگمانی یقین کی حد تک — کچھ اُدھر بھی ہے کچھ اِدھر بھی ہی
آنکھ پھر تیری آنکھ او کافر! — عشوہ گر بھی ہے فتنہ گر بھی ہی
وقت پر اپنا نالۂ سوزاں — با اثر بھی ہی بے اثر بھی ہی

میرے دل کو دیکھئے اس میں کوئی — آپ کا ہم شکل ہے ہم نام ہی

حسرت و یاس

جی بھر کے خواب میں بھی نہ دیکھا ترا جمال — اس طرح کچھ خوشی ہوئی ہی بیدار ہو گیا
کم بخت پوری بات بھی نکلی نہ تھی ابھی — یہ مُنہ کی مُنہ میں تھی اُدھر انکار ہو گیا

ہم لے رہے تھے قبر میں کیسی مزے کی نیند — اے شورِ حشر! کیوں ہمیں بیدار کر دیا

سسکتا چھوڑ دیا مجھ کو میرے قاتل نے　　کیا تھا ذبح تو قصّہ تمام کرنا تھا

پہنچتے ہم ابھی منزلِ مقصود پر کیوں کر　　اُڑی ہے سامنے آنکھوں کے گردِ کارواں کیا

حشر میں کس منہ سے جائیں سامنے اللہ کے　　کون سا ہم نے کیا کارِ نکو زیرِ فلک

وہ دیکھتے ہیں چشمِ عنایت سے کس طرف　　یہ دیکھتے ہیں بزمِ عدو میں بغور ہم

اور دل کی بے قراری بڑھ گئی　　کیوں کہا تھا اضطراب اچھا نہیں
غیر اچھے آپ اچھے لاکلام　　میں ہی اک خانہ خراب اچھا نہیں

جب نہ تھا قسمت میں اُس کو دیکھنا　　دی خدا نے کس لیئے بے کار آنکھ

نہ کی آخر ہماری پردہ پوشی دستِ وحشت نے　　نمایاں ہو گیا چاکِ جگر چاکِ گریباں سے

چمنِ دہر کی کیا خاک موافق ہو ہوا　　خار تو خار ہیں پھولوں سے بھی کھٹکا ہی کیے

رشکِ محبت

دوست بہت ہیں مگر اُن سے عزیز　　ذکر کسی نے نہ ہمارا کیا

غیر سے ملیئے نہ یوں دل کھول کر　　اس طرح کی سادگی اچھی نہیں

اے ظالم! ترے نقشِ قدم کے فیضِ صحبت سے　　زمیں کوئے دشمن غیرتِ گلزار ہوتی ہے

کچھ تجھے شرم بھی ہے دیدۂ گریاں آخر　　آتشِ ہجر میں کب تک ابھی جلنا ہے مجھے

نکلا ہوں اُس کی بزم سے لے کر عدو کا رشک
رکھتا ہوں اپنے ساتھ یہ تحفہ برائے دل

پابندیٔ وضع

یہ وہ نہیں ہے دل جو کسی اور پر مرے
یہ وہ ہے جس کا ہو گیا اک بار ہو گیا

خدا وہ دل دے کہ غم بھی خوشی کے ساتھ کٹے
خزاں بھی آئے نظر تو بہار کی صورت

ہم بے طلب نہ جائیں گے بزمِ رقیب میں
ہم اس کو روکتے نہیں جاتا ہے جائے دل

کہیں ٹلتے تمھارے درباں سے؟
اپنی عزت کو دیکھتے ہیں ہم

روزمرّہ

جس کا دل تھا اُس سے پوچھو اس کا حال
تم کو کیا جاتا رہا، جاتا رہا،

عرض تمنا بھی کوئی جرم تھا؟
آپ نے تو اتنے کو اتنا کیا

آسان تھا علاج ہمارے فراق کا
دشوار کر دیا اِسے دشوار ہو گیا

وہ تو جھلک دکھا کے اُدھر کو سرک گئے
اک حشر اِس طرف پسِ دیوار ہو گیا

کیا اور کوئی دل کو نہ لے گا بجا درست
بے کار تم نے کہدیا۔ بے کار ہو گیا؟

جب آپ کے پسند نہیں ہے دلِ حزیں
میرے بھی کام کا نہیں بے کار ہو گیا

یہ ملا عرض مکرر پر جواب
"جو مقدر کا تھا ملنا مل گیا"

نامۂ شوق دیکھ کر۔ کر دیا اُس نے چاک چاک
نامہ رساں سے کہدیا۔ "کہہ دے جواب آئے گا"

بنائے ایک کے دو دو کے چار چار کے آٹھ
پٹک کے شیشۂ دل چور چور میں نے کیا

کان رکھ کے سنتے ہیں وہ مجھ سے میری داستاں — داد ملتی ہے زباں کی لطف ہے تقریر کا

حلق میرا ہے جگر میرا ہے گردن میری — تیغ تیری ہے۔ چھری تیری ہے خنجر تیرا
کون ہے رسم محبت نہیں جس کو تجھ سے — کون ہے نام نہیں جس کی زباں پر تیرا
ہائے اصرار پہ اصرار وہ میرا پئے وصل — اور انکار پہ انکار مکرر تیرا
نشہ میں جام سے وہ جام بدل لیتے ہیں — اور کہتے ہیں "یہ میرا ہے یہ ساغر تیرا"
دل کی دل میں کہیں رہ جائے نہ حسرت میری — چلتے چلتے کہیں رک جائے نہ خنجر تیرا

رکھ دیا لے کر ہمارا نقد دل — کہہ دیا ہنس کر "مرے کس کام کا؟"

تمھیں سوچو تمھیں سمجھو تمھیں انصاف کرو — کوئی حسرت مری نکلی۔ کوئی ارماں نکلا؟

جو نہ کرنا تھا کیا وہ عشق نے — جو نہ ہونا تھا وہ آخر ہو گیا
اب کہاں دل چھوڑتا ہے عشق کو — ہو گیا جس بات کے سر ہو گیا
آج ان سے وصل کا وعدہ عزیز — ہو گیا پھر ہو گیا پھر ہو گیا

طریق محبت میں دل کی نہ پوچھو — کسی کا یہ رہبر ہے رہزن کسی کا

وہ تم ہو توڑتے ہو آس پر آس — یہ ہم ہیں کھا رہے ہیں چوٹ پر چوٹ

تم نکالو تو آرزو نکلے — دل خانہ خراب سے باہر

دوست دشمن کا سلیقہ دیکھیے — کیجیے تفویض کوئی کام خاص

دل دے کے پیارا مجھ کو وہ یوں بگڑ کے بولے — "یہ چیز تیری تجھ کو اے دل شکن! مبارک"

سوالِ وصل پر بولے بگڑ کر — "یہ بے باکی، یہ جرأت، یہ ترا دل ہے"

کہنے کو ہم نے کہہ بھی دیا اضطراب میں — سننے کو اُس نے سن بھی لیا ماجرائے دل

قابلِ دید ہے دیکھو مرے داغوں کی بہار — پھول اور اتنے بہت پھول گلستاں میں نہیں

اپنی محفل میں مجھے دیکھ کے وہ کہنے لگے — کون ہیں؟ کس لیے آئے ہیں؟ یہ کیا کہتے ہیں؟

جانتا ہوں تمھاری باتوں کو — اور پھر اعتبار کرتا ہوں

تری نظریں، تری باتیں، تری چالیں، تری چتون — کوئی ترچھی، کوئی ٹیڑھی، کوئی تیکھی، کوئی بانکی

اپنی تقدیر پہ ہر وقت بھروسا ہے مجھے — آج کی فکر نہ اندیشۂ عقبیٰ ہے مجھے

معانی آفرینی

تصور کو دعائیں دے رہا ہوں — لیا ہے کام اس سے دوربیں کا

اُن کا ہے امتحان کہ میرا ہے امتحان — کیوں چلتے چلتے خنجرِ فولاد رہ گیا

وہ جو مجھ کو کوستے ہیں شوق سے کوسا کریں — کچھ نہیں تو نام ہی وردِ زباں ہو جائے گا

بعدِ فنا بھی ظلمتِ عصیاں نہ کم ہوئی — پتھر سیاہ ہے مری لوحِ مزار کا

چھوٹ جاؤں قیدِ غم سے زندگی میں کیا مجال — ربع مسکوں ہے احاطہ خانۂ زنجیر کا

جورِ معشوق و گریۂ عاشق — ہیں یہ دونوں حساب سے باہر

یادِ عارض میں نکل آتے ہیں آنسو آنکھ سے
دیکھتا ہوں جب کبھی خورشید تاباں کی طرف

اس میں سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں
دل کی وسعت کو دیکھتے ہیں ہم

یہ کیا کہا کہ ملیں گے اگر ملی فرصت!
تمھاری بات کا تم کو بھی اعتبار نہیں

نوخیز شاعری ہے ہماری ابھی عزیز
جب ہم ضعیف ہوں تو کہیں یہ جوان ہو

مری تربت کو ٹھکرایا تو ٹھوکر سے صدا نکلی
کہ یہ گرد کدورت بھی غبارِ راہِ عقبیٰ ہو

یا الٰہی! جذب کیوں ہوتی ہے ساغر میں شراب
اس میں شامل تو نہیں مٹی کسی مے خوار کی؟

مہتاب میں بھی ہے تپش آفتابِ حشر
فرقت کی رات کم نہیں روزِ شمار سے

تمھاری وجہ سے اس کو ملا عروج عزیز
وگرنہ یار کا دروازہ پاسباں کے لیے؟

مدار کیسے تصور کو مزا ہے دید کا حاصل
ہماری آنکھ کا حلقہ تری تصویر کا گھر ہے

ایک مجموعۂ اضداد ہے اپنی ہستی
خاک ہے آب ہے آتش ہے ہوا ہے کیا ہے؟

"تجھ سے ہم مل کے رقیبوں سے ملیں گے کیوں کر؟"
کیوں یہ فقرہ ستم ایجاد نے لکھا ہے مجھے

میکشو! ظرف پر ہے یہ موقوف
میکشی عیب بھی ہنر بھی ہے

مضامین کی شوخی

لفظ وصال کیا کسی عاشق کا نام تھا!
کیوں تو یہ سن کے در پے آزار ہو گیا؟

یوں تو مزے کی بات ہی تھی وعدۂ وصال — لکنت نے اُن کی اور مزے دار کر دیا

آپ کی محفل ہے یا چوروں کا گھر — جس کو دیکھو چیختا ہے "دل گیا!"

مزا تھا چوک گئے ہم عدو کی محفل میں — ملے تھے اُن سے تو جھک کر سلام کرنا تھا
نہ تھی جہان میں کیا اور کوئی شے زاہد! — شراب ہی تھی؟ اسی کو حرام کرنا تھا؟

مجھ سے نہ پوچھو چھیڑ کر بزم میں دل کا مدعا — کہہ دوں اگر میں صاف صاف تم کو حجاب آئے گا

بے خود سے ہو گئے اُسے ناصح بھی دیکھ کر — حضرت کا وعظ اور وہ ارشاد رہ گیا

اُڑا دی غیر کے مرنے کی جھوٹ موٹ خبر — اُنھیں بھی اپنی طرح ناصبور میں نے کیا

دل میں جو داغ عشق ہو واعظ تو بات ہے — بے کار ہے جبیں پہ یہ گھٹّا نماز کا
خط کتابت میں یہی شرط مقدم ہے عزیز — چست مضمون ہو، خط صاف ہو، پیارا کاغذ
میکدے میں نہ پڑی مجھ پہ کسی غیر کی آنکھ — چھپ گئی ساری خدائی سے پس خم ہو کر
دم نہ مارا داورِ محشر کے آگے شیخ نے — کی بہت کچھ زندگی میں ہاؤ ہو زیرِ فلک
رکھ کے زاہد کے سامنے ساغر — حسن نیت کو دیکھتے ہیں ہم
اپنے بیگانوں سے ہر وقت لپٹ پڑتا ہے — بات کرنے کا سلیقہ ترے درباں میں نہیں
روک دے مجھ کو یہ ممکن ہے یہ ہو سکتا ہے — روک لے دل کو یہ طاقت ترے درباں میں نہیں
ایک پر ایک چلے آتے ہیں مشتاق جمال — روکے کس کس کو جو حواس آپ کے درباں میں نہیں
ہم سے چھپتی ہے کہیں دل کی لگی بھی ناصح! — وصف کیوں جور کا ہوتا ہے اگر کچھ بھی نہیں
یہ کہہ کے ان کو اپنے گلے سے لگا لیا — کرنی پڑے گی آج ملاقات عید کی
عادت ضرور چاہیئے ہر بات کے لیے — مے پی! جو آرزو ہے شراب طہور کی
وہ گورے گورے گال خدا کی قسم عزیز — قابل ہیں بوسے لینے کے لائق ہیں پیار کے

پئیں گے پلائیں گے تجھ کو بھی زاہد　　بڑی دھوم سے اک ضیافت کریں گے

الفاظ کی کھپت

آنکھ سے کام لیتے ہیں وہ ٹیلیفون کا　　تار نگاہ بہر خبر تار ہو گیا

جب دیکھو صورتیں ہیں ہزاروں نئی نئی　　دیوان خانہ آپ کا بازار ہو گیا

مجھ کو خط بھی نہ بھیجو۔ اور بھیجو　　غیر کو تار واہ واہ یہ کیا

غیر ممکن ہے کہ کہے وہ میری حالت من و عن　　یہ غلط ہے نامہ بر میری زبان ہو جائے گا

ساقیا صافی ہیں چھین کر اور بھی　　رنگ نکھرا بادۂ گل فام کا

عموماً مطلع اور مقطع زور غزل کا نمونہ سمجھا جاتا ہے اس لیے بعض غزلیات کے مطلعے بھی دیئے جاتے ہیں:-

مطلعے

پرسش کے ساتھ حشر میں بیدار ہو گیا　　داخل ثواب میں یہ گنہ گار ہو گیا

حال ابتر ہے شب غم نالۂ شب گیر کا　　اس اندھیرے میں پتا چلتا نہیں تاثیر کا

خیر سے شیخ بھی ہم مشرب رنداں نکلا　　ہم تو کافر اسے سمجھتے تھے مسلماں نکلا

عمر بھر مجھ کو حسینوں سے سروکار رہا　　اس کو تاکا اسے جھانکا یہی آزار رہا

قہر سے اس کے ڈر رہا ہوں میں　　موت سے پہلے مر رہا ہوں میں

خدا جانے کہاں سے آرہے ہیں　　قدم اٹھتے نہیں شرما رہے ہیں

کدورت کا برا ہو مانع دیدار ہوتی ہے　　کبھی چلمن کبھی پردا کبھی دیوار ہوتی ہے

حسن پہ اللہ ناز ازل سے دل مرا دیوانہ ہے　　پھول پہ بلبل ہے شمع بزم پہ پروانہ ہے

ہوس دولت دنیا بھی بلا ہوتی ہے جتنا کم کیجئے اتنی یہ سوا ہوتی ہے

گو نواب عزیز کی طبیعت شعر ہر قسم کے بحر میں غوطہ لگا کے گوہر مراد سے اپنا دامن بھر لیتی ہے لیکن ہیں چھوٹی چھوٹی بحروں میں ان کی طبیعت زیادہ رواں معلوم ہوتی ہے ان میں زبان طرز بیان اسلوب ادا اور تاثیرات کے آثار بھی پورے پورے نظر آتے ہیں بعض غزلیات ملاحظہ ہوں:-

غزلیات

اُس کو تنہا مکان میں دیکھا خود نمائی کی شان میں دیکھا
دشمنوں کو بنا لیا اپنا یہ اثر بھی زبان میں دیکھا
آپ کے حُسن کا جواب نہیں ہم نے سارے جہان میں دیکھا
اُس نے عرض وصال پر اے دل! کیا کہا تیری شان میں دیکھا؟
کعبہ و دیر پر نہیں موقوف اُس کو اپنے مکان میں دیکھا
ایک ٹکڑا مری کہانی کا عشق کی داستان میں دیکھا
بجلیاں کوندتی ہیں آہوں کی ساتویں آسمان میں دیکھا
دیدۂ شوق نے ترا جلوہ ہر جگہ ہر مکان میں دیکھا
اپنے دل کا نشان مرٹ کر گم شدہ کاروان میں دیکھا
ہر طرح اُس نے آزما کے مجھے امتحان امتحان میں دیکھا
اُن کے ایفائے عہد کا پہلو نامہ بر کے بیان میں دیکھا
نہ ملا تجھ سا دوسرا نہ ملا ہم نے دونوں جہان میں دیکھا
مہر کا لطف دوستی کا لحاظ اپنے اک مہربان میں دیکھا
داغ کے بعد لطف شعر عزیز
ہم نے تیری زبان میں دیکھا

روگ جی کا فراق ہے گویا سانس لینا بھی شاق ہے گویا
تم سے کب بھی وصال کی امید یہ بھی اک اتفاق ہے گویا
اُن سے مل کر بھی مل نہیں سکتے وصل میں بھی فراق ہے گویا
دشمنی تو ہے دشمنی اُن کی دوستی بھی نفاق ہے گویا

اس طرح سن رہے ہیں میرا حال — اُن کو بھی اشتیاق ہے گویا
دل لگانا ہے کھیل غیروں کو — جان دینا مذاق ہے گویا
آئیے جلد آئیے کہ عزیز
ہمہ تن اشتیاق ہے گویا

آپ کا اعتبار کرتا ہوں — اور بھی انتظار کرتا ہوں
حُسن کا اُن کے عشق کا اپنے — تذکرہ بار بار کرتا ہوں
چھیڑ کر اپنے درد کا قصہ — اُن کو بھی بے قرار کرتا ہوں
جان کر بھی جفا شعار انھیں — جان اپنی نثار کرتا ہوں
عشق کا راز تا نہ افشا ہو — گفت و گو پیچ دار کرتا ہوں
جانتا ہوں تمہارے وعدوں کو — اور پھر اعتبار کرتا ہوں
زورِ قسمت پہ چل نہیں سکتا — خامشی اختیار کرتا ہوں
کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی — کوششیں بار بار کرتا ہوں
وصل کی شام کا تو میں ہر روز — صبح سے انتظار کرتا ہوں
دیکھ کر۔ دیکھتا نہ ہو کوئی — آنکھ اُن سے دو چار کرتا ہوں
"کوئی امید بر نہیں آتی" — آرزوئیں ہزار کرتا ہوں
بہہ نکلتے ہیں بے شمار آنسو — جب خطائیں شمار کرتا ہوں
دیکھ کر اپنا حال آپ عزیزؔ
شکر پروردگار کرتا ہوں

عقل حیراں دل پریشاں کیا کریں — کیا کریں ملنے کا ساماں کیا کریں؟
ہائے ذکرِ زلفِ پیچاں۔ کیا کریں — اور بھی دل کو پریشاں۔ کیا کریں
ہم کدھر جائیں نکل کر اے جنون! — پھاند کر دیوارِ زنداں کیا کریں
کر دیا وحشت نے سب سے بے نیاز — آستیں، دامن گریباں کیا کریں
چھیڑ کر گذری ہوئی باتوں کا ذکر — اُس پشیماں کو پشیماں کیا کریں
وہ تو آئے ہیں نہ آئیں گے کبھی — جھوٹے وعدے جھوٹے پیماں کیا کریں
آتے جاتے ہیں عدو۔ چوری چھپے — پاسباں، دربان، نگہباں کیا کریں

بڑھتے بڑھتے دل کی وحشت بڑھ گئی — تنگ ہو صحرا کا میداں کیا کریں
اُن کی شہرت میری رسوائی کے ساتھ — ہوگئی دست و گریباں۔ کیا کریں
جان کا دشمن ہے میری رشک غیر — جان ایسی تم پہ قرباں۔ کیا کریں
کیا دھرا ہے اس دلِ ویراں میں اب — کیا بلائیں اُن کو مہماں۔ کیا کریں
شاعری مہماں ہے کچھ دن کی عزیزؔ
ہم مرتب اپنا دیواں۔ کیا کریں

میں کروں پیار واہ واہ یہ کیا — آپ بیزار واہ واہ یہ کیا
مفت لے لو گے نقد دل میرا — ایسے عیّار واہ واہ یہ کیا
مجھ کو خط بھی نہ بھیجو اور بھیجو — غیر کو تار واہ واہ یہ کیا
قتل عشاق کھیل سمجھے ہو — رکھ دو تلوار واہ واہ یہ کیا
وصل کی شب بھی ہے وہی حجت — وہی تکرار، واہ واہ یہ کیا
دم تو لینے دو مرنے والوں کو — وار پر وار واہ واہ یہ کیا
آپ اور آپ کی زباں سے عزیزؔ!
ایسے اشعار واہ واہ یہ کیا

آ چکے یار واہ کیا کہنا — حسب اقرار واہ کیا کہنا
مجھ سے بیزار واہ کیا کہنا — واہ سرکار! واہ کیا کہنا!
یوں تڑپتے رہیں ترے کشتے؟ — اے ستمگار! واہ کیا کہنا
عرض مطلب پہ گالیاں دیجے — اور دو چار واہ کیا کہنا
مجھ کو آسان امتحان وفا — تم کو دشوار واہ کیا کہنا
میرا دامن ہو دامنِ گلزار — چشم خوں بار واہ کیا کہنا
صبح امید ہوگئی کافور — اے شب تار! واہ کیا کہنا
یوں پریشاں رہے عزیزؔ ترا
واہ اے یار! واہ کیا کہنا!

دل گیا۔ کس کا؟ ہمارا دل گیا — بے وفا تھا بے وفا سے مل گیا
دیکھ کر اُن کو پریشاں خواب میں — کھل گئیں آنکھیں کلیجہ ہل گیا

سخت جانی نے مجھے تڑپا دیا / نیم بسمل چھوڑ کر قاتل گیا
میکشو! ساقی پہ اپنا زور کیا؟ / ہے بہت گر ایک قطرہ مل گیا
قیس کی آنکھوں میں کیا لیلیٰ نہ تھی؟ / کیوں یہ کہتا تھا کدھر محمل گیا!
یہ ملا عرض مکرر پر جواب / "جو مقدر کا تھا ملنا۔ مل گیا"
وہ بھی ہیں بیتاب ہم بھی مضطرب / دل لگی کا یہ نتیجہ۔ مل گیا
جو ہونے تھے ستم ہم پر ہوئے / جو نہ ملنا تھا وہ ہم کو مل گیا
آپ کی محفل ہے یا چوروں کا گھر / جس کو دیکھو چیختا ہے دل گیا!
دے رہا ہوں میں تصور کو دعا / جستجو جس کی تھی مجھ کو مل گیا
ان کی آمد کی خبر سن کر عزیزؔ
چین آیا۔ اضطراب دل گیا

وہ مجھ پہ وار نہ کرتا تو اور کیا کرتا / میں اس کو پیار نہ کرتا تو اور کیا کرتا؟
پری سمجھ کے تری تیغ کو میں اے قاتل! / گلے کا ہار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
طریق عشق میں اپنے ہی مضطرب دل کو / صلاح کار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
انھیں تو کھیل تھا وعدہ مگر یہاں دن بھر / میں انتظار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
غرض یہ تھی کہ وہ الجھیں میں اپنی باتوں کو / جو پیچ دار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
تم اپنے حسن پہ بگڑو، مری خطا کیا ہے؟ / میں تم کو پیار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
سمجھ لیا تھا کہ جھوٹا ہے اُن کا قول مگر / میں اعتبار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
بگڑتے ہیں تو وہ بگڑیں عدو کی محفل میں / میں آنکھ چار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
جواب خط کا کہاں تک میں منتظر رہتا؟ / دوبارہ تار نہ کرتا تو اور کیا کرتا
نہ آئے تم تو، تمھاری شبیہ دل کش کو
عزیزؔ پیار نہ کرتا تو اور کیا کرتا

ڈھونڈھتا پہلو کوئی آرام کا / کام تھا یہ بھی دل خود کام کا
مجھ کو چپ رہنے کی عادت ہو گئی / اُن کو لپکا پڑ گیا دشنام کا
آب حیواں ہے ہمارے واسطے / قطرہ قطرہ بادۂ گلفام کا
اُس نے مجھ کو قبر میں رکھ کر کہا / "یہ ٹھکانہ ہے بہت آرام کا"

رکھ دیا لے کر ہمارا نقدِ دل
کہہ دیا ہنس کر مرے کس کام کا؟

صدمۂ غم سے بدل جاتی ہے شکل
غیر ممکن ہے بدلنا نام کا

اُڑ کے جاتا ہے ہمارا نامہ بر
اس قدر ہے لالچی انعام کا

رند ہو۔ زاہد ہو، یا مے خوار ہو
چاہیئے سب کو خیال انجام کا

جس کو دنیا "موت" کہتی ہے عزیزؔ
دوسرا اک نام ہے آرام کا

وہ کہہ رہے ہیں تجھے ناصبور میں نے کیا
خطا مجھی سے ہوی یہ قصور میں نے کیا"

یہ اقتضائے محبت ہے شانِ حسن نہیں
پری بنایا تجھے میں نے حور میں نے کیا

بنائے ایک کے دو۔ دو کے چار۔ چار کے آٹھ
پٹک کے شیشۂ دل چور چور میں نے کیا

سوال وصل پہ روٹھو نہ اس قدر بگڑو
خدا کے واسطے بخشو۔ قصور میں نے کیا

اُڑا دی غیر کے مرنے کی جھوٹ موٹ خبر
اُنھیں بھی اپنی طرح ناصبور میں نے کیا

تمھارے نام سے حورانِ خلد جلتی ہیں
تمھارا نام بہت دور دور میں نے کیا

متاعِ دل پہ ہوا ناز تم کو یا مجھ کو
غرور تم نے کیا یا غرور میں نے کیا؟

ملے تو پوچھ لوں "ملنے سے کیوں ہوی نفرت
کوئی خطا ہوی کوئی قصور میں نے کیا"

نگاہِ شوق اشاروں میں کہہ رہی ہے عزیزؔ
تجھے خراب دل ناصبور میں نے کیا

حالتِ دل ملاحظہ کیجے!
عشقِ کامل ملاحظہ کیجے!

دعوئے مہر اور غیر سے چشمک
زعمِ باطل ملاحظہ کیجے!

اور کیا آپ کی تمنا ہے!
چیر کر دل ملاحظہ کیجے!

لوٹتا ہے یہ کس ادا کے ساتھ
رقصِ بسمل ملاحظہ کیجے!

بوسے، پھر وہ بھی عارض کے
جرأتِ دل ملاحظہ کیجے!

آپ ہوں میرے گھر خدا کی شان
جذبۂ دل ملاحظہ کیجے!

کون ہے دوست کون ہے دشمن؟
رنگِ محفل ملاحظہ کیجے!

آپ کے لب سے لب ملاتا ہے؟
ساغرِ گُل ملاحظہ کیجے!!

دیکھنا ہو جو دل جلوں کا حال
شمعِ محفل ملاحظہ کیجے!

عشق کیا کیا کنویں جھکاتا ہے — حضرتِ دل! ملاحظہ کیجے!
آدمی کیا فرشتے بھی ہیں اسیر — چاہِ بابل ملاحظہ کیجے!
لطف دے گا عزیز کا دیوان
اس کو کامل ملاحظہ کیجے!

تمام اجسام کی نہیں معلوم کیا مصلحت تھی کہ انسان کے بھرے بھرے جسم میں ایک چار انگل کا ٹکڑا لگا کے اِس کو اُس کا مطیع لیل و نہار بنا رکھا ہے۔ حضرت دل بھی عجیب طرفہ معجون ہیں اگر یہ دم بھر کو خفا ہو جائیں تو دم خفا ہو جائے۔ کسی کے حق میں آب حیات ہیں تو کسی کے لئے جان کی گھات عاشقوں کی سراپا حیات اُن کے ہاتھ ہے۔ معشوق، دو حرفی دل کا ٹھنڈے دل سے قصہ سننے کے عادی نہیں۔ بیچارے عشق کے مارے عاشق کو ہزار سوانگ بنانے پڑتے ہیں "دل ہے" والی غزل کو پڑھئے اور ایک قافیے کی پابندی کے ساتھ ہجوم مضامین کو بھی ملحوظ خاطر رکھئے اِس کی نسبت خود نواب عزیز کا فیصلہ خوب ہے ؎

بہت ہی حسن سے موزوں ہوئے ہیں قافیے "دل" کے
عزیز اب یہ غزل تو آپ کی دیوان "بیدل" ہے

دل ہے

حسینوں کی محبت سے رہائی سخت مشکل ہے — اگر ہمراہ مدفن میں یہی آنکھیں یہی دل ہے
اُدھر تلوار لے کر مستعد مقتل میں قاتل ہے — اِدھر مارے خوشی کے جامے سے باہر مرا دل ہے
یہ حوروں کی صفت خالی نہیں مطلب سے اے واعظ — کسی پر آج کل آیا ہوا حضرت کا بھی دل ہے
میں وہ گم کردہ دل ہوں گر کہیں شیشہ بھی پاتا ہوں — لگا لیتا ہوں سینہ سے سمجھ کر یہ میرا دل ہے
ذرا گردن جھکا کر دیکھ تو چشم حقیقت سے — یہ جام جم نہیں او بے خبر! آئینۂ دل ہے
وہ کہتا ہے محبت کر، "یہ کہتی ہے نہیں اچھا" — سنوں کس کی پریشاں عقل ہے حیرت زدہ دل ہے
کوئی جام شکستہ میکدے میں جب نظر آیا — تو میں نشہ میں یہ سمجھا مرا ٹوٹا ہوا دل ہے
کھٹکتا ہے شب فرقت نہیں راحت کسی کروٹ — الٰہی! کوئی کانٹا ہی مرے پہلو میں یا دل ہے؟
شکایت غیر سے کیا ہو شکایت ہو تو اس سے ہے — مرا دشمن میرا دل ہے مرا قاتل میرا دل ہے
کہاں وہ شغل میخواری، کہاں وہ صحبتیں اگلی — نہ وہ رنگ طبیعت ہے نہ وہ چرچے نہ وہ دل ہے
تمہارے ہی ہیں گھر دونوں جہاں چاہو چلے آؤ — ادھر آراستہ آنکھیں، ادھر آراستہ دل ہے

جو شیشہ مئے کا خالی دیکھتا ہوں بزم ساقی میں
سمجھتا ہوں کسی مے کش کا یہ حسرت بھرا دل ہے

ترے خال سیہ اور عارض پر نور کی بسم کو
نئی تشبیہ سوجھی، یہ سویدا اور وہ دل ہے

یہاں کچھ بس نہیں چلتا۔ کروں گا حشر میں رسوا
کہوں گا، روبرو سب کے یہی غارت گر دل ہے

ابھی میں ٹھونک دوں پہلو سے اسکو چیر کر پہلو
نہو الفت اگر اس میں تو پھر کس کام کا دل ہے

چھپائے سے کہیں الفت بھی چھپتی ہے ادھر دیکھو
نگاہیں صاف کہتی ہیں کہیں آیا ہوا دل ہے

ہمارے آتے ہی دیکھو آپ سے پھر ہو گیا باہر
کہاں قابو ہے اب دل پر کہاں قابو میں اب دل ہے

بہت ہی حسن سے موزوں ہوئے ہیں قافیے دل کے
عزیز اب یہ غزل تو آپ کی دیوان بیدل ہے

ارمغان عزیز کے آخر میں رباعیات بھی لگی ہوی ہیں اور ان میں بھی وہی روزمرہ اور زبان کا چٹخارہ ہے۔ حمد۔ تصویر۔ استقلال۔ فراق معشوق۔ ناامیدی۔ زازالی۔ معاملات۔ رشک زندگی کے مضامین کی منتخب رباعیاں پیش ہیں :-

رباعیات

(۱)

کس سے کہوں کہ تو کہاں رہتا ہے
تخصیص غلط ہے کہ یہاں رہتا ہے
پتلی بن کر کبھی سویدا بن کر
آنکھوں میں عیاں۔ دل میں نہاں رہتا ہے

(۲)

بے مثل ہے بے عیب ہے ساری تصویر
خود پیارے ہو کیوں کر نہ ہو پیاری تصویر
تکتا ہوں میں ہاتھوں سے دبا کر سینہ
دل چھین نہ لے کہیں تمھاری تصویر

اغیار تماشے کے ہیں بے حد ہیں شریر
یوں تیرے جلانے کی نکالی تدبیر
کیوں خط پہ لگایا ہے ٹکٹ سمجھا بھی؟
بہتر ہے کہیں تجھ سے یہ کمبخت تصویر

---(۳)---

ہو جائے گا بت وہ رام رفتہ رفتہ
نکلیں گے عزیز کام رفتہ رفتہ
مایوس ابھی سے کیوں ہوئے جاتے ہو؟
ہوتے ہیں یہ انتظام رفتہ رفتہ

۴

میری اُن کی باہم جدائی کب تک
کب تک یہ مقدر کی برائی کب تک؟
تھک تھک گیا ہائے ہائے کرتے کرتے
اے آہِ رسا! یہ نارسائی کب تک؟

ہم دل کو شب ہجر میں بہلاتے ہیں
جس طرح سے بن پڑتی ہے سمجھاتے ہیں
دھوکے ہی دیا کرتے ہیں اِس کو اکثر
کہتے ہیں ٹھہریے وہ ابھی آتے ہیں

معلوم نہ تھا بتوں سے کینا ہوگا
مر مر کے تمام عمر جینا ہوگا
اس درد جدائی کا بُرا ہو یارب!
گر یوں ہی رہے تو زہر پینا ہوگا

اے عمر رواں یہ بے قراری کب تک
اے دیدۂ تر! یہ اشک باری کب تک؟
اُن کی تو یہی رہے گی "ہاں ہاں ہر دم"
اے دل، اے دل! امیدواری کب تک؟

(۵)

اس باقی جور سے محبت توبہ!
امید وصال عیش و عشرت توبہ!
یہ خبط ہے یہ خیال باطل ہے عزیز!
دونوں ہاتھوں سے کیجیے حضرت توبہ!

کب اس نے کچھ ارمان نکالے میرے
کب اس نے گلے میں ہاتھ ڈالے میرے
کہتا ہوں گلے ملو تو اللہ رے ناز
کہتے ہیں: "بڑے چاہنے والے میرے!"

(۶)

کیا بات ہے، آج کیوں ہو آنسو روتے؟
بے فائدہ جان کس لیے ہو کھوتے؟
یہ جھوٹ ہے بہتان ہے تہمت ہے غرض
اوروں کو وہ چاہیں گے تمہارے ہوتے!

کہتے ہیں "تجھے اور ستائیں گے ابھی
آٹھ آٹھ آنسو تمھیں رلائیں گے ابھی
آسان نہیں ہے دل لگانا ہم سے
یہ یاد رہے اور جلائیں گے ابھی"

(۷)

عیار ہو، ظالم ہو، ستم آرا ہو
بد عہد ہو بے مہر ہو بے پروا ہو
مجھ کو دیکھو کہ جب سے دیکھا ہے تمھیں
"آنکھیں پھوٹیں" جو اور کو دیکھا ہو!

اک دن بھی ملا نہ وہ مہینے بھر میں　　حیران ہوں۔ مضطر ہوں اسی چکر میں
جب جاتا ہوں درباں یہی کہتا ہے عزیزؔ　　"پھر آیئے گا۔ اب وہ نہیں ہیں گھر میں"!

وہ آفتیں جھیلیں ہیں محبت کرکے　　اک عمر گزاری ہے یونہی مر مر کے
لیتا ہے اگر کوئی بھی معشوق کا نام　　کہتا ہوں "ستمگر تو نہیں ہے؟" ڈر کے

پھر اُن سے بگڑ کے بن رہی ہے اب تو!　　غیروں سے عزیزؔ تن رہی ہے اب تو
ہم ہیں وہ ہیں مزے مزے کے شکوے　　گھڑی اس طرح چھن رہی اب تو!

(۸)

دل رنج و مصیبت میں گھُلا جاتا ہے　　پانی پانی لہو ہُوا جاتا ہے۔
میں دور رہوں رہے یہ تیرے ہمراہ　　سایہ پہ بھی مجھ کو رشک آجاتا ہے

(۹)

پیاسا ہوں کہاں تک کہوں "ساقی ساقی"!　　یہ صحبت ہے اتفاقی ساقی!
برسات کا موسم ہے گھٹا چھائی ہے　　ساغر میں مرے ڈال دے باقی ساقی!

نواب عزیزؔ نے ایک واسوخت بھی لکھا ہے ایاغ شباب (۱۳۱۷ھ) اس کا تاریخی نام ہے یہ نام مہاراجہ سر یمین السلطنت بہادر شادؔ بالقابہ (صدر اعظم باب حکومت) کا مجوزہ ہے یہ واسوخت ممدوح ہی کے نام پر معنون بھی ہے۔ تاریخ گوؤں میں پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار لکھنوی متوفی (۱۶ اہ شوال ۱۳۱۹ھ) بھی نظر آتے ہیں، مطبع فخر نظامی حیدر آباد میں طبع ہوا ہے جس کو تیس سال کا عرصہ ہوا ہے (۱۲۲) بند (۹۶۶) اشعار ہیں۔ واسوخت میں محبوب سے شکوہ شکایت کر کے اپنا سوز و گداز دکھایا جاتا ہے اور بے پروائی ظاہر کر کے لجاجت کی جاتی ہے اس کے لئے یہ ضرور نہیں کہ مسدس ہی کہا جائے بلکہ شاعر جس صنف نظم میں چاہے یہ مضمون ادا کر سکتا ہے اس کو "واسوز" بھی کہتے ہیں۔ واسوخت شاعر کا عشق نامہ ہوتا ہے اور یادگار شباب، شاعر کو اس میدان میں اپنے دل کی لگی بہت بے تکلف بنا دیتی ہے اس میدان میں بہت سے شاعر بدنام ہیں "واسوخت امانت" کا نام تو بچہ بچہ جانتا ہے واسوخت میں

آغاز سے انجام تک حضرت عشق کی نیرنگیاں ہوتی ہیں، اس میں شاعر اول سے آخر تک واردات عشق کو بے تکلف بیان کر دیتا ہے اپنے جذبہ میں اسں کو کسی کا خیال تک نہیں رہتا وہ ایسی ایسی باتیں بیان کر دیتا ہے کہ جلوت کو بھی خلوت سمجھتا ہے، گویا سارا عالم اس کا معشوق ہے کہ کسی کے ماتھے پر شکن تک نہ آئے گی!

ساقی نامے سے یہ واسوخت شروع ہوتا ہے:۔

ساقیا دیر نہ کر ساغر الفت بھر دے — مے وصلت سے مرا شیشۂ فرقت بھر دے
ساغر چشم دوئی میں مئے وحدت بھر دے — مختصر یہ کہ مرے دل میں محبت بھر دے

جس طرف دیکھوں اُسی نور کا جلوہ دیکھوں
نار میں بھی میں اُسی نور کا جلوہ دیکھوں

نشہ ایسا ہو کہ کثرت میں بھی وحدت دیکھوں — لاکھ آئینے ہوں تو ایک ہی صورت دیکھوں
خار و خس میں بھی اُسی گل کی شباہت دیکھوں — کیف مستی میں بھی میں ہوش کی حالت دیکھوں

چشم بینا سے مری پردہ دوئی کا اٹھ جائے
لوح خاطر سے مری نقش خودی کا اٹھ جائے

پھر طبیعت کی روانی میں دکھاؤں ساقی! — پھر نئے سر سے جوانی میں دکھاؤں ساقی!
اپنی پھر سحر بیانی میں دکھاؤں ساقی! — شان الفاظ و معانی میں دکھاؤں ساقی!

رنگ جم جائے مضامیں کے گل ایسے پھولیں
بلبلیں فصل بہاری کے ترانے بھولیں

(ابتدا)

پیش ازیں عاشق شیدا نہ کسی کا میں تھا — جیسا اب ہوں نہ کبھی محو تماشا میں تھا
کو بکو خاک بسر پہلے نہ ایسا میں تھا — باہر آپے سے نہ تھا ہوش میں رہتا میں تھا

کر دیا بے خودئی شوق نے برباد مجھے
آج کی بات نہیں رہتی ہے کل یاد مجھے

آفت عشق سے پہلے میں خبردار نہ تھا — نرگسی چشم کا بیمار دلِ زار نہ تھا
لذتِ درد سے آگاہ میں زنہار نہ تھا — آہ و فریاد سے کچھ مجھ کو سروکار نہ تھا

اب یہ حالت ہے کہ لب خشک ہیں رنگت فق ہے

تیر کاری وہ لگا ہے کہ کلیجہ شق ہے

باغ

دیکھئے دیکھئے گھر بیٹھے یہ شامت آئی
مایۂ عیش کے لُٹ جانے کی نوبت آئی
سچ تو یہ ہے کہ مرے حق میں قیامت آئی
دفعتاً سیر گلستاں پہ طبیعت آئی
حیف مانی ہی نہیں دل نے کوئی بات مری
مفت برباد ہوئی عشق میں اوقات مری

باغ محبوب میں لے جا کے مجھے چھوڑ دیا
شام کے چار بجے تھے کہ وہاں جا پہنچا
قدرت حق کا نیا میں نے تماشا دیکھا
گہ اُدھر گاہ ادھر چار طرف خوب پھرا
کچھ عجب رنگ کے اس باغ میں گل بوٹے تھے
پھول مرجھائے تھے اس کے نہ ثمر ٹوٹے تھے

غنچے پھولوں کے نمایاں دُرِ دنداں کی طرح
سرو استادہ روش پر قدِ جاناں کی طرح
روشنی تھی زرِ گل میں رُخِ تاباں کی طرح
بکھری سنبل تھی کہیں زلف پریشاں کی طرح
قابل دید تھی جادو نگری نرگس کی
ایک کی دو کی ہو تعریف کروں کس کس کی

چہچہے کرتے تھے ہر شاخ پہ مستی سے طیور
ہلکی ہلکی سی وہ دھوپ آنکھ ہو جس سے پُر نور
مالنیں پھرتی تھیں بن ٹھن کے نہایت مسرور
باغبانِ ازلی کی وہ عنایت کا ظہور
قمریوں کا وہ سر سرو پہ خوش خوش رہنا
بلبل و گل کی محبت کا تو پھر کیا کہنا

گردانِ عشق

عشق وہ صرف ہے صرفی کو ہے سرگردانی
عشق وہ نحو ہے نحوی کو بھی ہے حیرانی
پھرتے ہیں ہیئتی اور ہندسی اس جا پانی
منطقی کی نہیں تقریر یہاں طولانی
عشق سے عاشق و معشوق اگر مشتق ہےؔ

ؔ یہ ٹیپ حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے ۱۲

اس کو کیوں عشق جفا؟ اس کا جگر کیوں شق ہے؟

وحشت مصر کو زنداں میں پھنسایا اُس نے — قیس کو نجد میں آوارہ پھرایا اس نے
کوہ آفت سر فرہاد پہ ڈھایا اس نے — الغرض کیا کہوں کس کس کو ستایا اس نے
خون گردن پہ یہی سب کا لیا کرتا ہے
بے سبب موت کو بدنام کیا کرتا ہے

حضرت دل

سن کے تقریر یہ سب دل نے کہا آہستہ — آپ نے عشق کے بارے میں بہت خوب کہا
روبرو آپ کے گستاخ کچھ کہنا سراسر ہے خطا — پر ذرا غور سے اس بات کو سنیے قبلہ
عشق جس دل میں نہیں دل نہیں ویرانہ ہے
کسی میخانہ کا ٹوٹا ہوا پیمانہ ہے

کور وہ آنکھ ہے جس آنکھ میں اس کا نہیں نور — خاک اُس دل پہ کہ جس دل پہ نہیں اس کا ظہور
قبلۂ من! ہو جسے آدمی بننا منظور — حضرت عشق سے ہے رسم ملاقات ضرور
آدمی بحر محبت میں اگر غرق نہیں
پھر تو انسان میں حیوان میں کچھ فرق نہیں

نام ور اس کی بدولت ہوئے کیسے کیسے — رونق بزم محبت ہوئے کیسے کیسے
صاحب شوکت و عظمت ہوئے کیسے کیسے — اس سے اعجاز و کرامت ہوئے کیسے کیسے
دی زلیخا کو نئے سر سے جوانی کس نے؟
اور کی قیس کی مشہور کہانی کس نے؟

پہلا آمنا سامنا

الغرض دل نے ابھی ختم نہ کی تھی تقریر — آ گئی سامنے اک چاہتی پیاری تصویر
باغ میں ایک روش پر تھا کھڑا وہ بے پیر — رخ تاباں میں تھی خورشید سے بڑھ کر تنویر
بال بکھرے تھے چمکتے ہوئے رخساروں پر

ہلکی ہلکی سی گھٹا چھائی ہوئی تاروں پر

سر جھکا لیتے تھے کچھ بات جو فرماتے تھے
رُخ سے آنچل کو کسی دم نہیں سرکاتے تھے
اوڑھے لپیٹے ہوئے گلشن کی ہوا کھاتے تھے
آنکھ نرگس سے لڑاتے ہوئے شرماتے تھے

دور ہی سے جو مجھے آنکھ چرا کر دیکھا
کچھ عجب ناز سے آنچل کو ہٹا کر دیکھا

چار ہوتے ہی نظر دل ہوا بے تاب مرا
نارسا ہونے لگی دیکھتے ہی عقل رسا
ہوش کے ہوش اُڑے دیکھ کے اس کا چہرا
بے خودی میں یہی مطلع مرے منہ سے نکلا

آنکھ اک شمع تجلی سے لڑا بیٹھے ہم
دل کو پروانہ کی مانند جلا بیٹھے ہم

سراپا

دو ورق روئے کتابی کے تھے دو تو رخسار
شکل تشدید نظر آتی تھی مژگاں کی قطار
مثل ضمہ کے خمیدہ تھے وہ گیسو خم دار
الغرض دید کے قابل تھی جوانی کی بہار

کچھ نہ بن آئی مجھے دیکھ کے اس کا چہرا
دور سے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر پھونکا

تو ہی اے روشنی طبع ذرا کر انصاف
کب ہیں آئینۂ خورشید میں ایسے اوصاف
حیرت انگیز خط سبز ہے رُخ کے اطراف
کہ یہ ہے جوہر آئینۂ روئے شفاف

خط ہے یا کاتب قدرت نے یہ لکھدی ہے سند
ہم نے بخشا تجھے حسن بے حد

ہاتھ وہ ہاتھ جو دل لینے کو بڑھتا ہے مدام
ہاتھ وہ ہاتھ جو ہٹتا نہیں بے نیل مرام
ہاتھ وہ ہاتھ ہی اٹھتا نہیں جو بہر سلام
ہتکھنڈے ایسے کہ حاصل ہے جنھیں شہرت عام

اس صفائی سے چرا لیتے ہیں دل اور جگر

ایک کی ایک کو ہونے نہیں پاتی ہے خبر

. . . .

رُجوع

ہر روش پر وہ چلے جاتے تھے بے خوف و خطر ‏ ‏ سیر کرتے ہوئے پھرتے تھے ادھر اور اُدھر
سر سے آنچل کو ذرا اور بڑھایا رُخ پر ‏ ‏ محوِ دیدار پہ اپنے جو پڑی اُن کی نظر
راہ کترا کے روش سے وہ چمن میں آئے
دیکھ کر شکل مری دور ہی سے گھبرائے

. . . .

اس نزاکت پہ میں قربان مری جان فدا ‏ ‏ دو قدم تیز چلا - چار قدم آہستا
اپنا پرتو نظر آیا تو یہ شوخی سے کہا ‏ ‏ چلتے چلتے جو لبِ نہر گیا ماہ لقا
"مجھ کو دھوکا ہے یہ چشمہ چہِ کنعاں تو نہیں؟
حضرت یوسف مصری کا یہ زنداں تو نہیں؟"
ساتھ ہی دل بھی روانہ ہوا سوئے دل دار ‏ ‏ جب کہ وہ پردہ نشیں ہو گیا بگھی میں سوار
تھا زباں پر مری یہ مطلع مومن ہر بار ‏ ‏ غش پہ غش آنے لگے چل دئے سب صبر و قرار
"وہ چلا جان چلی دو تو یہاں سے کھسکے
اُس کو روکوں کہ لیے پانو پڑوں کس کس کے"
ہوش بر جا نہ رہے عشق کا بیٹھا سکا ‏ ‏ دست و پا بھول گئے عقل ہوئی دم میں ہوا
آتشِ حسن کے شعلہ سے جلا دل کیا کیا ‏ ‏ گرمیِ ہجر سے گھل گھل کے جگر آب ہوا
ہاتھ دامن سے چلے جیب و گریباں کی طرف
پانو وحشت کے لگے بڑھنے بیاباں کی طرف

. . . .

چشمِ میگوں کے تصور نے رُلایا مجھ کو ‏ ‏ قامتِ یار نے سولی پہ چڑھایا مجھ کو
چین شب بھر کسی کروٹ نہیں آیا مجھ کو ‏ ‏ الغرض یاد نے اُس بت کی ستایا مجھ کو
کبھی لیٹا کبھی بیٹھا کبھی ٹہلاہے ہے
دل مضطر کسی پہلو نہیں بہلاہے ہے

مدتوں وقف فراقِ رخِ دلدار رہا تختۂ مشق غم و آلام و صد آزار رہا
بے خطا جور و جفا کا میں سزاوار رہا اک نئی روز مصیبت میں گرفتار رہا
گاہ زلفوں کے تصور میں پریشانی تھی
گاہ یادِ رخِ پُر نور میں حیرانی تھی

کششِ عشق

دوست تھے ایک جو تصویر کے فن میں اُستاد غیرتِ مانی انھیں کہیے کہ رشکِ بہزاد
تھا میں بے خود مگر اتنا تو مجھے خوب ہے یاد لائیں تصویریں حسینوں کی جو تھیں حد سے زیاد
دل اُڑا لینے میں استاد ہر اک تھی تصویر
غیرتِ حور پری زاد ہر اک تھی تصویر
ایک سے ایک تھی تصویر نہایت بہتر کوئی خورشید کوئی حسن میں مانندِ قمر
وقتِ نظارہ تحیر نے دکھایا یہ اثر دیکھنے والوں کو کچھ بھی نہ رہی اپنی خبر
محو تھے مردمِ دیدہ بھی وہ تصویریں تھیں
پانو میں پیکِ تصور کے بھی زنجیریں تھیں
خوبیِ بخت نے ناگاہ دکھائی تاثیر چمکی تقدیر تو آنکھیں بھی ہوئیں پُر تنویر
انھیں تصویروں میں اُن کی نظر آئی تصویر جن کی تصویرِ خیالی تھی مرے دامن گیر
للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست
از پسِ پردۂ تصویر کنوں جلوہ نماست
وہ مرے چہرے کی رنگت وہ خوشی وہ فرحت وہ مرا چیخ کے کہنا کہ زہے خوش قسمت
وہ پتا پوچھنا میرا وہ ہجومِ حسرت وہ مرے دوست کا انکار وہ میری منت
نوبت آنے کو تھی ہر بار خوشی میں غم کی
آ گئی کام جو دی مرنے کی اپنے دھمکی
جب گوارا نہ ہوا دوست کو مرنا میرا جیتے جی گلشنِ جنت میں مجھے پہنچایا
یعنے اس صاحبِ تصویر کا گھر بتلایا دور سے گھر کو جو دیکھا تو یہ حسرت سے کہا
جس جگہ کھینچنے ہم آے تھے یارب تصویر

کھینچ کر لائی ہے خود ہم کو وہاں اب تصویر

. . . .

اثرِ عشق

سچ تو ہے او اثرِ عشق ترے میں قرباں　　تو اگر چاہے تو یوں ہوتی ہے مشکل آساں
وہ لے آتے ہیں پرستارِ طلب کا فرماں　　اس طلب گاری پہ کیوں کر نہ ہو صدقے مری جاں
کچھ سنا آپ نے ؟ کیا بھیجا ہے پیغام مجھے
"تو نہ آئے گا تو آئے گا نہ آرام مجھے"

یہ تو ممکن ہی نہ تھا یوں انھیں مضطر رکھتا　　اُڑ کے جاتا میں سرِ بام اگر پَر رکھتا
پھر اٹھاتا نہ کبھی پانو پہ جب سر رکھتا　　لے کے آتا میں انھیں گھر میں اگر گھر رکھتا
دل پہ مجبوری سے ہر چند کہ صدمہ پہنچا
حسبِ فرمان حضوری میں مگر جا پہنچا

جب مقابل ہوئے ہم دونو لڑی جب کہ نگاہ　　بولے کچھ خیر ہے ؟ کیوں آپ کا ہے حال تباہ
ہاتھ کیوں دل پہ ہے اور لب پہ ہے کیوں نالہ و آہ　　مجھ سے دیکھی نہیں جاتی ہے یہ حالت واللہ
آپ بھی میری طرح والہ و شیدا تو نہیں
میں مروں آپ پہ آپ اور یہ ایسا تو نہیں؟

ہائے اللہ ہو عاشق سے جب اس طرح خطاب　　غیر ممکن ہے کہ آئے دلِ بیتاب کو تاب
حال جب یہ ہو تو پھر کون کرے خوفِ عتاب　　اُن کی باتوں کا نہ تھا اس کے سوا کوئی جواب
اُٹھّا اور اٹھ کے تصدق ہوا منھ چوم لیا
وہ اشاروں ہی میں کہتے رہے ہاں ہاں یہ کیا

اُن کا وہ عشق کا اظہار وہ حسرت میری　　اُن کی وہ چھیڑ وہ بے تاب طبیعت میری
اُن کی وہ طرزِ سخن اور وہ جراءت میری　　اُن کے وہ لطف و کرم اور وہ عجلت میری
دیکھ کر سارے پرستار پریشان رہے
منھ سے کچھ کہہ نہ سکے جان کے انجان رہے

. . . .
. . . .

"ایسے کیوں مست ہو شامت نے ہی گھیرا تم کو
سوجھتا ہے نہ اُجالا نہ اندھیرا تم کو"

. . . .

ہنگامۂ وصل

اب کہاں صبر کہاں تاب کہاں دل کو قرار — دل میں لاکھوں ہیں تمنائیں امیدیں ہیں ہزار
اب بھی کیا اُن کی جوانی کی نہ لوٹوں میں بہار — کیا میں چھیڑوں گا تو اب بھی وہ کریں گے انکار
اُس سے کیوں پوچھوں کہ اب قصد تمہارا کیا ہے؟
ہو چکا پہلے ہی ارشاد دوبارہ کیا ہے؟

. . . .

سچ تو یہ ہے کہ نہ تھے رسمِ جہاں سے واقف — نہ نہیں سے ابھی واقف تھے نہ ہاں سے واقف
عمر ہی کیا تھی ابھی ہوتے کہاں سے واقف — اب انھیں کرتے ہیں ہم رازِ نہاں سے واقف
وہ سمجھتے تھے گلے مل کے لپٹنے کو وصال
کچھ خبر ہی نہ تھی کیا وصل کی شب کا ہے مآل

. . . .

. . . .

"ہائے چھوڑو بھی یہ کیا ظلم ہے ہم مرتے ہیں
کہیں معشوق پہ ایسا بھی ستم کرتے ہیں؟

. . . .

ہائے اللہ اگر ہے یہی انجامِ وصال — مرتے دم تک بھی نہ لیں گے کبھی ہم نامِ وصال
کم کبھی صبحِ قیامت سے نہیں شامِ وصال — سچ تو یہ ہے وہی اچھے جو ہیں ناکامِ وصال
ہم کبھی وصل کے مضمون سے آگاہ نہ تھے
ایسے صدموں سے خبردار تو واللہ نہ تھے

. . . .

ہائے سوسن کی زباں لال نہیں تھی یا رب — کہہ تو دیتا تھا مصیبت کی ہی شب وصل کی شب
عمر میں مجھ سے بڑی جانتی ہو گی یہ سب — اُس نے کچھ بھی تو زباں سے نہ کہا ہائے غضب

اُس کا کس وقت کہا ہم نے نہیں مانا تھا
دوست جانا اُسے دشمن تو نہیں جانا تھا

دیدے پھوٹیں کہیں اللہ کرے نرگس کے   رنگ اس نے بھی تو دیکھے تھے مری مجلس کے
تھی خبردار مزے سے رطب و یابس کے   کہہ تو دینا تھا بڑے آپ ہیں پالے کس کے
رات دن کھیلتی تھی آنکھ مچولی مجھ سے
رہی اس رات پہ چُپ کچھ بھی نہ بولی مجھ سے

جی میں آتا ہے کہ سنبل کو میں کوڑے ماروں   صدمے دینے ہیں کروں سعی نہ ہمت ہاروں
ایڑی چوٹی پہ اسے اپنی میں ہر دم واروں   کہہ کے قحبہ اسے کس طرح نہ میں للکاروں
کہہ تو دینا تھا اگر وصل کا ساماں ہوگا
تار تار آپ کا بے وجہ گریباں ہوگا

کچھ شمشاد نے قد کیا ہی نکالا ہے بلند   یوں ہی چپ چاپ یہ استادہ رہے گی تا چند
بادب اس کا کھڑے رہنا نہیں مجھ کو پسند   یہ تو کہنا تھا کہ ہے وصل کا انجام گزند
دل میں آتا ہے کہ سولی پہ چڑھا دوں اس کو
ماما حوّا کی سی ہے گالیاں کیا دوں اس کو"

. . . .

یہ تو فرمائیے گا میں نے خطا کونسی کی   بس یہی نا کہ ہوئی وصل کی شب گستاخی
جب زمانہ کی یہی رسم ہو دستور یہی   آپ ہی کہیے کہ پھر اور کرے کیا کوئی
رسم عالم کی یہ ہے - یہ کوئی تقصیر نہیں
کچھ خطا اس میں مری اے بت بے پیر نہیں

کیا دلاتے ہو یقیں اپنی نزاکت کا مجھے   نازنیں تم ہو تو شکوہ ہے نقاہت کا مجھے
تم کو دعویٰ ہے شرافت کا نجابت کا مجھے   تم تونگر ہو اگر نشہ ہے دولت کا مجھے
مجھ سا عاشق نہ ملے گا تمھیں دنیا بھر میں
تم سے کچھ کم نہیں میں منصب و مال و زر میں

عذر بے جا کی عوض لا و بجا شکر خدا   تم کو قسمت سے ملا چاہنے والا مجھ سا
مال و منصب میں شرافت میں برابر والا   اس پہ طرّہ یہ ہے رکھتا ہوں معزز عہدا

اجی سررشتۂ انعام کا افسر میں ہوں
تم نہیں جانتے کیا ؟ ڈپٹی کمشنر میں ہوں

میں وہ ہوں میرے ہیں مخدوم وزیر افواج[1] — وہ نہ سن پائیں کہ مرنے پہ ہوں آمادہ میں آج
سن کے یہ تنتۂ غم ان کا نہ برہم ہو مزاج — تم سے اس برہمیٔ طبع کا ہوگا نہ علاج
پھر تمہارا نہ یہ رتبہ ہی رہے گا نہ یہ اوج
گھر کے اطراف میں دیکھو گے فقط فوج ہی فوج

آنے پائے نہ کوئی آپ کے گھر میرے سوا — ڈالنے پائے نہ عارض پہ نظر میرے سوا
اس جگہ ہو نہ فرشتے کا گزر میرے سوا — اس طرف دیکھ تو لے کوئی بشر میرے سوا!
کھائی ہے تم نے قسم اس کو نبا ہو تو سہی
تم بھلا میرے سوا اور کو چاہو تو سہی

میری اس دھمکی نے واللہ بڑا کام کیا — نہ رہے اس بت کمسن کے ذرا ہوش بجا
ڈر گئے کانپ گئے تھا یہ تقاضا سن کا — کچھ افاقہ جو ہوا مل کے گلے فرمایا
"ظلم ہم پر نہ گوارا کرو پیارے ہو کر
ہم تمہارے ہیں رہو تم بھی ہمارے ہو کر"

آگئے راہ پہ وہ کیوں نہ کروں شکر و سپاس — اب تو دل ہے نہ پریشاں نہ طبیعت ہے اداس
نہ تردد ہے کوئی اور نہ کوئی وسواس — نہ کسی کا ہمیں کھٹکا نہ کسی سے ہے ہراس
دن کی ہے قید نہ کچھ رات کی پابندی ہے
وصل ہی وصل ہے ہر وقت یہ خرسندی ہے

شکر ہے شکر کہ بر آگیا ارمانِ عزیز — بھر گیا پھر گل مقصود سے دامانِ عزیز
ہے عزیز ان پہ فدا وہ بھی ہیں قربانِ عزیز — ایسے معشوق پہ صدقے نہ ہو کیوں جانِ عزیز
وصل کے لطف اٹھاتا ہوں کرم سے ان کے
گھر ہے آباد مرا۔ یمن قدم سے ان کے

واسوخت کے ساتھ حضرت غفراں مکاں آصف کی ایک مشہور غزل پر خمسہ بھی ہے جس کا مطلع ہے

سوال وصل پہ نیچی نظر تھی کیا ان کی — ہماری آنکھ میں پھرتی ہے وہ حیا ان کی

---

[1] مہاراجہ بہادر کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت وزیر افواج تھے۔

اس غزل پر تقریباً ہند و دکن کے شعرائے مشاہیر نے خمسے کئے تھے جن کا سلسلہ گلدستہ "محبوب الکلام" میں ایک عرصہ تک چلتا رہا۔ بعض شعرائے مقامی کو خود بارگاہ شاہی میں حاضر آکر سنانے کی بھی عزت حاصل ہوی۔ ساری غزل میں ان دو شعروں پر مصرعے پہنچانے میں بڑا زور دکھایا جاتا تھا۔

یہ اُن کا قول ہے میری بلا لے تجھ سے　　بلائیں اُس کی بھی لوں گر لے بلا اُن کی
ملے تھے آج تو ہم بھی جناب آصفؔ سے　　عجیب رنگ میں ہیں پوچھتے ہو کیا اُن کی

نواب عزیز نے مقطع پر جو مصرعے پہنچائے ہیں وہ سن لیجیے ؎

عزیزؔ اور مصاحب تھے ہاتھ باندھے کھڑے　　جب اُن کے آگے پڑھے شاعروں نے یہ خمسے
سخن کی داد وہ دیتے تھے لے رہے تھے مزے　　"ملے تھے آج تو ہم بھی جناب آصفؔ سے
عجیب رنگ میں ہیں پوچھتے ہو کیا اُن کی"

ارمغان عزیز کے چھپنے کے بعد سے جو کچھ کہا ہے اُس پر نواب عزیز نے تاریخ تصنیف بھی لکھ دی ہے یہ بہت اچھا کیا ہے۔ زمانی اعتبار سے شاعر کی طبیعت کے نشیب و فراز کا پتا چل جاتا ہے اگر اسی اصول پر ارمغان عزیز کا دوسرا اڈیشن نکلے تو اصول تقابلی میں بڑی آسانی پیدا ہو جائے گی۔ ارمغان عزیز کے دوسرے اڈیشن کے متعلق تو ہماری رائے یہ ہے لیکن نواب عزیز کا خیال ہے کہ ؎

چھپنا دشوار ہے پھر راز محبت کا عزیزؔا　　چھپ کے مطبع سے اگر آپ کا دیوان نکلا
شاعری مہماں ہے کچھ دن کی عزیزؔ　　ہم مرتب اپنا دیوان کیا کریں؟

نواب عزیز کی شاعری کے مختلف نمونے انتخاب کر کے دیدیے گئے ہیں جن سے آپ کی شاعری کی نسبت عام رائے تو قائم کرلی جا سکتی ہے۔ پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ ؎

لطف دے گا عزیزؔ کا دیواں　　اس کو کامل ملاحظہ کیجیے!

اور اس تنگ نائے میں اتنی وسعت کہاں کہ ارمغان عزیز کو سامنے رکھ دوں ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے　　سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

نواب عزیز کے کلام میں پختگی اور کہنہ مشقی کے علاوہ قدیم رنگ کے ساتھ ساتھ جدت مذاق کی ترکیب زیادہ نمایاں ہے ؎

مضمون نئے، مذاق نیا، بندشیں نئی　　رونق ہوی عزیزؔ سے طرز جدید کی

اس کے ساتھ ہی زمانے کے مذاق کو دیکھ کر کہتے ہیں ؎

بدلا ہوا ہے ذوقِ سخن آج کل عزیزؔ! غزلیں نئی نئی ہیں! سخنداں نئے نئے!
شاعری کا مذاق تھا پہلے شاعری اب مذاق ہے گویا

ایک جگہ تو اپنے رنگ شاعری کے متعلق دیکھیے کس قدر سچ کہا ہے ؎

ہی طبیعت میں جو آزادہ روی اپنی عزیزؔ! اک زمانے سے الگ ہے مرے اشعار کا رنگ

دیوان کا دیوان پڑھے جائیے کہیں بھی آپ کو ثقیل، غریب، مغلق الفاظ اور نامانوس ترکیبیں نظر نہیں آئیں گی۔ دیوان میں شروع سے آخر تک ایک ہی رنگ اور بیان کی جدتیں ادا ہی ادا ہے۔ کلام عزیزؔ نے زبان اور سلاست و فصاحت اور اسلوب بیان کے لحاظ سے ایک خاص رنگ اختیار کر لیا ہے اور یہی نواب عزیزؔ کی خصوصیت شعری کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے

*

عکس تحریر نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

عزیز من

جناب من

مجھکو افسوس ہے کہ آپ کا بلند حوصلہ مجھکو

نہیں ملا

آپ نے ایک اچھے کام کا ارادہ کیا ہے

اسکی کتاب سے فن شاعری کی یادتازہ

ہو جائیگی ۔

آپ کسی بھی جمعہ کو صبح سے ظہر تک مجھے دیکھ

سکتے ہیں تشریف لا سکتے ہیں میں آپ کی

ملاقات کا نہایت مسرت کے ساتھ منتظر

رہونگا والسلام خاکسار

عزیز یار جنگ

۱۸ ستمبر ۱۳۴۷

گلستان و بوستان کا موازنہ

(مترجمہ جناب ابوالمحاسن محمد محسن خاں صاحب متین حیدرآبادی)

فارسی کے مشہور علمی رسالہ "ایران شہر" میں گلستان و بوستان سعدی رح پر یہ دلچسپ موازنہ میرزا حسن خاں بدیع نامی ایک فاضل ایرانی کے نتائج قلم سے شائع ہوا۔ فارسی کی ان دو مشہور ترین کتابوں کا بالمقابل مطالعہ ادبی نقطۂ نظر سے ایک پرلطف چیز ہے مولوی محمد محسن خاں صاحب نے اس مفید مضمون کے ترجمہ سے اردو دانوں کے آگے ایک عمدہ چیز پیش کی ہے امید ہے کہ ارباب ذوق اس سے لطف اندوز ہونگے "مکتبہ"

وہی شخص گلستاں اور بوستاں کی خوبیوں سے لطف اٹھاسکتا ہے جو فارسی جیسی شیریں زبان میں گفتگو کا ملکہ رکھتا ہے۔ یہ دونوں ادبی شاہکار اُن دو چمکدار تاروں اور اُن انمول موتیوں کی مانند ہیں جن سے ہماری ادبیات کی افق جگمگارہی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ہمارے مقدس شاعر "شیخ سعدی" کی متوالی طبیعت کی بھٹی کی کھینچی ہوی شراب کے دو چھلکتے ہوے ساغر ہیں۔

یہی وہ دو بہترین "باقیات الصالحات" ہیں جو سخندانی کے فن اور مضامین و معانی کی جدت طرازی میں ہمارے "نابغہ"[1] کی قادرالکلامی، دقیق الخیالی اور عمیق الفکری کا ثبوت دیتی ہیں آج ہم اپنی جس قدر بڑائی کریں اور اپنا جس قدر بھی فخر جتائیں کم ہے ہمارا یہ دعوا ے بالکل بجا ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ اس ایرانی عنصر کے پردے میں ایسے ایسے نوابغ (بلند پایہ شاعر) وجود میں آئے ہیں کہ جن کی افکار کے نتائج کو۔ مشرق اور مغرب کے مبصرین آج حیرت اور استحسان کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور دنیا کی اکثر و بیشتر زندہ و ہمہ گیر زبانوں میں اُن کے ترجمے بھی ہو گئے ہیں۔

گلستاں اور بوستاں کے موضوع پر اظہار خیالات کرنے کا مقصود اصلی، وکاہت اور تفنن ہے جس کو ہم ایک مناظرہ کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اس مناظرہ سے ہمارا مقصد ایک شئے کی ستائش اور دوسری چیز کی مذمت کرنا نہیں ہے اور نہ ہمارا یہ مطمع نظر ہے کہ یہ دو نوادبی شاہکار ایک لالہ و

[1] نابغہ عرب کے مشہور شاعر و خطیب کا نام ہے جو نعمان بن منذر کا مداح تھا لیکن اس سے مراد یہاں شیخ سعدی ہیں ۱۲

گل سے سجی ہوئی اور دوسری نسرین و سنبل سے آراستہ گلستاں و بوستاں ہیں اور یہ دونوں کے دونو، اپنی دل کشی و دل ربائی کی وجہ سے دنیا کے فاضلوں اور ادیبوں کے مرغوب طبع ہیں، بلکہ ہماری غرض یہ ہے کہ ان دونو "جواہر پاروں" کو پرکھیں، ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں اور ہمارے شاعر کی علم و بلند پایگی کو ظاہر کریں۔ چونکہ اس ناچیز نے گلستاں کو بوستاں پر ترجیح دی ہے؛ اس لئے محترم ادیبوں سے یہ میری تمنا ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو اس کام کا اہل اور اس ادبی دنگل کا پہلوان سمجھتا ہے وہ اپنی طبیعت کو لڑا کر بوستاں کے ادبی فضایل اور اس کی ترجیح کی وجوہ کے بارے میں ایک مدلل مضمون تحریر کرے۔

کوئی صاحب ذوق اس امر کا انکار نہیں کرسکتا کہ دنیائے ادبیات میں گلستاں اور بوستاں دونوں کے دونو اعلیٰ رنگینی میں ایک ممتاز خصوصیت رکھتے ہیں، لیکن گلستاں بہت بڑا ادبی تفوق رکھتی ہے اور بوستاں باوجود ان تمام خوبیوں کے اُس کی لطافت و ظرافت کو نہیں پہنچ سکتی ہم بوستاں کی قدر و قیمت سے بغیر کسی چیز کو گھٹائے دلایل کے ذریعہ اس مدعا کو ثابت کرنے والے ہیں؛۔ اس سبب سے کہ ہر پھول ایک خاص قسم کی بو رکھتا ہے اور ہر جمال ایک خاص قسم کی کشش گلستاں دو چیزوں کی حامل ہے۔ ایک اس کی نثر ہے جو قطب شمالی کے فرقد اور برج اسد کے نثرہ نامی تاروں کی مانند بکھری ہوی ہے۔ دوسری اس کی نظم ہے جو موتیوں کی لڑی کی مانند ایک دوسرے پر چُنی ہوی ہے، لیکن بوستاں میں فقط منظوم شعر ہی شعر ہیں جو نثری محسنات سے بالکل الگ ہیں؛ اسی نقطہ کے لحاظ سے گلستاں کمالیت کے درجہ میں اُس سے بڑھ گئی ہے۔ گلستاں میں چونکہ اکثر حصہ نثر کا ہے اور وہ فصاحت و بلاغت کی وجہ سے بوستاں پر فوقیت رکھتی ہے اس لئے کہ عبارت آرائی شعر گوئی سے بہت آسان ہے دوسرے کلام منثور چونکہ وزن اور قافیہ کی پابندیوں سے آزاد ہے، اس باعث سے وہ خیالات کے اظہار اور مطالب کی ادائی کے لئے کلام منظوم سے زیادہ تر مفید ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ گلستاں اپنے موضوع پر ایک بالکل اچھوتی چیز ہے، اب تک استادان سخن میں سے کسی نے اس قسم کی کتاب تصنیف نہیں کی ہے، لیکن بوستاں جیسی کتابیں بیسیوں شعرا نے لکھی ہیں، انتہا یہ کہ بوستاں ان سب سے بہتر ہے لیکن اس کو گلستاں کی مانند اوّلیت کا تفوق حاصل نہ ہوسکا۔

سے بہارستان اور خارستان کو جو گلستان کے جواب میں لکھی گئی ہیں غالباً ان کو ہمارے فاضل مقالہ نگار نے نظر انداز کر دیا ہے۔

بوستاں کے اشعار چونکہ تمام کے تمام بحر تقارب میں ہیں اس لئے خواہ وہ کتنے بھی لطیف و آبدار ہوں لیکن اُن کے پڑھنے سے انسان کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ جس طرح سے کہ ایک قسم کی غذا خواہ وہ کتنی ہی پسند خاطر اور ذائقہ دار ہو، جوں ہی انسان اس میں سے چند بار کھا لیتا ہے بار دگر اس کی جانب رغبت نہیں کرتا۔ منہ کا مزا بدلنے کے لئے دوسری غذا کی خواہش کرتا ہے۔ شعر بھی ایک روحی غذا ہے اگر وہ مختلف طرزوں اور مختلف اوزان میں ہوگا تو طبیعت کو بہت پسند آئیگا یہ تنوع و برتری بوستاں سے مفقود او گلستاں میں موجود ہے کیونکہ اس کے دل کو موہ لینے والے مختلف بحروں کے اشعار اور اُس کی تمام رنگین عبارت، قطعوں، رباعیوں، مثنویوں اور منفرد بیتوں سے مزین ہے جن میں سے ہر ایک چیز ایک بلند پایہ نصیحت اور ایک اخلاقی او اجتماعی نکتہ کی حامل ہے یہ امر مسلمہ ہے کہ شعر جس قدر بھی مختصر اور کم ہونگے وہ بہت پسندیدہ اور نوک زباں ہونے میں آسان تر ہونگے۔ اسی نقطہ نظر سے گلستان کے اشعار بوستاں کے اشعار سے زیادہ خاص و عام کی زبانوں پر جاری ہیں۔ ایران میں عالموں اور جاہلوں میں سے کوئی ایسا شخص نہیں ملے گا جو گلستان کے اشعار میں سے کم و بیش کچھ نہ جانتا ہو لیکن بوستاں کے اشعار اس قدر شائع اور مشہور نہیں ہیں اور بہت کم لوگ اس کے حفظ کی جانب رغبت کرتے ہیں۔

ہم جو عام طور پر لوگوں کا گلستاں کی جانب رجحان پاتے ہیں اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ ایران کے تمام مدارس میں گلستان کا درس دیا جاتا ہے اور اسی طرح ہندوستان۔ ترکستان۔ افغانستان اور بلاد عثمانیہ میں بھی آج کل گلستان السنہ قدیمہ (CLASSICS) کے درس کا ایک بڑا جزو سمجھی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کو اہل فرنگ بھی پڑھتے ہیں۔

میں نے بارہا دیکھا ہے کہ بعض یوروپین ہم کلامی کے ضمن میں گلستاں کے اشعار کو ثبوت میں پیش کرتے ہیں لیکن بوستاں نے اس درجہ عام قبولیت اور توجہ حاصل نہیں کی ہے۔ اور یہی نکتہ گلستاں کے بوستاں سے مفید تر ہونے کو ثابت کرتا ہے۔ چونکہ بوستاں کی تصنیف ۶۵۵ھ میں ہوی ہے جیسا کہ حضرت شیخ نے فرمایا ہے:

بدوراں ہمایوں دسال سعید — بتاریخ فرخ میانِ دو عید
ز ششصد فزوں بود پنجاہ و پنج — کہ پُر در شد ایں نامبردار گنج

گلستاں میں فرمایا ہے:

"ہر کہ را زر در ترازو است زور در بازو"

"اے مردان بکوشید تا جامہ زناں نہ پوشید"

"حیف است کہ ہنرمنداں بمیرند و بے ہنراں جائے ایشاں بگیرند"

"مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید"

"آنرا کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک است"..... انتہیٰ

اگر قرآن[*] فارسی زبان میں ہوتا تو اس کی آیتیں ان مختصر جملوں سے زیادہ فصیح نہ ہوتیں اس نکتہ کو کچھ نکتہ سنج ہی جانتے ہیں کہ ان چھوٹے سے جملوں میں کس قدر گہرے مطالب اور کس قدر دقیق سے دقیق اخلاقی نکات بیان کیے گئے ہیں۔

ہم خود حضرت شیخ کے کلام کے وثیقہ سے ثابت کر سکتے ہیں کہ گلستاں بوستاں پر فوقیت رکھتی ہے۔ ہمارے بزرگ شاعر نے بوستاں کے نظم کرنے کے اسباب میں کچھ اسکے متعلق روشنی ڈالی ہے اور آخر میں کہتا ہے۔

کہ در بحر لولو صدف نیز ہست	درخت بلند است در باغ و پست
الا اے خردمند پاکیزہ خوے	ہنرمند نشنیدہ ام عیب جوے
قبا گر حریر است و گر پرنیاں	بناچار حشوش بود در میاں
تو گر پرنیانی نیابی مجوش	کرم کار فرما و حشوش بپوش

اگرچہ ان ابیات میں ہمارے شیریں زبان شاعر نے از راہ ادب و انکسار معذرت چاہی ہے اور بوستاں کے زوائد کی نسبت اس کا اعتراف، تواضع کے باب میں آیا ہے، لیکن وہ چیز جو اس کے کلام سے مفہوم ہوتی ہے یہ ہے کہ خود شیخ نے اپنی بوستاں میں سہو اور لغزش کا گمان کیا ہے اور اس کو اس امر کا بھی احتمال ہوا ہے کہ یہ ادبی شاہکار اپنے زمانہ کے ادیبوں اور سخن سنجوں کے انتقاد اور نکتہ چینی کا مورد بنے گا۔ اسی وجہ سے اپنی بوستاں کو دریا کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ دریا میں صدف بھی پائی جاتی ہے اور موتی بھی، اسی طرح سے باغ میں بلند درخت بھی ہیں اور پست بھی اور مجبوری "قبائے حریر" کے جیسی حشو کو درمیان رکھ کر خواہش ظاہر کرتا ہے کہ اس "حشو" سے چشم پوشی کریں اسی سبب سے فرماتا ہے:۔

---

[*] ہمارا فاضل مقالہ نگار کی اس حسن عقیدت سے متفق ہونا کچھ ضرور نہیں (مترجم)

نازم بہ سرمایۂ فضل خویش — بدریوزہ آوردہ ام دست پیش
شنیدم کہ در روز امید و بیم — بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم
تو نیز از بدی بینیم در سخن — بخلق جہاں آفریں کار کن
چو بیتے پسند آیدت از ہزار — بمردی کہ دست از تعنت بدار

ان ابیات کے مضمون کا حاصل مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے خداوند تبارک و تعالےٰ قیامت کے دن گناہگاروں کو نیکوکار اشخاص کی وجہ سے بخشدیگا۔ تم بھی خلاق عالم کے اخلاق کی پیروی کر کے اگر میرے کلام میں کچھ لغزش نظر آئے تو اس سے چشم پوشی کرو! میرے خراب شعر سے اچھے شعر کے بدلے میں درگزر کرو! بوستاں کے بارہ میں شیخ کا یہ عقیدہ ہے۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ شیخ بزرگوار گلستاں کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ ....

.... گلستاں کے تصنیف کرنے کے اسباب میں فرماتے ہیں۔

رات کے وقت مجھے ایک دوست کے ساتھ باغ میں رہنے کا اتفاق ہوا وہ ایک ایسی سرسبز و شاداب جگہ تھی جس میں بڑے بڑے تناور اور گنجان درخت کمال جاذبیت سے ناظرین کے دلوں کو اپنی جانب کھینچ رہے تھے، درختوں کے تلے مٹی پر رنگ برنگ کے پتے سبز رنگ مینا کی طرح پڑے ہوئے تھے۔ منڈوے سے انگور کے خوشے عقد ثریا کی مانند لٹک رہے تھے، جب صبح ہوئی تو واپسی کا ارادہ، قیام کرنے کی رائے پر غالب آیا۔ اُس کو میں نے اس حالت میں دیکھا کہ وہ اپنے دامن کو گلاب ریحان سنبل اور ضمیران سے بھر کر شہر کے ارادہ سے چل کھڑا ہوا۔ میں نے کہا بوستاں کے پھول جیسا کہ تو جانتا ہے اس کے عہد اور اس کی حیات کو ابدیت حاصل نہیں ہے۔ جس کے متعلق حکماء نے بھی کہا ہے! جو چیز فانی ہو وہ دل لگانے کے قابل نہیں اس نے کہا وہ کونسی چیز ہے جس کو ابدیت حاصل ہے! میں نے کہا ناظرین کے دل کی شگفتگی اور حاضرین کی وسعت معلومات کے لیے میں ایک ایسے گلستاں کی بنیاد ڈال سکتا ہوں جس کے اوراق باد خزاں کی دست درازیوں سے بچے رہیں گے اور زمانہ کی گردش اس کی زندگی کی بہار کو خزاں کے سخت حملے کے ذریعہ سے تاراج نہ کر سکے گی!

بچہ کار آیدت ز گل طبقے — از گلستاں من ببر ورقے

گل ہمیں پنج روز و شش باشد — ویں گلستاں ہمیشہ خوش باشد

جوں ہی میری زبان سے یہ الفاظ نکلے اس نے اپنے دامن سے پھول پھینک دیئے اور میرے دامن کو یہ کہہ کر پکڑ لیا کہ "الکریم اذا وعد وفا" (کریم جب وعدہ کرتا ہے اس کا ایفا بھی کرتا ہے) مجھے اسی دن ایک فصل لکھنے کا اتفاق ہوا جو حسن معاشرت اور آداب مجلس میں ایک خاص پیرایہ کے ساتھ مقررین کے کام آئے گی اور انشا پردازوں کی بلاغت و بلند پروازی میں ایک زبردست اضافہ کرے گی گلستاں میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

گر التفات خداوندیش بیارآید — نگار خانۂ چینی و نقش ارژنگی ست
امید ہست کہ روئے ملال درنکشد — ازیں سبب کہ گلستاں نہ جائے دل تنگی ست

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

بماند سالہا ایں نظم و ترتیب — زما ہر ذرۂ خاک افتادہ

کسی دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

تمام ایں روضۂ رعنا و حدیقہ علیا چوں بہشت ہشت باب اتفاق افتاد" انتہی

ان بیانات کے ذریعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گلستاں شیخ کی نظر میں نہایت مقبول اور پسندیدہ واقع ہوئی تھی۔ اور وہ اس کے موضوع کو ایک لطیف و اعجوبہ خیز تصور کرتے تھے جیسا کہ وہ کئی مقامات پر مختلف اسلوب بیان کے ساتھ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ باد خزاں کا "دست تطاول" اس گلستاں کے اوراق پر نہ پہنچ سکیگا اور یہ گلستاں "ہمیشہ بہار" ہے۔

کبھی گلستاں کے ایک ورق کو ایک "طبق گل" سے بہتر خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "پھول پانچ چھ روز سے زیادہ عرصہ تک نہ رہیں گے اور یہ گلستاں ہمیشہ کے لئے تر و تازہ رہے گا"۔ کبھی کہتے ہیں "یہ گلستاں ادیبوں کے بھی کام آئے گی اور محرروں کو بھی انشا پردازی سکھلائے گی"۔ دوسرے موقع پر گلستاں کو خوبی اور آراستگی میں "نگار خانہ چین" اور "نقش ارژنگ" تصور کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ اس کتاب کے مطالعہ سے پڑھنے والے کا دل کسی قسم کی تکان محسوس نہ کرے گا۔ وہ اس کو قدرتی گلستاں کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں جو سیر کے لئے "جائے دلتنگ" نہیں ہے۔

سب سے بڑی دلیل یہ ہی کہ شیخ نے گلستاں کو بہشت کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

ان بیانات سے ظاہر ہے کہ ہمارا محترم شاعر اپنی گلستاں سے جس قدر خوش تھا اس قدر اس نے اپنی بوستاں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اس کا سبب بھی وہی چیز ہے جس کو شیخ نے اپنے اشعار میں ظاہر کیا ہے۔ یہ کہ اس نے بوستاں کو یا تو اپنی مسافرت اور سیاحت کے زمانہ میں نظم کیا ہے یا یہ کہ اس عجلت میں جبکہ وہ سیاحت سے واپس ہوا ہے اور ابھی اس کا دل بحر و بر کے سفر اور سیاحت کی تکان کی وجہ سے آسودہ نہ ہوا تھا۔ اور اس کی فکر تھکی ماندی تھی، تصنیف فرمایا ہے جیسا کہ وہ بوستاں میں فرماتے ہیں:-

در اقصائے عالم بگشتم بسے	بسر بردم ایام با ہر کسے
تمتع ز ہر گوشۂ یافتم	ز ہر خرمنے خوشہ یافتم
چوں پاکان شیراز خاکی نہاد	ندیدم کہ رحمت براں خاک باد
تولائے مردان ایں خاک و بوم	برانگیختم خاطر از شام و روم
دریغ آمدم زاں ہمہ بوستاں	تہی دست رفتن بر دوستاں

لیکن انھوں نے گلستاں کو شیراز میں جس وقت وہ بے تکلف دوستوں اور ہم مذاق ساتھیوں کے ساتھ بے فکری کی حالت میں بلوستاں کے عیش اور دوستوں کے ساتھ رنگ رلیوں میں مصروف تھے، تصنیف کیا ہے۔ اس کتاب میں اپنی انتہا درجہ کی شاعرانہ مہارت کو خرچ کیا ہے پس ان روشن دلایل کے پیش کرنے کے بعد کہ گلستاں بوستاں پر تفوق رکھتی ہے پھر کسی تردید کی گنجائش نہیں۔

انسان اور کائنات

(از جناب میر غوث الدین علی صاحب)

موجودہ تحریک روحانیت نے زندگی کی غرض و نہایت اور اس کی قدر و قیمت کے متعلق عام طور پر انسان کے خیال و قیاس میں ایک تغیر عظیم برپا کر دیا ہے اس وجہ سے یہ لازمی ہے کہ اس نئے مطمح نظر کے حایل جو مشکلات ہیں ان میں قدم رکھ کر محققین کرام کے خیالات اور دقایق کے ہر پہلو پر نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھیں تو شاید اصلی راز منکشف ہو۔ فلسفہ سے مدد لی جائے اور فلسفہ کی روشنی میں ان واقعات کو دیکھا جائے تو ممکن ہے کہ کچھ کام بنے۔

فلسفہ کی بنیاد واقعات اور مشاہدات ہیں اور فلسفہ کی غایت اور مقصد واقعات کو ہم آہنگ کرنا اور ایک دوسرے کے ساتھ انکا صحیح تعلق بتلانا ہے۔

عہد قدیم میں یہ باور کیا جاتا تھا کہ انسان کائنات سے کچھ جدا نہیں ہے بلکہ اس کا ایک جزء ہے اور مذہب جو ایک اعلیٰ ترین اور بلند پایہ اصول ہے۔ حقیقت میں یہی ایک واسطہ ہے جس کے ذریعہ انسان زندگی کی حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور یہی ایک واحد ذریعہ ہے جو وجود کلی کے ساتھ اتحاد شعوری پیدا کر سکتا ہے۔ اور اسی کے وسیلہ سے زندگی کی ممتاز ترین حالت یعنے کامل آزادی کا مرتبۂ الوہیت کے ساتھ میل جول ممکن ہے۔ اور اس کی بدولت ہم اس امر کے سمجھنے کے قابل ہوئے ہیں چنانچہ فلسفہ کے بہترین اصول اور کلیے ذہن انسانی اور روح انسانی کے عمیق سوالات یہ ہیں کہ زندگی یا وجود کا منبع کیا ہے؟ خود زندگی کیا چیز ہے؟ اور ہم اپنے مادی اجسام میں کیوں آباد ہیں؟ جب دنیوی زندگی ختم ہو چکتی ہے تو پھر ہم کہاں جاتے ہیں یا اور اس کے بعد کونسی قسمت ہماری منتظر رہتی ہے؟ غور و خوض کے دوران میں تصور اور خیال کے وقت بیداری کی حالت میں اور مادی گرد و پیش سے غیر حسی کی صورت میں یہ اہم ترین روحانی سوالات پیدا ہوتے اور حل طلب کرتے ہیں اور مبلغ علم کے موافق اور پیدا کردہ صبر و استقلال کے حسب قابلیت اور باطنی صفائی کی استعداد کے مطابق یہ جوابات صحیح اور مکمل ہوتے ہیں۔

ان جملہ تحقیقات کا اصل اصول اور تمام فلسفیانہ خیالات کی کنجی موقوف ہوتی ہے اس راز کے

حل پر کہ زندگی کیا چیز ہے ؟ بیشتر محققین نے مادی اور غیر مادی عالموں کے واقعات اور انکے نتائج کو ایک خاص مسلک اور طرز میں منسلک کرنے کی کوشش کی بعضوں نے صرف قریب ترین منظر پر ہی اکتفا کیا اور مادی حدود کے اندر خود کو مقید سمجھا اور دوسروں نے مادی حدود کی ناقص حالت کو پہچانا اور اس کے آگے بڑھ کر روحانیات کے اندر اپنے کو پایا ہے۔

پروفیسر ٹنڈال جو ایک عام خیال کے تحت مادہ پرستوں کے بھی مادہ پرست تھے اپنے ایک خطبہ میں اس طور پر اقرار کرتے ہیں "میں نے اپنے سالہا سال کی تحقیقات کے دوران میں معلوم کیا کہ طاقتور ذہنیت قوی اور پاک خیالات کے گھنٹوں میں یہ اصول یعنے مادیت اور دہریت میرے دماغ میں پھٹکنے تک نہیں اور ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ طاقتور اور پاک خیالات کے وقت وہ بالکل غائب ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد اس راز کا کوئی حل نہیں ملتا جس کے اندر ہم اپنا وجود پاتے ہیں اور جس کے ہم ایک جزو ہیں" ایک ممتاز فلسفی کا خیال ہے کہ تعصب نے جس طرح سے مذہب کو نقصان پہنچایا اسی طرح سے مادہ پرستی نے بھی فلسفہ کا مضحکہ اڑایا۔ "چنانچہ مادہ پرست ہمیشہ اس امر کے امتیاز کرنے میں ناکام رہتے ہیں کہ کونسی چیز عارضی یا فانی ہے اور کونسی دائم یا باقی رہنے والی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی پبلک فائدہ پیش نظر ہو ایک گروہ کا اجتماع ہو جاتا ہے بعد ازاں جب وہ منشا یا مقصد پورا ہو سکتا ہے تو مجمع بھی منتشر ہو جاتا ہے لیکن ہم کو نظر آتا ہے کہ وہ فوری پیدا شدہ احساس جو انسانی اجتماع کی بدولت پیدا ہوا تھا مجمع کے انتشار کے بعد بھی باقی رہ جاتا ہے آسمان پر بادل چھا جاتے ہیں اس کے بعد بھی نیلا آسمان دکھائی دیتا ہے۔ شبنم پتے پر نمودار ہوتی ہے کچھ دیر کے بعد غائب ہو جاتی ہے لیکن ہم بخوبی جانتے ہیں کہ غیر محسوس اور نامعلوم طور پر وہ پیدا ہوتی اور پھر پنہاں ہو کر دوبارہ غیر محسوس طریقہ پر نمودار ہو گی اس اثناء میں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہی شبنم کا قطرہ آفتاب کی روشنی میں چمکتا ہے اور اپنے اندر تمام اطراف و اکناف کی دنیا کو منعکس کرتا ہے اور اس دوران میں اظہار حسن عالم کا وہ حصہ لے لیتا اور اپنی ذمہ داری کو پورا کر لیتا ہے جو اس کی تخلیق کی غایت اور علت تھی اس کا غیر محسوس مادی وجود عارضی ہوتا ہے ایک قطرہ کی حیثیت سے وہ پیدا ہوتا اور ایک قطرہ کی ہی حیثیت سے نابود ہو جاتا ہے لیکن بخارات آبی کی حیثیت سے وہ قائم اور باقی رہتا ہے جو فی الحقیقت ایک غیر فانی طبعی چیز ہوتی ہے پھر دیکھنا چاہئے کہ آخر زندگی کیا چیز ہے؟

۴۵۹۸

کیا وہ ایک عدم یا مفقود الوجود ہے جس نے کاربن۔ ہیڈروجن اور آکسیجن کے اجزا کو ترکیب دے کر ایک دیوہیکل درخت یا ایک پرند یا انسان کی شکل کو پیدا کر دیا ہے؟

ظاہر ہے کہ کوئی شخص دنیا کے جملہ حالات پر عبور نہیں حاصل کر سکتا۔ اگر اطمینان اور غور کے ساتھ ان ہزاروں تغیرات پر نظر ڈالیں جو روزمرہ ہمارے گردوپیش مادی دنیا میں وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں مثلاً کیمیائی تغیرات۔ کیمیائی تعاملوں کی باقاعدگی اور قلمدار چیزوں کی باقاعدہ صورت پذیری، نباتات کی روئیدگی اور حیوانات کا تحرک اور پھر سب سے بڑھ کر جسم انسان کی پیچیدہ ترکیب، یہ سب واقعات اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ تمام مادی تغیرات کی پشت پر کوئی ایسی زبردست طاقت موجود ہے جس کی اصلیت اور کنہ تک انسانی عقل کی رسائی ناممکن ہے۔

ایک روشن خیال مصنف نے کیا خوب کہا ہے کہ جب ہم اپنے خیالات کے اس درجہ تک پہنچتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ الوہیت مادہ کے وہ تمام دعوے کس قدر کھوکھلے اور بے بنیاد تھے اور وہ سب کوششیں بے سود تھیں جو ذہنی قابلیتوں کو بے اصل ثابت کرنے کے لئے کیجاتی تھیں جس کے اوپر ہزاروں ہی نے اپنی عمریں تباہ کیں اور جب کبھی مایوسی سے سابقہ پڑتا تو تنگ نظری کی بدولت اُن کا ذہن رسا بے شمار غلطیوں کی طرف اُن کی رہنمائی کرتا۔ اس نوبت تک پہنچنے سے پہلے ہی مادی عالم ان کے نزدیک موہوم اور دھندلی سی شکل اختیار کر لیتا اور صرف ایک سایہ ہی سایہ باقی رہ جاتا ہے۔ اور وہ مادی وجود سے پرے غیر محسوس عالم میں داخل ہو جاتے ہیں اس وقت ان کے دماغوں میں ایک ٹھوس خیال جاگزیں ہوتا ہے اور نہایت خاموشی کے ساتھ وہ اپنا عمل شروع کر دیتا ہے اور ان کو یقین دلاتا ہے کہ اس تغیرات کی دنیا میں صرف میں ہی باقی رہ گیا ہوں اور یہاں سے تمہارا رہبر بنکر تم کو اصلی راستہ کی طرف لئے چلتا ہوں اس کے بعد بقا کے اصول کو وہ سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں چنانچہ انکی سمجھ میں آجاتا ہے کہ پھول، درخت، بادل شعاع آفتاب یا ایک پتھر کی چٹان اپنا کوئی ذاتی وجود نہیں رکھتی سوائے اس کے کہ وہ اس ذات واجب الوجود کی وجہ موجود ہیں اور گویا کہ فطرت کے حروف ہجا کی حیثیت سے اپنا وجود رکھتے ہیں۔ ہجا کے حروف کی طرح وہ ایک دوسرے کے ساتھ الفاظ کی صورت میں ملے جلے اور ترکیب کھائے ہوئے ہیں حروف ہجا کی طرح وہ موجود ہیں اپنی ذات واحد کے لئے نہیں بلکہ عناصر کی طرح جن کے ذریعہ کلمہ اور کلام ذہن اور عقل ظاہر ہوتے اور خیالات وضع کئے جاتے ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سب فانی اور غائب ہونے والے اور تغیر پذیر ہیں

اگر کسی چیز کو قیام حاصل ہے اور باقی ہے تو وہ غیر متغیر طاقت ہے جو اس جملہ مادّی تغیرات کی پشت پر واقع ہے اور اگر کسی کو بقا حاصل ہے تو اس عقل کل کو حاصل ہے۔ جو ان تمام تغیرات کے دوران میں کسی خاص منزل کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور جن چیزوں کو قوانین فطرت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ انکشافات ہیں ان جملہ قدرتی اسباب و علل کے اور عمل ہیں اس دائمی محبت و ارتباط کے جیسا کہ انسانی جسم کے حرکات و سکنات انسانی ارادے کے تابع ہیں اسی طرح سے عقل کل بھی رہبر ہے اس کائنات کے جملہ انتظامات کے برقرار رکھنے میں۔

دور افتادہ

(لارڈ بائرن کی ایک نظم کا تر[جمہ])

از جناب محشر عابدی

(۱)

ہوئے جب ہم جدا دونوں خموشی تھی رواں آنسو — شکستہ قلب وارفتہ تھے ہم محو فغاں ہر سو
ہماری سحر لئے ہم جیسی ٹٹتی جاتی تھیں — شب فرقت کی گھڑیاں وحشت افزا بڑھتی آتی تھیں
تمہارا رنگ بدلا طرز بدلا، غم کی صورت تھی — تمہارا جسم ٹھنڈا اور شکستہ کی سی حالت تھی
میرے دل نے کہا مجھ سے شگون اچھا نہیں ایسا — خدا جانے کہ دکھلائیگی قسمت وقت اب کیسا

(۲)

خیال بے وفائی ہے مگر خاموش رہتا ہوں — تمہاری یاد میں لیکن عبث مدہوش رہتا ہوں
تمہارا ذکر میری موت کا پیغام ہوتا ہے — محبت اُف محبت کا یہی انجام ہوتا ہے
مجھے بھولے تو کیا، تم ایک ہی میرا تصوّر ہو — نہ آؤ بھی تو کیا، موجود میرے دل کے اندر ہو
مگر تا عمر غم کی داستاں کہتا رہوں گا میں — سناؤں گا تمھیں اور تم سے پھر سنتا رہوں گا میں

(۳)

مسرت جب تھی تم سے اب میں تنہائی میں روتا ہوں — نہ دن کو چین آتا ہے نہ میں راتوں میں سوتا ہوں
ستایا تم نے لیکن اب تصوّر بھی ستاتا ہے — رلایا تم نے لیکن اب تصوّر بھی رلاتا ہے
اگر برسوں میں قسمت پھر کبھی تم سے ملائیگی — تو خود ہی دیکھ لینا جو مری حالت دکھائیگی

ملوں گا کس طرح تم سے ابھی بتلاؤں تم کو کیا
رواں ہونگے وہی آنسو خموشی اور وہی نقشا

محب وطن

(از ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور)

(مترجمہ پیرس بی انصاری)

چتر گپتا جو موت کے دروازہ پر بیٹھے ہوئے بلا رو رعایت (دنیا کے اعمال) قلم بند کیا کرتا ہے مجھے یقین ہے کہ اس نے میرے متعلق بھی ایسے الزامات نہایت جلی قلم سے لکھ رکھے ہوں گے جو بالکل لاعلمی کے عالم میں مجھ سے سرزد ہوئے ہوں لیکن ساتھ ہی اکثر گناہ جن کے وقوعہ سے دیگر حضرات ناواقف ہیں میرے حافظہ میں نہایت واضح طور سے محفوظ ہیں میرے جادہ راستے سے ہٹنے کی کہانی جو میں سنانا چاہتا ہوں آخر الذکر میں داخل ہے۔ اپنے گناہ کے سچے اقرار سے مجھ کو اُمید ہے کہ قبل اس کے کہ میرا گناہ کتاب تقدیر یا صحیفہ اعمال میں لکھا جائے اور سزا مقرر ہو شاید اس کی سزا میں کمی ہو جائے۔

یہ واقعہ کل ہی ہمارے محلہ میں پیش آیا یہ دن جینیوں کے کوئی تہوار کا بھی تھا اور جس وقت کہ میں اپنی بیوی سا کما کے ساتھ نائن موہن کے ہاں جو میرے ایک عزیز ہیں چائے نوشی کے لئے جا رہا تھا۔

میری بیوی کے نام کے لفظی معنے رکلی، کے ہیں، یہ نام میرے خسر کا رکھا ہوا ہے اگر میری بیوی اور اس نام کے مفہوم میں کوئی نسبت نظر نہ آئے تو اس کے واحد ذمہ دار میرے خسر ہی ہیں۔ میری بیوی کے نزدیک کوئی بات ناشدنی غور طلب نہیں ہی بلکہ اکثر مسئلوں کے متعلق تو اس کی رائے حد تمام تک پہونچ چکی ہے ایک مرتبہ جبکہ وہ بورا بازار میں غیر ملکی کپڑا خریدنے والوں کو روکتے ہوئے نہایت دلیری سے پہرہ دے رہی تھی تو اُنکی جماعت کے دہشت زدہ اراکین نے ان کے اس شجاعانہ کارگزاریوں پر دھرو و ادرتا کا لقب دیدیا یعنے وہ عورت جس کے قول و فعل میں کبھی تزلزل نہیں ہوتا۔

میرا نام گر ندرا ہے یعنے چٹانوں کا دیوتا یہ نام میرے ملکی بھائیوں میں عام تو ہے لیکن اس کا اسم بامسمی شاذ و نادر ہوتا ہے کالکا کے ثناخواں کو میرے متعلق صرف اس قدر علم ہے کہ میں اپنی بیوی کا شوہر ہوں ورنہ میری ذات کو تو وہ بالکل ناقابل التفات سی تصور کرتے ہیں لیکن خوش قسمتی سے میرے ساتھ چند ایسی آبائی خصوصیات چلی آ رہی ہیں جو میری بیوی کے ساتھیوں کو چندہ جمع کرتے

وقت بہت ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔

میاں بیوی میں پوری طرح سے موافقت کے بہ نسبت اگر اُن کی خصلتوں میں اختلاف ہو تو میرا خیال ہے کہ یگانگت کا بہترین موقع ملتا ہے جس طرح کہ خشک زمین میں ابر باراں کا برسنا! میری فطرت میں بے اعتنائی ہونے کی وجہ سے زیادہ غور و تفکر کا عادی نہیں ہوں لیکن میری بیوی کی ذہنیت میں کچھ ایسا استحکام ہے کہ کوئی بات اس سے نظر انداز نہیں ہوسکتی لیکن یقین کیجئے کہ یہی غیر شاہت ہمارے امور خانہ داری میں انضباط قایم رکھنے میں بہت مفید ثابت ہوئی ہے

ہاں! ہم میں ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے جس پر آج تک کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکا وہ یہ ہے کہ میری بیوی مجھ کو حب وطن کے جذبہ سے عاری سمجھتی ہے۔

یہ نہایت پریشان کن بات ہے کہ میری بیوی کے نزدیک صحیح وہ ہے جو اُس کے وہم و گمان میں صحیح ہے حالانکہ میرے حب وطنی کے ثبوت کے لیے اس کے پاس بہت سے اندرونی (دوسروں کی نظر سے اوجھل) شواہد موجود ہیں۔ لیکن چونکہ اس کے ہم شربوں کی طرح مجھ پر کوئی ایسا لبادہ نہیں ہے جس پر قومیت کی کوئی مہر ثبت ہو۔ اسی سبب سے شاید اس کو انکار ہے۔

مجھ کو بچپن سے کتابوں سے گہری محبت رہی ہے۔ کتابیں خریدنے کا تو مجھے ایک جنون ہے اس حقیقت سے میرے دشمنوں کو بھی انکار کی جرات نہیں ہوسکتی کہ میں ان کا مطالعہ بھی کیا کرتا ہوں، میرے دوست تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے مضامین پر کسی دلچسپی سے اُن کے ساتھ بحث کیا کرتا ہوں۔ اس طرح سے میرے اکثر دوستوں کو علمی روشنی حاصل ہوئی آخر میں بن ہماری اکیلا ساتھی رہ گیا جس کے ساتھ تنہائی میں خوب گفتگو ہوا کرتی ہے ہم ابھی ایسے واقعات میں سے گذرے ہیں کہ ایک طرف عہدہ داران کوتوالی نے ہمارے نزدیک گیتا کی موجودگی کی وجہ سے ہمارے ساتھ انتہائی نفرت انگیز سلوک کیا۔ دوسری طرف ہمارے محبان وطن کو یہ بات محال نظر آتی ہے کہ ایک شخص کسی غیر ملکی ادبیات کا دلدادہ رہتے ہوئے اپنی مادر وطن کے ساتھ عقیدتمندی کا دم بھرے۔ سرسوتی جو ہمارے یہاں روایتاً شائستگی کی دیوی کہلاتی ہے، محض اس کا رنگ گورا ہونے کی وجہ سے ہمارے نوجوان قوم پرست اس کے متعلق شک کرنے لگے ہیں اور انھوں نے کالج کے لکچروں کو ترک کرکے یہ بات صاف طور سے ظاہر کردی کہ اُس مقدس جھیل کا پانی جس میں سرسوتی کنول کے پھول پر جلوہ افروز ہے ہمارے مادر بھارت لکشمی میں اُس تباہ کن آگ کو بجھانے کے ناقابل ہے۔ جو صدیوں سے بربادی اور خرابی مچاتی چلی

آرہی ہے بہرحال دماغی شائستگی سیاسی زندگی کی نشو و نما کے لیے ایک روک تصور کی جاتی ہے۔

میری بیوی کے شدید اصرار اور خود اس کے عملی نمونہ کی موجودگی میں بھی میں کھدر نہیں پہنتا، اس لئے نہیں کہ اس میں کوئی عیب ہے یا اپنی خودنمائی میں کسی قسم کی کمی ہو جائے گی۔ بلکہ اس امر کو کہ مجھ کو کس قسم کا لباس اختیار کرنا چاہیئے، میں اس بات کو میری ان عادتوں میں شامل نہیں کر سکتا جو خود ہمارے قومی خصائل سے بالکل مختلف ہیں۔ واقعہ ہے کہ کالکا کی اس جدید تبدیلی سے کہیں پیشتر میں چینیوں کے دوکان سے جوڑے سر والے جوتے خرید کر پہنا کرتا اور ان کو چلا کرنے کی بھی مجھ کو پرواہ نہیں تھی۔ مجھ کو تو پاتتابے بھی استعمال کرنے کے لیے تامل ہوتا تھا میں پنجابی قمیصوں کو ان کے گنڈیاں لگانے میں نقائص کو نظرانداز کرتے ہوئے انگریزی قمیصوں پر ترجیح دیتا تھا میری ایسی عادتوں سے خانگی زندگی میں ایک قسم کی تلخی پیدا ہو گئی یہاں تک کہ ہم میں ایک دوسرے سے مستقل طور سے جدا ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ کالکا نے کہنا شروع کیا کہ پبلک میں اس کے ساتھ میری موجودگی سے اسے شرمندگی ہوتی ہے اگرچہ یہ بیوی کے فرائض میں داخل ہے کہ جس مجلس میں وہ جائے شوہر کو ساتھ لیجائے! لیکن میں نے ان مجلسوں میں جہاں میری موجودگی سے بدمزگی کا احتمال ہو جانے سے پرہیز کیا۔

زمانہ بالکل بدل چکا ہے۔ لیکن میری شومی قسمت حسب سابق باقی ہے کالکا کی زبان پر اب تک یہی ورد ہے "تمہارے ساتھ کہیں چلنے کے لئے مجھے شرم آتی ہے" پہلے جبکہ اس کا تعلق قومی کشمکش کے پیشتر کے زمانہ سے تھا مجھ کو اس کی جماعت کے ساتھ ہم رنگ بننے میں پس و پیش رہا! اور اب بھی جبکہ وہ موجودہ طریق عمل پر چلنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ مجھ کو اسکی جماعت کی طرح لباس اختیار کرنے میں تامل ہے۔ یہ عیب میری ہی فطرت میں نہایت گہرے طور سے متمکن ہے میں اپنی شخصیت کے لئے تمام ظاہری خودنمائیوں سے پرہیز کرتا ہوں۔

میرے اس کشیدہ مزاجی سے گھریلو دنیا میں لگاتار ناچاقیاں پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ میری بیوی کو اپنی جبلی قابلیت کے باعث، اپنے شریک زندگی میں ایک ناقابل ترمیم افتراق کو تسلیم کرنے سے عار ہے اس کا ذہن ایسی پہاڑی ندی کے مانند ہے، جو ایک چٹان کے اطراف نہایت تندی سے گردش کرتی اور اس کو اپنے دھارے کے ساتھ بہا لیجانے کی سعی لاحاصل کرتی ہے کوئی بات اس کے نقطۂ نظر سے اگر مختلف ہو جائے تو گویا وہ اپنے آپ سے باہر ہو جاتی ہے۔

کل جس وقت باہر جانے کی تیاری ہو رہی تھی غیر کھدر لباس کی مخالفت کرتے وقت میری بیوی کا لہجہ نہایت دلکش تھا۔ بدقسمتی سے مجھے اپنی قابلیت پر انتہائی ناز تھا جس کی وجہ سے میں اپنی بیوی سے مباحثہ کرنے کے لئے مجبور ہو گیا۔ مباحثہ بالکل ناخوشگوار تھا بلکہ مہمل۔

"عورتیں اس میں نہایت آسانی خیال کرتی ہیں" میں نے اس سے کہا کہ آنکھ بند کئے کسی مقتدر کی رسی پکڑے ہوئے چلے جائیں اور جب ان کی تمام آزادی سلب کر لیجائے کر انھیں سخت پردہ میں مقید کر دیا جاتا ہے تو تب بھی وہ اپنے کو مطمئن پاتی ہیں آج ہماری عورتیں نہایت آسانی سے کھدر کے استعمال میں جو گرم جوشی ظاہر کر رہی ہیں وہ محض اس وجہ سے ہے کہ ہمارے ظاہری نام و نمود کے اظہار کے معیاروں کی فہرست میں ایک اور چیز کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ جس سے ہمیں ایک قسم کی تسلی بھی حاصل ہوتی ہے" کالکا نے تقریباً غصہ سے جواب دیا" وہ دن میرے ملک کے لئے ایک عظیم الشان ہوگا جبکہ لوگ جس طرح دریائے گنگا میں غوطہ مارنے کو اندھا دھند ایک مقدس عمل سمجھتے ہیں ایسا ہی ایمان کھدر پوشی کے متعلق رکھیں۔ عقلی معاملات میں تناسب پیدا کیا جائے تو وہی رسم و رواج میں ہو پیدا ہو جاتے ہیں آزاد خیالی ایسی روح کی مانند ہے جس کا مسکن (نام نہاد) انجنیں ہیں اور وہ آسمانی فضا میں مارے مارے پھرتے رہنے کو ترک کر دیتے ہیں کیونکہ انھیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے معقول ذریعہ ہاتھ آ جاتا ہے"۔

میں تاڑ گیا کہ یہ دانشمندانہ اقوال ناش موہن کے ہیں پھر نام کا حوالہ نہیں لیکن کالکا کو یہ اقوال اپنے طرف منسوب کر لینے میں کوئی پس و پیش نہیں تھا۔

جس آدمی نے یہ قول" خاموش پسندی تمام بکھیڑوں کا علاج ہے" ایجاد کیا ہو وہ ضرور مجرد ہوگا کیونکہ میرے سکوت نے میری بیوی کے جوش کو اور برافروختہ کر دیا۔" تمھاری ذات پات کی مخالفت" اس نے کہا "صرف زبان کی حد تک ہی ہے برخلاف اس کے ان تمام رنگی امتیازوں کو مٹانے کیلئے سب کے سب ایک سفید وردی پہن کر ہم تو عملی ثبوت دیتے ہیں"۔

میں یہ جواب دینے والا تھا کہ درحقیقت میری ذات پات کی مخالفت کی ابتدا کی اصلیت میری زبان سے ہی ہے چونکہ جب کبھی کوئی مسلمان عمدہ کھانا پکاتا ہے تو میں بخوشی مزے لیکر کھاتا ہوں یہ ایک غیر تحریر شدہ بات ہے لیکن زبانی نہیں فی الواقع یہ امور باطنی ہیں ایک ظاہری پردہ ان امتیازات کو پوشیدہ تو کر سکتا ہے لیکن اس سے ان کا استیصال ممکن نہیں۔

مجھ کو کامل یقین ہے کہ میرا اتنا لال ایسا وزنی تھا کہ اس کو ضرور پیش کیا جاتا لیکن میں اپنی

کمزوری اور بزدلی کی وجہ سے غیر جانبدارانہ خاموشی میں اپنی سلامتی سمجھا کیونکہ مجھ کو بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ ایسے ہی کئی ایک مباحثے اُن سے تنہائی میں ہوئے لیکن بعد کیا دیکھتا ہوں کہ میری بیوی ہی کے ذریعہ سے اُس کے دوستوں میں یہ خبریں پہنچ جاتی ہیں اور وہاں میری باتوں کا نہایت بُری طرح سے مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ اس میں ایک ناخوش گوار عادت یہ ہے کہ وہ نائن موہن کے چند فقرے سن ناکر میرے سامنے بارش کی طرح برس پڑتی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کوئی جواب دینے سے پہلے مقابلہ کے میدان سے چمپت بھی ہو جاتی ہے۔

پروفیسر کی چائے کی میز پر جو کچھ بھی ہوگا اس سے میں بخوبی واقف تھا کچھ رسمی ہندو تہذیب اور آزاد خیالی کا ڈھنڈھورا ہوگا۔ اور کچھ صدیوں کے نسلی تجربات اور حقایق پر دو آنسو بہائے جائیں گے جو اس وقت تنزل اور اختلاط کے منجدھار میں بہے چلے جا رہے ہیں، اتنے میں مجھ کو اُس نئی کتاب کا جس کی جلد مراکو کے چمڑے سے نہایت خوبصورت بنی ہوئی ہے خیال آیا۔ جو بھورے کاغذ میں عجیب طور سے لپیٹے ہوئے میرے مطالعہ کے انتظار میں پلنگ پر پڑی ہوئی ہے لیکن ان الفاظ کے خوف سے جن میں سے کچھ بیان کر دئے جائیں گے اور کچھ بیان کرنے سے رہ جائیں گے اور ایسے حرکات وسکنات سے جن سے مصیبت کا سامنا ہو جائے میں اپنی مشغولیت پر قایم رہنے کیلئے مجبور ہو گیا

ہم مکان سے تھوڑا ہی فاصلہ طے کرکے ایک گلی میں سے گزرے جہاں ایک کویلی سے چھائی ہوئی جھونپڑی میں ایک دوکاندار بدہضمی کے متعلق اُبلے ہوئے سرسوں کے تیل میں مختلف اشکال تلا رہا تھا کہ یکایک خوفناک چیخوں نے ہمیں چونکا دیا۔

مارواڑیاں اپنے عبادتی قیمتی نذر و نیاز کی اشیاء لئے ہوئے مندر کو جا رہے تھے یکایک اس مقام پر رک گئے" غصہ کی آواز سنائی دی جس کے ساتھ مار پیٹ کی بھی آواز شامل تھی میں نے خیال کیا کہ شاید کسی جیب کترے کی مرمت ہو رہی ہے اور غصہ کی زیادتی کی وجہ سے لوگ اپنے ہی ایک ہم جنس کے ساتھ آزادی سے یہ بے رحمانہ سلوک کرکے لطف اٹھا رہے ہیں ہم ہارن کو جلد جلد بجاتے ہوئے جب اس مشتعل مجمع میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے ضلع کا بوڑھا مہتر بُری طرح پٹیا گیا ہے۔ وہ ابھی دوپہر کا غسل کرکے سیدھے ہاتھ میں ایک بالٹی میں صاف پانی لئے اور بغل میں جھاڑو دبائے جا رہا تھا اس وقت وہ چاک کا کوٹ پہنے اپنے بالوں کو اچھی طرح کنگھی کئے ہوئے تھا جو اب تک تر تھے ایک سات سالہ پوترے کو اس طرح لئے ہوئے جاتے وقت وہ شاید کسی سے چھو گیا یا اور کوئی بات ہوئی جس کی وجہ سے اس غریب پر یوں آسمان ٹوٹ پڑا۔

لڑکا لوگوں سے روتے ہوئے منت کر رہا تھا کہ اس کے نانا کو نہ ماریں اور یہ بوڑھا بھی ہاتھ جوڑ کر لوگوں سے گڑگڑا رہا تھا کہ اس کے اس غیر ارادی جرم کی بخشش کی جائے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک دریا بہہ رہا تھا اور اس کی ڈاڑھی خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔

یہ نظارہ میرے لئے ناقابل برداشت تھا اور میں نے اس بات کا تہیہ کر لیا کہ میں اس مہتر کو اپنی موٹر میں بٹھا لوں گا اور اپنے اس عمل سے اس مقدس جماعت پر یہ ظاہر کر دونگا کہ میں تمھارے طریق کا نہیں ہوں۔

میری مضطربانہ حرکات کو دیکھ کر کالکا نے بھانپ لیا کہ اس وقت میرے دماغ میں کیا کھچڑی پک رہی ہے میرے شانوں کو دبا کر اس نے کان میں کہا "تم نے یہ کیا نازیبا حرکت پر کمر باندھی ہے کیا تمھیں نظر نہیں آرہا ہے وہ تو مہتر ہے"۔

میں نے کہا کوئی مضائقہ نہیں اگر وہ مہتر ہے لیکن ان لوگوں کو اس غریب کو اس طرح سے پیٹنے کا حق کہاں سے آگیا"۔

"اجی میاں یہ تو اسی کمبخت کا قصور ہے" کالکا نے جواب دیا "اگر وہ موا بیچ راستہ میں سے نہ چلتا تو کیا اس کی شان میں کوئی فرق آجاتا"۔

"مجھ کو علم نہیں" میں نے جلدی سے جواب دیا۔ خواہ کچھ ہی ہو میں تو اسکو موٹر میں ضرور بٹھالونگا"

"تو میں اسی وقت تمھاری موٹر پر تف بھیجتی ہوں" میری بیوی نے برہمی سے کہا "میں ایک مہتر کے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتی"۔

"کیا تم اندھی ہوگئیں دیکھو اس نے ابھی غسل کیا ہے اور کپڑے کیسے صاف ستھرے ہیں بلکہ حقیقت میں وہ ان لوگوں سے زیادہ پاک صاف ہے جو اس بیچارے کو پیٹ رہے ہیں"۔

"وہ مہتر ہے"۔ میری بیوی نے بطور فیصلہ کہا اور شوفر سے یوں کہا "گنگادین موٹر کو بڑھاؤ" مجھ کو شکست نصیب ہوی اور یہ میری محض بزدلی تھی"۔

سنا کہ این موہن نے عمرانیات کے متعلق نہایت بہترین خیالات کا اظہار کیا خاصکر پیشے اور قدرتی کمزوری کی وجہ سے غیر مساوات اور عدم رواداری کی نسبت۔ لیکن ان الفاظ سے میرے کان نا آشنا رہے اور اس روز تمام شام مجھ پر ایک خاموشی طاری رہی۔

ٹالسٹائے اور عوام الناس

(از جناب عترت حسین صاحب زبیری)

انیسویں صدی یورپ کی مذہبی اور ادبی تاریخ میں ایک نمایاں اہمیت رکھتی ہے سائنس کی حیرت انگیز ایجادات اور فلسفہ کی ہنگامہ آرائیوں نے لوگوں کے عقاید اور خیالات میں ایک ہیجان برپا کر دیا تھا۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ جب ڈاروِن نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "سلالت انسان" شایع کی تو لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب مذہب اور اخلاق کی دنیا کو کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔

جب تمام یورپ اس مذہبی بے چینی میں مبتلا تھا اور گزشتہ صدی کے عقاید کی عمارتیں منہدم کیجا رہی تھیں اس کے ایک گوشے سے ٹالسٹائے ایک عالمگیر پیغام لیکر اٹھتا ہے اس کا پیغام یورپ کے مادی رجحانات اور سرمایہ داری کی تہذیب کا ایک لازمی نتیجہ تھا اس نے ان قومی روایات اور مذہبی عقاید کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جن پر یورپ کی مادی تہذیب کا دار و مدار ہے لیکن ٹالسٹائے سائنس داں نہیں تھا کہ اس کے خیالات کو لوگ اہمیت دیتے، وہ فلسفی نہ تھا کہ لوگ اسکی رسائی فہم اور نکتہ چینی پر سر دھنتے پھر وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے ٹالسٹائے کی مقناطیسی شخصیت کے خطوط قوت کا ایک جال یورپ کی فضا میں بچھا دیا۔ قدرت کامیابی کے لئے خود بخود اسباب مہیا کر دیتی ہے ٹالسٹائے اپنے مذہبی رنگ میں اس وقت ظاہر ہوتا ہے جبکہ اس کے ادبی کارناموں کا چرچا یورپ کے قہوہ خانوں اور کلبوں کو گرما چکا تھا اس کی ادبی فتوحات کے اثرات ابھی ہلکے بھی نہ پڑنے پائے تھے کہ اس کے مذہبی عقاید نے یورپ کی سوسائٹی کی بنیادوں کو متزلزل کرنا شروع کر دیا اس کی ادبی عظمت اپنا سکہ جما چکی تھی لہذا یورپ اس کے پیغام کے سننے پر مجبور ہو گیا۔ اگر ٹالسٹائے ادیب نہ ہوتا تو قرین قیاس یہی ہے کہ یورپ کے خود سر سرمایہ دار اس کے پیغام کو "دیوانے کی بڑ" کہہ کر ٹھکرا دیتے۔ یورپ کی قوموں میں فرانسیسی غیر ملکی ادبی کارناموں کی بہت کم داد دیتے ہیں لیکن ۱۸۸۵ء میں ہی مالکیر ڈی دو (MELCHIOR DE VOGUE) اپنی مشہور کتاب رومن روسے (ROMAN RUSSE) میں لکھتا ہے "اگر در اصل وہی کتابیں دلچسپ ہوتی ہیں جو کسی خاص عہد کے عوام الناس کی زندگی کا بہترین مرقع ہوں تو ہماری انیسویں صدی نے ٹالسٹائے سے بڑا کوئی ادیب پیدا نہیں کیا مجھ کو یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ٹالسٹائے کو

اس صدی کے تمام ادیبوں پر فوقیت حاصل ہے۔"

فلوبرٹ (FLAUBERT) نے جب ٹالسٹائے کی کتابوں کو پڑھا تو وہ چلا اٹھا "یہ شکسپیر ہے اواللہ! یہ شکسپیر ہے"۔ مشہور فرانسیسی مصنف رومن رولنڈ (ROMAN ROLLAND) جسکو نوبل انعام مل چکا ہے، کہتا ہے "ٹالسٹائے کی ناولوں کی ہمارے لئے وہی اہمیت ہے جو ورتھر (WERTHER) گیٹے کا مشہور ناول) کی گزشتہ نسل کے لئے تھی یہ ہمارے جذبات، خیالات، کمزوریوں، کامیابیوں اور امیدوں کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔

اس کی ہر دلعزیزی نے اس کے پیغام کو یورپ کے کونے کونے میں پہنچا دیا۔ اور ان لوگوں کو جو بچوں کی طرح سائنس کے خوشنما کھلونوں کو اپنا دل دے چکے تھے اپنی حالت پر دوبارہ سوچنے اور غور کرنے کے لئے مجبور کر دیا۔

جب ہم ٹالسٹائے کے مذہبی عقاید اور سیاسی نظریات کے اثرات کا اندازہ کرتے ہیں جو نہ صرف یورپ بلکہ تقریباً تمام مہذب دنیا پر مرتب ہوئے تو اس کے ادبی کارنامے پھیکے پڑ جاتے ہیں اور ہمارے لئے ادیب ٹالسٹائے نہیں؛ بلکہ یورپ کی مادی تہذیب کا نقاد ٹالسٹائے دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے؛ یوں تو ٹالسٹائے کے مذہبی اور سیاسی خیالات ہر اس شخص کے لئے اہمیت رکھتے ہیں جو ٹالسٹائے کی دماغی نشوونما کو سمجھنے کا خواہشمند ہے لیکن ہندوستان کے لیے اُن میں ایک نمایاں خصوصیت اور دلچسپی پنہاں ہے۔ اگر ہم ہندوستان کے عہد حاضرہ کی سیاسی زندگی کے عناصر معلوم کرنے میں کوشاں ہوں تو گاندھی کی عجیب و غریب شخصیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے یہ ایک ایسا بیّن اور روشن امر ہے جس کا اقرار گاندھی کے مخالفین بھی کرتے ہیں۔ گاندھی کی زندگی کے تدریجی ارتقاء کا مطالعہ کرنے کے لیے ہم کو ان اثرات کو بے نقاب کرنا پڑے گا جنھوں نے گاندھی کو گاندھی بنا دیا۔ ہم کو ان اثرات میں سب سے نمایاں اثر ٹالسٹائے کا معلوم ہوگا جو گاندھی کی ذہنیت کے رگ و ریشہ میں سرایت کئے ہوئے ہے اور اس امر کا خود گاندھی کو بھی اقرار ہے۔ اس طرح ٹالسٹائے ہندوستان کے لئے ایک خاص دلچسپی کا مرکز بن گیا ہے یہ بظاہر حسن اتفاق ہے کہ ٹالسٹائے کے ادبی کارناموں اور مذہبی عقاید کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور یہ نہایت سادہ الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

"دو کسانوں اور مزدوروں کی زندگی سے انتہائی رغبت و محبت"

اس مختصر مضمون کا مقصد اس محبت کی ابتدا اور اس کی غرض و غایت بتانا ہے اور اس کے

اثرات جو ٹالسٹائے کی زندگی پر پڑے ان کو ظاہر کرنا ہے نیز ان اثرات سے ٹالسٹائے کے نظریات کی نشو ونما کو بھی دکھلانا ہے۔

کسانوں اور مزدوروں کی زندگی سے جو دلچسپی اور اُنس ٹالسٹائے کو عمر بھر رہا اسکی ابتدا اور تدریجی ارتقاء کو ظاہر کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ٹالسٹائے کے بچپن اور لڑکپن کا سرسری خاکہ کھینچ دیا جائے کیونکہ انسان کا دماغ ہر جاندار شئے کی طرح اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ بچپن کے اثرات کے دھندلے خاکے ہی جوانی میں ابھرے ہوے نقوش کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اس طرح بچپن کے ارتسامات سے زندگی کے اصول اخذ کیئے جاتے ہیں۔

کاونٹ لیو ٹالسٹائے ۱۸۲۸ء میں ایک امیر خاندان میں پیدا ہوا۔ اس قدیم خاندان میں روسی زمینداروں کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ٹالسٹائے نے ناز و اندام میں پرورش پائی۔ اس کے بچپن کا زمانہ وسط روس کی خاموش فضایں گزرا اس زمانہ میں جن آدمیوں میں اس نے پرورش پائی وہ سادہ لوح کسان یا گرشیا (CRISHA) کی طرح نیم مذہبی دیوانے تھے جنکی دلچسپ تصویر ٹالسٹائے نے اپنی کتاب بچپن (CHILD HOOD) میں کھینچی ہے ٹالسٹائے کی عمر ابھی ڈیڑہ سال ہی کی تھی کہ اس کی ماں شہزادی میاری ویال کناس کی (MARIE VOLKONSKY) کا انتقال ہو گیا۔ ٹالسٹائے اور اس کے تین بڑے بھائیوں کی پرورش اسکی رشتہ کی چچی تلیانا وارگولسکی (TALYANA YERGOLSH) کے سپرد کردی گئی۔ اپنی چچی کی زندگی کا دلکش مرقع ٹالسٹائے نے صلح و جنگ[1] میں کھینچا ہے۔ ٹالسٹائے نے متعدد بار اس امر کا اقرار کیا ہے کہ اسکی زندگی پر سب سے گہرا اثر اس کی چچی کا ہوا" اس نے (چچی نے) مجھ کو محبت کی روحی لذت سے آشنا کیا اس محبت کا درس الفاظ کے ذریعہ نہیں دیا گیا۔ بلکہ اسکی تمام زندگی اس قسم کی محبت کی درخشاں مثال تھی میں نے اسکو محبت کرتے اور محبت سے مسرور ہوتے ہوئے دیکھا اور میں نے محبت کی روحانی مسرت کو پا لیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا سبق تھا" یہ شاید اسکی چچی کی سادہ اور محبت آگیں زندگی کا ہی اثر تھا جس نے ٹالسٹائے کے دل میں بنی نوع انسان کی محبت کا بیج بو یا اس کی تصانیف اور زندگی دونوں میں سب سے نمایاں شئے اسکی عالمگیر محبت ہے جس نے ٹالسٹائے کو کسانوں اور مزدوروں کا گرویدہ بنا دیا اس کے بچپن میں دوسری نمایاں خصوصیت جو ہم کو ملتی ہے وہ اس کی قوت تمیزی ہے۔ فطرت نے شروع سے ہی اسمیں برائی کو پہچاننے اور اس سے نفرت کی طبعی عادت ودیعت کی تھی وہ اپنے بچپن کے ایک

[1] WAR AND PEACE

واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "ہمارے ساتھ بہت سی عورتیں بھی تھیں جن سے میں ناواقف تھا ہم سب نے مل کر گھومنا اور کودنا شروع کیا۔ اور لسں ڈور۔ ایونوِچ (TESDOR IVNOVITCH) (یہ جرمن استاد تھا) نے اپنی ٹانگوں کو بہت بلند کر کے کودنا اور شور مچانا شروع کیا' میں نے فوراً محسوس کیا کہ یہ درست نہیں' میں رونے لگا تمام لوگ پریشان ہو گئے۔"

تیسری خصوصیت جس کا اس زمانہ میں پتہ چلتا ہے وہ تشدد اور ناانصافی کی نفرت ہے ایسا طرح کسان اور مزدور جن پر ہر قسم کا تشدد روا رکھا جاتا ہے اور جن کے ساتھ ہر جگہ ناانصافی کا سلوک برتا جاتا ہے ٹالسٹائے کی محبت کے سب سے زیادہ حقدار تھے وہ اپنے بچپن کی طالب علمانہ زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "مجھ کو ٹھیک طور پر یاد نہیں کہ کس قصور پر لیکن وہ کوئی ایسی خطا نہ تھی جس پر کہ میں سزا کا مستحق تھا) میرے فرانسیسی استاد سنٹ تھامس (ST: THOMAS) نے مجھ کو کمرے میں بند کر دیا۔ اور کوڑے لگانے کی دھمکی دی۔ میرے دماغ میں (ST: THOMAS) کے خلاف نہیں بلکہ اس تشدد کے خلاف غم وغصہ کے جذبات پیدا ہو گئے۔ ممکن ہے کہ یہی واقعہ میری تشدد کی نفرت کا باعث ہوا ہو جس کو میں نے اپنی تمام عمر محسوس کیا ہے۔"

چوتھی قابل غور خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتا تھا ایکدن جبکہ اسکی عمر آٹھ سال کی تھی اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ پیروں کو ہاتھوں سے پکڑ کر کھڑکی میں سے کودنا چاہئیے اس خیال کے آتے ہی وہ فوراً اپنے مکان کی سب سے اونچی کھڑکی کی چوکھٹ سے کود پڑا تھوڑی دیر کے بعد وہ زمین پر بے ہوش پایا گیا اور اس کے سر میں خفیف زخم بھی تھا۔

لڑکپن میں اپنے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے ایک دن اس نے یہ محسوس کیا کہ حقیقی خوشی، خارج میں نہیں بلکہ وہ انسان کے اندر موجود ہے اس کے حصول کے لئے مصیبت برداشت کرنا ضروری ہے لہذا اس نے اپنے آپ کو مصیبت اٹھانے کے لئے تیار کرنا شروع کر دیا اور اپنی برہنہ پیٹھ پر اتنے کوڑے لگائے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد موت کا خیال اس کے دل و دماغ پر اتنا غالب آ گیا کہ اس نے دنیا کی تمام مسرتوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور وہ تین دن تک اپنے بچھونے پر پڑا رہا۔

ٹالسٹائے کے بچپن کے اس دھندلے خاکے سے ہم کو ان خصوصیات کا پتہ چلتا ہے جو نشوونما پا کر اس کی زندگی کے اہم ترین اصول بن گئے۔ لیکن ان تمام خصوصیات کا مرکز وہی کارخانے کے گرد وغبار میں کام کرنے والے مزدور اور تنگ و تاریک جھونپڑیوں میں زندگی بسر کرنے والے

لڑکپن BOYHOOD

کسان ہیں ۔ جیسے جیسے ٹالسٹائے کو دنیا کے تلخ تجربات کا سامنا ہوتا گیا اس نے محسوس کیا کہ مغربی تہذیب اور سوسائٹی کے آئینی قواعد نے غریبوں اور امیروں کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا کر دی ہے جس کا پاٹنا مشکل ہے ۔ ترقی حقیقی ترقی اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ وہ انسانوں کے دلوں کو ایک رشتۂ الفت میں منسلک کر دے اور دنیاوی امتیازات کو ایک حد تک مٹانے کی کوشش کرے لیکن جدید تہذیب نے رنگ اور قوم کی خصوصیات کو اتنا نمایاں کر دیا ہے کہ خود تہذیب معرض خطر میں ہے ۔ اس خیال کو مدنظر رکھ کر ٹالسٹائے نے انسان کی تاریخ کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانی مسرت کا مفہوم تہذیب کی ترقی کے ساتھ ہر عہد میں بدلتا رہا ہے ۔ ایک زمانہ وہ تھا جبکہ انسان کی فطرت میں خود غرضی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس انفرادی خود غرضی میں اس کو ایک مسرت حاصل ہوتی تھی ۔ اپنی ہی خواہشات کو پورا کرنا اسکی زندگی کا مقصد تھا ۔ اس کا زاویۂ نگاہ تنگ تھا اور اس کی فطرت ارتقا کے ابتدائی منازل طے کر رہی تھی ۔ زمانہ بدلا تہذیب نے ترقی کی اور انسان اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کو اپنے خاندان، ملک و قوم پر بخوشی قربان کرنے لگا ۔ تیسری اور آخری منزل پر ابھی ہم نہیں پہنچے اس درجہ پر انفرادیت عوام الناس کی محبت میں فنا ہو جاتی ہے یہ محبت ملک، قوم اور مذہب کی قیود سے آزاد ہے یہ محبت معصوم اور ملکوتی رنگ لئے ہوتی ہے ۔ اس لئے ٹالسٹائے انفرادیت کی شکست کو خدا کی بادشاہت قرار دیتا ہے ۔ اور خدا کی بادشاہت کے پانے کے لئے ٹالسٹائے اپنی خودی کو عوام الناس کی زندگی میں گم کر دینا چاہتا ہے ۔ مجھ میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں حقیقی معنوں میں زندہ رہوں اور زندگی کے اصلی مفہوم کو سمجھوں لیکن اس کی تلاش ایسے لوگوں کی زندگی میں نہیں کرنا چاہیے جو زندگی سے تنگ آ کر خودکشی پر آمادہ ہوں اس کا پتہ ان سادہ کسانوں کی زندگی میں ملے گا جو خود زندہ رہتے ہیں اور ہماری زندگی کا بھی بار اٹھاتے ہیں میں نے ایسے لاکھوں غریب آدمیوں کو دیکھا ہے جو زندہ رہ چکے ہیں اور زندہ ہیں ۔ ٹالسٹائے نے زندگی کے قوانین کی بنیادیں ان سادہ انسانوں کے طریقۂ زندگی پر رکھی ہیں اور اس نے ہر اس چیز کو زندگی سے جدا کرنے کی کوشش کی ہے جو انسانوں میں تفریق پیدا کرتی ہے اور چونکہ مغربی تہذیب نے خصوصیت اور رنگ کے زہریلے اثرات کی اشاعت میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے اس لئے ٹالسٹائے اس کو مجرم قرار دیتا ہے اس کی نگاہ میں وہ تہذیب ہی

ہی نہیں جو مساوات کا خون کرنے پر تلی ہو۔ اس طرح ٹالسٹائے کا پیغام گاندھی کی طرح "پتھر کی طرف واپسی ہے۔"

"وہ ہمارے عہد کی غلامی" میں لکھتا ہے "تفریحی باغات، برقی روشنی، نمائش اور تھیٹر اچھی چیزیں ہیں۔ سگاروں، دیا سلائیوں، قیمتی باروں اور موٹروں میں بھی کوئی برائی نہیں لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ ان چیزوں کے تیار کرنے کے لئے ۹۹ فی صدی کی جانیں کارخانوں کی گرد آلود فضا میں تباہ ہو رہی ہیں اور لاکھوں مزدور غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تو میں ان چیزوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا اگر لندن اور پیٹرس برگ میں برقی روشنی کا اہتمام کرنے کے لئے نمائش گاہیں تعمیر کرنے کے لئے اور خوبصورت روغن تیار کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ چند انسانوں کی بھی زندگی کم یا تباہ ہو (اور اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ ایسا ہو رہا ہے) تو لندن اور پیٹرس برگ میں کیسی چراغ ہی جلنے دو ان عجیب نمائشوں اور دلکش روغنوں کو فراموش کر دو لیکن خدا کے لئے انسانوں کو غلام بنا کر انکی زندگی کو کارخانوں میں تباہ مت کرو۔"

اس طرح ٹالسٹائے کسانوں اور مزدوروں کو غلامی سے بچانے کے لئے ان آرام و آسائش کو بھی قربان کر دینا چاہتا تھا جو سائنس کی ایجادات کا نتیجہ ہیں۔ لیکن سائنس کی تخریبی ایجادات اور نمائشی تہذیب کی موشگافیوں پر ہی یورپ کی عظمت کی بنیادیں رکھی ہوئی ہیں۔ اور انھیں کے زور پر یورپ حکومت کر رہا ہے۔ لہذا ٹالسٹائے یورپ کی مملکت کے خلاف صدائے احتجاج اس لئے بلند کرتا ہے کہ اس نے عوام الناس کو غلام بنا رکھا ہے اور تمام طاقت و حکومت سرمایہ داروں کے ایک حلقہ تک محدود ہے ایک طرف تو اپنے سیاسی اقتدار کی وجہ سے وہ عوام الناس کو ابھرنے نہیں دیتے اور دوسری طرف دنیا کے تمام تجارتی بازار ان کے ہاتھ میں ہیں جس کی وجہ سے انھوں نے مزدوروں اور کسانوں کو معاشی غلام بنا رکھا ہے۔ ٹالسٹائے نے حکومت کو "تلغراتی چنگیز خاں" کا مضحکہ خیز نام دیا ہے یعنے ایسا چنگیز خاں جس نے اپنے ظلم و تشدد کے دائرہ اثر کو وسیع اور مستحکم کرنے کے لئے سائنس کی ایجادات کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔

وہ اپنی کتاب (KINGDOM OF GOD IS WITHIN YOU. خدا کی بادشاہت تمہارے دل میں ہے) میں لکھتا ہے موجودہ حکومت اور حکمراں طبقہ میں انصاف نام کو

بھی نہیں۔ سائنس کی ترقی کی بنا پر انھوں نے ملک کو تشدد کے ایک ایسے زبردست دائرے میں مقید کر دیا ہے جس سے کسی شخص کا باہر نکلنا ناممکن ہے۔"

لیکن حکومت کے خلاف تشدد آمیز کارروائیوں کا وہ قایل نہیں، اس کا خیال ہے کہ جب لوگ ترک موالات کی حقیقت کو سمجھ جائینگے تو وہ خود بخود حکومت کی مدد روپیہ اور سپاہیوں سے کرنا بند کر دیں گے۔ جب ملک کے افراد کی ایک بڑی تعداد اس اصول پر کاربند ہو جائے گی تو حکومت کا یہ طلسم ٹوٹ جائے گا۔ غلامی سے آزادی کا صرف یہی ایک طریقہ ہے اس بیان سے ٹالسٹائے کے ترک موالات کے نظریہ کی نشو و نما بخوبی ظاہر ہے۔

سرمایہ دارانہ سوسائٹی کے متعلق وہ واٹ ٹو ڈو (WHAT TO DO) میں لکھتا ہے آرام و خوشی حاصل کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ جدید پیچیدہ ذرایع اور طبی امداد نہیں بلکہ جسمانی آرام اور روحانی اطمینان کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ سادہ زندگی بسر کرنا اور اپنی روزی خود کمانا ہے، جو دنیا میں کام نہیں کرتے ان کو کھانے کا کوئی حق حاصل نہیں، ان کو اتنا کام کرنا چاہیئے جتنا کہ وہ کھاتے ہیں"۔ ٹالسٹائے کی نکتہ چیں طبیعت اس بات کو بھی گوارا نہیں کرتی کہ نوکروں سے عدم مساوات کا سلوک کیا جائے۔ سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں میں جو صفائی کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے اس کا ذکر کرتے ہوے لکھتا ہے "آج صفائی کا مفہوم صرف دن میں ایک مرتبہ قمیص تبدیل کرنا ہے کل دو دفعہ تبدیل کرنا ہوگا۔ آج نوکر کے ہاتھ صاف ہونے چاہیں دوسرے دن اس کو دستانہ پہننا ضروری ہے اور اپنے ہاتھوں سے خط نقرئی تھالی میں رکھ کر پیش کرنا چاہیے اس صفائی کی کوئی حد و انتہا نہیں، اس کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ انسانوں میں باہم تفریق پیدا کی جائے۔ صفائی وہ صفائی نہیں جس کا انحصار دوسرے کے کام پر ہو۔ ٹالسٹائے ان رہبران قوم و ملک میں سے نہ تھا جو خود آرام و عیش کی زندگی بسر کرکے دوسروں کو تکلیف اٹھانے کی تعلیم دیتے ہیں، جن اصولوں کو اس نے دنیا کے سامنے پیش کیا ان کی سچائی کو اس نے خود کاربند ہو کر ثابت کر دکھایا۔ وہ امیر خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں شہزادی تھی لیکن اس نے اپنے اصولوں کے مقابلہ میں تمام عیش و آرام کو خیرباد کہہ دیا۔ جون ۱۸۸۱ء میں وہ خانقاہ (OPTIN) کی زیارت کے لئے

اس شان سے پا پیادہ گیا کہ اس کا جوتا دیہات کی دوکان کا بنا ہوا تھا اور اس کا لباس روسی کسان کا تھا اس کے پڑھنے کے کمرے میں آلات کاشت رکھے رہتے تھے وہ کاشت کرتا اور ہل چلاتا تھا انیا سیاون (ANNA SEUVON) جو ٹالسٹائے کے بچوں کی نگہداشت کے لئے ملازم تھی کہتی ہے کہ ۱۸۸۳ء میں ٹالسٹائے نے جوتے بنانا شروع کردئے اور وہ شخص جس نے ہمیشہ ریشمی موزے پہنے اب معمولی کسانوں کی طرح اپنی پنڈلیوں پر پٹیاں باندھنے لگا" یہ تمام باتیں دنیا میں مشہور ہو چکی ہیں آخری عمر میں ٹالسٹائے اور اس کی بیوی (SOUYA) کے تعلقات تلخ ہو گئے۔ ٹالسٹائے کی دلی خواہش یہ تھی کہ اپنی تمام جائداد غریب کسانوں میں تقسیم کردے۔ اور اس کی بیوی و بچے غریب کسانوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ لیکن (SOUYA) اس پر رضامند نہیں ہوی۔ ٹالسٹاے اپنے ۱۲ جولائی ۱۹۰۹ء کے روزنامچہ میں لکھتا ہے "میری خواہش یہ ہے کہ میں گھر سے چلا جاؤں میری موجودگی سے کسی کو بھی فائدہ نہیں اے میرے خدا مجھ کو سچائی کا راستہ دکھا میری تمنا صرف یہی ہے کہ میں تیرے احکام کو بجا لاؤں، میں لکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کیا یہ درست ہے؟ میں اپنے آپ کو دھوکا تو نہیں دے رہا ہوں۔ میری مدد کر۔ میری مدد کر۔ میری مدد کر" اس واقعہ کے پندرہ مہینے بعد ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو آٹھویں صدی کا سب سے بڑا ادیب کسان کے لباس میں اپنے گھر کو خیرباد کہہ دیتا ہے صرف اس لئے کہ وہ غریب کسانوں کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتا ہے جو اس کو گھر پر میسر نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ اسی سفر کے دوران میں ٹالسٹائے کا انتقال ایک معمولی ریلوے اسٹیشن اسٹاپورو (ASTAPORO) پر ہو گیا۔

نوحۂ غم

از جناب ابو الافتخار سید عبد الغفار صاحب فخر مدرس مدرسہ فوقانیہ چار محل

بیقراری سکوں برباد کیوں ہی جوش پر — کیوں ہجوم نوحۂ غم ہے لب خاموش پر
آہ کیوں تھمتا نہیں یہ گریۂ بے اختیار — آہ کیوں یہ ٹوٹنے پاتا نہیں اشکوں کا تار
کیوں عروس شب کے تن پر ہی لباس ماتمی — چادر ظلمت میں ہی سراپا کیوں لپٹی ہوئی
ٹھنڈی سانسیں بھر رہی ہی آج کیوں باد سحر — چاک داماں صحن گلشن میں ہیں کیوں گلہائے تر
دلربا شیریں ادا دریا ہی کیوں طوفاں بدوش — کیوں ہیں موجیں مضطرب ساحل ہی کیوں محو خروش
خاک کیوں سر پر اڑاتے ہیں بگولے دمبدم — آندھیاں چل چل کے پیہم کیوں یہ ڈھاتی ہیں ستم
کیا ہوی وہ دلفریبی فضائے کہسار — کیا ہوی وہ دلکشی نغمہ ہائے آبشار
کیا ہوی وہ دیدہ زیبی بہار سبزہ زار — کیا ہوی وہ جانفزائی نسیم خوشگوار
صورت ماتم کدہ ہی کیوں یہ صحن گلستاں — نغمہ سنجان چمن ہیں آہ کیوں صرف فغاں

آج بے رونق ہی کیوں نکھرا ہوا رنگ چمن
شام غربت سے ہی بدتر آج کیوں صبح وطن

وجہ ماتم پوچھتے کیا ہو بتائیں کیا تمھیں — قصہ بربادی قسمت سنائیں کیا تمھیں
تار برقی نے کیا ہشیار ہم تھے بے خبر — گوش شنوا میں یہ پہنچا دی خبر وحشت اثر
شاعر شیریں بیاں یعنی سلیم باصفا — کہہ گیا لبیک داعی اجل کو حسرتا

آہ اک انسان کامل دور ہم سے ہو گیا
گوہر نایاب ہاتھوں سے ہمارے کھو گیا

آہ اے روشن دماغ اے کاشف راز نہاں — آہ اے شمع ادب اے شاعر رنگیں بیاں

تیرے اوصافِ حمیدہ کب ہیں محتاجِ بیاں — تیری علمی خدمتوں سے خوب واقف ہے جہاں
اف تری وہ قابلیت وہ ترا فضل و کمال — اف وہ مضموں آفرینی اور وہ پروازِ خیال
اف وہ تیری جدتِ فکرِ رسائے ذہنِ تیز — اف وہ تیرا فطرتی جوشِ طبیعت حشر خیز
بھر دیا رنگیں خیالی نے تری اردو میں رنگ — کھو دیا آئینۂ الفاظ سے جدت نے زنگ
پُر اثر پُر سوز تو اردو ادب کا ساز تھا — تیری ہستی پر بجا اردو زباں کو ناز تھا

وہ فروزاں تھا توجہ سے تری اردو ادب
شمعِ بزمِ عالمِ اردو تجھے کہتے تھے سب

طبعِ جدت آشنا سے تو نے اے فردِ فرید — کیا نہ کی تکمیلِ وضعِ اصطلاحاتِ جدید
کیا نہیں ہے یہ ترا اردو پہ احسانِ عظیم — وادیٔ پُر خار ہے اب رشکِ باغِ نعیم
شاعرانِ باسلف نے شانِ اردو کی رفیع — تو نے زورِ علم سے میداں کیا اس کا وسیع
بے کدورت قلب تیرا علم کا آئینہ تھا — سینۂ بے کینہ معلومات کا گنجینہ تھا
غدر کا دیکھا طفولیت میں تو نے انقلاب — گزرا علمی صحبتوں میں تیرا ہنگامِ شباب
ہم رکابِ مصلحِ قومِ مسلماں تو رہا — ہمنشینِ مایۂ نازِ سخنداں تو رہا

طالبِ علمانہ تو نے اپنی کاٹی زندگی
جستجوئے علم ہی میں تو نے اپنی جان دی

آہ اے آزادِ غم اے بے نیازِ زندگی — آہ اے آسودۂ آغوشِ خاکِ نیستی
تشنۂ فریاد لب، نالہ کناں دل چشم نم — درد انگیز آہ تیرا نوحہ کیا ہو گا رقم

مو بر آوردہ زبانِ کلکِ شعلہ خیز ہے
قاصر از مضموں طرازی طبعِ گوہر ریز ہے

بادِ دکن

مجلہ مکتبہ کی ششماہی جلد کے ساتھ شیر محمد خاں ایمان کے سلسلۂ کلام کو بھی ختم کرا دیا گیا۔ ایمان کے کلیات میں ابھی بڑی گنجائش ہے کم از کم فرصت کے وقت ان کی شاعری پر ایک اختتامی مضمون لکھنے کی ضرورت ہو گی۔ مجلہ مکتبہ کی دوسری جلد کے ساتھ ایک دوسرے شاعر لچھمی نراین شفیق (و صاحب) اورنگ آبادی کے کلام کے نمونے شروع کیے جاتے ہیں۔ صاحب اپنی ایک تالیف "چمنستان شعرا" کی وجہ سے مشہور ہیں۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) اس تذکرہ کو چھاپ رہی ہے رسالہ اردو (جولائی سنہ ۱۹۲۷ء و جنوری سنہ ۱۹۲۸ء) میں ان کے کلام کے نمونے آ چکے ہیں اور رسالہ تجلی حیدر آباد (جنوری سنہ ۱۹۲۸ء) میں بھی صاحب کی مثنوی "تصویر جاناں" پر میرا ایک مضمون چھپ چکا ہے۔ اس میں ان کی تصانیف اور حالات سے روشناس کرانے کی ایک حد تک کوشش کی گئی تھی۔ اب جو کلام کے نمونے پیش کیے جائیں گے ان کے کلیات سے منقول ہوں گے۔ یہ کلیات ایک عنایت فرما نے عنایت کیا ہے۔ کلیات کے سرسری مطالعہ سے میری اگلی معلومات میں ایک گونہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اس میں صاحب نے خود اپنی "سوانح عمری" منظوم لکھی ہے اگرچہ کہ یہ سوانح عمری ناقص سی معلوم ہوتی ہے تاہم موجودہ معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ پہلے کلیات ہی کے معلومات کے اقتباسات دیے جائیں گے تفصیل کے لیے "رسالہ تجلی" دیکھنے کی زحمت گوارا کیجیے۔

(منظوم سوانح عمری)

. . . .

حسبِ نامِ خدا سے اب بجا ساز ، ایجاد کی داستاں ہے آغاز
سال ہجری کا تھا بڑا ٹھاٹھ — گیارہ سو پر پچاس اور آٹھ
تاریخ صفر کی دوسری تھی — یک شنبہ کے شام کی گھڑی تھی

. . . .

میزان کے بیچ مشتری تھی — برج ہفتم کو بہتری تھی

تب حق نے کیا کرم سے ایجاد — مولد ہے مرا خجستہ بنیاد
دیکھنے بخت اور ستارا ان — سب نے کہے لچھمی نراین
جب عمر کے چار برس بیتے — مکتب مجھے بھیجنے کو چلتے
استاد و ادیب نیک اطوار — عبدالقادر حشمت آثار
تعلیم پہ میری ہو کے مامور — بہبود رکھے تھے میری منظور
ازبس کہ تھی مجھ کو طبع موزوں — رہتا تھا مجھے تلاش مضموں
نو سالگی میں جب عمر آئی — فکر اشعار دل پہ چھائی

جس دم میں لیا عیار دانش   منظوم کیا بہار دانش
اس کا جب منتخب کیا میں   نام و اشعار لکھ لیا میں
اُستاد سے لے سبق کو ہر روز   موزوں کرتا تھا سخت جاں سوز
"اشعار چمنستان" رکھا نام   جب سال دگر کیا میں اتمام
اس طور سے دس ہزار اشعار   دہ سالگی میں ہوئے نمودار
پھر میں نے لکھا نسیم نامہ   سیراب ہو جس سے روح خامہ
نثر رنگیں میں کئی حکایات   تحریر کیا میں شوق دل سات
رو آئینہ کا مناظرہ لکھ   زلف و رخ کا مکابرہ لکھ
جس وقت ہوا وہ نسخہ اتمام   "گلدستہ انجمن" رکھا نام
. . . .
پھر تذکرہ ریختہ لکھا میں   اس ذکر میں مدتیں رہا میں
لکھا "گل رعنا" تذکرہ کو   جتنے ہیں ہند میں جو کہ فارسی گو
. . . .
احوال جناب شاہ آزاد   خوش وقت لکھا میں ہو دل شاد
شعرا کا چمنستان رکھا نام   ہوئے سات ہزار بیت اتمام
نام اس کا جو "اسمر زواہر"
یہ نام تو حاوی عدد ہے   سال ہجری پہ جد و کد ہے
ہے پانچ ہزار بیت ظاہر

(نام، تخلص، وطن)

مرا لچھمی نراین نام ہے صاحب تخلص ہے   دکن کی سرزمیں میں مجھ سے سو اندکو رہے کیسو کا

(آزاد کی شاگردی)

کیوں نہ صاحب نام ہو عالم کی محفل میں ترا   ہوں غلام اب حضرت آزاد سے سلطان کا

(عالی جاہ کا توسل)

ارادہ تذکرہ کا ہو اگر صاحب ترے دل میں   مجھے اس میں غلام آزاد عالی جاہ کا لکھنا

عالی جاہ کے علاوہ ان کے چھوٹے بھائی میر جہانگیر علی خاں سلیمان جاہ سے بھی ربط معلوم ہوتا ہے۔

میں وہی بندۂ درگاہ سلیماں جاہ ہوں   تم نے ہر چند غلامی سے اب آزاد کیا

(آزاد کے بھتیجے میر اولاد محمد ذکا سے مراسم)

روٹھنا بندہ سے صاحب کا عبث ہے اے ذکا   حیف ہے آقا ہو ناخوش جاں فشاں نوکر کے ساتھ
تمہارا اے ذکا بندہ ہوا صاحب اگر دل سے   تکلف برطرف سرکار کا کیا اس میں نقصاں ہے
ذکا کے امر عالی سے تجاوز میں مجھے صاحب   مکرر اس سخن کا کر لیا ہے امتحاں تو نے
عقیدت ہے ذکا سے یہ مجھے ازبس کہ اے صاحب   مجھے وردِ زباں ہے رات دن یا پیر یا ہادی
اک آن جدائی نہ ہو صاحب سے ذکا کو   اللہ کرے میری جو نیت ہے بر آوے
صاحب تو بندگی سے ذکا کی نہ جائے گا   کیا فائدہ ہے اس کو مقید کرے ہے

کلیات میں تقریباً جملہ اصناف سخن نظر آتے ہیں۔ غزلیں عموماً پانچ پانچ شعر کی ہیں کہیں کہیں حسب ضرورت زیادہ بھی وہ خود کہتے ہیں سے

میں نے ابیات تامل سے کہا ہوں لیکن کم
حسب احوال کہا ہوں گا میں اشعار بہت

(لفظ گورنر کا استعمال)

ٹوپی کے پہننے سے لے کا فرتری سج اور ہے
تو گورنر ہے کلہ پوشوں کا یا ہے پاشاہ

جب ولی دلی میں پہنچے ہیں تو شکایت کی ہے کہ

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

شرف الدین علی خاں پیام بھی دلی کے دل لوٹنے والوں کا پیام پہنچاتے ہیں۔

دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے
کام عشاق کا تمام کیا

کوئی عاشق نظر نہیں آتا
ٹوپی والوں نے قتل عام کیا

اور مرزا علی لطف بھی ایک آوازہ کر دیتے ہیں۔

ہوا آوارہ ہندستاں سے لطف آگے خدا جانے
دکن کے سانولوں نے مارا یا انگلن کے گوروں نے

لیکن صاحب "از دست خویشتن فریاد" ہیں۔

بے وفا ہیں گرچہ سب جا خوب رو
لیکن ان میں حیدر آبادی خصوص

سودا کی تاریخ ایک عدد کے تخرجہ سے کیا خوب کہی ہے :۔ ع

"ہائے سودا جہاں سیں گذرے"

جب "صاحب کے آبا و اجداد پنجاب کے کھتری اور لاہور کے متوطن شہنشاہ عالمگیر نے" "جب دکن پر فوج کشی کی تو ان کے دادا لالہ بھوانی داس لشکر کے ساتھ آکر خجستہ بنیاد" "اورنگ آباد میں سکونت پذیر ہو گئے صاحب کے والد لالہ منارام اور صاحب" "کی ولادت اورنگ آباد میں ہوی منارام حضرت آصف جاہ اول کے پیش کار تھے" "لچھمی نراین کا اردو میں صاحب اور فارسی میں شفیق تخلص تھا نواب آصف جاہ ثانی کے" "فرزند دلبند میر احمد علی خاں عالیجاہ کے دامن دولت سے وابستہ تھے، مولانا میر غلام علی آزاد" "بلگرامی سے تلمذ تھا، بہار و آتش، گلدستۂ انجمن، چمنستان شعرا، اشعار چمنستان، نسب نامہ" "رو آئینہ، زلف و رخ، گل رعنا، جواہر زواہر کے علاوہ تمیسق شگرف، حقیقت ہائے ہندوستان" "ماثر آصفی، دیوان صاحب (یقین کے دیوان کا جواب) حالات حیدر آباد، بساط الغنائم"

۱۔ آب حیات صفحہ ۹۳ ۲۔ تذکرہ میر حسن صفحہ ۶۷ ۳۔ مقدمہ گلشن ہند صفحہ ۱۲

تنقیدیں

تندرستی

تقطیع ۷/۲×۵ - صفحات ۱۰۰ - مطبوعہ مطبع برقی (چارمکان) قیمت ۶ر - مصنف یا محمد علی احمد حسین تاجر کتب گلزار حوض (حیدرآباد دکن) سے مل سکتی ہے۔

یہ کتاب جناب واحد علی صاحب قادری صدر مدرس تحتانیہ قصبہ پیدہ پلی ضلع کریم نگر کی مولفہ ہے۔ مولف نے یہ کتاب طبی اصول کو پیش نظر رکھکر لکھی ہے۔ کتاب موضوع کے اعتبار سے مفید اور بلحاظ طرز بیان دلچسپ ہے۔ اردو میں کم عمر بچوں اور صنف لطیف کے پڑھنے کیلئے بہت کم مواد موجود ہے۔ اسلئے یہ کتاب قابل توجہ ہے۔ ضلع مذکور کی انجمن اساتذہ اس باب میں مبارکباد کے قابل ہے کہ اسنے اس مفید کتاب کو اپنے زیر سرپرستی شائع کرکے نہ صرف مولف کی محنت کو ٹھکانے لگایا بلکہ طبقۂ مدرسین میں تصنیف و تالیف کے مشغلہ کو جاری رکھنے کی تحریک پیدا کردی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ دیگر حلقوں کی انجمنیں بھی لائق مدرسین سے طلبہ کے استفادہ کیلئے مفید و پر از معلومات کتب لکھوانے کی کوشش کرکے عملی نمونہ پیش کرینگی۔

حمایت المصلین

تقطیع ۷/۲×۵ - صفحات ۵۰ - مطبوعہ مطبع برقی - قیمت کا اندراج نہیں ہے۔

یہ کتاب بھی جناب واحد علی صاحب کی مرتبہ اور انجمن مذکور کی علمی دلچسپیوں کا نتیجہ ہے۔ مرتب نے اس کتاب میں معرفت خدا کا بیان، نماز، تشہد، اذکار اوراد عیہ کے علاوہ، پانچوں کلموں اور صفت، بیان مجمل و مفصل وغیرہ کو ان کے اردو ترجمہ کے ساتھ درج کیا ہے۔ مرتب صاحب نے جہاں طلبہ کی خاطر اتنی محنت و جانکاہی کرکے اس کتاب کو لکھا ہے اگر اس کے ساتھ ساتھ سلاست بھی ان کے پیش نظر ہوتی تو شاید کتاب کو مفید سے مفید تر بنانے میں انہیں کا حصہ ہوتا۔

حمایت العقائد

تقطیع ۷/۲×۵ انچ - صفحات ۶۵ - مطبوعہ مطبع برقی - قیمت درج نہیں ہے۔

یہ منظوم رسالہ بھی جو دراصل احسن المسائل اور کیمیائے سعادت وغیرہ سے ماخوذ و منتخب ہے واحد علی صاحب کی جدت طبع کا نتیجہ ہے جس طرح مولانا محمد شجاع الدین قادری علیہ الرحمہ کا رسالہ "کشف الخلاصہ" تیرہویں صدی ہجری کے وسط میں بلحاظ اپنی جامعیت کے مقبولیت حاصل کرچکا ہے اسی طرح لائق مولف نے بھی اس مختصر سے رسالہ میں شرعی مسائل کو حصر و نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ رسالہ بلحاظ زبان و بیان، قدیم اسالیب کا حامل مگر مفید اور قدر کے قابل ہے۔

جیون چرتر

تقطیع ۸×۲/۱ ۵ - صفحات ۸۰ - مطبوعہ مطبع تاج حیدرآباد دکن - یہ تصنیف

اور مصور کتاب راۓ تیجراۓ سرگبا شسی کی سوانحعمری ہے۔ جنکی تصویر گذشتہ نمبر میں شائع ہوئی تھی۔ اسکے مرتب راۓ صاحب کے نوجوان نواسہ مسٹر وی گر وداس متعلم بی۔ اے (عثمانیہ) ہیں۔ کتاب کی ابتدا میں راۓ صاحب اعلی کے بلاک کی تصویر ہے۔ راۓ ہری لعل صاحب ایم۔اے نے تعارف لکھا ہے۔

مسلمانوں کی سلطنت ہند کے دور میں فارسی زبان کا رواج تھا۔ اور اس زبان میں جس طرح کالیستھ قوم کے افراد نے کمال پیدا کیا اسیطرح چھتری بھی اس میں پیش پیش تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی زبان کے ہندی دور میں ان اقوام نے اسکی ویسی ہی خدمت کی جیسی ایرانیوں نے عربی کی کی تھی۔ اس باہمی ارتباط اور تعاون کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اکثر ہندو بزرگ بھی اعلیٰ ترین سرکاری خدمات پر فائز کیے جاتے تھے۔ راجہ مان سنگھ راجہ ٹوڈرمل۔ راجہ چندو لعل اور خود راۓ تیجراۓ کی مثالیں سرسری طور پر پیش ہوجاتی ہیں۔

راۓ گروداس صاحب نے کتاب کے مواد کی ترتیب میں سلیقہ سے کام لیا ہے۔ خاندان، ملازمت، قومی خدمات، علمی خدمات اور تمام ضروری امور پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کو ختم کرنے کے بعد پائیگاہ کے میر مجلس اور "صحیفۂ آسمانجاہی" کے مصنف کی زندگی اور اہمیت کا خاکہ ذہن نشین ہوجاتا ہے۔ یہ سوانح نگاری کی خوبی ہے حال کا سوانح نگار درحقیقت آیندہ مورخ کیلئے سواد فراہم کرنیوالا ہوتا ہے "بعیون چیز تر" بھی چھتری قوم کی تاریخ میں ایک کڑی کا اضافہ ہے۔ قوم کے باعظمت بزرگوں کی سوانحعمریاں، نہ صرف قوم کے کردار کو درست کرنے میں کام آتی ہیں۔ بلکہ ان کے ذریعہ مستقبل بعید پر حکومت کیجا سکتی ہے۔

ہونہار مولف کا اپنے بزرگوں کے ساتھ یہ جذبہ احترام نہایت قابل تعریف اور سبق آموز ہے امید ہے کہ وہ اپنی علمی کوششوں کو اسی طرح جاری رکھینگے۔

عروج عثمانی

تقطیع ۲۲×۲۸-انچہ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی حیدرآباد دکن قیمت بلا فریم ۸ سے مع فریم للعہ

حضرت سلطان العلوم کے دور مسعود میں حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں جو تمدنی ترقیاں ہوئیں ان کے اجمال کا ایک نقشہ چارٹ کی صورت میں تیار کیا گیا ہے۔ نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم اے بیرسٹرایٹ لا مشہرا مورعامہ اسکے محرک اور مولوی محمد سلطان الدین خانصاحب اس کے مرتب ہیں۔ تمام مواد کو "ملک پرائز یکیوٹیو کونسل کی حکومت" اور "ملکی آمدنی کا ملک پر خرچ" کے دو اہم عنوانات پر تقسیم کیا ہے۔ اور تقریباً سلطنت کے تمام ضروری شعبوں میں جو ترقیاں ہوئی ہیں انکا اجمالی ذکر کیا ہے۔ بیچ میں حضرت اقدس اعلیٰ کی شبیہ مبارک ہے۔ مولوی سلطان الدینخان صاحب کی یہ جدت طرازانہ سعی قابل تحسین ہے۔ اور یہ چارٹ ہر گھر اور ہر ادارہ بلکہ ہر دفتر و ہر مدرسہ میں آویزاں کیے جانے کے قابل ہے۔ تاکہ ہر چھوٹا بڑا ملک کے متعلق ضروری معلومات سے ہر وقت آگاہ ہوتا رہے۔

"م" اور "س"

فہرست مضامین مجلہ مکتبہ

(جلد اوّل)

بہترین افسانے

پریم پچیسی ہر دو حصص از منشی پریم چند ۲/- ۱۲/
پریم بتیسی " " ۱/۸ ۱/
بازارِ حُسن " " ۲/- ۱۲/
خاکِ پروانہ " " ۱/۴ ۴/
خواب و خیال " " از احمد شجاع ۱/۴ ۱۲/
چمپا اور دیگر افسانے ۱/۴ ۹/
جلال الدین خوارزم شاہ .. از سجاد حیدر ... ۱/۲ ۳/
خیالستان .... // ... ۱/۴ ۱۴/
احتساسات .... // ۱/۴ ۹/
زرین افسانے .... // ۱/۴ ۹/
ہیبت ناک افسانے از امتیاز علی تاج ۱/۴ ۱۴/
الہامی افسانے از مرتضیٰ احمد خاں ۱/۴ ۴/
سیرِ گل از جلیل احمد قدوائی ۱/۴ ۹/
پس پردہ از آغا حیدر حسن ۱/۴ ۹/
صبحِ وطن از منشی سدرشن ۱/۴ ۴/
سدا بہار پھول " " ۱۵/
چندن " " ۱/۴ ۱۴/
بہارستان " " ۱/۴ ۱۳/
افسانہ جوش از جوش ۱/۴ ۴/
حفیظ کے افسانے از حفیظ ۱/۴ ۴/
طوفانِ زندگی از وحشی ۸/ تصویرِ معاشرت از وحشی ۱/۴ -
زندگی کی صبح و شام از وحشی ۱/۴ - درسِ عبرت " ۱/۴ ۴/
عروجِ زندگی از وحشی ۱/۴ - رہبرِ زندگی از وحشی ۱/۴ ۴/

تازہ رسائل

نیرنگِ خیال ۵/ کلدار معادل ۵/۱۰ عثمانیہ
نگار ۸/ کلدار " ۹/۴ " "
مخزن ۶/ کلدار " ۷/ " "
نظام گزٹ ہفتہ وار .... ۳/۶ //
عالمگیر ۵/ کلدار معادل ۵/۱۰ عثمانیہ
معارف ۸/ کلدار " ۹/۴ "
مجلہ مکتبہ .... ۶/ "
رعیت ہفتہ وار .... ۲/ "
عصمت ۷/ کلدار معادل ۸/۲ عثمانیہ
ہمایوں ۸/ کلدار " ۹/۴ "
مخزن سہ ماہی .... ۱۲/ "
عالمگیر خاص نمبر ۱/۴ کلدار معادل ۱/۴ عثمانیہ
سفینہ سہ ماہی (مدراس) .... ۱/۴ "
نیرنگِ خیال عید نمبر ۱/۴ کلدار معادل ۱/۴ "
زمانہ .... ۸/ " " ۹/۴ "
مجلہ عثمانیہ سہ ماہی .... ۱/۴ "
عصمت کا جوبلی نمبر ۱/ کلدار معادل ۱/۸ عثمانیہ
تازیانہ ہفتہ وار ۱/ " " ۱/۳ "
طاقت ... ۲/ " " ۲/۶ "
زبان خاص نمبر ۱/۴ کلدار .... ۱/۴ "
نیرنگ نثر نمبر ۱/۴ کلدار .... ۱/۴ "

ملنے کا پتہ
مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

افتخار الحکما نواب حاذق جنگ مرحوم سابق افسر الاطبا فرماتے ہیں

میں نہایت مسرت اور بڑی خوشی کے ساتھ محض بیماروں کی شفا کی غرض سے چند سطور سپرد قلم کرتا ہوں برص منتشر (یعنی کوڑھ اور سفید داغ) کا علاج نہایت مشکل ہے۔ یہ مرض عموماً بڑھتا ہی جاتا ہے حکیم مولوی محمد عبد القادر صاحب مددگار صدر مخزن الادویہ یونانی سرکار عالی و رکن دار التشخیص و انجمن الاطبا حیدرآباد دکن خصوصاً علاج برص میں ید طولیٰ رکھتے ہیں صاحب موصوف نے اکثر مریضان برص کا علاج بہت ہی کم مدت میں نہایت قابلیت سے کیا اور بہ فضلہ کامیاب ہوئے میں نے بچشم خود مریضان برص کا معائنہ کیا ہے بعد علاج جسم بالکل اصلی حالت پر ہو جاتا ہے حکیم صاحب موصوف کی بہترین قابلیت اور مجرب دوا کا اثر ہے میں حکیم صاحب موصوف کو ایسے کٹھن مرض کی دوا سے مجرب کی ایجاد پر مبارک باد دیتا ہوں اور پبلک سے زور کے ساتھ سفارش کرتا ہوں کہ وہ برص کے مریضوں کو حکیم صاحب موصوف کے پاس رجوع ہونے کی ہدایت کریں اور مریضان برص کو چاہیئے کہ وہ اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر حکیم صاحب موصوف سے علاج کرائیں اور اس مرض منحوس سے غافل نہ رہیں۔ وما علینا الا البلاغ شرحہ دستخط (افتخار الحکما حاذق جنگ)

پیٹال بام

بیرونی استعمال کی پر تاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے جو انسان کے اعصابی اور اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے اسکو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے کوئی گھر اور کوئی خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہیئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے علی الخصوص نقرس۔ وجع مفاصل۔ دمہ۔ درد سر۔ درد سول۔ بچھو کے زہر کے لئے اور زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال۔ تھوڑی دوا لے کر دن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھانپ دیں اور صاف کریں جو اصحاب بغرض امتحان دوا طلب فرمادیں۔ بہ خوشی تعمیل کیجائیگی۔ **نوٹ**۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت مہیا رہتا ہے اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کیئے جاتے ہیں۔ فقط **المشتہر**

مطبوعات مکتبہ

دکن میں اُردو - مولفہ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب منشی فاضل - جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی عادل شاہی و آصف جاہی دوران میں اردو نظم و نثر کی حالت و شعرائے اردو کا تذکرہ مع نمونہ کلام ضخامت ۴۸۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا بار دوم قیمت للعہ

خیابانِ اُردو - مرتبہ جناب محمد عارف صاحب حیدرآبادی ہندستان کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور نامی گرامی شعرائے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۲۴۵ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ للعہ

روحِ تنقید مصنفہ مولوی ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے - فن تنقید کے متعلق اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں ماضی و حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۲۵۵ سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ بار دوم قیمت عہ

تنقیدی مقالات مصنفہ زور صاحب - یہ روح تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روح تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی، فارسی اور اردو زبانوں کے مشہور اہل قلم کی قلمکاریوں پر تنقید کر کے اصولوں کا استعمال دکھلایا ہے اور نیز بعض مشہور اردو انشاپردازوں کے طرز تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کئے گئے ہیں ضخامت ۲۵۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی وغیرہ عمدہ مجلد سادہ ۱۲؍ للعہ

اُردو کے اسالیب بیان مصنفہ زور صاحب - نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت۔ ابتدا سے لیکر آجتک کے نثر نگاروں کے طرز تحریر و انداز بیان کا تذکرہ۔ خاص طرز تحریر کے اردو انشا پردازوں کے اسالیب بیان پر تبصرہ ضخامت ۴۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن - کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ عہ

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب مصنفہ زور صاحب سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی، ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۲۰ صفحے - کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ - سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲؍

دنیائے افسانہ مصنفہ مولوی محمد عبد القادر سروری ایم اے ایل ایل بی - افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نویسی کے اصول و معیار یہ اردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۲۱۸ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن - کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت عہ

مبادی فلسفہ مولفہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی، ڈاکٹر اے رسل راپورٹ پی - ایچ - ڈی کی پرائمر آف فلاسفی کا ملخص بامحاورہ اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے - سائز پاکٹ ایڈیشن - کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۴؍

اربابِ نثرِ اُردو - مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے - فورٹ ولیم کالج کے اردو اہل قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ - المسیو رحمدی عیسوی کی اردو نثر نگاری کی تاریخ ضخامت ۲۴۴ صفحے - سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عاں

آثار الکرام جلد اول مصنفہ شمس المورخین جناب حکیم سید شمس اللہ قادری ایم آر اے ایس - ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی محققانہ تاریخ ضخامت ۲۴۴ صفحے - سائز ۲۰×۲۶/۱۶ کاغذ چکنا - لکھائی چھپائی خاصی قیمت ۱۲؍

جواہر کلیات نظیر - منتخبہ جناب مولانا ذہین و سید مختار احمد نظیر اکبرآبادی کے کلیات سے اخلاقی - ادبی - نصیحت آموز ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۶۰ صفحے - سائز پاکٹ ایڈیشن - کاغذ چکنا لکھائی چھپائی خاصی قیمت عہ

عقائد امام - ترجمہ مولوی محمد عبد الغفور عابدی صاحب فقہ اکبر کا عام فہم اور بامحاورہ اردو ترجمہ - قیمت ۴؍

اسوۂ حسنہ مصنفہ مولوی محمد عبد اللہ مسعودی بی اے آنرس - بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۸؍

دکنی لغت مولفہ مولوی سید شعار احمد شعار ہاشمی - اردوئے قدیم یعنے دکھنیات کا لغت جس میں دکھنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے - سائز پاکٹ ایڈیشن - کاغذ چکنا - لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۸؍

شاہ رفیع الدین قندھاری مرتبہ مولوی محمد عبد الغفور صاحب عابدی - دکن کے ایک مشہور صاحبدل صوفی عالم کے دلچسپ حالات ضخامت ۸۴ صفحے - سائز پاکٹ ایڈیشن - کاغذ چکنا - لکھائی چھپائی قیمت ۵؍

خزینۂ اخلاق مصنفہ مولوی سید عبد العزیز صاحب عزیز اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ - ضخامت ۶۴ صفحے - سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۶؍

سیرت خیر البشر و سیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالے جس میں آنحضرت صلعم کے مکارم اخلاق بیان کیے گئے ہیں - قیمت ۱؍

نیک بی بی مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے - نیک خو بی بی کس طرح اپنے بدخو شوہر کو ٹھیک کر سکتی ہے - قیمت ۲؍

چھوٹا شیطان مصنفہ مولانا ذہین - منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ۱؍

ملنے کا پتہ - انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ روبروئے محکمۂ مالگزاری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام رام کشن لیتھوگرافر منیجر مطبع

مجلہ مکتبہ

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر
محمد عبدالقادر سروری
ایم۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی

مجلّۂ مکتبہ

۱- یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔
۲- یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔
۳- بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔
۴- قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عالہ) فی پرچہ ۶
۵- اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (عہ) نصف کے لئے (ے/) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ ½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے انکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلاقیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلاقیمت حاضر ہوگا۔ یکشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی۔ جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں منتظم مجلہ مکتبہ کے پاس بھیجدیں تاکہ انکے نام جاری کر دیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر۔ و مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلہ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

رجسٹرڈ نشان پٹہ سرکار آصفیہ (٦٥)

مجلّہ مکتبہ

رجسٹرڈ نشان پٹہ سرکار انگلشیہ (.......)

جلد (٢) بابتہ ماہ دی ١٣٣٨ف مطابق نومبر ١٩٢٨ء شمارہ (٢)

تصویر :- مولانا جمال الدین نوری مرحوم پروفیسر عربی نظام کالج

فہرست

*

شذرات

اِس ماہ میں اعلیٰحضرت سلطان العلوم خسرو دکن، دہلی کے نوتعمیر محل کو ملاحظہ فرمانے کی غرض سے شہزادگان بلند اقبال، شہزادیان ہمایون فال اور محلات عالیہ کے ساتھ ہندوستان کی اس قدیم ترین راجدھانی میں رونق افروز ہوئے تھے جو کبھی ہندو مہاراجاؤں اور کسی وقت مغل شہنشاہوں کی تخت گاہ اور ہر وقت مرکز سلطنت رہی۔ اعلیٰحضرت کی یہ روانگی خانگی تھی۔ لیکن اسکے باوجود شمالی ہند کے باشندوں خصوصاً دہلی اور اس کے نواح کے رہنے والوں نے، آپ کی ہر دلعزیزی سے متحرک ہو کر آپ کا غیر معمولی اور تاریخی خیر مقدم کیا۔ اخباروں اور رسالوں نے اپنی دلی ارادت اور عقیدت مندی کے اظہار کیلئے خاص نمبر شائع کئے۔ آپ کا قیام دہلی میں دو ہفتہ سے کچھ زیادہ نہیں تھا۔ اس دوران میں والیسرائے بہادر اور جن جن حضرات نے آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا، آپ کی غیر معمولی ذہانت اور استقلال کردار سے بے حد متاثر ہوئے۔

آپکی مراجعت کے موقع پر بلدہ میں نہایت وسیع اور مہتم بالشان پیمانہ پر خیر مقدم کا اہتمام کیا گیا تھا اعلیٰحضرت کی گزرگاہ اور دیگر مقامات پر تیس سے زیادہ عارضی کمانیں ہر قوم اور طبقہ کے جانب سے نصب کی گئی تھیں۔ ۱۹ ؍ دی ۱۳۴۳ ف کی شب میں روشنی بھی ایسی غیر معمولی کیگئی تھی کہ جسکی نظیر مشکل سے مل سکیگی۔ ۲۰ ؍ دی ۱۳۴۳ ف کی صبح کو رعایا کی جانب سے اعلیٰحضرت کی خدمت میں بالمشافہ اظہار عقیدت کرنے کے لئے، اڈریس پیش کیا گیا۔ اس کے جواب میں حضور نے زبان بلاغت ترجمان سے جو کچھ ارشاد فرمایا، وہ بادشاہوں کی نسلوں کے لئے ایک لائحہ عمل بننے کے قابل ہے۔

۱۵ ؍ امرداد ۱۳۴۴ ف کی اشاعت میں ہم نے پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللطیف بی۔ اے۔ پی۔ اچ۔ ڈی (لندن) کی انگریزی کتاب "غالب" (زندگی اور شاعری پر ریویو) کے زیر طبع ہونے کا ذکر کیا تھا بڑی مسرت کی بات ہے یہ اب منظر عام پر آچکی ہے اور ادبی حلقوں میں اسکو خاص اہمیت دی جارہی ہے ڈاکٹر بجنوری کے مقدمہ دیوان غالب کو پڑھنے کے بعد اس کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں اسکی قیمت تین روپیہ ہے اور منتظم مجلہ عثمانیہ، نظامت منزل نیز مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن سے مل سکتی ہے

کچھ دنوں پہلے جامعہ عثمانیہ کے ایک ہونہار فرزند ڈاکٹر سید حسین کے جامعہ لندن سے بامراد و خائز بلدہ ہونیکی خبر بڑی مسرت کیساتھ پڑھی گئی تھی۔ اب اس سلسلہ میں ڈاکٹر ولی الدین ام، اے، پی، اچ، ڈی، بیرسٹرایٹ لا کی جامعہ لندن ہی سے کامیاب و اپسی قابل مبارکباد ہے ڈاکٹر ولی الدین نے جامعہ عثمانیہ کے پہلے امتحان انتہا شعبہ فلسفہ میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی، اور پھر ڈھاکہ یونیورسٹی سے ام، اے کیا تھا۔ انگلستان میں جامعہ لندن سے دو سال کے عرصہ میں آپ نے فلسفہ کی ڈگری لی اور اسکے ساتھ ہی ساتھ قانون میں بیرسٹر بھی ہو گئے ہیں امید ہے کہ یہ تمام نونہالان ملک، اپنی مادر علمی جامعہ عثمانیہ، جسکی آغوش محبت میں انھوں نے تربیت پائی [illegible]

حالی اور جدید شاعری

از جناب احمد عبد اللہ صاحب المسدوسی، بی۔ اے

(✻)

(حالی کی شاعری سے مراد ذہن نشین رہے کہ ان کی شاعری کا آخری اور انقلابی دور ہے، ابتدائی دور جس کو عاشقانہ شاعری کہنا چاہیئے۔ ہمیشہ ان کی شاعری کی عظمت کے ایوان سے باہر سمجھا گیا ہے) حالی کبھی بھی ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے مشہور نہیں ہوئے اگرچہ ان میں صنف شاعری کا پایہ اس قدر بلند ہے کہ بے کھٹکے ان کو اُردو کے عام مسلم الثبوت اُستادوں کے پہلو میں لیجا کر کھڑا کیا جا سکتا ہے، ان کی لوچدار اور میر کی سی سلیس زبان، طرزِ ادا کا بانکپن اور قادر الکلامی جن کے ثبوت میں اشعار کے پیش کرنے کا یہ موقع نہیں، یہ ایسی خصوصیات ہیں جو اُن کو اُردو کے بہت سارے اساتذہ غزل سے بھی برتر ثابت کر سکتی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ کبھی بھی تغزل میں میر و غالب پر تفوق نہیں حاصل کر سکتے اور اس کے بغیر اُن کی شاعری کا چلنا معلوم۔ ان کے نام کا جس چیز نے ڈنکا بجایا اور جس کے سبب آج ان کا نام ہندوستان میں بچہ بچہ کی زبان پر ہے وہ اُن کی شاعری کا آخری دور ہے اور اسی آخری دور کی کامیابی نے ایک بڑی حد تک اُن کی ابتدائی دور کی شاعری کے محاسن اور خوبیوں پر پردہ ڈال دیا۔ اور کبھی بھی اُن کو ایک اعلیٰ درجہ کے غزل گو شاعر کی حیثیت سے کامیاب ہونے نہ دیا۔ حالانکہ یہی دور فن اور شاعری کی حیثیت سے غور کیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ نہایت اہم اور اصلی دور ہے۔ ان کی انقلابی دور کی شاعری کا آغاز انہیں کے الفاظ میں اس وقت ہُوا "جب آفتابِ شاعری نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہُوا" اس لئے لازمی طور پر اس میں وہ جوش و خروش، امنگ اور زندہ دلی نہیں پائی جاتی جو عہد شباب کی اُمنگوں کا کرشمہ ہوتی اور زیادہ تر کسی جدید تحریک کی کامیابی کی ضامن ہو سکتی ہے۔

(اس کے علاوہ جس جدید شاعری کے کوچہ میں اُنھوں نے قدم رکھا ہے اُس کے راہ و رسم سے بخوبی واقف نہ ہونے کے باعث وہ جگہ جگہ پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ ابتدا سے جس طرزِ بیان کے وہ عادی ہو گئے تھے وہی طرزِ بیان ہر جگہ اپنی جھلکیاں دکھلاتا ہے، قومی شاعری، نیچرل شاعری اور عاشقانہ شاعری وہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں۔)

دوسرے ان کا آخری رنگ فطری نہیں مجبوری اور مصنوعی ہے۔ ضروریات زمانہ سے مجبور ہو کر بہ تکلف چونکہ انہوں نے اس قسم کی شاعری شروع کی تھی اس لئے اس میں جگہ جگہ پر پھیکا پن پیدا ہو گیا ہے اور آورد معلوم ہونے لگتی ہے۔

تیسرے جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا ہے اُن کی چالیس سالہ زندگی کے بعد خیالات نے پلٹا کھایا اور نیا رنگ بدلا ہے اس لئے ہمیشہ ان کے نئے اور پرانے خیالات میں ایک قسم کی کشمکش نظر آتی ہے وہ ضروریاتِ زمانہ اور بعض اصلاحی خیالات سے مجبور ہو کر نہ کہ اپنی افتادِ طبیعت کی بنا پر ایک خاص اور جدید رنگ کی شاعری کی طرح ڈالتے اور اس پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں، پیرانہ سالی اور ضعف کے سبب پہلے تو قدموں میں وہ تیزی نہیں کہ لیلیٔ جدید (شاعری) کے شوق محمل میں تیز گامی دکھلائیں، دوم وہ ان کا "قدیم شاہد رعنائے سخن" ان کا دامنگیر ہوتا ہے۔ ایک طرف سے سالہا سال کی مشق غزل انہیں روکتی ہے تو دوسری طرف سے نئی شاعری کا لپکا انہیں کھینچتا ہے۔ کعبہ ان کے پیچھے ہے تو **کلیسا** ان کے آگے ہے۔ اس عالم میں ان کی آخری شاعری کا آغاز و انجام ہوتا ہے۔

چوتھے اپنے دنیوی رہنما سرسید علیہ الرحمہ کی طرح جنھوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام پر **یورپ** کے عائد کردہ الزامات کا جواب دینے کی کوشش میں بغیر اس امر کا اندازہ کئے کہ وہ اس اہم کام کے قابل بھی ہیں یا نہیں نادانستہ چند در چند غلطیاں کی ہیں وہ بھی اُردو شاعری سے "چند محدود، فرسودہ اور غیر شائستہ الفاظ کے مجموعہ" ہونے کا الزام دُور کرنے کے خیال سے جدید طبقہ کی تمام مطلوبہ اصناف پر شاعری کرتے ہیں۔ نیچرل شاعری کا گلدستہ وہ سجاتے ہیں، اخلاقی شاعری کے خارزار سے وہ الجھتے ہیں، قومی شاعری کا راگ وہ الاپتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ من طلب الکل فات الکل۔

اپنے اس دفتر کے ایک بڑے حصہ کے متعلق یہ سُنکر کہ وہ شعریت سے معرا ہے ان کو عذر پیش کرنا پڑتا ہے کہ "گر زمانہ کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ دلفریب مگر نکمّی باتوں پر آفریں سننے سے دلشکن مگر کام کی باتوں پر نفریں سننی بہتر ہے[۱]"۔ اور غالباً اسی کو پیش نظر رکھکر شعر سے اس طرح خطاب کیا ہے کہ ؎

اے شعر! دلفریب نہیں تو تو غم نہیں ۔۔۔ پر تجھیہ حیف ہے جو نہو دلگداز تو

ہم یہ نہیں کہتے کہ **حالی** کا آخری دورِ شاعری بالکل نکما اور بیکار ہے لیکن ان کی قومی شاعری کے سوا بقیہ حصہ کے متعلق جدید شاعری کی ابتداء و ارتقاء کی کڑی کے گم ہوجانے اور اُس کی تاریخ کے مٹ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم کو ع ایں دفتر بے معنی غرقِ مئے ناب اولی است۔ کی صدا لگانے والوں کی اس زور و شور سے مخالفت کرنے کی

---

[۱] دیباچہ دیوان حالی صفحہ (۲)

ضرورت نہیں پیش آتی۔

حالیؔ قدیم اور جدید شاعری کے سنگم ہیں۔ انہیں سے جدید شاعری کے وہ سرچیوں سوتیں پھوٹ کر نکلی اور بہی ہیں جو قوم کی دماغی، اخلاقی اور اصلاحی کھیتیوں کو ہمیشہ سرسبز وشاداب کرینگی۔ وہ حالی ہی ہیں جنہوں نے اردو شعراء کو عاشقانہ شاعری کے " دلفریب " باغ سے جس کی مختلف روشوں پر اور کیاریوں میں وہ کائنات اور اس کی نیرنگیوں سے بیخبر گھوما کرتے تھے زبردستی باہر نکالا اور فطرت کے وسیع اور نہایت دلچسپ میدان کے اندر کھڑا کیا ہے جہاں آنے کے بعد ان کی آنکھوں کے سامنے غیر محدود نیرنگیوں اور دلفریبیوں کے مختلف مرغزار نظر آتے ہیں، ان کے توسن سبع کی جولانیوں کے لئے ایک وسیع میدان اور ان کے طائر خیال کی پرواز کے لئے غیر محدود فضاء مہیا ہو جاتی ہے اس لحاظ سے لٹریچر میں حالی کا پایہ بہت بلند ہے اور جب کبھی اردو شاعری کی تاریخ لکھی جائیگی ان کا نام سنہری حرفوں سے سرنامہ پر لکھا جائیگا اور تاریخ ادب کے مورخ کو شاندار الفاظ میں اعتراف کرنا پڑیگا کہ اردو شاعری کو غیر فطری راستہ سے ہٹا کر فطری راستہ پر ڈالنے والے حالی تھے لیکن اس اعترافِ احسان سے ان اعتراضات کا قلع قمع نہیں ہوجاتا جو ان کی شاعری پر سنجیدگی اور فن کی حیثیت سے وارد ہوتے ہیں۔ اب زمانہ آگیا ہے کہ ہم تصنیف سے دل سے یہ یقین رکھنے کے بعد بھی کہ

" مولانا کا کلام اردو میں کلاسک یعنی ادبیات عالیہ کا درجہ رکھتا ہے وہ ایک ایسی تاریخی چیز ہوگئی ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے۔[۵] "

اس امر پر غور کریں کہ ان واقعات سے قطع نظر جو حالی کو جدید شاعری میں زندہ رہنے والے بنائینگے اور اس غزلیہ دور کو مستثنیٰ کردینے کے بعد جو حالی کی عظمت پر بحث کرتے وقت توجہ اور غور کا بالکل مستحق نہیں سمجھا جاتا اور جس کی صحیح قدر وقیمت کا اندازہ کرنا آگے چل کر ضروری اور لابدی ہوجائیگا ان کی جدید شاعری کی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہوسکے ہیں؟ ان کی جدید شاعری کی تین اقسام ہیں۔

(۱) نیچرل شاعری (۲) قومی شاعری اور (۳) اخلاقی شاعری

(۱) نیچرل شاعری

نیچرل شاعری کے اندر بعض چھوٹی چھوٹی نظموں کو مستثنیٰ کردینے کے بعد مقابل لحاظ بر کھارت نظر آتی ہے۔ یہ نظم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فی الجملہ قابلِ تعریف ہے لیکن اس میں وہ تازگی، شگفتگی، اور صناعی نظر نہیں آتی جو اسی قبیل کی بعض قدیم شعراء کی نظموں میں پائی جاتی اور ہماری توجہ کو اپنی طرف منعطف کرلیتی ہے نہ اس میں

---

۵ مولوی عبدالحق بی۔اے۔ رسالہ " اردو " صفحہ ۱۴۴ جلد سوم۔

وہ تخیلی پیکر پیدا ہوتے ہیں جو مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم کے معیار کے مطابق شاعری کا کمال اور شاعر کی کامیابی کا راز ہے۔

نظیر اکبر آبادی اس ضمن میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس کی نظموں کا حالی کی یہ برکھارت مقابلہ نہیں کرسکتی یہی نہیں۔ محسن کاکوری کے مشہور نعتیہ قصیدے ع

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل

کے اندر جو زور ہے اور تشبیب کے اجمال کے اندر برسات کے موسم کی ایک خاص کیفیت کا جو ہو بہو نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے وہ برکھارت کی تفصیل کے باوجود ممکن نہیں۔ ان کی افسردہ دلی بفحوائے ع افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را۔ اس نشاط انگیز موسم کی یاد کو بھی منغص کر دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ برکھارت کا سماں کامیابی سے نہیں دکھلا سکے۔ ہندوستان کے لئے "برکھارت" بہار کا موسم ہے اسکی تصویر کو عیش و عشرت، سرمستی و رندی اور فرحت و نشاط کی انتہائی صورت میں جلوہ گر ہونا چاہیئے اس موسم کی تصویر کو اس وقت تک مکمل کامیاب اور جاندار نہیں بنایا جا سکتا (جب تک کہ زندہ دلی اور مسرت کا خیال اس کے اندر مجسم بنا کر نہ پیش کر دیا جائے۔ حالی اپنی مردہ دلی اور ماحول کے سبب ایسا کرنے سے قاصر تھے، زندگی کے متعلق، مسلمانوں کے قسمت کی طرح ان کے خیالات "رجائی" نہیں "قنوطی تھے" ان کی "مدوجزر اسلام" اس پر گواہ ہے، بعض لوگوں کے توجہ دلانے سے انہوں نے ایک ضمیمہ بعد میں لکھکر اس مسدس میں شامل کیا ہے تاکہ امید کے آفتاب کے ذریعہ یاس و افسردگی کی شبنم کو فنا کر دیں مگر طبعی رنگ یہاں بھی جھلک پڑتا ہے اور ان کے "قنوطی" نقطۂ نظر کو واضح کر دیتا ہے)

(بہر حال ماننا پڑتا ہے کہ اس میدان میں انہوں نے اپنی کوششوں سے ایک مخصوص صنف کی شاعری کا نمونہ پیش کرنے کے علاوہ اپنی عظمت و شخصیت کے لئے کوئی بنیاد نہیں قائم کی کیونکہ نیچرل شاعری اردو شعراء کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے، اردو شعراء نے مختلف مراسم و مناظر کا اپنے اشعار میں نقشہ کھینچا ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ کھینچا ہے) انیس کے صبح و شام کے زور پر میر سودا کا مثنویوں میں جنگل وغیرہ کے مناظر سے ہماری آنکھیں اور غالب کی لطیف بہاریہ غزل ؎

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

سے ہمارے کان آشنا ہیں (ہم حالی کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے مناظرِ قدرت کا مستقل عنوان قرار دیکر نظم لکھی ورنہ اس سے پہلے عموماً ان مناظر و مواسم کا ضمناً ذکر آجایا کرتا تھا مگر اس شرف میں ان کے ہم عصر مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی بھی ان کے شریک ہو جاتے ہیں قطع نظر اس کے اوپر بیان ہو چکا ہے،

کہ نظیر اکبرآبادی کی نظمیں کس طرح حالی کی نظموں پر فضیلت رکھتی ہیں (حالی کا پایہ نیچرل شاعری میں اس لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ نظیر کے برخلاف ان کا حلقۂ اثر نہایت وسیع ہے اور انہیں کی نظموں نے بعد کے اردو شعراء کے دل میں اس صنفِ شاعری کی قدر و قیمت کا سکہ بٹھا دیا اس حیثیت سے اگر قطع نظر کی جائے تو حالی کی ترجیح کے لئے اس صنفِ شاعری میں کچھ نہیں رہ جاتا۔)

(اس ناکامی سے حالی پر کسی قسم کا حرف نہیں آسکتا کیونکہ اگر ان کی بجائے کوئی دوسرا ہوتا تو اس کا بھی یہی حشر ہوتا اور ناکامی کا اسکو بھی منہ دیکھنا نصیب ہوتا جیسا کہ ہم نے اوپر نیچرل شاعری کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ "نیچر پرستی" خواہ وہ اچھی ہو یا بُری جب تک ہمارے رگ و ریشہ میں سرایت نہ کر جائے کسی کامیاب اور قابلِ ستائش کارنامے کی اُمید بیجا ہے تعلیم کی توسیع اور انگریزی شعراء کے مطالعہ سے وہ گہرے اثرات نیچر کی خوبی و حسن کے متعلق ہماری لوحِ دل پر ثبت نہیں ہو سکتے جن کی نشو و نما ہمارے ماحول اور ابتدائی زندگی کے بالکل برخلاف نہیں تو کسی طرح موافق بھی نہیں ہے) جب تک ہماری ایک پوری نسل کے دل و دماغ نیچر کی پرستش گاہ نہ بن جائینگے کسی ورڈسورتھ کی امید بیجا ہے یہی وجہ ہے کہ چالیس پچاس برس کی انگریزی تعلیم انگریزی خیالات کی ترویج اور "نیچر" "نیچر" کی آوازوں اور ہنگامہ آرائیں صداؤں نے ہماری بے حسی کو بہت کم توڑا ہے اور ہمارے جاہل اور عوام کا تو کیا ذکر تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی بہت کم متاثر کیا ہے۔

قومی شاعری

(ان کی شاعری کا دوسرا رُخ قومی شاعری ہے جس حیثیت سے کہ وہ آج مدرسہ کے بچوں سے لیکر مسجد کے واعظوں تک مشہور ہیں قومی شاعری میں وہ بلاشبہ کامیاب ہیں اور خصوصاً اس کا وہ حصہ جہاں وہ مسلمانوں کی عظمت گذشتہ کی داستان بیان کرنے پر اُتر آتے ہیں اس قدر پرسوز و گداز ہوتا ہے کہ مبالغہ اگر اس زمانہ میں جائز سمجھا جائے تو "اُردو" کے فاضل ایڈیٹر کے اس قول کی تائید کرنی پڑیگی :-

"مولانا جب قوموں کے عروج و زوال اور مصیبت زدوں کی بپتا بیان کرنے پر اُتر آتے ہیں تو دُنیا کا کوئی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔"[۱])

ایسا ہونا ضروری تھا پہلے تو وہ خاندانی طور پر مذہباً شیعہ تھے اور بچپن سے واقعات کربلا کی غمناک داستان اور مراثی کا جو اثر ان کی طبیعت میں رچ گیا تھا وہ آخری زمانے کے تبدیل مذہب سے دُور نہیں ہو سکتا تھا۔ دوم ان کے زمانے میں جیسے ہولناک واقعات غدر کے سلسلہ میں پیش آئے اُنہوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور اس شراب کو دو آتشہ بنا دیا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے مسلمانوں کی عظمت گذشتہ کی ہزاروں نشانیاں اس طرح

[۱] رسالۂ اُردو صفحہ ۱۴۴ جلد سوم۔

گئیں کہ وہ ان پر جی کھول کے بھی نہ رو سکے۔ سلطنت کا چھن جانا، بہادر شاہ کے بیٹوں کا اُن کے سامنے بیدردی سے قتل، ان کا قید کیا جانا، لاکھوں خاندانوں کا اُجڑ جانا، شریفوں اور امیروں کا محتاج ہو کر گھر گھر بھیک مانگتے پھرنا ہزاروں شرفا کا قتل اور جنگل جنگل سر چھپاتے پھرنا اور جگہ نہ پانا۔ غدر کیا تھا ایک عذاب الٰہی تھا۔ ان واقعات وحادثات نے ان کے خانگی رنج و آلام، زندگی کی تربیت اور ماحول اور پھر ان کی شاعرانہ حساس طبیعت سے مل کر ان کے دل کو ایک آتشکدہ بنا دیا تھا ایسے حالات میں ان کو سرسید ملتے ہیں ؎

گم کی تھی ہم نے راہ مصیبت یہی تھی سخت
پھر یہ غضب ہوا کہ تم ایسے خضر ملے

اس بڈھے جادوگر نے مطلب برآری کے لئے مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی پستی کے کچھ ایسے تاریک اور بھیانک نقشے دکھا دکھا کر ان کو پرچایا کہ اب حالی پبلک اسٹیج پر آتے ہیں تو وہ غم و الم کا سماں باندھتے ہیں کہ سامعین کو رُلا رُلا کر بے چین کر دیتے ہیں اب تک حکومت کی دار و گیر کے خوف نے ان کے ان جذبات و احساسات کو دبا رکھا تھا اب قومی شاعری کی آڑ پکڑ کے اور تعلیمی و اصلاحی مشن کے پردہ میں سالہا سال کے جذبات غم و الم کو جن سے وہ اندر ہی اندر پھنک رہے تھے اپنی مخصوص سیدھی سادھی زبان میں جس کو وہ ہر جگہ استعمال کر چکے اور بے موقع ہونے کے سبب ناکام رہ چکے تھے اور جو فی الحقیقت اسی قسم کی شاعری کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ ایک دفعہ ہندوستان کے اِس سرے سے اُس سرے تک آگ لگ جاتی ہے اور اسکو وہ مقبولیت حاصل ہوتی ہے کہ خود انہیں کے الفاظ میں۔

"مولود شریف کی مجلسوں میں جا بجا اس کے بند پڑھے جاتے ہیں، اکثر لوگ اس کو پڑھکر بے اختیار روتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ اس کے بہت سے بند ہمارے واعظوں کی زبان پر جاری ہیں۔ کہیں کہیں قومی ناٹک میں اس کے مضامین ایکٹ کئے جاتے ہیں۔"

آج بھی ان کی نظمیں اور ان کے پرسوز نالے محفلِ عشرت کو مجلسِ عزا بنا دیتے ہیں ان کے مشہور مسدس "مدوجزر اسلام" کے سوز و گداز اور درد بھری داستان کے لئے یہ رباعی نمونہ کا کام دیگی ؎

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

اسی پر بس نہیں وہ جگہ جگہ پر یہ کہتے ہوئے کہ ؎

کچھ قوم کی ہم سے سوگواری سُن لو
کچھ چشمِ جہاں میں اپنی خواری سن لو
افسانۂ قیس و کوہکن یاد نہیں
چاہو تو کتھا ہم سے ہماری سن لو

کبھی تو "قوم کی سوگواری" کرتے ہیں ؎

یاروں کو تجھ سے حالیؔ اب سرگرانیاں ہیں   نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
ہوگا تو پہلے ہوگا اے چرخ مہرباں تو   کچھ ان دنوں تو ہم پر نامہربانیاں ہیں
اپنی نظر میں بھی یاں اب تو حقیر ہیں ہم   بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں
روتے ہیں چار ہم پر ہنستے ہیں چار ہم پر   یاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں
خاور سے باختر تک جنکے نشاں تھے برپا   کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں
دیکھا نہیں ابھی تک قحط الرجال تم نے   اس سے بھی سخت آنی آگے گرانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا   کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں   گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

کبھی تو "چشمِ جہاں میں اپنی خواری" سناتے ہیں۔

منہ سے دھواں سا اُٹھا لیتے ہی نامِ اسلام   بارود بجھ رہی تھی گویا لبِ دہن میں
پھر زخم پھوٹ نکلا حالیؔ نہ چھیڑنا تھا   فصلِ خزاں کا قصہ ذکرِ گل و سمن میں
گو رو چکے ہیں دکھڑا سو بار قوم کا ہم   پر تازگی وہی ہے اِس قصۂ کہن میں
وہ قوم جو جہاں میں کل صدرِ انجمن تھی   تم نے سنا بھی اُس پر کیا گذری انجمن میں
پائینِ بزم بھی اب ملتی نہیں اُسے جا   روندن میں ہے وہ گلبن پھولا تھا جو چمن میں
اس باغ کی خزاں نے کچھ خاک سی اُڑا دی   فصلِ بہار گویا آئی نہ تھی چمن میں
ڈالی نہ ہوگی آگے اے دورِ چرخ شاید   جو اب کے تو نے ڈالی ہلچل ہے انجمن میں
فوج اور سپہ دونوں پھرتی ہیں بے سری سے   گویا امیرِ لشکر مارا گیا ہے رن میں
خورد و بزرگ سارے ہیں بدحواس گویا   لُٹنے کی قافلے کے پہنچی خبر وطن میں
بھولی ہوئی ہیں دوڑیں ہرنوں کی چوکڑی سب   جائیں کدھر کو ہر سو دوں لگ رہی ہے بن میں
حالیؔ بس اب نہیں یاں سننے کی تاب باقی   مانا کہ ہے بہت کچھ وسعت ترے سخن میں
نوکِ زباں نے تیری سینوں کو چھید ڈالا   ترکش میں ہے یہ پیکاں یا ہے زباں دہن میں

اور کبھی "اپنی کتھا" دربارِ رسالت میں اس طرح جوشِ گریہ سے شروع کرتے ہیں ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے   اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے   پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے
جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ   خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے

وہ دین ہوا جس سے جہاں بزم چراغاں — اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے — اس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے
جس دین نے تھے غیروں کے دل آکے ملائے — اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جُدا ہے
جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی — اس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے
جس دین کی حجت سے سب ادیان تھے مغلوب — اب معترض اس دین پہ ہر ہرزہ درا ہے
ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی — دینداروں میں پر آب ہے باقی نہ صفا ہے
دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے — اک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے
گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی — پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے
ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر — مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے
فریاد ہے اے کشتیِٔ اُمت کے نگہباں — بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے
تدبیر سنبھلنے کی ہمارے نہیں کوئی — ہاں ایک دُعا تیری کہ مقبولِ خدا ہے

چشمِ تصور سے کام لیجیے اور غور کیجیے کہ ان اشعار نے مجمع کے غم و الم کے جذبات کی آگ کے لیے کس طرح تیل کا کام کیا ہوگا اور بنظرِ تعمق غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان اشعار نے جن کی غرض و غایت یقیناً براہِ راست اخلاق و موعظت نہیں تھی اور جو ایک درد و الم کے عالم میں بے ساختہ ان کی زبانِ قلم سے نکل پڑے تھے ان کی ان طولانی نظموں سے جن کے اندر نصیحت و غرضِ پنہاں تھی زیادہ دردناک ہی نہیں زیادہ موثر اور مفید بھی ہے اسی قسم کا کلام ہے جس کے متعلق اُن کی یہ رائے صادق آتی ہے کہ "شعر اگرچہ براہِ راست علمِ اخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا۔ لیکن از روئے انصاف اس کو علمِ اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں[1]"۔

حقیقت یہ ہے کہ حالی داخلی شاعری کے اُستاد اور حزن و ملال کے جذبات کے بیان کے ماہر تھے مشہور انگریزی نقاد اور شاعر میتھو آرنلڈ کے متعلق جو خارجی شاعری کی اہمیت کا بڑا قائل تھا اور ہمیشہ خارجی شاعری کو اپنی کامیابی اور شاعرانہ کمال کا زینہ سمجھتا تھا کہا جاتا ہے کہ اس کی شاعری کا بہترین نمونہ اور اُس کے کمالاتِ فن کے کامیاب مظاہر اس کی داخلی شاعری سے متعلق نظمیں ہیں۔ حالی کے متعلق بھی یہی رائے قائم کرنی پڑتی ہے۔ اُنہوں نے اپنے اُستاد مرزا غالب کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ اس قدر

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۵

المناک اور حسرت انگیز ہے کہ دنیا کی زبانوں میں اس کی بہت کم مثالیں مل سکتی ہیں گو خود اردو زبان کے طویل مراثی کو مستثنٰے کر دیجیے تو یہ مرثیہ اردو زبان کا مایۂ ناز کارنامہ ہے۔ میں اس حیثیت سے اس کو مسدس کے ساتھ ساتھ حالی کا شہ کار سمجھنے پر مجبور ہوں افسوس کے مضمون کی طوالت کے خوف سے پورا مرثیہ نقل نہیں کیا جا سکتا۔ آخری بند درج ذیل ہے اس موقع پر میں ناظرین سے ایک مرتبہ اس کو دوبارہ دیکھنے کی درخواست کرونگا ؎

ہند میں نام پائیگا اب کون؟ — سکہ اپنا بٹھائیگا اب کون؟
ہم نے جانی ہے اس سے قدر سلف — ان پہ ایمان لائیگا اب کون؟
اس نے سب کو بھلا دیا دل سے — اس کو دل سے بھلائیگا اب کون؟
تھی کسی کی نہ جس میں گنجائش — وہ جگہ دل میں پائیگا اب کون؟
اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے — جا کے دلی سے آئیگا اب کون؟
مر گیا قدر دانِ فہمِ سخن — شعر ہم کو سنائیگا اب کون؟
مر گیا تشنۂ مذاقِ کلام — ہم کو گھر سے بلائیگا اب کون؟
تھا بساطِ سخن میں شاطر ایک — ہمکو چالیں بتائیگا اب کون؟
شعر میں ناتمام ہے حالی — غزل اس کی بنائیگا اب کون؟
کَمْ لَنَا فِیْہِ مِنْ بُکًی وَعَوِیْل — وَعِتَابٍ مَعَ الزَّمَانِ طَوِیْل

اس مرثیہ کے پہلو بہ پہلو دہلی مرحوم کے تذکرے کو جس کے چھیڑنے سے بیچارے حالی یہ کہکر ع "نہ سنا جائیگا ہم سے یہ فسانہ ہرگز" رو کتے تھے خواجہ امداد حسین مرحوم ان کے بھائی اور حکیم محمود خانصاحب دہلوی کے مرثیوں کو اور اس ترکیب بند کو پڑھیئے جو ۱۸۹۲ء میں بمقام دہلی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتویں اجلاس میں پڑھا گیا تھا تو معلوم ہوگا کہ حالی دنیا میں رونے اور رلانے کے لئے پیدا ہوئے تھے اس زمانہ ان کی نام لیوا پارٹی کے روح رواں مولوی عبدالحق بی۔ اے کے قول "مولینا جب قوموں کے عروج و زوال اور مصیبت زدوں کی بپتا بیان کرنے پر اتر آتے ہیں تو دنیا کا کوئی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا" کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اس طرح ہم ان پر منطبق کر سکتے ہیں کہ مولینا جب مصیبت زدوں کی بپتا بیان کرنے اور مرثیہ کوئی پر اتر آتے ہیں تو دنیا کے بہت کم شاعر ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں اقبال نے یہ شعر شاید انہیں کے حسب حال کہا تھا کہ ؎

اڑائی بلبلوں نے، قمریوں نے، عندلیبوں نے — چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

بہر حال حالی قوموں کے عروج و زوال کی بپتا بیان کرنے میں نہیں جسکو ہم آگے چل کر اقبال کی بحث میں شواہد و شعار سے ثابت کرینگے بلکہ مرثیہ گوئی میں ید طولی رکھتے تھے اور اس کے اسباب بھی ہم اوپر بیان کر آئے ہیں (حالی نے ایسا پُر آشوب زمانہ پایا تھا اور غم و الم کے بادل مسلمانوں کی قسمت پر اس طرح چھائے ہوئے تھے اور آفات و مصائب کی بجلیاں اس طرح مسلسل تڑپ تڑپ کر گرتی اور خرمن امن و عافیت کو جلاتی تھیں کہ دُنیا و ما فیہا میں مسلمانوں کا کہیں ٹھکانہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس صورتِ حال کا شاعری پر اثر انداز ہونا ضروری تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ شاعر قومی عزت و حکومت کے گُلستان کے اُجڑ جانے پر دلآویز اور یاس آگیں آہیں نہ کھینچے گا؟ حالی خود ایک جگہ نہایت عمدگی کے ساتھ اس طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

نالہ بے اختیارِ بلبلِ نالاں ہیں ہم   پھوٹ پڑتے ہیں تماشہ اس چمن کا دیکھ کر)

یہی وجہ ہے کہ ان کے اور ہم عصر شعراء کا لب و لہجہ جو یقیناً شاعرانہ قابلیت کے لحاظ سے ان سے فروتر تھے ویسا ہی دردناک ہے شبلی ہی کو لیجئے ان کی مشہور نظم "شہر آشوب اسلام" جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کبتک   چراغ کشتۂ محفل سے اٹھیگا دھواں کبتک

کا طرز بیان بے انتہا دردناک اور ہلچل مچا دینے والا ہے اگر ڈاکٹر لطیف[۱] کا قول مبالغہ پر مبنی ہو کہ "شبلی کا سُب لہجہ اپنے ہم مذہبوں کے مصائب اور آزادی کی طاقت کے زوال پر زیادہ دردناک ہے" تو اس سے مشکل انکار کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی طرح حالی سے کم نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ دَور جو ابھی ختم نہیں ہوا ہے اور جس نے اکبر و اقبال کی شاعری کو بھی اپنے عالمگیر اور زبردست اثرات میں پوری طور پر رنگ لیا ہے جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا غم و الم کا دَور ہے' اس قرن کو مرثیہ گوئی اور ماتم گساری کا دَور کہنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ روزانہ سینکڑوں نظمیں رسائل و جرائد میں شائع ہوتی اور قعرِ گمنامی میں روپوش ہو جاتی ہیں جن پر ڈاکٹر عبداللطیف کا تعجب اس لئے بیجا ہے کہ وہ زمانہ کی نیرنگیوں اور فلک کجرفتار کی خوں آشامیوں کے فریادی ہیں جوں ہی یہ قتل و خون اور اسلامی حکومتوں کے سلب و نہب کی بارش رُک جائیگی اور جذبات میں سکون پیدا ہوگا وہ صفحہ دُنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائینگی

غالباً اسی "مرثیہ گوئی" کے دَور کو دیکھکر ان کو اس رائے کا اظہار کرنا پڑا ہے کہ "(جبکہ اُردو نثر ہر سمت میں قابلِ لحاظ ترقی کر رہی ہے۔ اُردو نظم وہیں پر ہے جہاں اس کو حالی اور ان کے ہم عصروں نے چھوڑا تھا")[۲]

---

[۱] انگریزی ادبیات کا اُردو ادبیات پر اثر مؤلفہ ڈاکٹر سید عبداللطیف یم۔اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ۔

[۲] ڈاکٹر لطیف سے مراد ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب ایم۔اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ ہیں جن کا گرانقدر مضمون "مجلۂ عثمانیہ" کے پہلے نمبر میں" غالب کی عظمت" پر شائع ہوا ہے موصوف نے اسکے علاوہ بھی مذکورہ بالا مقالہ لکھا ہے اور اس مضمون میں اسی کتاب سے مراد ہے۔

(حالی قومی مرثیہ گو تھے اور اس موقع پر اس مشہور مقولہ کے دُہرانے کی ضرورت نہیں کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو بگڑا گویا مرثیہ خواں"۔ قومی شاعری خارجی شاعری سے میل کھاتی ہے اور چونکہ حالی داخلی شاعری کے شہسوار تھے اس لئے قومی شاعری میں ان کی ناکامی غیر متوقع نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے خود مثنویوں کے ذکر میں جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ قولِ فیصل اور ہر قسم کے کلام کیلئے شمع راہ کا کام دے سکتی ہے۔ "جن لوگوں کی طبیعت پر غزلیت کا رنگ غالب آجاتا ہے ان سے مثنوی کے فرائض اچھی طرح انجام نہیں پا سکتے۔")

(اس کے علاوہ ان کے سامنے کہا جا سکتا ہے کہ خارجی شاعری کی کوئی کامیاب مثال موجود نہیں تھی، انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کی نظموں کا تذکرہ سُن لینا یا ایک آدھ نظم کو پڑھوا کر سُن لینا یا کسی ترجمہ کے ذریعہ اندازہ لگا لینا اس صنفِ شاعری میں ان کو صحیح راہِ عمل اختیار کرنے میں کامیاب نہیں کر سکتا تھا چنانچہ یہی ہوا۔ انہوں نے یوں تو عام طور پر اپنی نظموں میں لیکن علی الخصوص "مد و جزر اسلام" میں سخت ٹھوکریں کھائی ہیں، اس میں اس قدر سخت ناہمواری پائی جاتی ہے اور خیالات اس قدر بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں کہ اس کی اصلی وجہ اس غرض کے لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فطری ناموزونیت ہے نہ اس لئے کہ وہ انگریزی شاعری سے نابلد تھے اور یورپی زبانوں سے براہِ راست استفادہ نہ کر سکتے تھے بلکہ اس لئے کہ ان کی افتادِ طبیعت کے یہ رنگ مخالف تھا، جس حکیمانہ مذاق اور اعلیٰ فلسفیانہ دماغ کی جو شاعری کے اندر مناسب مقدار میں قوموں کے عروج و زوال کے اساسی و بنیادی اصولوں کو سمونے ضرورت تھی وہ حالی کے دل و دماغ کا کام نہ تھا) ان کی خود نوشتہ سوانحِ عمری کے جو حال ہیں معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوئی پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ (اس خرابی کی ذمہ دار ان کی ادھوری تعلیم اور دل و دماغ کی ناقص تربیت ہے جس کا ثبوت ایک طرح یوں بھی ملتا ہے کہ ان کی تصانیف میں ادبی کتابیں زیادہ ہیں۔ شبلی کی طرح فلسفیانہ، تاریخ اور کلامی مباحث و موضوع پر اُن کا قلم کبھی نہ اُٹھ سکا)

(یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ حالی ان علوم و فنون میں بھی مہارت رکھتے تھے لیکن اپنے محبوب مشاغلِ ادبی کی مصروفیت میں اس طرف توجہ کرنے کا وقت نہ نکال سکے۔ کیونکہ سرسید علیہ الرحمۃ سے جیسی ارادت اور عقیدت انہیں تھی اور جس کو ہم "عشق" کے درجہ سے تعبیر کر سکتے ہیں اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ سید کے مذہبی خیالات کی تائید میں نہ سہی بعض اصلاحی اور تعلیمی خیالات و عقائد کی حمایت ہی میں وہ ان مفید حربوں سے ضرور کام لیتے اور ان کے خلاف مخالفت کا جو طوفان برپا تھا اس کو روکنے کی کوشش کرتے جیسا کہ شبلی وغیرہ نے کیا ہے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا حالانکہ ان کی آخری زندگی کی سرگرمیوں کا واحد مقصد جس طرح بنے سرسید مشن کی تبلیغ اور تکفیر کی بجا تضحیک تھا)

(بہر حال مد و جزر کو پڑھیئے، اسلام کے عروج کی پُرشوکت داستان کے بیان کرنے کے بعد فطری طور پر

آپ کو خیال ہوگا کہ انہوں نے تنزل و پستی کے ایسے ڈراؤنے اور تاریک منظر دکھلائے ہونگے کہ ع غافلوں کیلئے پیغام ہے بیداری کا لیکن افسوس کا مقام ہے کہ حالی کے مسدس کے اس اہم حصہ کو پڑھکر ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے، اس نقطہ پر پہنچکر جو ایک جادو بیان اور فطرت شناس شاعر کے ہاتھوں میں قوم کے جذبات کو ابھارنے اور صدیوں کے جمود و سکوت کو توڑنے کے لئے ایک پیغام الٰہی بن سکتا تھا حالی اخلاقی اصولوں کی ایسی معمولی معمولی جزیات پر اتر آتے ہیں جو غیر موزوں ہونے کے ساتھ ساتھ نظم کی دلکشی کو برباد کردینے اور اس کے جادو کو ملیا میٹ کرنے والی ہیں، قوم کو اخلاقی سبق پڑھانیکا شوق جس کا انہوں نے بڑے زور و شور سے اپنی جدید زندگی کی ہر تصنیف و تالیف میں ذکر کیا ہے کچھ ایسا اس طرح ان کے مذاق شاعری پر غالب آتا ہے کہ وہ بطور ناصح مشفق "بنکر اخلاق کا وعظ شروع کردیتے ہیں، مسدس کے اس مقام پر پہنچکر جہاں سے ہر کے بعد جزر کو شروع ہونا چاہیئے وہ اپنے شاعرانہ اور اعلیٰ مقصد کو بھول جاتے اور تقلید، جمال پسندی، تحط کتب دینیہ تعصب، غیبت، حسد و تکبر، خبث نفس، فتنہ انگیزی، لعب قلیم وغیرہ کے عنوانات قرار دیکر دو دو، چار چار بند لکھنا شروع کردیتے ہیں، اگر وہ صحیح مذاقی اور سلیقہ مندی کو ذرا زیادہ کام میں لاتے تو سرسید علیہ الرحمۃ کی فرمائش کو بھی باحسن الوجوہ پورا کرسکتے تھے اور سلمانوں کے تنزل کی داستان بیان کرتے ہوئے ان کمزوریوں اور نقائص کو بھی جن کا بیان کرنا اور دور کرنا وہ قوم کی ترقی کے لئے ضروری خیال کرتے تھے) اس طرح بیان کرجاتے کہ سننے والوں کی زبان سے تعریف میں بے اختیار ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں   گفتہ آید در حدیث دیگراں

نکل جاتا (ان کے مسدس کے اندر جگہ جگہ پر پڑھنے والے کے خیالات میں دفعتاً ایسی رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے کہ ناگوار معلوم ہونے کے سوا نظم کی دلکشی کے خرمن کے لئے برق سوزاں کا کام دیتی ہے اس طرح دفعتاً وہ اپنے خیالات کے بہاؤ کو روک کر "نصیحت بازی" پر اتر آتے ہیں کہ ناظرین اپنے دماغ کے اندر بمشکل ایک قسم کا جھٹکا محسوس کیئے بغیر رہ سکتے ہیں۔ نظم کے فطری بہاؤ کو روک کر اخلاقی مسائل کی چٹانوں اور ٹیلوں پر سے بہانے کی کوشش کرنا ایسی فاش اور سخت غلطی تھی کہ شاعری کے دریا کو ان سے سر ٹکرا کر منتشر ہوجانا پڑا اور بھٹک کر جنگلوں اور پہاڑوں میں نبٹ جانا پڑا، اس "نصیحت بازی" کے مقام پر پہنچ کر وہ اس طرح بھٹکے ہیں کہ راہ پانا مشکل ہے، ان کی شاعری کی کشتی اس تصادم و کشمکش میں ہر ٹیلہ اور چٹان سے سر ٹکراتی اور اپنے بادبانوں اور تختوں کے لئے سامان موت مہیا کرتی ہے اس عالم میں چل کر اسلام کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کا بھی دردناک انجام ہوتا ہے۔ اس بنا پر یہ عقیدہ رکھنے والے شاید غلطی پر نہیں ہیں کہ "مسدس لکھکر حالی نے کوئی ادبی احسان نہیں کیا بلکہ اپنے لئے زاد راہ آخرت مہیا کرلیا۔")

حیرت ہے کہ ایک بزرگ اسی نظم کا پشتارہ باندھ اور پشت پر لاد کر اس کو بازارِ ادب میں سادگی، صفائی، دلکشی، حسنِ زبان و روزمرہ اور صنف و موضوع پر "حیرتناک قدرت" کے نمونے اُچھالتے ہوئے لاتے اور سخن سنجوں اور جنسِ ادب کے جوہریوں کی آنکھ میں خاک جھونک کر اپنے ٹکے سیدھے کرنے کے لئے صدا لگاتے پھرتے ہیں کہ انمول اور لاقیمت شئے ہے اور اقبال کے شکوہ اور جواب شکوہ سے جو مصنوعی اور قدیم زبان اور مصنوعی قدیم اسٹائل میں لکھے گئے ہیں بہتر ہے۔" ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است،
ہم آگے انشاءاللہ اقبال کے ضمن میں اس پر تفصیل سے بحث کرینگے (یہاں صرف مسدس مد و جزر اسلام کے متعلق جیمس بیلے (James Bailey) کی نظم "Festus" جو ابتداءً بڑی کامیاب رہی تھی، کے بارے میں ٹینی سن Tennyson کے اس مشہور قول کو دُہرانا چاہتے ہیں کہ "اثر کے لحاظ سے ایک خشک نظم مگر جس کے اندر بہت سی کارآمد چیزیں بھی موجود ہیں"[۱])

اخلاقی شاعری

اب آخر میں ان کی اخلاقی شاعری باقی رہ جاتی ہے جس کا قومی شاعری کے ساتھ چولی دامن کا تعلق ہے۔ یہ صنف بہت زیادہ بحث و تمحیص کی محتاج ہے ہم کو آزادی کے ساتھ رجال پرستی چھوڑ کر اس پر تنقید کرنا چاہئے ورنہ خود میرے دل میں حالی مرحوم کی اعلیٰ اخلاقی صفات، جرأت و نیکی، عقیدت مندی اور دردمندی کی اتنی قدر ہے کہ شاید اُن کے دم بھرنے والے معتقد بھی نہ کرتے ہوں اور ان کی اعلیٰ انشاءپردازی کی قابلیت کا میں خود ایسا مداح ہوں کہ شاید اُن کا اسکول بھی نہ ہو۔

(اخلاقی شاعری کی حالی کے ہاتھوں میں آکر اس قدر مٹی پلید ہوئی ہے کہ بعض نقادوں اور ادب شناس لوگوں کو اس خیال کی تائید پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے کہ اخلاقی شاعری فی الحقیقت شاعری کا جو فنونِ لطیفہ میں سے ہے کوئی جزو نہیں۔ ان کی اس حسرتناک ناکامی کے کئی اسباب ہیں اور ہم اس خیال کو اس قدر بلند آہنگی کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کرنے کی پاداش میں اس پر تفصیل سے نظر ڈالنے پر مجبور ہیں، کیونکہ آج تک مختلف مرکزوں اور مختلف باثر بلکہ باجبروت ہستیوں کی طرف سے حالی کی شاعری کا ڈھول اس زور سے پیٹا گیا ہے کہ بزم میں سارنگی و ستار، ہارمونیم و گراموفون کے نغموں کی سریلی آوازیں پست ہو کر رہ گئی ہیں (حالی کی شاعری کا وہ شور و غوغا مچایا گیا ہے کہ بہت سے مستحق تعریف و توصیف شعراء کو خاموش ہو جانا پڑا ہے۔ پس جب تک پبلک کو اس کا احساس نہ کروا دیا جائے آگے کسی کامیاب کارنامے کی امید

---

[۱] The Outline History of English Literature by W. H. Hudson Page 282

ہیجا ہے۔ علی الخصوص جب تک حالی کی قدر وقیمت کا اندازہ نہ کریں اس وقت تک اسمٰعیل میرٹھی، اکبر و اقبال کی شاعری کی قدر وقیمت نہیں معلوم ہوسکتی، ایک مرتبہ حالی کی شاعری کے اس دشوار گزار اور ناہموار کوہ د بیابان کو طے کرنا ضروری ہے تاکہ اسمٰعیل میرٹھی اکبر و اقبال کی اقلیم سخن میں قدم دھرنے اور میٹھی میٹھی اور پیاری پیاری نظموں، حیات افروز ترانوں اور متانت سوز اخلاقی لطیفوں، حکایتوں اور چٹکلوں سے محظوظ ہونے کا موقع دستیاب ہوسکے۔

اوپر بیان ہوچکا ہے کہ حالی کی نئی زندگی کا حقیقی دور سرسید کے زیر اثر شروع ہوا ہے واقعہ یہ ہے کہ حالی سرسید کے مشن میں شریک ہوتے وقت اپنی زندگی کی اس منزل پر پہنچ گئے تھے جبکہ متعدد اور پیہم دل شکنیوں اور زمانہ کی سرد مہریوں کے باعث کسی جدید تحریک میں حصہ لینے کی جرأت نہ کرسکتے تھے)

جو قدم بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی دوڑ گز دو گز زمین میں محدود ہو ان سے وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا اس کے سوا بیس برس کی بیکار اور نکمی گردش میں ہاتھ پاؤں چور ہو گئے تھے اور طاقت رفتار جواب دے چکی تھی[۱]

(لیکن یہ صرف سرسید کی عجیب وغریب شخصیت اور افسون کا اثر تھا کہ حالی کے دل میں پھر نئے سرے سے ولولہ پیدا ہوا اور وہ کچھ کرنے پر تیار ہوگئے۔ ان کی تحریریں پڑھنے سے اور ان کے اشعار کا مطالعہ کرنے سے اس زبردست عقیدہ کا پتہ چلتا ہے جو ان کے دل میں سرسید کی طرف سے تھی اور اس محبت کا ثبوت ملتا ہے جو وہ اُن کے کاموں سے رکھتے تھے، ان کے دیوان میں سرسید کی تعریف میں متعدد نظمیں موجود ہیں اور رہے اُن کے اغراض و مقاصد تو اُن کی شاعری کا یہ مستقل عنوان ہے گویا کہ سرسید اور علیگڈھ کی تحریک ان کی شاعری کے لئے وہی کام دیتی ہے جو مسز جین ولیمس (Mrs Jane Williams) کا پُر اسرار اور طلسمی وجود شلی (Shelley) کی شاعری کے لئے کرتا ہے ایسی حالت میں ہم کو یہ دیکھکر کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ حالی سرسید کے خیالات کو اپنے بحر وقافیہ کے رکارڈ میں بھر کر نظم اور مسدس کے گراموفون کے ذریعہ سُناتے ہیں، ان کے آخری زمانہ کی شاعری کا مقصد یہ نہایت اہم اور یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ علیگڈھ کی تحریک کے لئے پلیٹ فارم پر مناسب اور حسب منشا فضا پیدا کرنی تھی، شاعری کلیکا ان دنوں گھر گھر پہنچ چکا تھا۔ اس چاشنی کے ذریعہ وہ سرسید کے خیالات کو ہر شخص تک پہنچا دینا چاہتے تھے اور بس۔ اس سے زیادہ ان کی نہ کبھی خواہش تھی اور نہ کوئی غرض۔ قوم پروری اور ملت دوستی کے جذبات حالی کے دل و دماغ پر اس قدر غالب

---

[۱] دیباچہ مسدس صفحہ (۳)

آ گئے تھے کہ ان کے لئے یہ سوچنے کا بالکل موقع نہ رہا تھا کہ

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی　　کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

کہ جس راستہ پر وہ جا رہے ہیں وہ شاعری کے کعبہ کی طرف نہیں بلکہ اصلاحِ مسلمانان کے ترکستان کی طرف جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ محبت و الفت اندھی ہوتی ہے اسی اندھی محبت نے جو بلاشبہ ہماری تعریف و توصیف کی بجا طور پر مستحق ہے ان کو انجام پر غور کرنے سے روکا مگر کون کہہ سکتا ہے کہ انہوں نے انجام پر غور نہیں کیا بلکہ ایک جوش اور فوری ولولہ کے عالم میں اُس راہ پر چل کھڑے ہوئے جو بجائے کعبہ کے ترکستان کی طرف جاتا تھا ان کی مسدس کے دیباچہ میں جب ہم اس پارہ کو پڑھتے ہیں:۔

"قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے (جو اپنی قوم کے سوا تمام مُلک میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے) جس طرح خود اپنے پرزور ہاتھ اور قوی بازو سے بھائیوں کی خدمت کر رہا ہے اسی طرح ہر اپاہج اور نکمے کو اسی کام میں لگانا چاہتا ہے آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوانِ ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑی شرم کی بات ہے۔"

رو چو انسان لب بجنبان در دہن　　ورجمادی اف انسانی مزن

قوم کی حالت تباہ ہے، عزیز ذلیل ہو گئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے ہیں، علم کا خاتمہ ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے، افلاس کی گھر گھر پکار ہے، پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے، اخلاق بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹائیں قوم پر چھائی ہوئی ہیں، رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے، جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امراء جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں غافل و بے پرواہ ہیں، جن لوگوں کو قوم کی اصلاح میں بڑا دخل ہے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں ایسے میں جس سے جو بن آئے تو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ چکے اور لکھ رہے ہیں مگر نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے قوم کے بیدار کرنیکے لئے اب تک کسی نے نہیں لکھی اگرچہ ظاہر ہے کہ اور تدبیروں سے کیا ہوا جو اس تدبیر سے ہوگا مگر ایسی تنگ حالتوں میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو ہی قسم کے خیالات گزرتے ہیں ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیئے، پہلے خیال کا نتیجہ

ہوا کہ کچھ نہ ہوا دوسرے خیالات سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے۔" ؎

در فیض است منشیں از کشائش نا امید اینجا
بہ رنگِ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا

وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا و ینشر رحمتہ[۵۱]

ہر چند اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور اس خدمت کا بوجھ اٹھانا دشوار تھا مگر ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی، دل سے نکلی تھی دل میں جا کر ٹھہری، برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑھی میں اُبال آیا، افسردہ دل، بوسیدہ دماغ جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے انہیں سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی اور دنیا کے مکروہات سے بہت کم فرصت ملی اور بیماریوں کے ہجوم سے اطمینان کبھی نصیب نہ ہوا مگر ہر حال میں یہ دُھن لگی رہی کہ۔ بارے الحمدللہ کہ بہت سی دقتوں کے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی نظم اس عاجز بندہ کی بساط کے موافق تیار ہوگئی اور ناصح مشفق سے شرمندہ نہ ہونا پڑا۔[۵۲] صرف ایک امید کے سہارے پر یہ راہِ دُور دراز طے کی گئی ہے ورنہ منزل کا نشان نہ ابتک ملا ہے نہ آئندہ ملنے کی توقع ہے ؎

خبرم نیست کہ منزل گہِ آں یار کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگِ جرس می آید

تو اس خیال کی اصلاح کرنی پڑتی ہے کہ (نادانستہ ان کی شاعری کی باگ دوسری طرف مُڑ گئی تھی بلکہ برخلاف اس کے جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں اس حقیقت پر سے پردہ اٹھتا ہے کہ ان کی شاعری کی غرض و غایت لٹریری خدمت اور اُردو ادب کے خزانے میں کسی انمول جوہر کا اضافہ کرنا نہیں بلکہ سرسید کے خیالات کی تبلیغ اور اصلاحِ مسلمانان کی تکمیل میں حصہ لینا تھا۔ یہ غرض پُوری ہوئی اور اس دلوں کے بھید اور " اعمال کی نیتوں" کو جاننے والے نے اس کا انہیں بدلہ بھی دیا۔)

۵۱ وہ خدا ہی جو نا امیدی کے بعد بارش کو بھیجتا ہے اور اپنی رحمت کے بادلوں کو پھیلاتا ہے ۱۲

۵۲ مقدمہ مسدس صفحہ ۴ و ۵ مطبوعہ ۱۹۰۲ء مطبع انسٹیٹیوٹ پریس علیگڈھ ۱۲

قصۂ ناتمام

(از جناب "اپالو")

رات کے کوئی دو بجے ہونگے، میں اپنے کتب خانہ میں چیخوف کے ایک قصے پر قصہ لکھتا بیٹھا تھا کہ میرا ملازم گھبرایا ہوا، اور دوڑتا اندر آیا اور کہنے لگا کہ بوڑھی بیگم مرجان جسکا دروازہ آپ کے گھر سے ملا ہوا ہے باورچیخانہ میں بیٹھی آپ کو بلا رہی ہے۔ یہ کہتے کہتے اس کا دم پھولنے لگا۔ "اس کے کرایہ دار کو کچھ ہوگیا ہے۔ وہ گولی مار لیا یا پھانسی دے لیا۔"

"میں کیا کرسکتا ہوں؟" مینے کہا "وہ ڈاکٹر کے پاس جاسکتی ہے یا کوتوالی"

"میاں وہ غریب ڈاکٹر کو بلانے کیا جائیگی۔ اس کا تو دم نکل رہا ہے۔ مارے ڈر کے چولہوں کے اندر گھس گئی ہے۔ خدا کے واسطے آپ مدد کیجیے۔"

مینے اپنی شیروانی اور ٹوپی پہنی۔ اور بیگم مرجان کے مکان کو گیا۔ جس دروازے کی طرف میں چلا تھا۔ کسی حریص کے منہ کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہاں کچھ توقف کرکے ڈرتے ڈرتے صحن کے اندر گیا۔ آواز دینے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوا۔ اندھیری کمانوں میں دروازہ کو غیر مقفل پایا۔ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ روشنی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ لیکن ایک طرح کی خوشبو آرہی تھی۔ اندھیرے میں راستہ ٹٹول ٹٹول کر چلنے لگا۔ میری کہنی کسی سخت لوہے کی چیز سے ٹکرا گئی۔ اور ایک تختہ سے معانقہ ہوا جو زمین پر آتے آتے رہ گیا۔

اس کو دیو و پری کا قصہ نہ سمجھیے۔ میرا مقصد قارئین کو ڈرانا نہیں ہے۔ جو نقشہ میں نے دروازے کے قریب سے دیکھا عجیب وسواس زا تھا۔ ایسا نقشہ موت ہی اُتار سکتی ہے میرے سامنے ہی وہ دروازہ تھا جس سے دیوانخانہ کو راستہ جاتا تھا۔ تین پانچ بتی دار شمعدان ایک قطار میں رکھے ہوئے، دیوار کے بھورے بد رنگ کاغذ پر روشنی ڈال رہے تھے کمرے کے درمیان دو میزوں پر ٹکا ہوا ایک جنازہ رکھا ہوا تھا۔ دو شمعوں کی روشنی میں وہ مُہیب چہرہ نظر آرہا تھا، جس کا رنگ زرد اور منہ نیم باز، ناک سوتواں

ملازم کی زبانی۔

تھی ململ کی تھیں بے ترتیبی کے ساتھ چہرہ سے لیکر پاؤں کے انگوٹھے تک لپٹے ہوئے تھیں اس میں سے دو بے حس ہاتھ ایک تسبیح لئے ہوئے نظر آرہے تھے۔ دیوانخانہ کے تاریک گوشہ، جنازہ کے پیچھے کی چیزیں اور خود جنازہ ہر چیز، سوائے ٹمٹماتے ہوئے شمعون کے موت سے متاثر بلکہ ایک لحد کا نمونہ بنے ہوئی تھی۔

"کسقدر تعجب ہے!" میں اس غیر متوقع نظارہ موت سے گوبگا ہوکر خیال کرنے لگا: "غضب کی تیزی۔ کرایہ دار نے بمشکل مار لیا ہوگا یا پھانسی دے لی ہوگی اور یہاں پہلے ہی سے جنازہ موجود ہے!"

میں مڑکر دیکھا۔ بائیں جانب ایک دروازہ شیشہ کی کمانوں کا تھا۔ سیدھی طرف ایک ٹوٹی کھونٹی جس پر ایک فرسودہ شیروانی لٹک رہی تھی۔

"پانی" ایک کراہنے کی آواز کان میں آنے لگی۔

آواز بائیں جانب سے آرہی تھی۔ جدھر شیشہ والا دروازہ واقع تھا۔ میں دروازہ کھولکر اس اندھیرے اور ایک ایسے دریچہ والے کمرہ میں داخل ہوا۔ جو کوچہ کی قندیل سے روشنی لے کر اُجلا ہو رہا تھا۔

"کیا یہاں کوئی ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

جواب کا انتظار کیئے بغیر میں نے دیاسلائی جلائی۔ اسکی روشنی میں جو کچھ دیکھا وہ یہ ہے ایک بھلا مانس خون آلود زمین پر میرے قدموں کے پاس ہی بیٹھا ہوا ہے اگر میرا قدم ذرا آگے بڑھتا، تو یقیناً اُس کے سر پر اُترتا۔ پاؤں پھیلے ہوئے اور ہاتھ زمین پر ٹکے ہوئے تھے۔ وہ اپنے اس خوب صورت چہرہ کو اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس پر اُس کی گھنی ڈاڑھی میں سے بھی موت کی زردی کے آثار ہویدا تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں جو میری طرف کو اُٹھیں، وحشت، تکلیف اور التجا کا نمونہ بنی ہوئی ہیں۔ ٹھنڈے پسینے کے قطرے چہرے پر بہ رہے تھے۔ یہ پسینے کے قطرے، اُس کے تیور، زمین پر ٹکے ہوئے ہاتھوں کی کپکپاہٹ سانس کی تیزی اور مضبوط بندھے ہوئے دانت بتلا رہے تھے کہ وہ ناقابل برداشت تکلیف میں مبتلا ہے۔ سیدھے ہاتھ کے قریب خون کے چھتے میں ایک روالور رکھا ہوا تھا۔

"جاؤ نہیں!" ایک ضعیف آواز میرے کان میں آئی، جب دیاسلائی بجھ گئی "یہ میز پر ایک شمع رکھی ہے۔"

میں نے شمع روشن کی۔ اور بہوت بنا کمرہ کے درمیان کھڑا رہا۔ اس خیال میں کے اب کیا کرنا چاہیئے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس آدمی کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

"درد نا قابل برداشت ہے" اُس نے آہستہ کہا، "اور مجھ میں اتنی قوت نہیں کہ پھر ماروں طبیعت بھی نہیں چاہتی"۔

میں نے شیروانی پھینک دی۔ اور بیمار کے پاس گیا۔ اس کو بچے کی طرح زمین سے گود میں اُٹھا کر، قریب کے صوفہ پر بیٹھا یا اور اُس کے کپڑے احتیاط سے اُتارے۔ اُس کا جسم سردی سے کانپ رہا تھا۔ لیکن زخم پر جب نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ وہ اس کپکپاہٹ اور بدہیبتی کے مناسب نہیں تھا۔ خفیف سا تھا۔ گولی پسلی کی پانچویں اور چھٹی ہڈی پر کھال اور گوشت کے درمیان سے گزر گئی تھی۔ خود گولی اُس کی شیروانی کی بڑی جیب کے پاس اٹک رہی تھی۔ حتی الامکان خون کو روکنے کی تدبیر کرنے کے لئے غلاف، تولیے اور دو دستیوں کی ایک عارضی پٹی بنا کر باندھ دی زخمی کو تھوڑا پانی پلایا۔ اور ایک قریب لٹکتے ہوئے اور کوٹ میں اُس کو لپیٹ دیا۔ پٹی باندھتے ہوئے ہم میں سے کسی نے بھی گفتگو نہیں کی۔ میں جب مصروف تھا، تو وہ تصویر کی طرح کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ گویا خودکشی کی اس ادھوری کوشش اور میری زحمت سے وہ شرمندہ ہے۔

"اب میں آپ کو بے حس پڑے رہنے کی زحمت دیتا ہوں"۔ مینے اس وقت کہا جبکہ زخم کا باندھنا ختم ہو چکا تھا۔ "میں دوا ساز کے پاس سے دوا لانے جا رہا ہوں"۔

"ضرورت نہیں" اُس نے دبی زبان میں کہا۔ اور میری آستین کھینچتے ہوئے آنکھیں پھاڑ دیں اُن آنکھوں میں دہشت بھری تھی۔ میرے جانے سے وہ ڈر رہا تھا۔

"ضرورت نہیں۔ پانچ منٹ اور توقف کیجئے۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو۔ توقف کیجیے۔ میری درخواست ہے"۔

اس التجا کے وقت وہ پھر تھرّا رہا تھا۔ اور اُس کے دانت بج رہے تھے۔ دس منٹ خاموشی کی حالت میں گزرے۔ میں بے حس بیٹھا ہوا اس کمرہ کو دیکھ رہا تھا، جہاں اتفاق نے مجھے اس غیر متوقع طور پر پہنچا دیا تھا۔ یہ شخص جو ایک پسندیدہ اور نسائی چہرہ اور گھنی ترشی ہوئی داڑھی اور ایسا ماحول رکھتا تھا، جو ایک معمولی کاروباری آدمی کے لئے باعث رشک نہیں ہو سکتا تھا۔ صوفہ پر کے آمریکائی چمڑے کی دھجیاں اُڑ رہی تھیں۔ ایک فرسودہ چکنی کرسی، ایک میز کاغذ سے ڈھکی ہوئی اور ایک بدنما نقشہ دیوار پر لٹکا ہوا اس کمرہ کی

کائنات تھی سکرہ نم، بند اور اُداس تھا۔

"کیسی تیز ہوا ہے؟" مریض نے آنکھیں کھولے بغیر ہی کہنا شروع کیا۔ "کیا سنائے سے چل رہی ہے"

"ہاں" میرا جواب تھا۔ "میرا خیال ہے کہ میں تم کو جانتا ہوں۔ کیا تم نے کھٹاؤ زر کمپنی کے ساتھ برسال کرشنا تھیٹر میں کھیل کیا تھا"

"اِس کا کیا ذکر ہے" اُس نے آنکھیں کھولکر کہا۔

اس کے چھرہ پر غم کے بادل چھاتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

"میں نے تم کو یقیناً وہاں دیکھا ہے۔ کیا تمہارا نام۔ وحید نہیں ہے؟"

"اگر ہو بھی تو اس سے کیا سروکار مجھے جاننے سے تمہارا کیا فائدہ ہوگا؟"

"کچھ نہیں یونہیں دریافت کیا"

...... وحید نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اور اِس طرح صوفہ کی دوسری جانب پلٹ گیا گویا کہ وہ رنجیدہ ہوگیا ہے۔

میں تمہاری اِس کرید کو نہیں سمجھا۔ اب آگے مجھ سے تم یہ بھی دریافت کرنے لگو گے کہ کس چیز نے مجھے خودکشی پر مجبور کیا"

ایک منٹ بھی نہیں گزرا ہوگا کہ وہ میری طرف پھر پلٹ گیا۔ اور آنکھیں کھولکر روتی آواز میں کہنے لگا۔

"اِس گستاخانہ لہجے کو معاف فرمائیے۔ لیکن آپ اُس سے انکار نہیں کر سکتے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ایک مجرم سے یہ دریافت کرنا کہ وہ قید خانہ میں کسطرح آگیا یا ایک مرتکب خودکشی سے کہ اُس نے کس لئے اس کا ارتکاب کیا، کوئی ہمدردانہ فعل نہیں ہے۔ کرید کی تشفی کا خیال دوسرے کے سکون کی بربادی پر!

"تمہارے مضطرب ہونے کی ضرورت نہیں......... وجہ تحریک کے دریافت کا مجھے بالکل خیال نہیں ہوا"

"تم وہی پوچھتے .... یہی لوگ ہمیشہ کیا کرتے ہیں گو اس سے کوئی فائدہ بھی نہو۔ اگر میں تم سے کہوں تو تم کو یقین نہ آئے یا تمہاری سمجھ میں نہیں آئیگا......... میں معترف ہوں کہ یہ چیز خود میری سمجھ سے بالا ہے۔ بعض فقرے کوتوالی کی رپورٹ یا اخباروں میں ملتے ہیں

جیسے "ناکام محبت" "حد سے بڑھا ہوا افلاس" لیکن اسباب معلوم نہیں ہوتے .... نہ تم کو معلوم ہیں، نہ مجھے اور نہ اِس اخباری کو جو "خودکشی کی ڈائری" لکھنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ خدا ہی اس انسان کے دل سے واقف ہو سکتا ہے جو اپنی جان آپ لینے تیار ہو جاتا ہے۔ مگر "تو اگر ان نخوردہ گزند راچہ خبر"۔

"یہ سب درست ہے۔ لیکن تم کو بات کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے"۔

خودکش خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ تکیے پر سر جھکا کر ایک بڑے پروفیسر کی طرح کہنے لگا۔

"انسان خودکش کی نفسیاتی نزاکت کو ہرگز نہیں سمجھ سکتا۔ پھر اسباب و علل کی گفتگو کون کرسکتا ہے؟ آج یہ سبب ایک آدمی کو ایک ریوالور پکڑنے پر مستعد بنا دیتا ہے۔ اور کل وہی سبب ایک کوڑی کی اہمیت بھی نہیں رکھتا۔ اس کا تمامتر انحصار عموماً کسی خاص موقع میں کسی فرد کی خاص حالت پر ہوتا ہے۔ مثلاً مجھے لیجیئے۔ آدھ گھنٹہ پہلے مجھے مرنے کی سخت خواہش تھی۔ اب جب چراغ روشن ہوگیا۔ اور تم میرے قریب بیٹھے ہوئے ہو، میں موت کا خیال تک بھی نہیں کرسکتا اِس تغیر کو سمجھاؤ اگر تم سے ہو سکے۔ کیا میں گزر گیا یا میری بیوی زندہ ہوگئی۔ کیا یہ روشنی کا اثر ہے یا ایک اجنبی کی موجودگی کا؟"

"روشنی یقیناً ایک اثر رکھتی ہے" میں نے کچھ کہنے کی خاطر کہہ ڈالا۔ "روشنی کا اثر اجسام پر"۔

"روشنی کا اثر"........ "ہم اسکو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن تم جانتے ہو کہ لوگ روشنی میں بھی اپنے آپ کو ہلاک کر لیتے ہیں۔ حقیقت میں تمہاری ناولوں کے بڑے شخص قصہ کی بڑی بے حرمتی ہوگی اگر صرف ایک شمع کی روشنی اس کی حیات کے کھیل میں ایسا فوری انقلاب پیدا کر دے یہ تمام بکواس شاید سمجھائی جاسکے۔ لیکن ہم سے نہیں جس چیز کو ہم خود نہیں سمجھتے اُس کی وضاحت کرنی یا اس کے متعلق سوالات کرنا فضول سی بات ہے۔

"معاف کرنا" میں نے جواب دیا۔ "لیکن اس وقت تمہارے چہرہ کے تیور سے یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ تم ہرا رہے ہو۔

وحید نے چونک کر کہا۔ "ہاں کیا عجب! میں عادتاً ظاہر پرست اور کمزور فطرت ہوں۔ اچھا اگر تم کو قیافہ شناسی کا ادعا ہے تو اس کو سمجھاؤ تو سہی۔ آدھ گھنٹہ قبل میں نے خودکشی کی کوشش کی۔ اور اب میں اس سے مکر رہا ہوں۔ بیجئے اسکی توجیہ۔

یہ آخری الفاظ وحید نے ضعیف اور کمزور آواز میں ادا کیے۔ وہ تھک گیا تھا اور آخرکار

خاموش بھی ہو گیا۔ یہ سکوت کچھ عرصہ تک قائم رہا میں نے اس کے چہرہ پر نگاہ تجسس ڈالنی شروع کی۔ مُردنی چھا رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی روح نکل گئی۔ صرف اُس کی ہچکی اور اضطراب کی کیفیت اُس کے زندہ ہونے کا یقین دلا رہی تھی۔ اس چہرہ کی طرف دیکھنا تکلیف دہ تھا۔

لیکن خود وحید کی کیا حالت تھی نہیں معلوم جس میں ابھی تک بحث کرنے کی قوت باقی تھی اور اگر میں غلطی پر نہیں تو ہرانے کی بھی۔

"تم یہاں ...... کیا تم یہیں ہو؟" وحید نے دفعتہً کہنیوں کے بل اُٹھکر دریافت کیا۔ خوب! اچھا سنو"!

میں ہمہ تن گوش بن گیا۔ بارش بغیر ایک منٹ وقفہ لئے ہوئے بھی، سیاہ دریچہ سے ٹکرا رہی تھی۔ ہوا کا زور و شور المناک آوازوں میں سنائی دے رہا تھا۔

"اور میں برف سے زیادہ سفید ہو جاؤنگا، اور میرے کان خوش آہنگی اور خوشخبری سے آشنا ہو جائینگے"۔ بیگم مرجان جواب واپس ہو چکی تھی، کمزور اور تھکی ہوئی آواز سے دیوانخانہ میں پڑھ رہی تھی۔ اس کی آواز میں اُتار چڑھاؤ نہ تھا۔

"کس قدر فرحت خیز ہے؟ کیوں سنتے ہو؟" وحید نے خوف زدہ آنکھیں میری طرف کرکے آہستہ سے کہا۔

"خداوندا! انسان کو کیا کیا دیکھنا اور سنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی اس سمع خراشی کو خوش آہنگی میں تبدیل کر دے۔ تو پھر بقول شخصے یہ حالت ہو جائیگی۔

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا"

اِس وقت اِس ترنم کو میں کسقدر عمدگی سے سن سکونگا۔ اور کیسے محسوس کرونگا! اب وقت کیا ہو گا؟

"تین بجنے میں پانچ منٹ ہیں"

"صبح تو ابھی دور ہے، لیکن ادھر ہوئی اور ادھر جنازہ کی تیاری۔ کیا خوبصورت سماں ہو گا۔ جنازہ کے ہمراہ ایک شخص کیچڑ پانی میں جا رہا ہے، اور چلتے ہوئے کچھ نہیں دیکھ سکتا سوائے ابر آلود آسمان اور المناک منظر کے۔

راستہ، دکانیں دیوار در سب کے سب خاک آلود ...... خود پیجامہ بھی گھٹنوں تک بھیگا ہوا۔ راہ ناپید اکنار۔ بے تہذیب لوگ۔ اور دل پر پتھر رکھے ہوئے۔

کچھ وقفہ سے اُسنے یک بیک دریافت کیا؛"
"کیا لفٹنٹ کریم کو دیکھے ہوئے تمہیں عرصہ ہو گیا؟"
"گزشتہ گرمیوں کے بعد سے اُسے نہیں دیکھا۔
"وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ایک سورما تصور کرتا ہے۔ لیکن آدمی اچھا ہے۔ کیا تمہارا لکھنا ختم نہیں ہوا۔
"نہیں کچھ باقی ہے۔"
"اہا...... کیا تم کو یاد ہے کہ میں زہرا سے محبت کی ابتدا کے وقت کس طرح اُس کے ساتھ سایہ کی طرح پھرتا تھا۔ اور اُس کی خاطر تھیٹر کا کیسا دیوانہ ہو رہا تھا؟...... یہ سب بیوقوفانہ حرکات نہیں۔ لیکن بُری نہیں۔ نداق تھا۔ اسکی یاد کے ساتھ ہی بھار کا سیلاب آتا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اب...... کس قدر دل خراش تبدیلی! یہ تمہارے لئے اچھا موضوع ہے صرف خودکشی کے واقعات لکھنے سے پرہیز کرو۔ یہ تو ایک رسمی اور بدنما بات ہے۔ تم اس سے کوئی ظریفانہ پہلو نکال لوگے۔"
"پھر تم نے ہرزہ درائی شروع کردی" مینے کہا" تمہارے معاملے میں کوئی چیز مضحکہ خیز نہیں۔"
"کچھ مضحکہ خیز نہیں۔ تم کہتے ہو کہ کچھ مضحکہ خیز نہیں۔" اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنسو آنکھوں میں کھیلنے لگے۔ اُس کے زرد چہرہ سے نہایت تکلیف دہ آثار ظاہر ہونے لگے۔ ہونٹ کانپنے لگے۔
"دغاباز دفتریوں اور بے وفا بیویوں کی تو تم ہنسی اُڑاتے ہو" اُس نے کہا" لیکن کون دفتری اور کون بیوفا بیوی نے ایسی دغا کی جیسی کہ میری قسمت نے دغا کی۔ مجھ سا فریب خوردہ نہ تو بنک میں روپیہ رکھنے والا ہوگا اور نہ کوئی مطیع شوہر۔ صرف اس کے سمجھنے کی کوشش کرو کہ میں بھی کسقدر بیوقوف بنایا گیا۔ تمہارے سامنے کی بات ہے کہ پارسال خوشی کے مارے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے اور اب تمہارے سامنے......
وحید کا سر تکیہ میں چھپ گیا۔ اور وہ ہنسنے لگا۔" اِس انقلاب سے زیادہ شاید ہی کوئی چیز قیاس میں آسکیگی۔ پہلا باب محبت، شادی۔ شادی حقیقی معنوں میں دوسرا باب تلاش معاش، بینئے کی دوکان، تھیٹر، دوا ساز کی دوکان اور...... کل کیچڑ اور

پانی میں چلتا ہوا قبرستان کو"
اُس نے ہنسنا شروع کیا۔ مجھپر بیحد رقت طاری ہوئی۔ میں جانے کے لئے تیار ہو گیا
"مین تم سے کہتا ہوں کہ تم کچھ دیر آرام کر لو۔ مین دواساز کی دوکان ہو آتا ہون"
اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مین نے اپنا لبادہ پہن لیا۔ اور کمرہ کے باہر چلا۔
آگے بڑھنے پر جنازہ نظر پڑا جس کے قریب مرجان بیٹھی ہوئی تلاوت میں مصروف تھی۔
مین نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر غور کیا۔ لیکن بہ ہیئت، زرد رنگ زہرا کو نہیں پہچان سکا
جو کبھی حسین، دلربا اور گھٹاؤں کی کمپنی کی روح رواں تھی۔
"رہے نام اللہ کا" میری زبان سے نکل گیا۔
اِس کے بعد ہی مین باہر نکل گیا۔ ریوالور کو بھی لیتا گیا۔ دواساز کے پاس پہونچا۔
چلے جانے کا مجھے خیال بھی نہیں آیا۔ جب میں پھر واپس ہوا تو وحید کو بیہوش پڑا پایا پٹیاں
بُری طرح پھاڑ دی گئی تہین۔ اور زخموں سے خون جاری تھا۔ پو پھٹنے سے پہلے میں اس کو
ہوش میں لانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس پر بحران کی حالت طاری تھی۔ جسم کانپ رہا
تھا۔ اور دن نکلنے تک اُس کی حسرتناک نظریں کمرہ کے اطراف پھرتی رہیں۔ مردہ کو غسل
دینے والوں کی آوازیں ہمارے کان میں آنے لگیں۔
جب وحید کا کمرہ خویش واقارب سے بھرا ہوا تھا۔ اور میت اپنے آخری ٹھکانے
کی طرف جا چکی۔ تو مین نے اسکو مکان ہی میں آرام کرنے کی تاکید کی لیکن میری بات وہ کب
ماننے والا تھا۔ باوجود شدید درد، صبح کی سردی اور بارش کے وہ اپنی کر رہا تھا۔ ننگے سر
قبرستان تک خاموشی کے ساتھ جنازہ کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ قدم اُٹھانا مشکل تھا۔ زخموں
کو نوچ پھاڑ رہا تھا۔ اس کا چہرہ حیات سے بیزار معلوم ہوتا تھا کئی دفعہ چھوٹے چھوٹے
سوالات کرکے اُس کو اس کی محویت کی حالت سے نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک دفعہ
اُس نے باڑ پر نظر ڈالی اور کچھ دیر تک اُس کی آنکھوں سے غم وغصہ کے آثار ظاہر رہے۔
"حکیم محمد عبد القدوس سند یافتہ" ایک تختہ پر پڑھا" جاہل نادان انسان انہیں شیطان
پکڑلے"۔ قبرستان سے اُس کو میں گھر لے گیا۔

اِس یادگار رات کو اب صرف ایک سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ اور بمشکل وحید کا وہ جوتا

بھی پھٹا ہوگا۔ جس کو پہنے ہوئے اُس نے کیچڑ پانی میں اپنی بی بی کے جنازے کا ساتھ قبرستان تک دیا تھا۔

اِس قصہ کو اب میں ختم کر رہا ہوں۔ وہ اِس وقت میرے دیوانخانہ میں بیٹھا ہوا ہے اور ہارمونیم کے پردوں کو چھیڑ رہا ہے۔ میں پردہ کا موید نہیں اِسلئے پردہ شکن بیویوں اور لڑکیوں کا اجتماع یہاں اکثر رہتا ہے۔ چنانچہ اِس وقت بھی ایسا ہی ایک موقع ہے۔ کچھ لڑکیاں جو وحید کی دوست ہیں، اُن کو یہ اس وقت دیہاتی لڑکیوں کے گانے کی نقل کرکے بتلا رہا ہے لڑکیوں کی خندہ زنی سے سررشتہ خیال گم ہے۔ وحید کیا کر رہا ہے؟ وہ بھی ہنس رہا ہے اِس کو وہ لطف حیات سے تعبیر کرتا ہے۔

میں اُس کو اپنے کتب خانہ میں بلاتا ہوں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دلچسپ صحبت میں میری صدا مداخلت کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ آتا بھی ہے تو اسطرح کہ میری میز کے سامنے ڈٹ جاتا ہے گویا اہم مشاغل والے آدمی کی طرح اس کو گفتگو کا بھی وقت نہیں ہے۔

مین نے یہ قصہ اس کو پڑھنے کے لئے دیا۔ دنیا میری قدرت قصہ نگاری کی قائل ہو تو ہو لیکن یہ اس کو کبھی تسلیم نہیں کرتا۔ ایک ٹھنڈی سانس بھرتا ہے، اور آرام کرسی پر دراز ہو کر اسپر تنقید شروع کر دیتا ہے۔

"رچوٹھے بہاڑیں جھونکو۔ کیسے ہوشربا واقعات ہیں!" مُسکراہٹ کے ساتھ گنگنانے لگتا ہے۔ لیکن آگے جس قدر وہ بڑھتا جاتا ہے، چہرہ پر سنجیدگی کے آثار نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ آخر کار دلشکن ماضی کے حالات اس کے چہرہ کو زرد بنا کر چھوڑتے ہیں، وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن پڑھنا جاری ہے۔ ختم کرکے ٹہلنے لگتا ہے۔

"قصہ کسطرح ختم ہو رہا ہے"؟ مین نے دریافت کیا۔

"قصہ کس طرح ختم ہو رہا ہے"؟ ہوں ان ان ...."

وہ کمرے کو، مجھکو اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ اس کو اپنی وضعدار نئی شیروانی کا خیال آتا ہے دوست لڑکیوں کی ہنسی کی آوازیں سنتا ہے .... ایک کرسی پر بیٹھکر وہی ہنسی ہنستا ہے جو اس رات میں دیکھی گئی تھی۔

"کس قدر درست کہتا تھا کہ یہ سب حماقت ہے؟ خدایا! کیا بوجھ اٹھا رہا ہون جو ایک ہاتھی کی پیٹ بھی توڑ دیگا۔ خدا جانتا ہے مجھے کیا تکلیفین اُٹھانی پڑی ہیں شاید ہی کوئی

ایسی تکلیفوں میں مبتلا ہوا ہوگا۔ اور اب کہاں ہیں وہ اثرات؛ تعجب ہے۔ ایک سبکسار ساحل یہ خیال کریگا کہ زحمتوں کے اثرات انسان پر ہمیشہ مسلط رہتے ہیں اور کبھی محو نہیں ہوتے۔ لیکن کہ وہ کس طرح آسانی کے ساتھ ایک "مارکٹی"[1] جوتے کی پائداری سو بھی جلد محو رہے ہیں۔ کچھ باقی نہیں۔ گویا ہمنے کبھی مصائب اٹھائے ہی نہیں تھے اور ہمیشہ ناز و نعم میں رہا۔ اِس عالم کی ہر شئے فانی ہے اور فنائیت خود بیکار ہے؛ ظریفوں کے لئے ایک وسیع میدان ہاتھ لگا ہے۔ یار! کسی ظریفانہ خاتمہ پر قصہ ختم کرو"

"وحید! وحید! جلد ادہر آنا" لڑکیوں نے بے صبر ہوکر پکارنا شروع کیا۔

"آیا" اِس "تہی مغز کمزور فطرت" کا جواب ہوتا ہے۔ "دوست یہ سب کچھ لغو اور قابل رحم اور لغو ہے۔ لیکن کریں کیا؟ خدا میں بڑی قدرت ہے۔ مادر فطرت کی تعریف کرتا ہوں کہ ہئیت کی تبدیلی میں اس کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ اگر ہمارے دردسر کی تکلیف دہ یاد اور ہر ایک پر گزرے ہوئے مصائب کی یاد تازہ رہے تو یقیناً ہم خاکیوں کی حیات نہایت خسارہ میں رہے۔

میں اس کے خندہ زنان چہرہ پر دیکھتا ہوں تو سال بھر پہلے کی اس کی وہ مایوس اور مہیب صورت یاد آجاتی ہے جب وہ تاریک دریچہ پر نظریں گاڑے ہوئے تھا اور جب اس کی ذہن ہرزہ درائیوں اور تبدیل ہئیت کے متعلق نظریوں کو سنتا ہوں تو معاً اس کا خون کے ڈبرے میں زمین پر بیٹھنا اور مایوس عاجزانہ نگاہوں سے دیکھنا یاد آجاتا ہے۔

"قصہ کس طرح ختم ہوگا؟" میں باواز اپنے آپ سے پوچھتا ہوں۔

وحید سیٹی بجاتے ہوئے اور اپنی شیروانی کا کالر درست کرتے ہوئے میرے کمرہ سے نکلکر دیوانخانہ میں چلا جاتا ہے۔ میری نظریں اس کے ساتھ جاتی جاتی ناراض واپس ہوتی ہیں۔ چند وجوہات سے مجھے اس کی گذشتہ مصائب پر ترس آتا ہے۔ اس مہیب رات میں اس شخص پر ترس کھانے پر مجھے تاسف ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری کوئی شئے کھو گئی ہے ...."

---

[1] "مارکٹی" سے اس کی مراد وہ کم قیمت جوتے ہیں جو افضل گنج (حیدرآباد دکن) کے قریب مارکٹ میں بیچے جاتے ہیں۔

بہرام گور دکھن میں

"ہمارے لایق دوست مولوی ابو الحسنات، سید غلام محی الدین صاحب قادری زور ایم۔اے عثمانیہ یونیورسٹی کے وہ قابل قدر طالب علم ہیں کہ جنھوں نے اپنی غیر معمولی جودت اور اپنے تنقیدی مقالات کی وجہ سے ملک میں ایک خاص امتیاز حاصل کرلیا ہے۔" اس وقت موصوف انگلستان میں سرکار عالی کی جانب سے "لسانیات" کی تحقیقاتی تعلیم میں معروف ہیں، وہاں بھی وہ اپنی جودت طبع کے باعث مشہور ہو چکے ہیں، آج کل برٹش میوزم کی فہرستوں کی تنقید میں منہمک ہیں، ان فہرستوں میں جو جو فرو گزاشتیں ہوگئی ہیں اُن کی تصحیح کے ساتھ فہرستوں کے بعد کی داخل شدہ کتابوں کی بھی ایک فہرست تیار کر رہے ہیں جو غالباً ان فہرستوں کے ضمیمہ کے طور پر برٹش میوزم کی جانب سے شایع ہوگی۔ یہ مضمون اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔" (مجلّہ مکتبہ)

"یہ وہ مشہور نیم تاریخی شخصیت ہے جس کے متعلق فارسی میں بعض دلچسپ فسانے لکھے گئے ہیں اور جن کی غیر معمولی قبولیت نے دوسری زبانوں کے سخنوروں کو بھی اس موضوع پر طبع آزمائیاں کرنے کا شوق پیدا کر دیا۔

دکھنی زبان میں 'نہ معلوم' اس کے متعلق کتنے قصے لکھے گئے۔ اب تک جن تین کارناموں کا پتہ چلا ہے۔ اُن کی نسبت بھی' افسوس ہے کہ' عام طور پر غلط معلومات کی اشاعت ہوئی ہے۔ چنانچہ ان اصولی غلطیوں کی تردید بھی اس مضمون کے مقاصد تحریر میں داخل ہے۔

اصل موضوع پر قلم اُٹھانے سے پہلے اس امر کا ذکر شاید نامناسب نہوگا کہ فارسی حصوں میں۔ ۱۔ نظامی کی "ہفت پیکر" ۲۔ ہاتفی کی "ہفت منظر" ۳۔ خسرو کی "ہشت بہشت" اور ۴۔ امین کی "بہرام و گل اندام" کے علاوہ برٹش میوزم ہی میں اس موضوع پر (گورنی زبان میں ایک' گجراتی میں ایک' پنجابی میں دو' اور اردو نثر میں ایک ——— حبلہ باقی

اور کتابیں موجود ہیں جن میں سے اکثر کا ذکر دکھنی مثنویوں کے اسی تبصرے میں موقع بموقع آتا رہے گا۔"

(۱)

دکھن میں بہرام کے متعلق سب سے قدیم مثنوی "بہرام و بانوحسن" ہے۔ یہ ۱۰۵۰ھ میں لکھی گئی ہے، جیسا کہ کتاب کے آخر کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے جو بعد میں نقل کئے جائینگے فی الحال یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ مصنف گولکنڈہ کا تھا یا بیجاپور کا۔

برٹش میوزیم کے کیٹلاگ میں (دیکھو صفحہ ۲۰ مخطوطہ نمبر ۲۴) مصنف کا نام دولت لکھا گیا ہے۔ حالانکہ اِس کا اصلی مصنف امین ہے۔ جس کے بعض ثبوت یہ ہیں۔

۱۔ حمد کے خاتمہ اور نعت کے آغاز کے وقت لکھا ہے۔

امین کر ثنا بیچ آخر کلام محمدؐ پر بھیجو درود و سلام (ورق ۲-۱)

۲۔ اپنے مرشد کے ذکر میں۔

امین شاہ عالم ہمارے ہیں پیر ہیں روزِ حشر میں میرے دستگیر (ورق ۲-ب)

امین آستانہ کا توں خاک ہو حشر کے گنہ سے توں بے باک ہو (" " ")

۳۔ وجہ تصنیف وغیرہ کے ذکر میں۔

امین داستانہ قصہ اب کہو خدا کے ثنا بیچ دایم رہو

۴۔ برٹش میوزیم میں گجراتی ہجی میں جو نسخہ بہرام و بانوحسن کا موجود ہے (دیکھو کیٹلاگ اُردو صفحہ ۲۰ مخطوطہ نمبر ۴۴) وہ دراصل یہی مثنوی ہے۔ لیکن گجراتی میں پہلے کے ۵۳ شعر چھوڑ دینے کے بعد حسب ذیل شعر سے آغاز کیا گیا ہے۔

زبان پر سخن خوب آتا چلا یو مضمون خوش تر بناتا چلا

اور اسی طرح کتاب کے آخر میں ۱۹ شعر چھوڑ دیئے گئے ہیں اور اُس کو اِس شعر پر ختم کر دیا گیا ہے۔

منگا تخت زریں بٹھلا کر شہنشاہ بانوحسن سوار کر (۹)

لیکن ابتدا میں اتفاق سے امین تخلص ظاہر کرنے والا حسب ذیل شعر بھی آگیا ہے جو ثابت کرتا ہے کہ واقعی یہ مثنوی امین کی ہے۔

امین داستانہ قصہ اب کہو خدا کے ثنا بیچ دایم رہو

تاہم دولت بھی اِس کا مصنف تھا۔ اُس نے غالباً اِس کا آخری حصہ لکھا ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ کتنے شعر اُس کے نتیجۂ قلم ہیں۔ مرتبِ کٹلاگ نے صرف آخر کے حسب ذیل شعروں کو دیکھکر دولت کو اِس کا مصنف قرار دے دیا تھا۔ حالانکہ انہی میں صاف طور سے بیان کر دیا گیا ہے کہ امین نے اس کو ناقص چھوڑ دیا تھا اور دولت ایک دوسرے شاعر نے اس کو ختم کیا۔

ہوئے بیت صد چار اور اک ہزار ۔۔۔ بیان اِس کا دولت کیا آشکار
امین نے ناقص رکھا تھا اوسے ۔۔۔ کہ دولت نے پورا کیا اب اوسے
سنہ ایک ہزار اور پنجاہ میں ۔۔۔ جمعہ روز (۹) ربیع ماہ میں
بفضل الٰہی کیا میں نظم ۔۔۔ بتاریخ چہارم کیتا ختم
پڑے اور سنے جو کرے مجکوں یاد ۔۔۔ خوشی سیں کرے وہ اپن دل میں شاد
تنا شعر میرے کی میں نہیں کیا ۔۔۔ طبیعت کی زوری سے زینت کیا
غلام ہوں میں سادا تون کا در اصل ۔۔۔ میں ہون خاکپا اُن کا از صدق دل
دعا کر یو مجہ حق اسے مومناں ۔۔۔ چھڑاویں نبی میرے تئیں بے گماں
کیا قصہ دولت نے یہ جب تمام ۔۔۔ بحق محمدؐ علیہ السّلام

دونو شاعروں (امین اور دولت) کے متعلق بیرونی ذریعوں سے اِس وقت تک کوئی حالات معلوم نہو سکے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ امین کے تخلص کے اور دو مصنف قطب شاہیہ دور میں ملتے ہیں۔ لیکن اِس امین سے اُن دونو کو کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا کیونکہ

۱۔ شاہ بہرام و بانوحسن کا مصنف غالباً ۱۰۵۰ھ سے پہلے مرچکا تھا ورنہ دولت کو اِس کا شروع کیا ہوا قصہ ختم کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ غالباً وہ خود کرلیتا۔

۲۔ یوسف زلیخا (دیکھو اسپرنگر کٹلاگ اودہ صفحہ ۶۰۱) کا مصنف شیخ محمدؐ امین اورنگ زیب کے زمانہ میں (۱۱۰۹ھ میں) قصہ لکھتا ہے۔ یہ غیر معمولی بات معلوم ہوتی ہے کہ تقریباً ۶۰ سال تک بہرام والا امین ہی زندہ رہا ہو۔ نیز یہ کہ ۶۰ سال کے بعد ایک اور کتاب "یوسف زلیخا" لکھے اور خود اپنی شروع کی ہوئی "بہرام و بانوحسن" کو نہ ختم کرے۔

۳- قصۂ شمہ (دیکھو کٹلاگ اُردو انڈیا افس صفحہ ۴۳) کا مصنف ابوالحسن تاناشاہ کے عہد حکومت میں (یعنے ۱۰۸۳ھ کے بعد) ۱۹ سال کا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ جو شخص ۱۰۸۳ کے بعد ۱۹ سال کا ہو ۱۰۵۰ میں تو پیدا ابھی نہوا ہوگا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ امین نمبر ۲ اور ۳ ایک ہی شخص ہو۔

برٹش میوزیم میں "بہرام وگل اندام" نام ایک مثنوی فارسی میں ہے جس کے مصنف کا تخلص بھی امین ہی ہے۔ (دیکھو مخطوطہ فارسی۔ اور نیل نمبر ۳۳۴۱)

امین بگذر ز پوچ خود کہ تا کے ⁂ بہ لب کف آوری و بر جبیں خوے

اِس خیال سے کہ شاید دونو ایک ہی مصنف کے ہوں، اُن کا مقابلی مطالعہ بھی کیا گیا لیکن فی الحال کوئی قطعی رائے نہیں قایم کی جاسکی۔ اتنا ضرور ہے کہ ان دونوں قصہ بالکل مشترک معلوم ہوتا ہے متعدد مقامات پر اشعار کے اشعار ہم مطلب ہیں۔ مثلاً

۱- دیو اور بہرام کی ملاقات کے وقت بہرام کی گفتگو۔

فارسی میں۔ کہ بنشین پیش من اے دیو بہتر ⁂ ز استادن نشستن از تو بہتر
چرا ہستی تو استادہ بہ پیشم ⁂ بیا، بنشین، بخور ساغر ز دستم
تو پیش من بخور مے من بہ پیشت ⁂ وگرنہ من ہمی ترسم ز نیشت
نشست آں دیو پیش شاہ و مے را ⁂ بخورد و گوش کرد آواز نے را

اُردو میں دیا شاہ نے دیو کوں تب یہ جواب ⁂ کہ آؤ اپن مل کے پیویں شراب
گیا شہ کے نزدیک تسلیم کر ⁂ بٹھایا شہنشاہ نے تعظیم کر
دو لوں مل کے بیٹھے ہوئے ہم کلام ⁂ گئی شاہ کے دل کی دہشت تمام
کیا شاہ اور دیو نیں مے کشی ⁂ ہوئے آپ میں آپ دونو خوشی

۲- بانو حسن یا گل اندام کی بہرام سے ملاقات کی تقریب۔

فارسی میں۔ ز چشمہ خویش را بیروں کشیدند ⁂ نظر کردند و رخت خود ندیدند
بہر سو جست و جو کردند بسیار ⁂ ندیدند ہیچ کس را جز پے یار
پری رخ در تعجب گشت و استاد ⁂ پری روے دگر آواز بر داد
کہ ہر کس برد رخت ما ازیں جا ⁂ بیاید خود شتاباں بر در ما
ہر آں کارے کہ دارد ما بر آریم ⁂ برائے خاطر او جاں سپاریم

اُردو میں نہ دیکھا اپس رخت کوں ٹھار پر | اوٹھیاں وہ ترت سینہ (پر) بار کر
وو رونے لگیاں وہا (ں) اپنٹ زار زار | صبر کر گریباں کے تئیں پھاڑ پھاڑ
وہاں ڈھونڈیا (ں) بہوت بیزار ہو | اپس میں وہ سب آپ لاچار ہو
کھڑیاں ہو اُسی ٹھار کیتا اواز | کہ اے دزد چھندی و حیلہ دراز
تو ہو آدمی یا فرشتا مگر | کہ ہے جن پری دیو بیدادگر
تو ہوئے اپس کی کہے آمراد | قسم ہے خدا کی کریں اُس کو شاد

۳- بہرام کو گورخر کا لے اڑنا۔

فارسی میں بر آورد از کمر قمچی وزد شاہ | بجست و خیز آمد گور ناگاہ
بسوے آسمان پرید از جا | بسانِ بازگشت او بادپیا
اُردو میں ماری قمچی شہ نے اُسی آن پر | اڑا شہ کوں لیکر وہ اسمان پر

اگرچہ ان فارسی اور اُردو مخطوطوں میں قصہ بہت زیادہ ملتا جلتا ہے لیکن ان دونوں میں حسب ذیل اختلافات بھی ہیں۔

۱- اُردو میں معشوق کا نام بانو حسن ہے اور فارسی میں گل اندام۔

۲- اُردو میں بہرام کو بیس برس کی عمر سے پیش کیا ہے اور ایک دم قصہ شروع کر دیا ہے فارسی میں بہرام کے پیدا ہونے سے قبل اُس کے باپ کی بچہ کے لئے خواہش دکھائی ہے۔ پھر بچہ پیدا ہوتا ہے جو بڑا ہوشیار نکلتا ہے۔ لیکن شکار کو جانے اور اُس کے بعد گورخر کے بہرام کو لے اُڑنے کے بعد دونو قصے متحد ہو گئے ہیں۔

۳- فارسی میں جب گورخر غائب ہو جاتا ہے تو پہلے ایک سفید پوش انسان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے لیکن اُردو میں ایک دم سفید دیو کی شکل میں آنکلتا ہے۔

تاہم اِن اختلافات کے باوجود جو یگانگت ہے وہ زیادہ قابل لحاظ ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ دکھنی امین نے اِسی فارسی قصہ کا ترجمہ کیا ہو۔

دکنی مثنوی "بہرام و بانو حسن" سے امین کے متعلق صرف اِس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ حنفی مذہب کا پیرو تھا اور شاہ عالم نامی کا مُرید۔ ایک فارسی قصہ دیکھکر اُس کا ترجمہ کرنے کا

خیال پیدا ہوا اور چونکہ طبیعت میں روانی تھی آسانی سے شعر نکلنے لگے۔ باوجود شاعرانہ قوت کے شاعر نہایت خاکساری اور انکسار سے کام لیتا ہے۔

دولت نے اِس قصہ کو بروز جمعہ ۱۴ ربیع (اول یا دوم؟) ۱۰۵۰ھ میں ختم کیا۔ تقریباً ۱۴۰۰ اشعر ہیں۔ دولت کے متعلق صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنی آپ تعریف کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اور سیدوں کا خاص طور پر معتقد تھا۔

قصہ کا آغاز حمد سے ہوتا ہے۔ جس کے بعد چند شعر نعت اور چار یار، حسن، حسین، اور فاطمہ کی ثنا میں لکھے گئے ہیں۔ زبان صاف ہے نمونہ کے طور پر نیز کتاب کے متعلق کچھ اور معلومات دینے کے لیئے چند آغازی شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

کیا حمد اور نعت کوں مختصر　　نہیں ہیں کیا طول یو سر بسر
یکایک میرے دل پر آیا خیال　　قصا ایک کہوں میں مقیمیں مثال
زبان پر بچن خوب آتا چلا　　یو مضمون خوشتر بناتا چلا
مرے شعر نادر سنو اے عزیز　　زباں کوں کیا ہوں سخن خوش تمیز
زباں پر ہے جس کے موتی آبدار　　اُسی کے بچن کا ہے اکثر وقار
مرے شعر کی میں ثنا نہیں کیا　　جو ہر مجھ زباں کا عیاں نہیں کیا
قصا میں کیا ہے جو گل نام کا　　سو بانو حسن شاہ بہرام کا
جو کوئی پڑے سو کرے مجکوں یاد　　تعجب سے دل کوں کرے اپنی شاد
آئین داستانہ قصہ اب کہو　　خدا کے ثنا بیچ دایم رہو
قصا فارسی سن کے پائی خبر　　خدا کے جو قدرت میں یک تھا شہر
کہ فارس اُسی شہر کا نام تھا　　وہاں بادشاہ شاہ بہرام تھا

---

(۲)

اس موضوع پر دوسری اہم دکھنی مثنوی ملک خوشنود بیجا پوری کی "ہشت بہشت" ہے۔ یہ محمد عادل شاہ کے زمانہ میں (یعنے ۱۰۳۶ھ-۱۰۶۷ھ کے درمیان) لکھی گئی ہے۔ زیر نظر مخطوطے سے تاریخ تصنیف کا جو پتہ چلتا ہے اُس کی طرف برٹش میوزیم کے مرتب کٹلاگ کی توجہ منعطف نہیں ہوسکی حالانکہ ایک جگہ مصنف نے اِس کا ضرور ذکر کیا ہے کہ ؎

ملک خوشنود موتی صاف رولیا اپس کے نانو کا تاریخ بولیا

اِس سے بظاہر تو کوئی کام کی بات نکلتی نظر نہیں آتی۔ لیکن غور و خوض سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اپنے تخلص ہی سے اپنی تصنیف کا سنہ نکالتا ہے۔ یعنے ممکن ہے کہ ملک خوشنود سے تاریخ نکلتی ہو (۱۰۵۶ھ) اِس لفظ کو خوشنود نہیں بلکہ "خشنود" لکھا ہے۔ یہ تاریخ اِس لئے بھی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ مصنف نے محمد عادل شاہ کے عہد حکومت میں اِس مثنوی کے تصنیف پانے کا ذکر کیا ہے اور اُس کا عہد حکومت جیسا کہ اُوپر لکھا گیا ہے [illegible] سے [illegible] تک تھا۔

برٹش میوزیم کے کٹلاگ میں (دیکھو صفحہ ۳۲، مخطوطہ نمبر ۵) مصنف کا نام محمد شاہ لکھا گیا ہے یہ غلط ہے۔ کتاب میں متعدد جگہ مصنف نے اپنے تخلص کا استعمال کیا ہے جس کے بعض ثبوت یہ ہیں۔

۱۔ نعت کا آخری شعر دلا تج لطف کا دارو نبی پاک بندے خوشنود کا جیو ہے دردناک (ورق ۶۷-ا)

۲۔ منقبت کا آخری شعر بندے خوشنود پر شہ کا نظر ہے مرا جنت نگر کے بیچ گھر ہے (ورق ۸۰-ا)

۳۔ مدح بادشاہ کا آخری شعر ملک خوشنود موتی صاف رولیا اپس کے نانو کا تاریخ بولیا (ورق ۸۰-ا)

۴۔ ایک قصہ کے آخر میں مٹھائی ہے بہوت اِس داستان میں رہیا ہے یاد تو سب کی زبان میں
جو کوئی دیکھے سو پاوے مدعا سب بندے خوشنود کوں کرنا دعا سب (ورق ۸۰-ا)

۵۔ ایک اور قصہ کے آخر میں بندے خوشنود کوں توں نا بسرنا دعاے خیر میرے حق پو کرنا (ورق ۱۰۸-ب)

۶۔ ایک اور قصہ کے آخر میں اتنکے جیو کے طوطی کا ہے چارا کیا خوشنود نے اتمام سارا (ورق ۱۱۷-ا)

۷۔ ایک اور قصہ کے آخر میں بندے خوشنود اوپر لطف دہرنا بچن سن ملک دعا سوں یاد کرنا (۱۳۰-ا)

۸۔ ایک اور قصہ کے آخر میں بندے خوشنود کا نادر بچن ہے مجکو (جو کوئی) سمجھے اُو سے سب نور تن ہے (۱۴۹-ا)

۹- ایک اور قصے کے آخر میں: مٹھائی بات میں جو پاوے ساری — کہے خوشنود کا ہے یادگاری (۱۶۲-ر)

۱۰- ایک اور قصے کے آخر میں: مرے حق پر بکل کرنا دعا سب — یہی خوشنود کا ہے مدعا سب (۱۶۴-ر)

۱۱- بہرام کی وفات کے ذکر کے بعد: چلے جوں نیک مرداں چل توں خوشنود — خدا حاصل کریں گا دل کا مقصود (۱۶۶-ر)

۱۲- کتاب کا آخری شعر: بچن نادر ورق سب زرنگاری — ملک خوشنود کا ہے یادگاری (۱۶۸-ر)

مرتب کٹلاگ کو غالباً اِس وجہ سے غلط فہمی ہوئی کہ مثنوی کے آخری شعروں میں یہ شعر بھی شامل ہیں:-

کیا میں تو کتاب یو جگ میں مشہور — رہیا دنیا میں یوں جوں کھن اور سور
لکھیا کاتب عجب خوش خط زیبا — محمد شاہ ابن حاجی بابا
بزرگاں کے بچن میں کان دھرنا — کسی پر عیب دھر غیبت نہ کرنا
بدی سوں جن مراغیبت کرے گا — خدا ہور مصطفےٰ کوں ناڈرے گا
رہے گنبد منن اسمان کا ساز — جگچ بولے وہی آتا ہے آواز

معلوم ہوتا ہے کہ خود مصنف نے کاتب کی تعریف (جو کچھ) میں ایک شعر لکھ دیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مصنف نے ابتدا ہی سے مثنوی کو محمد شاہ کے ہاتھ سے لکھایا ہو۔ بہر حال یہ ایک انوکھی بات ضرور ہے کہ متن کتاب میں کاتب کا نام بھی آجائے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بعد کا اضافہ ہوگا۔ کیونکہ اِس شعر کے بعد پندرہ بیس شعر اور ہیں جو حسب ذیل بیتوں پر ختم ہوتے ہیں:-

جو ہے میر کتاب یو سب جہاں میں — عزیزوں گر اچھے سب کی زباں میں
اُسے توں خاص کر سار یا کسی من میں — کھلے دل دیکھ اِس جوں پھول بن میں
پشانی عجز کا ہیں پر دھریا ہوں — کتاب یو ختم کر سجدہ کریا ہوں
کروں میں شکر حق کا کیا بیاں ہے — جواہر بات کا مج کوں دیا ہے
کیا ہوں بیت کا نادر شماریو — جو ہے دو سو پچیس اور تین ہزار یو
بچن نادر ورق سب زرنگاری — ملک خوشنود کا ہے یادگاری

اگر محمد شاہ والے شعر کو اضافہ سمجھا جائے تو انہیں بھی اضافہ ہی سمجھنا پڑے گا لیکن انہیں شاید ہی کوئی اضافہ سمجھ سکے۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مصنف نے اشعار کی تعداد ۲۲۲۵ بتائی ہے لیکن زیر نظر مخطوطہ میں ۲۰۰۰ دو ہزار سے بھی کم شعر ہیں۔

مصنف کے متعلق کتاب سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی گم نام شاعر نہیں تھا اُس نے اس سے قبل یوسف زلیخا پر بھی طبع آزمائی کی تھی۔ اُس کا کلام مشہور ہو چکا تھا۔ نیز یہ کہ محمدؐ عادل شاہ اُس کا خاص طور پر قدرداں تھا۔ چنانچہ یہ کتاب بھی اُسی کی فرمایش سے لکھی گئی ہے۔ یہ حالات اُن اشعار سے معلوم ہوتے ہیں جو محمدؐ عادل شاہ کی مدح کے سلسلہ میں کتاب کے آغاز میں لکھے گئے ہیں اور جو آئندہ پیش کئے جائیں گے۔

مصنف اور اُس کی تصنیفات کے متعلق کسی اور ذریعہ سے اب تک کوئی معلومات نہ ہو سکیں

امیر خسرو کی "ہشت بہشت" سے اِس کا مقابلہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اُس کا بعینہ ترجمہ ہے۔ بہت کم ملک خوشنود نے اپنی طرف سے اضافہ یا تغیر و تبدل کیا ہے۔

عام مشرقی کتابوں کی طرح حمد سے آغاز کیا گیا ہے، نعت کے بعد دکھنی کی دوسری مثنویوں کی طرح معراج کا مستقل عنوان قایم کر کے اُس کا تفصیلی بیان لکھا ہے۔ پھر منقبت شروع کی ہے جس کے ساتھ ہی اپنے متعلق عجیب طرح سے حالات شروع کئے ہیں جن کے بعض شعر یہ ہیں:-

عجب یک ٹھار میں گلزار دیکھا ۔۔۔ بخل (؟) جوں حسن کا بازار دیکھا
رنگارنگی کھلے پھولاں چمن میں ۔۔۔ او چاے شور بلبل پھولبن میں

اِسی سلسلے میں قسم قسم کے پھولوں کی حالت بیان کی ہے اور لکھتے ہیں:-

دعا منگتے چناراں کھول ہاتاں ۔۔۔ کھڑے تھے ذکر کرتے پھول باتاں
بڑا اس باغ میں یک پھول تھا لعل ۔۔۔ امولک جوں رتن میں قیمتی لعل
کھیا ہاتف سُن ادپھول باتاں ۔۔۔ سچ میرے بچن کے صاف دھاتاں
کھیا تجہ پہ نبی کا جم نظر ہے ۔۔۔ علی کے لطف کا تجہ پر گذر ہے
کیا مُنج پر نظر او شاہ غازی ۔۔۔ رہے تو مُنج بچن کوں سرفرازی

ال چشمے بھرے میرے بچن کے | کہ جوں ساں کوں ال چلتے رتن کے (؟)
کیا گوہر فشانی ہیں بچن کا | کیا تو مدح ہیں شاہ دکھن کا

چوں کہ محمد عادل شاہ کی مدح بعض امور کے لحاظ سے اہم ہے اِس لئے ذیل میں اُس کے چند اشعار کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

انتخاب اشعار مدح محمد عادل شاہ

(ورق ۹۷)

توں سلطان محمد شاہ غازی | جہاں کوں شاہ سوں ہے سرفرازی
سخی عادل بہادر نوجواں ہے | قوی طالع ملکیں (؟) ترکماں ہے
بنی کے لطف کا دل ہے خزینا | انگوٹی تو فلک چند رنگینا
کہوں ثانی سکندر باک جم ہے | نین شاہاں کی جس کے ڈرسوں نم ہے
دیکھت شمشیر ہور سن شہ کی ہاکاں | پہاڑاں پھوٹکر ہوتی ہیں پھانکاں
گگن کا توپ نیزے سوں کیا ہے | کرن سورج کا بے پرچم (پرچم؟) کیا ہے
کرے جب شاہ تیراندازی ہنر کا | کلنگ تس بھال سوں ہوے چندر کا
فلک چندر ستارے ہے جداں لگ | جہاں (میں) بادشاہی کرتداں لگ
خضر کا دے الٰہی زندگانی | جتے دشمن ہیں توں کر آج فانی
کھیا ایک روز مجھ شاہ جہانگیر | جو انکی کیمیا کا پاک اکسیر
امولک بخ (؟) دھرتا ہے صافی | قلم ہے تیز کرتا موشکافی
ہنرنادر جو کرتا جیو کوں تازہ | سیتاب ملک میں یو گرم اوازہ
بچن سن دل ہیں بھرتا ہے سکل نور | ملاتا وصل کرتا برہ کوں دور
کہ پھر مجنوں دلیلے کا سمایا | بچن تیرا یو جگ میں شور اچایا
رتن کا کان ہے گر طبع تیرا | ہوس کرتا ہے نادر جیو میرا
ملا ایک ٹھار گر سارے رتن کوں | جگت مشہور کر تیرے بچن کوں
کتاب اُس کا عجب کر زرنگاری | اچھے دو جگ میں نادر یادگاری
کئے جب حکم عادل شاہ سجکوں | اچنبے (؟) خسروی کا ماہ منجکوں

خزینا کر رکھیا ہوں دھیان میں سب کہ جیوں موتی ہے جیو کی کاں میں سب
لگے دریا اُبلنے شوق کے تو دِسے اکثر جواہر ذوق کے تو
رکھیا دل کوں عجب ہمت کی کھن پر کہ جوں نادر چند راو نچے گگن پر
خزینے راز کے کھولیا بچن سوں کیا عنبر فشانی لاکھ فن سوں
قلم روشن کیا گُن کے چراغاں عطارد کے دیا سینے پو داغاں
کروں میں اس ورق کوں یوں جو بولے کو اڑاں عاشقاں کے دل کے کھولے
کیا باتاں سیٹھے جگ میں جیتے ہے عجایب ہور غرایب جس کتے ہے (؟)
پرت اصلی میں سوں شکر لیا ہوں (؟) امولک چاشنی سب کوں دیا ہوں
ہر یک میٹھا بچن تازا سو بولیا بساط اوپر نوا شطرنج کھولیا
عجب اس رنگ کوں خوش باش ہے او بھی ایسا رنگ ہو خوش باش ہے او
لکھوں نا بات سا ہر ایک کہانی اچھے جم عاشقاں میں خوش زبانی
جسے ہے عقل جگ میں ارجمندی وہی نہج شعر کا بوجھے بلندی
وہی بوجھے جو دھرتا صاف سینا دھریا ہوں کس انگوٹھی میں نگینا
اگر کوئی عقل سوں لے یار جانی بہوت خوش حال ہوئے سُن کہانی
کہانی آٹھ بولیا سُن سخن در کہ جوں ہے اٹھ جنت اٹھ کوثر
بہشت تیوں ہر یکس کا ایک نام ہے ملک ہور حور کوثر سب تمام ہے
امولک بیبدل جوں زر نگار ہے جسم (؟) اُس کا ناؤں سو جنت نگار ہے
ملک نو خشنود موتی صاف رولیا ایس کے ناؤ کا تاریخ بولیا

اِس مثنوی کی زبان بہ نسبت اُس کے جو ایسی موضوع کی دوسری مثنوی کے لئے استعمال کی گئی ہے، زیادہ غیر مانوس معلوم ہوتی ہے۔ تاہم بعض بعض جگہ نہایت صاف جملے نظر آجاتے ہیں۔ مثلاً بہرام کی وفات کے بعد دنیا کی بے ثباتی کے متعلق چند عبرت انگیز خیالات اِس طرح سے ظاہر کئے ہیں:۔

عجب بے مہر دنیا بے وفا ہے محبت عین اس کا سب جفا ہے
جتے ہیں دوستاں فرزند ساتی سکل ہے گور لگ اوسب سنگاتی

پہل نیکی کے گھر کا واں بنیاد ترے بعد از کرے سب خلق تجہ یاد
نکر ایسا بدی جو سر دھنا دے موے پیچھے ترا کوئی غم نہ کھاوے (ورق ۲۵، ۲۶)

ہشت بہشت کا تبصرہ ختم کرنے سے پہلے مناسب ہوگا اُس کے چند اختتامیہ اشعار کا انتخاب بھی دیدیا جائے تاکہ ملک خوشنود کی شاعری کے متعلق اُنہیں کے ذریعہ سے کچھ اور معلومات ہوجائیں:۔

ہوا جب یو مرتب نقش گلزار ہوا تو عاشقاں کا گرم بازار
کیا نیاں پو میرا مشتری ٹھاؤں کیا اسمان منج پر لطف کا تھاوں
ہوا جب تے بچن کا گرم اوازا کیا سارے ملک کا مغز تازا
خدا منج خام کو ات بل دیا ہے قلم تو عنبر افشانی کیا ہے
جداں لگ دوت محکم چاند ہور سور جداں لگ ہے یو ان دن رات سمدور
رہے گا تو تلک محکم یو بنیاد بندیا منج طبع کا بے مثل استاد
جگیج جگ میں بشر کا ہے نشانی سو ہے نیکی و بعضے سبے ثانی
گیا تن خاک میں جب تن ہوا خاک ہوا دنیا سوں اُس کا نام سب پاک
کتک اُن کے پچھیں سب آدمی زاد بسر جاتے، نہیں کرتے ہے کوئی یاد
مگر ایسی کتب کا بات تازا رھیا تازے بچن کا گرم اوازا
طبیعت سب کا جوں کنچن ہریا ہے نہ کہنا کوئی جو یو دفتر بُرا ہے

---

(۳)

اِس سلسلہ کی آخری لیکن بہترین مثنوی طبعی کی "بہرام وگل اندام" ہے۔ اِس کا ایک سرسری مطالعہ ہی ظاہر کرتا ہے کہ یہ دکھنی زبان کے بہترین کارناموں میں سے ہے۔ اِس کی زبان، اسلوب بیان، شاعرانہ نزاکتوں اور ادبی حلاوتوں پر اِس مختصر سے نوٹ میں تفصیلی نظر نہیں ڈالی جا سکتی۔

طبعی کی تصنیف ظاہر کرتی ہے کہ اِس کا کہنے والا نہ صرف ایک شاعر ہے بلکہ ایک سلیقہ مند مصنف بھی۔ اُس نے اشعار کی تعداد اور عنوانات کی تقسیم اِسقدر باضابطہ طریقوں پر کی ہے۔

کہ یہ مثنوی بجائے ایک فسانہ کے ایک علمی اور سائنٹفک کتاب معلوم ہوتی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ ساری کتاب یعنے ۱۳۴۰ شعر صرف چالیس ہی دن میں لکھ ڈالے۔

کیا ہوں میں چالیس دن میں کتاب　　　بہوت فکر کر رات دن بے حساب
یو نامہ پڑیں گے تو بہر خدا　　　پڑو فاتحہ نام لیبکر مرا
گنا بیت بیتاں کو میں اک جو دل　　　ہزار اور ہے تین سو پر چہل
اتھا سال تاریخہ کا خوب نیک　　　سنہ یکہزار اور ہشتاد ایک
یو نامے کو طبعی کیا ہے تمام　　　بحق محمد علیہ السلام

زیر نظر مخطوطے میں تقریباً ۱۲۰۵ شعر ہیں۔ نہ معلوم اور ایک سو شعروں کا کیا حشر ہوا۔

طبعی قطب شاہیہ دور کا آخری بڑا شاعر معلوم ہوتا ہے۔ اس کو اپنی شاعری کی خوبیوں کا احساس بھی تھا۔ ملک خوشنود، دولت اور ابن کے برخلاف اُس نے اپنے کمالات کی تعریف بھی کی ہے۔ اور اپنے مخالفوں اور معترضوں پر سخت سے سخت چوٹیں کیں ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِسی موضوع پر لکھنے والے دوسرے شاعروں کی طرح وہ گوشہ نشین نہیں تھا۔ اُس کی شہرت پھیل چکی تھی اور اُس کی شاعری پر لوگوں کی نظریں اُٹھتی تھیں۔

اظہار خود اعتمادی کے ساتھ ہی طبعی دوسرے بڑے شاعروں کی عزت بھی کرتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں وجہی بہت زیادہ مقبول ہوگیا تھا۔ چنانچہ طبعی خواب میں اُس سے اپنی اس مثنوی کی داد حاصل کرتا ہے۔ اور اس خواب کو بھی اپنے کلام کے بہتر ہونے کا ایک ثبوت قرار دیتا ہے۔ بعض اشعار یہ ہیں۔

لگیا میں جو یو مثنوی بولنے　　　یو موتیاں نچھل دھال یوں رولنے
یو وجہی میرے خواب میں اے کر　　　مکھ اپنا سورج ناد دکھلائے کر
سراسر سنیا جو میری مثنوی　　　کیا بات طبعی ہے تیری نوی
ہو خوشحال سن کر یو باتاں مری　　　اپس (غالباً بہا) کے لئے ہاتاں میں ہاتاں میری
پرے پیار سوں اپنا یو شل (؟)　　　سنیا سو پڑیا خواب سے میں اچھل

کتا ہوں سنو کان دھر لوگ ہو | کہاوت ہنے بات ہو آئے سو
اگر شعر کوئی خوب کہکر جو لائے | تو خوباں کوں سن رشک البتہ آئے
یکس کوں سو یک دیکھ سکتے نہیں | یکس کوں سو یک مان رکھتے نہیں
اگر کچھ کہے تو کدھر کا کدھر | کہے تو کہتے ہیں اُسے پیچ کر
اگر خوب جو بولے تو ووں اہے | اگر جو بُرا بولے تو یوں اہے
طبعی توں او کام کر اختیار | کہ رہے تا قیامت ترا یادگار

(زیر نظر مخطوطہ میں بعض مصرعے اور اشعار چھوڑ دیئے گئے جن سے مطلب مسلسل نہیں سمجھ میں آتا)

بزرگ شاعروں کے علاوہ طبعی شاہ راجو اور ابو الحسن تانا شاہ دونوں کا خاص طور پر عقیدت مند ہے۔ اُس کی بادشاہ کے ساتھ وفاداری نہ صرف اُن اشعار سے ظاہر ہوتی ہے جو تانا شاہ کی مدح میں ایک مستقل عنوان سے لکھے گئے ہیں اور جنکا انتخاب آئندہ نقل کیا جائیگا بلکہ دوران نظم میں بھی اپنی بادشاہ پرستی کا اظہار کرتا ہے مثلاً ایک جگہ کہتا ہے۔

جگت کے شہاں سارے اُس ماہ کے | مرے ناو مداح تھے شاہ کے

ساتھ ہی اس امر کا اظہار نامناسب نہوگا کہ اس کتاب کے لکھنے سے قبل بادشاہ کے یہاں طبعی کی غالباً زیادہ قدر نہیں کی گئی تھی جیسا کہ مدح کے آخری اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

مثنوی حمد سے شروع کی گئی ہے جس کے بعض قابل ذکر شعر یہ ہیں ؎

الٰہی یو طبعی ترا داس ہے | دے ایمان اسکوں ترا آس ہے
الٰہی بچن کا منجے تاب دے | مری جیب کی تیغ کوں آب دے
الٰہی بچن کا پلا منجے شراب | کہ بولوں ہر اک بات جوں آفتاب
الٰہی بچن کا دوانہ ہوں میں | کرم تے ترے گرچہ دانا ہوں میں
الٰہی بچن کی منجے دے عروس | سینے کوں لگا کر اُسے دیوں بوس
بچن کی نگن کا منجے ماہ کر | رتن کر منجے توں کہ ہوں میں کنکر
زباں آشنا کر صلاحت ستے | فصاحت، بلاغت، ملاحت ستے
الٰہی تو میرے اوپر رحم کر | کہ تا نا چنے عیب کوئی بے ہنر

زبان طعن کی دور مجہ تے کریں مرے شعر پہ نا زچپ نا دھریں
اگر کہیں غلط یو حکایت اہے کہیں گے تو مین عنایت اہے
الٰہی مرے پر توں ہو مہرباں دو ناداں کے ہاتہ تے دے اماں
اول یک غلط خواں بد آواز تے دوجا عیب جو چور غماز تے

اِن کے بعد نعت اور منقبت کو اِس شعر پر ختم کیا گیا ہے۔

تری مدح بن کچھ نہ دھرتا ہے کام یو طبعی ہے بن دام تیرا غلام

ساتھ ہی شاہ راجو کی ثنا اور پھر تانا شاہ کی مدح کیے بعد دیگرے شروع کی گئی ہے۔ اِن دونو کے بعد وجہ تصنیف کے متعلق جو شعر لکھے ہیں اُن کا انتخاب وجہی کے ذکر میں آچکا ہے۔

قصہ کے اثنا میں ایک غزل بھی آگئی ہے جو بہرام کی زبان سے اُس کے والد کی مدح میں کہلائی گئی ہے۔ اس کی صفائی بیان وغیرہ کے متعلق کچھ لکھنے سے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اُسی کو یہاں نقل کر دیا جائے۔

غزل طبعی

ترے ہات میں شاہ جم جام اچھو ہمیشہ بغل میں دلارام اچھو
جگت کے شہاں میں تو اچہ نیکنام کہ دشمن ترا ہے سو بدنام اچھو
چندر سور کے جام تے آسماں تجے غسل کرنے کوں حمام اچھو
اچھو سب سلامت عزیزاں ترے جہاں لگ عدو ہیں سو گمنام اچھو
اچھے لگ گگن ہور زمین پتیرواں ترے یک پو قربان بہرام اچھو

طبعی کی طبیعت کی باضابطگی کی ایک دو مثالیں یہ ہیں کہ

۱۔ اُس نے ہر عنوان کے تحت ایک ہی تعداد کے اشعار لکھے ہیں مثلاً مدح ابو الحسن میں جتنے شعر لکھے گئے ہیں اتنے ہی مدح شاہ راجو کے لئے لکھے ہیں وغیرہ۔

۲۔ قصہ کے دوران میں ایک موقع ایسا آتا ہے کہ بہرام کا باپ اُس کو سات مختلف اُمور کی نصیحت کرتا ہے جن میں سے ہر نصیحت کو طبعی نے بالالتزام سات سات شعروں ہی میں ختم کیا ہے۔

طبعی کا قصہ ابن و دولت کے قصہ بہرام سے اصولی باتوں میں بہت کم متفرق ہے۔ تاہم

۱۔ سب سے بڑا فرق اس بات کا ہے کہ طبعی نے فارسی قصوں کی غلامانہ تقلید نہیں کی۔ اس کا مقصد صرف قصہ گوئی ہی نہیں بلکہ وہ صحیح طور پر شاعری کرنا چاہتا تھا۔ اس کے قصہ میں جگہ جگہ اونچی شان نمایاں ہے۔

۲۔ زاویۂ نگاہ کے اس فرق کے علاوہ دونوں میں زبان اور اسلوب بیان کا بھی بیحد فرق ہے جس کا ثبوت ایک ہی مطلب کی حسب ذیل دو مثالوں سے بآسانی حاصل ہو سکتا ہے۔

ا۔ مثنوی بہرام و بانوحسن از ابن و دولت۔

بانوحسن کی تعریف میں چند منتخب اشعار۔

عجب سیس پر اس بلنبے بال تھے ۔۔۔ پھنگ شاخ صندل پر رکھوال تھے
جبین دیکھ اس کی چھپے آفتاب ۔۔۔ لے مکھ پر اپس کے رین کا نقاب
بھواں پر اسی کے نظر کر ہلال ۔۔۔ کیا تن کوں لاغر اپس کے کمال
نین دیکھ آہو پریشان ہو ۔۔۔ چمن بیچ نرگس سو حیران ہو
عجب اسکی انکھوں میں ڈوری تھے لال ۔۔۔ کچھن نین کارن بنائی جو چال
ڈو گالاں صفا کی ثنا کی نہ جائے ۔۔۔ دیکھت آشنا اُن کے رشک ت لیائے
سیہ خال نادر تھا اس گال پر ۔۔۔ بھور ہو کے بیٹھا ہے گل لال پر
دو لب آب حیوان لبریز تھے ۔۔۔ کہ با شہد شکر سوں آمیز تھے
اتھے دانت مکھ بیچ ہیرے جڑے ۔۔۔ دہن کے صدف بیچ موتی جڑے
جہاں وہ خوشی سات ہنس بولتی ۔۔۔ گلاں اور موتیاں گئی رولتی
سینہ پر دو پستان انار تھے ۔۔۔ یا دو برج مشکیں تاتار تھے
شکم موج دریائے سیاب ہے ۔۔۔ انئے ناف تس بیچ گرداب ہے
چرن دیکھ چنپا کھلا باغ باغ ۔۔۔ وہ رخ دیکھ لالا ہوا داغ داغ

ب۔ مثنوی بہرام و گل اندام از طبعی

گل اندام کی تعریف میں چند شعر۔

او زعفران دلاں کو ہندولے اہیں ۔۔۔ غلط میں کیا ڈو سنپو سے اہیں

بھنواں باگ نک ہور انکھیاں ہرن — کہ او موہنی ہے عجب من ہرن
او گالاں کی سرخی سو لالی ہیں نیں — او بالاں کی خوشبوی بالی ہیں نیں
دِسے پھول دو سیوتی کے (لے) دو کان — پچنپے کی کلی ناک ہے (دے) دُرفشان
عجایب او چاہ زنخدان ہے — کہ غرق اُسینے دین ایمان ہے
دو جوبن سو چولی کے دو ہاٹ ہیں — جو امریت پھل چھپ رہے پاٹ ہیں
اتھا پیٹ جوں آرسی ناو صاف — کہوں کیا جھمکتا اتھا جیوں شگاف

۴۔ ایک اور اختلاف یہ ہے کہ ایمن کی مثنوی ۲۰ سال کی عمر سے بہرام کو پیش کرتی ہے اور طبعی اُس کی پیدائش سے پہلے ہی قصہ کا آغاز کرتا ہے اور پیدائش تک کے واقعات بیان کرنے کے بعد جب بہرام گورخر کے پیچھے نکل پڑتا ہے وہاں سے ان دونوں کے قصوں میں اتحاد پیدا ہو جاتا ہے اگرچہ جزوی اختلافات کے ساتھ۔

۵۔ طبعی کی مثنوی زیادہ موافق فطرت باتوں کو پیش کرتی ہے فوق فطری باتیں ایمن کے قصہ کو غیر دلچسپ بنا دیتی ہیں۔ گل اندام ایمن کی بانو حسن کی طرح ایک پری نہیں ہے بلکہ بادشاہِ چین کی بیٹی وغیرہ۔

اس موقعہ پر اس غلط فہمی کا ازالہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ طبعی کی گل اندام کو بادشاہ ہندوستان کی بیٹی بتایا گیا ہے حالانکہ زیر نظر مخطوطہ سے اس کا دختر شاہ چین ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ؎

ولایت منے چین کے شاہ تھا — وہ بہو تیج مقبول جوں ماہ تھا
اُسے ایک بیٹی تھی جوں مشتری — نہیں آدمی زاد، تھی او پری وغیرہ

اس مضمون کو طبعی کی حسب ذیل دو مدحوں کے انتخاب پر ختم کیا جاتا ہے جن کا مطالعہ اُس کی ذات اور شاعری دونو کے متعلق ناظرین کی معلومات میں غالباً اضافہ کرے گا۔

مدح شاہ راجو

ولی توں بڑا ہے ہوا گر شاہ راجو — چل آیا ہے شہ تیرے گھر شاہ راجو
چھپیں گا قیامت کے دن روسفید — ترا موں دیکھیا سو کھتر شاہ راجو
فلک پر توں اڑتا ہے شہباز بن — کرامت کی لا شاہ اپر شاہ راجو
خبر تیری معلوم نیں بے خبر کون — خبردار جانے خبر شاہ راجو
مریداں سو تیرے کنول کے ہیں پھولاں — اتمیق توں ہو کے بہور شاہ راجو؟
توں مخدوم سید محمد کی کھن سکا — بہوت بے بدل ہی گہر شاہ راجو
کرامت ہوا سب کوں معلوم یو ظاہر — توں باطن میں کر یک نظر شاہ راجو
دکھن کا کیا بادشاہ بوالحسن کوں — ترا تخت دیکر چھتر شاہ راجو
کھڑا ہو کو خدمت میں تیری سورج — اڑاتا کرنکی چنور شاہ راجو
کسی کا نہیں عیب چنتا توں ہرگز — بڑا تجہ میں ہے یو ہنر شاہ راجو

. . . .

بندا ہو کو کرتا ہے خدمت تری — جدہر توں چلیا تو ادہر شاہ راجو

. . . .

مرا دل ہے جیوں چھاؤں سنگات تری — جدہر توں چلیا تو ادہر شاہ راجو
تیرے عشق کا کیف کھایا سو چڑکر — اترتا نہیں ہے اثر شاہ راجو

. . . .

. . . .

قدم تیرے پکڑیا ہوں امید لے کر — میرے بخت تیرے نظر[۲] شاہ راجو
خدا پاس اچاہات کرتا ہے طبعی — دعا تجکوں شام وسحر شاہ راجو

---

۲ ہو سکے نذر

بادهٔ دکن

(۲)

(لچھمی نارائن صاحب تخلص اورنگ آبادی)

مینخانۂ عاشقی

۱۱۸۷ھ

یہ مثنوی کلیات کے سوا ہے۔ کلیات دست یاب ہونے کے بعد یہ مثنوی میرے ہاتھ لگی۔ اس لئے کلیات کی جدید معلومات کے سلسلے میں اس کا ذکر نہ آسکا۔ "مینخانہ عاشقی" (۱۱۸۷ھ) تاریخی نام ہے۔ محمد فقیہ صاحب درد مند (دکنی) کے مشہور ساقی نامہ کی طرز پر اس کی اٹھان معلوم ہوتی ہے۔ (عمر یافعی)

حمد

خدا کی ثنا کب ہے حد بشر ۔۔۔ اسی حرف پر ہی سخن مختصر

نعت

محمد کی تھی ذات پاک عین رب ۔۔۔ کہ بے میم احمد تھے بے عین عرب[۱]
سو لا احصی آپہی کہے آشکار ۔۔۔ کیے ما عرفناک کے تیں پکار
خدا جب کیا ایں ثنائے خدا ۔۔۔ تو ہم سے ہو کیوں کر ثنا یہ ادا
ثنا کب بھرے جائے اندیشہ میں ۔۔۔ سماتی ہے یہ مے کہاں شیشہ میں

توحید

اسی طرح سے اور رند کور ہے ۔۔۔ کہ بندہ سبھی طرح مجبور ہے
جز اس کے نکلتی نہیں ہم سو بات ۔۔۔ صراحی کی قلقل ہی ساقی کے ہات
خم مے کی سن تو صدا کر کے غور ۔۔۔ کہ یاں بولتا ہے کوئی شخص اور
توجانے ہی یہ خم کی آواز ہے ۔۔۔ ولے جوش مے کا تو یہ راز ہے

سخنِ شیشہ بائے

سنا بزم مستوں میں یں کل کی بات ۔۔۔ کہا شیشہ نے مے سے قلقل میں بات
کہ کیوں ہی تجھے میری صحبت سے ننگ ۔۔۔ تو ہی دختر رز میں فرزند سنگ[۲]
مرے باپ کا گھر ہے دیر و حرم ۔۔۔ کہ ہے کفر و اسلام میں محترم
برہمن کو جیوں بت پہ نت ہے نظر ۔۔۔ حرم میں کہ ہے شیخ بوسِ حجر
عجب کچھ ہے اس کی یہ ذات مجید ۔۔۔ کہ شیخ و برہمن ہیں دو نو مرید
جواہر کہ میرے حقیقی ہیں عم ۔۔۔ بہت کچھ ہیں دنیا میں وو محتشم
کوئی اس سے حرمت رکھے یا دکیا ۔۔۔ کہ رکھتے ہیں شاہوں کے وو سر پہ جا
حقیقی مرے بھائی ہیں سیم و زر ۔۔۔ کہ دنیا میں جن کی بہت ہے قدر
مرے باپ میں کتنی طلسمات ہے ۔۔۔ ہزاروں طرح کی کرامات ہے
غرض یوں نسب میں ہوں ایسا نجیب ۔۔۔ حسب میں بھی ہوں مثل اختر خوش نصیب

---

۱ "عین" کا نون (ن) غنہ پڑھیں تو فصاحت اس کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ اور اگر اسی نون (ن) کا اعلان کیا جائے تو "عرب" کا عین (ع)، الف وصل کا ہم نشین بن جاتا ہے ۱۲

۲ دختر رز شراب کو سنتے آئے لیکن شیشے کو "فرزند سنگ" ابھی سنا ۱۲

پری بھی مرے ہاں کبھی آتی ہے مرے تن کو جو خضادل پاتی ہے دے شیشے پہ شیشے گھڑے پر گھڑے پلا اس طرح واچھڑے واچھڑے

نہ بس میں ازل سے ہوں تیرا فدا بنا اس طرح سینکڑوں آنچ کھا تجھے ناکہوں تو کہوں کس سے اب تجھے مجھ سے اغماض کیا ہے سبب

میں قالب ہوں تو تو مری جان ہے تعجب مجھے تجھ سے ہر آن ہے ترے [illegible] مری ہی یہی گفت و گو کہ قبلہ ہے کعبہ ہے والی ہے تو

کہ مجلس میں جس وقت آتی ہے تو مجھے چھوڑ پیالے میں جاتی ہے تو نہ پیالے سے مجھ کو نہ مے سے ہے کام غلاموں میں تیرے ہوں کمتر غلام

ترے بن مے فانی تنک بو نہیں تجھے پاس اخلاص کی خو نہیں نہ کہتا ہوں دے مجھ کو جام و سبو مجھے میکشوں بیچ دے آبرو

نگہ کر چمن میں تنک غور سیں کہ اب کے بہار آئی کس طور سیں

نہ سمجھیو یہ، وکر کے بیر سے یارا مرا اور ترا اس میں کیا اختیار بھرا سبزہ و گل سے گلشن تمام بھرا مے سے شبنم کے لالہ کا جام

میں اور تو تو ہیں غیر کے ہات میں ہمیں دخل کیا ہے کسی بات میں بھرا بو سیں غنچہ نے مینائی تیں چلیں ندیاں بھر کے دریا کے تیں

کہ جس پیار رکھے ہے وہ رہتے ہیں ہم بتاوے ہے جس طور رہتے ہیں ہم بھرے کس طرح دیکھ تالاب سب ابل کر چلے چشمۂ آب سب

کہاں ہے جنا کے تئیں اختیار یہ غیر میں ہے خزان و بہار نظر کر کے شغل مے آشام کو بھرے ہے رہٹ دم بدم جام کو

نہ بوجھ اس کو نکیں ہے آوا نئے نوازندہ کے لب سے یہ شور ہے تعجب ہے تجھ سا مرا والی ہو مرا جام اس وقت میں خالی ہو

مغنی کے ہاتوں ہوں طنبور دار صدا نکلے ہے مجھ سے بے اختیار رہوں ایسے کرم میں محروم حیف کہوں کیا تجھے میرے مخدوم حیف!

مرا نام صاحب جو مشہور ہے بجا نام زنگی کا کافور ہے بھلا اس طرح فصل گل مفت جائے بہار ایسی بے جام کل مفت جائے

ولیکن یہاں سرسری مت گذر مے حرف وحدت پہ تو کان دھر یہی دم بدم ابر کا شور ہے کہ مے نوشی اس وقت میں زور ہے

تخلص مرا قابل غور ہے۔ مسمی کوئی اسم کوئی اور ہے یہی ہر زماں شور دولاب ہے کہ پُر کیفیت عالم آب ہے

اگر لفظ میں ہوں تو معنے ہے وہ عہ اگر رنگ میں ہوں تو وہ مثل بو اشارت سے نرگس یہ کہتا ہے بات کہ لے جام زریں کے تئیں اپنے ہات

مجھے ایک شب ہوئی ہے بے کلی خم دل سے یہ مے ابل کر چلی شہ گل کا یہ اذن عام ہے کہ لب ریز بہتر ہے جو جام ہے

غم مے سے لالہ چمن میں ہو داغ بھرا اپنے خوں سیتی اپنا ایاغ

چنار اب کہے ہر زماں یا مجیب مرے پنجہ کو جام ہووے نصیب

خطاب با ساقی

ارے ساقی! اے روح بخش جہاں ارے ساقی اے جان کج تن کجا کہے ہے پپیہا کہ جب تک ہے جی ارے جام پی جام پی جام پی

ترے دیکھ کر یہ تغافل کے ڈھنگ بھر آتی ہے چھاتی مری بے درنگ خطِ جام سے ہے مری سرنوشت ہوئی ہے گلِ مے سے میری سرشت

تری گردشِ چشم بس ہے مجھے یہی دور کی اب ہوس ہے مجھے زباں پر مری ہے دعائے قدح مجھے وردِ جاں ہے ثنائے قدح

دو پیالے مجھے دے کے مت بھول جا کہ ہوں بحر لوش اب میں فضل خدا ارے پیاس کے مارے آب آب ہوا تنک میرے منہ میں تو پانی چوا

عہ یہ لہجہ دہلی میں بھی بہادر شاہی عہد تک رائج تھا' (غالب:
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے"

لے نقل۔؟

پلا دے مجھے تیں اس قدر ایک دم ۔۔۔ کہ بھولوں میں دنیا و عقبیٰ کا غم
یہ دنیا سراسر غم آباد ہے ۔۔۔ غنیمت ہے وہ دم کہ جو شاد ہے
نظر کر ذرہ حالت آبشار ۔۔۔ کہ روتے ہی گذرے ہے لیل و نہار
خوشا کبک خورم دل و شادماں ۔۔۔ کہ انگارے کھاتا ہے خندہ زباں
سراپا اگرچہ میں ہوں پُر قصور ۔۔۔ ولے لطف تیرا ہے مجھ پر ضرور
پلا آج مجھ کو مئے پُرتگال ۔۔۔ خدا جانے کل چرخ کی کیا ہے چال
مرے موں سے نکلا غلط نام کل ۔۔۔ زمانہ تو اک پل میں ہے چل بچل
نظر کر بہ بست و کشاد فلک ۔۔۔ تنک میں اندھیرا تنک میں جھلک
سمجھ مت رواں ہے یہ باد صبوح ۔۔۔ کہ نکلی چلی جاتی ہے گل کی روح

نقل

سنا ہوں میں یہ حضرت بایزیدؒ ۔۔۔ نماز جماعت کے تیں روز عید
وضو کے ارادے تیمم سے کیے ۔۔۔ پھر اٹھ چشمۂ آب کی رہ لیے
کیے چشمہ پر جا وضو کے تیئں ۔۔۔ دیے شست و شو دست سر دو کے تیئں
نگہ کر کے یہ حال اک بے ادب ۔۔۔ کہا اُب تیمم کا کیا تھا سبب
نہ تھا آب یاں سے تو اتنا بعید ۔۔۔ مگر چند اقدام اے بایزید!
تری حرکت لغو کو دیکھ کر ۔۔۔ تحیّر نے گھیرا مجھے سر بسر

سخن سن یہ رد کر کہے بایزید ۔۔۔ کہ فی الواقع پانی نہ تھا کچھ بعید
ولیکن توقع کسے تھی یہاں ۔۔۔ کہ پہنچے گا تا آب یہ نیم جاں

ارے یار! یہ دم غنیمت ہے دم ۔۔۔ نہیں آسرے دل سے ہیم ضم
تغافل نہ کر میرے احوال پر ۔۔۔ مجھے تو ذرہ ایک دم مت بسر

قسمیہ

تجھے بادہ نوشیؔ کی کی قسم ۔۔۔ تجھے رنگ اور بوئے مے کی قسم
بطِ مے کے تجھ کو لہو کی قسم ۔۔۔ تجھے طوطی کی گفت و گو کی قسم
تجھے مست کی چشم تر کی قسم ۔۔۔ تجھے اُس کی حیران نظر کی قسم
تجھے مصحف رو کی تیرے قسم ۔۔۔ تجھے طاق ابرو کی تیرے قسم
تجھے سرکشی کی تری ہی قسم ۔۔۔ تجھے دل خوشی کی تری ہی قسم
تجھے شیشہ دل کی میرے قسم ۔۔۔ تجھے حسن کے مے کی تیرے قسم
تجھے نازنینی کی اپنی قسم ۔۔۔ تجھے مہ جبینی کی اپنی قسم
قسم ہے تجھے بارش ابر کی ۔۔۔ قسم ہے تجھے جانِ بے صبر کی
قسم ہے تجھے جان گلفام کی ۔۔۔ قسم ہے تجھے تاک کے نام کی
تجھے سرو موزوں کی سوگند ہے ۔۔۔ تجھے غنچۂ خوں کی سوگند ہے
تجھے سینہ چاکوں کے ہنسنے کی سوں ۔۔۔ اناروں کی تجھ کو کھلنے کی سوں
زباں کی مری لٹ پٹانے کی سوں ۔۔۔ تجھے تیرے مے کے پلانے کی سوں
تجھے تیرے ہی غم کی سوگند ہے ۔۔۔ مرے دیدۂ نم کی سوگند ہے
سخن سن مرا چپکے رہنے کی سوں ۔۔۔ سنا مجھ کو اوروں سے کہنے کی سوں
ترے موں چھپانے کی سوگند ہے ۔۔۔ مجھے بھول جانے کی سوگند ہے
تجھے غصے سیں لب چبانے کی سوں ۔۔۔ تجھے مجھ کو گالی سنانے کی سوں
قسم تیرے تیں روح مجنوں کی ہے ۔۔۔ قسم تجھ کو لیلیٰ کے اموں کی ہے
تجھے مجھ سے قسمیں دلانے کی سوں ۔۔۔ تجھے تیرے قسموں کے کھانے کی سوں
لبھا کر مجھے تیرے لینے کی سوں ۔۔۔ تجھے میرے اس دل کے دینے کی سوں
جلاتا مجھے اس میں حاصل نہیں ۔۔۔ یہ ناچیز جلنے کا قابل نہیں
جلا کر مجھے چاہتا ہے جو تو ۔۔۔ بنا دے مری گِل سے جام اور سبو
مری تو سعادت ہے اس بات میں ۔۔۔ کہ پہنچے مری خاک اُس ہات میں
ولے اُس سیتی کچھ بنے گا نہیں ۔۔۔ بنا کچھ بھی ہے راکھ سیتی کہیں

سے بھول ۱۲۔

خفا ہو کے پچھتائے گا تو ندا شن[1] اِسی واسطے عرض میری تو مان
نہیں جی چھپانا مجھے مدّعا ہے اس بات میں بلکہ تیرا بھلا
یہی خیر خواہوں کا دستور ہے بھلائی تری مجھ کو منظور ہے
مجھے مت جلا تجھ کو بھی ہے زیاں ہو اخس جو آخر تو شعلہ کہاں
تری ہم سے ہے اے میاں! صاحبی غلامی نہیں تو کہاں صاحبی
مری آنکھوں میں اب جو بستا ہے تو تو کیوں رونے پہ میرے ہنستا ہے تو
مرے تئیں رلانا بھلا خوب ہے گھر اپنا ڈوبانا بھلا خوب ہے
مجھے سخت حیرت ہے اے جانِ جاں! کہ تیرا نشیمن کروں میں کہاں
رکھوں کیوں کے دل میں کہ سوزاں ہے یہ رکھوں کیوں کہ آنکھوں میں گریاں ہے یہ
یہ دونوں مکاں ہیں نہایت خراب کہیں جوشِ آتش کہیں جوشِ آب
مگر اب ہو جی میں اے جانِ جاں کہ بہتر نہیں اس سے کوئی مکاں

فخریہ

وفا میں مشہورِ آفاق ہوں فنِ دل ہی میں بہت طاق ہوں
میں وہ شخص ہوں ایک قائم مزاج کہ ہمت مرے تئیں کو دیتی ہے باج
مجھے جامِ جم کی تمنا نہیں سلیماں کے خاتم کی پروا نہیں
اگر چیں بہ ابرو ہو فغفور چیں تو سمجھوں اُسے کنجلکِ آستیں
فریدوں کی یہ شان دیہ کر دفر مرے پاس رکھتی نہیں کچھ قدر
اگر جوہروں کو کروں اپنی عرض مرے سے صفا لیوے آئینہ قرض
کہاں ہے زمانے میں میرا نظیر مرے سے فلاطوں ہے اصلاح گیر
قسم سر کی تیرے میں ہوں مغتنم کسی چیز میں نئیں مجھے پائے کم
مرے حال پر مہربانی سے دیکھ بھلا تو ذرا قدر دانی سے دیکھ

ہزاروں ہیں مجھ سے تری مدح گو ولیکن مرے تئیں کو واحد ہے تو
تو خوبوں کا ہے شاہ ذوالاحترام دل و جاں سے صاحب ہے تیرا غلام
ہوی بعد مدت دعا مستجاب کیا باز حق نے سب عشرت کے باب
شراب و کباب و شبِ ماہتاب صدائے رباب و لبِ جوئے آب
مہکتی چمن میں ہے بوئے گلاب خیاباں میں ہے بلبلِ بادِ مست خواب
پھر اب سامنے تجھ سا حاضر جواب سخن سنج شیریں ادا نکتہ یاب
غنیمت ہے یہ چرخ وارون خرام ہوا مدتوں بعد حسب المرام
یہی عرض میری تو اب مان لے تو آ تو اس وقت میں جام دے

مقصدِ دیگر

پھر اب اور خدمت میں اک عرض ہے کہ اظہار اس کا مجھے فرض ہے
سحر جو نکالے گا سر آفتاب جہاں کے تئیں جب کرے گا کباب
سبھی خوابِ شیریں سے جاگیں گے مست مچا دیں گے غل ہر طرف مے پرست
جہاں تک ہیں خمخانہ کے بادہ کش پکاریں گے سب العطش العطش
مرے تئیں کو مت بھول تب نیمآ صبوحی پلا توڑ میرا خمار
سبھوں سے مجھے جام دے بیشتر مری آبرو رکھ تو رسوا نہ کر
نکال اس طرح مے کے تیں شیشے سے کہ جل کر مرے زاہد اس رشک میں

خطاب بازاہد

ارے زاہدِ بے حیا یوں کے پیر جوانوں پہ آتنا نہ ہو خوردہ گیر
کیا فرض میں نے کرمی ہے حرام ولیکن تعصب بھلا کب ہے کام
ترے پاس یہ مے جو مذموم ہے یہ ہے آفتاب اور تو بوم ہے
تنفر ہے مے سا تجھ شوم کو کہ نفرت ہے خورشید سے بوم کو
اگر تجھ کو ہوتا دلِ ہوشیار نہ جاتا تو کعبہ کو ہو خر سوار
تری ریش جو اس طرح ہے طویل حماقت پہ رکھتی ہے تیری دلیل

---

[1] نداں۔ ہمیشہ ۱۲

[2] غالب یاد آگئے۔ "عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال" الخ۔

تری ڈاڑھی کانٹوں کی جھاڑی ہے یہ تری گول پگڑی پہاڑی ہے یہ
تری گول پگڑی یہ گنبذ[1] نما دل مردہ پر ہے ترے اب گوا[2]
ترا ہر سخن مکر ہے سر بسر زباں پر ہے اللہ دل میں ہے زر
تری عقل رسوا کرے گی تجھے گدھے پر چڑھائے پھرے گی تجھے
مرے جی میں آتا ہے جانے خفا ملوں تیری داڑھی پہ لائے شراب[3]
پھر اس داڑھی کی بھوس کو پھونک دوں تری موں پہ خاکستر اس کی ملوں
تب اس شکل ہی سے تو خر سوار اگر ہو تو ہے کیفیت بے شمار
کیا امتحاں میں تجھے بارہا تری عقل میں ہے سراسر خطا
خدا پاس عبادت[4] سی ملتے ہیں حور عجب عقل و دانش عجب یہ شعور
اری توبہ کر ایسی باتوں سے تو کبھی میں کو بھی راگ بھی سن کبھو
تو خیرہ نہ ہو اپنے اعمال پر نگہ رکھ خدا کے تو افضال پر
ارے فائدہ کیا کیے یوں وضو کر اب دل کے تیں اپنی تو شست و شو
یہ ضرب المثل کیا نہیں تو سنا سہاگن ہے وہ جس کو چاہے پیا

صدا چنگ سی ہے یہی آشکار غفور و رحیم است آمرزگار

خطاب بہ مطرب

اے مطرب ای یار زیبا جمال غزل پڑھ کوئی تو تو اب حسب حال
کہ لاتی ہے تقوے میں بیشک خلل لب یار سے عاشقانہ غزل
تری شکل زیبا ہے وجہ فتوح ترا راگ دل چھینے ہے قوت روح
گلو سوز کیا نغمۂ عود ہے صدا تیری الحان داؤدی ہے
دم عیسوی ہے مگر تیری بات کہ دل مردہ پاتے ہیں تجھ سی حیات
نوائے ازل جب سے ہے کان میں تبھی سے مری جاں ہے تان میں
مرے شور نالہ پہ تو دھیان دے طنبورہ کے تاروں کو ٹک چھیڑ دے
بھلا بول تو ایک ستھری سی تان نہ کر ان مجھ سے مری بات مان
ای مطرب تو اب دل کی گھنڈی کو کھول ترانہ میں یہ بیت ہر وقت بول
نہ رکھ جگ میں صاحب کے محتاج غیر الٰہی کر اب خاتمہ کو بخیر

بفضل خدا یہ ہوا اختتام
ہے میخانۂ عاشقی اس کا نام
۱۱۸۷

---

[1] گنبذ اور گنبد دونوں صحیح ہیں جیسے نبیذ و نبید ۱۲۔

[2] گوا۔ گواہ کا مخفف ہے ۱۲۔

[3] لائے شراب۔ شراب کی گاد و تلچھٹ۔ دُرد مے ۱۲

[4] عبادت کا عین (ع) تقطیع میں قابل چشم پوشی ہے ۱۲۔

احساسات

از جناب ظفر تابان۔ پروفیسر السنۂ مشرقیہ نظام کالج

خلش سی کچھ مجھے دل کے قریں معلوم ہوتی ہے
مگر تیری نگاہِ دل نشیں معلوم ہوتی ہے

ہر اک شئے میں تمہارے کچھ نہ کچھ انداز پاتا ہوں
مجھے قوسِ قزح چینِ جبیں معلوم ہوتی ہے

تری صورت حسیں بیشک ہے لیکن واقعہ یہ ہے
تصور میں کہیں زائد حسیں معلوم ہوتی ہے

ہجومِ ہر دو عالم میں کیا ہے منتخب تجھکو
نظر بھی کس بلا کی دوربیں معلوم ہوتی ہے

قیامت جسکی برہم سازیوں کا شور برپا تھا
تری رفتار محشر آفریں معلوم ہوتی ہے

بنا دے بیخبر پھر اک نگاہِ کیف ساماں سے
پریشاں خاطرِ اندوہگیں معلوم ہوتی ہے

دکھیاری بلبل

(سید شبیر حسن قیس رضوی حیدر آبادی متعلم چادر گھاٹ ہائی اسکول)

مئی کا مسرت انگیز مہینہ تھا۔ میں ایک خوشبودار مہندی کے جھنڈ کے سایہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ جانور اچھل کود رہے تھے۔ اور پرند نغمہ سرائی میں مست تھے۔ درخت شاداب اور پودے نمو آور تھے ہر چیز ہشاش وبشاش تھی بجز غمزدہ بلبل کے۔ بیچاری غریب بلبل مجسم غم بنی ہوئی کانٹے پر سینہ رکھے دردناک گیت الاپ رہی تھی۔

"فیا۔ فیا۔ فیا" کبھی وہ گاتی اور کبھی "ٹیرو۔ ٹیرو۔ ٹیرو" کی پر درد صدا دیتی۔

اس فریاد پر میرے آنسو نکل پڑے۔ میں اس غم کے زندہ اظہار پر اپنے آپ غور کرنے لگا۔

میں نے خیال کیا آہ بلبل تو ناحق سر دھن رہی ہے۔ تیری اس شکستہ حالی پر کوئی غمخوار نہیں۔ کوتہ عقل گلبن تیری فریاد کو نہیں سن سکتے۔ سنگدل جانور تجکو بشاش نہیں کرسکتے۔ شاہ پنڈین (جو گریک کا بادشاہ تھا) مرچکا اور اس کے رفقا مردہ سیسہ کے صندوق میں بند ہیں تیرے ہمنوا تجھ سے بے اعتنا ہوکر مسرت کے گیت گا رہے ہیں۔

تیری ہی طرح اے دکھیاری بلبل میرا بھی کوئی پرسان حال باقی نہیں۔ (ترجمہ)

خیالات آزاد

(از جناب سید محمد حسین آزاد منشی فاضل)

لٹیں بکھری ہوئی رخسار جاناں پر ہیں بالونکی
یہ کیا اندھیر ہے یورش ہے پھر گوروں پہ کالونکی

نہ ان کو کنگ کا کھٹکا نہ ان کو امپیرر کا ڈر
نظر میں کوئی جچتا ہی نہیں اللہ والوں کی

یہ چرچے چرچ کے ہیں شیخ! مسجد کا خدا حافظ
برہمن بھی مناتے خیر ہیں اپنے شوالوں کی

بساط الٹیگی نقش مات کا پڑ جائیگا آخر
کہ گتھی کھل رہی ہے ہر طرف شاطر کے چالوں کی

جواب اک سیدھا سادہ دیجئے کیسی راستبازی سے
اڑا دیں دھجیاں یاروں نے پیچیدہ سوالوں کی

انہیں سیراب یورپ نے کیا دریا دلی سے ہے
پھلے پھولے تمنا انڈیا کے نونہالوں کی

یہ کس پر ہے چڑھائی کا ارادہ کچھ نہیں کھلتا
ادھر ہے پلٹنوں کا کوچ ادھر آمد رسالوں کی

سدا جو اپنی موٹی کملیوں میں مست رہتے ہیں
وہ پرواہی نہیں کرتے ہیں اوروں کے دوشالونکی

ہنر سیکھو کوئی اب فیشنبل بن کے کیا حاصل ؟
کرو اے نوجوانو! ریس لیکن باکمالوں کی

اب ان آنکھوں میں جلوے سینما کے روز رہتے ہیں
جنھوں نے پتلیاں دیکھی ہیں برسوں مالوانوکی

ہنسوں کی چشم و مژگاں کا تو آخر ہوگیا گھائل
نکیلی اور چبھتی بات ہے ان بھولے بھالونکی

ہوئے ہیں کیسے کیسے انقلاب اس دور میں صاحب
ابھی دیکھی نہیں تاثیر تم نے میرے نالوں کی

برائی کا نہ پڑ جائے کہیں سایہ یہاں تم پر
بری صحبت سے بھاگو دوستو! تم بدخصالوں کی

بلا کے پینے والے ہیں بلا نوشانِ بادہ کش
عجب یہ دور ہے گردش یہ گردش ہے پیالونکی

یہ عبرت کا محل ہے باپ کا واں دم نکلتا ہے
ادھر بیٹے کو سوجھی ہے مکانوں کے قبالونکی

مقدس روز ہے، سرکار کے احکام مانع ہیں
خوشامد کر رہے ہیں پینے والے کیا کلالوں کی

شرافت کا ہی گر دعویٰ شریفوں کی سی باتیں کر
کہ جنٹلمین میں ہوتی نہیں باتیں رذالوں کی

اگر حاوی ہوئی ہیں عورتیں یورپ کی مردوں پر
کرینگے شیر بھی کیا ناز برداری غزالوں کی؟

کلام اکبر کا ہے مشہور جیسا اس زمانے میں
مچی اک دھوم ہے آزادِ دکنی کے خیالوں کی



تنقیدیں

انشائے جدید تقطیع ... حجم ۱۴۴ صفحے مطبوعہ برقی پریس دہلی قیمت درج نہیں ہے۔ غالباً مصنف سے خسرو باغ رامپور اسٹیٹ کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

فارسی زبان خصوصاً جدید فارسی کے شائقین کے لئے نہایت مفید کتاب ہے۔ ہندوستان میں قدیم فارسی سے بہت سے کم و بیش تمام فارسی دان واقف ہیں لیکن ایران کی مغربی قوموں کے اثرات مسلط ہونے کے بعد سے فارسی زبان میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ لیکن قلیل تعداد میں پیدا ہوگئی اور ہو رہی ہیں ان سے شاید چند ہی خبر نویس ہوں گے۔ اس اعتبار اور نیز اس لئے بھی کہ زندہ زبانوں کی حیثیت سے فارسی ہندوستان اور یورپ کی تمام جامعات میں جگہ پائی ہوئی ہے ان کے مختلف اور گوناگوں اسالیب اور نوپید الفاظ اور اصطلاحات سے واقف ہونا ان تمام لوگوں کے لئے ضروری ہے جو فارسی قدیم اور جدید سے کچھ ذوق رکھتے ہیں اسی ضرورت کو مدنظر رکھ کر مولوی محمد علی خاں صاحب اثر رامپوری نے یہ کتاب لکھی ہے دیباچہ میں کتاب کی ضرورت بتلاتے ہوئے ہر قسم کی مراسلت خواہ خانگی ہو یا عمومی یا سرکاری اس کے نمونے مع لوازمات مفید اختصار کے ساتھ پیش کئے ہیں، ضمناً ہندوستانی فارسی اور ایران کی فارسی کی مراسلت میں جو اختلافات پیدا ہوگئے ہیں، ان کو بھی نمونوں کے ذریعہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے جو نہایت مستحسن ہے۔

عصر حاضر میں فارسی ادب اور ایرانی ذہنیت کے انقلاب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بھی اس کتاب میں مواد موجود ہے کیونکہ یہ جدید اثرات کے تحت فارسی زبان کی تبدیلیوں کی بڑی حد تک مظہر ہے۔

اس کتاب کا اگر غائر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں امید ہے کہ عوام اور خواص فارسی مراسلت کی بہت سی غلطیوں سے بچ جائیں گے۔

شیب و شباب تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ صفحات ۴۲ مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ قیمت ۶/ مصنف کے پتہ پر اردیوان ڈیوڑھی اورنگ آباد دکن اور نیز مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتی ہے

براؤننگ کی ایک نظم "ربیع بن عذرا" کا یہ منظوم ترجمہ ہے۔ اس کا نثری ترجمہ اس سے پہلے مولوی سید وقار احمد صاحب ... نے پیش کیا تھا جناب محمد امیر صاحب بی اے بی ٹی نے اس ضرورت کو محسوس کر کے کہ اس نظم کا ترجمہ نظم میں اس جانکاہی اور احتیاط سے کیا جائے کہ نقل میں اصل کی روح کھینچ آئے" اس کوشش کا آغاز کیا اور توقع ہے کہ یہ کوشش نہایت مشکور ہوگی۔

ترجمہ کا کام یوں بھی آسان نہیں خصوصاً ایک مشکل شاعر کے کلام کا ترجمہ نظم سے نظم میں کرنا اور بھی دقت طلب ہے۔ اہل رائے بزرگوں کا خیال ہے کہ کسی زبان کے ادبی شہ کار کا ترجمہ دوسری زبان میں ہو ہی نہیں سکتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی کبھی ایسے ترجمے اصل سے بڑھ نہیں گئے تو کم سے کم ان کے پیچھے بھی نہیں رہے چنانچہ ... کالج (آکسفورڈ) کے مشہور عالم صدر بنجامن جوئٹ (   ) نے بعض یونانی اور رومی شہ کاروں کے ایسے ترجمے پیش کئے تھے کہ نقاد ان کو اصل سے کم رتبہ سمجھنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہو سکے۔ مولانا علی حیدر صاحب نظم طباطبائی (نواب حیدر یار جنگ بہادر) کی "گریز ایلجی" کو اردو نظم کا جامہ پہنانے کی کوشش ایسی ہی کامیاب ثابت ہوئی۔ ہمیں یقین ہے کہ جو مصنفین اس میدان میں گرم رفتار ہیں وہ بھی ایسی کامیابیوں کی منزل مقصود سے بہت دور نہیں ہیں۔ ان کی وجہ سے ہم اردو دان کم سے کم مغربی طرز خیال سے تو روشناس ہو جائیں گے۔

اس ترجمہ میں بڑی خوبی یہ ہے کہ لفظی ترجمہ کی پابندیوں سے قطع نظر کر کے اصل خیال کو ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس لئے ترجمہ میں اجنبیت نہیں معلوم ہوتی نظم جو رجائیت سے پر ہے، ہمارے بڑھاپے سے مایوس و قنوطی بزرگوں کے لئے یقیناً ایک بڑی تسلی کا سبب پیش ہوگی

"د س"

مطبوعات جامعہ ملیہ۔ دہلی

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جہاں مسلمانان ہند کے احیاء و بقا کے لئے بہت سے کام اپنے ذمہ لیے ہیں وہاں اس کا ایک اہم کام اردو زبان میں اعلیٰ لٹریچر بہم پہونچانا بھی ہے۔ چنانچہ ابتدا ہی سے اس نے اپنے ہاں تصنیف و تالیف کا ایک شعبہ قایم کیا تھا جو اب اردو اکاڈمی کے نام سے موسوم ہے۔ اردو اکاڈمی مختلف علوم و فنون پر چند نہایت مفید کتابیں شایع کر چکی ہے۔ جن کی فہرست ہم آیندہ صفحات میں درج کرتے ہیں نیز ان کتابوں کی بھی ایک فہرست درج کر رہے ہیں جو مکتبہ جامعہ نے مفید سمجھ کر خود شایع کی ہیں۔ قدر دانان علم سے ہمیں امید ہے کہ ان مطبوعات کی قدر افزائی فرمایں گے۔

سلسلہ اردو اکاڈمی

تاریخ الامت ۔ مصنفہ حافظ محمد اسلم صاحب جیر جپوری۔ تاریخ اسلام کا یہ سلسلہ صحیح تاریخی اصول اور تحقیق و تنقید کے ساتھ اردو میں پہلی بار شایع ہو رہا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہر شخص نہایت آسانی سے مسلمانوں کے تاریخی کارناموں سے واقف ہو سکتا ہے۔ جامعہ ملیہ اور صوبہ متوسط و برار کے محکمہ تعلیم نے اسے اپنے مدارس کے لئے بھی پسند کیا ہے۔ اب تک چھ حصے شایع ہو چکے ہیں جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) حصہ اول سیرۃ الرسول عہ
(۲) حصہ دوم خلافت راشدہ عہ
(۳) حصہ سوم خلافت بنی امیہ عہ
(۴) حصہ چہارم خلافت عباسیہ جلد اول عہ
(۵) حصہ پنجم " " جلد دوم عہ
(۶) حصہ ششم عباسیہ مصر عہ

تاریخ الدولتین اس کتاب میں خلافت بنی امیہ و بنی عباس کے حالات پر ایک نقادانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ مصر کے مشہور اہل قلم جرجی زیدان کی تصنیف ہے جسے مولانا نیاز فتحپوری نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ قیمت عہ

مبادی معاشیات ۔ یہ علم المعیشت پر ایڈون کینن کی مشہور و معروف تصنیف ہے جس کا ترجمہ پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب نے نہایت سلیس اردو میں کیا ہے یہ کتاب فن کے مبتدیوں کے لئے مفید ہے قیمت عہ

تاریخ ہند قدیم قدیم ہندوستان کی تاریخ کا ایک مختصر لیکن نہایت جامع خاکہ جو تصنیف نے کے، ایم، پانیکر صاحب (ایم۔ اے آکسن) سے انگریزی میں لکھ کر اردو میں ترجمہ کرائی۔ قیمت عہ

ذکرے تفسیر پارہ عم مصنفہ خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی استاذ تفسیر جامعہ۔ سلسلۂ تفسیر "القرقان فی معارف القرآن" کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ کتاب بھی اسی مفید سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں پارہ عم کی تفسیر خواجہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں امت اسلام کے لئے پیش کی ہے۔ قیمت عہ

عبرت تفسیر سورۂ یوسف سلسلۂ تفاسیر کی ایک اہم جلد جس میں احسن القصص یعنی سورۂ یوسف کی تفسیر نہایت خوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور اس کے عبرت انگیز نتایج کو بہت موثر

طریقہ پر پیش کیا گیا ہے قیمت عہ

برہان | سورۂ نور کی مکمل اور مبسوط تفسیر نہایت پرزور اور دلکش طرز تحریر قیمت عہ

قواعد عربی | (حصہ اول) کتاب الصرف اردو میں عربی صرف کی مستند کتاب جسے ہندوستان کے مشہور عربی ادیب لمنا ابو عبداللہ محمد بن یوسف السورتی استاذ عربیات جامعہ نے نہایت تحقیق سے مرتب کیا ہے۔ قیمت

تاریخ فلسفہ اسلام | از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی (برلن) ہالینڈ کے مشہور فلسفی اور مستشرق ٹ۔ ج۔ دی بویر کی گرانقدر تصنیف کا براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ۔ تاریخ فلسفہ اسلام پر اردو میں یہ پہلی قابل قدر کتاب ہے قیمت

عربوں کا تمدن | ڈاکٹر جوزف ہیل پروفیسر میونک یونیورسٹی کی مشہور و معروف تصنیف KULTR DER ARABER کا ترجمہ از سید نذیر نیازی صاحب بی اے (جامعہ) مترجم نے کتاب کی قدر نہایت مفید ضمیمہ لکھکر اور بھی بڑھا دی ہے جو تاریخ اسلام پر یوں بھی نہایت محققانہ اور بصیرت افروز مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے

قیمت

دیوان غالب

طبع ثانی

مطبوعہ برلن (جرمنی)

ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر و ادیب مرزا غالب کا کلام جو شان رکھتا ہے اور جس قدر و منزلت کا وہ مستحق ہے ہم نے اسی حسن و خوبی اور لطافت و نفاست کے ساتھ مرزا کے کلام کا مجموعہ ارباب ذوق کے سامنے پیش کیا ہے۔

یہ دیوان نہایت اہتمام کے ساتھ جرمنی میں طبع کرایا گیا ہے۔ خوبصورت ملایم جلد، اس پر سنہرے دلفریب نقش و نگار طلائی اوراق اور سب سے زیادہ مرزا غالب کی لاثانی عکسی تصویر جرمن ہنرمندی اور کمال کا اعلےٰ نمونہ ہیں۔

ہمارے اس دیوان کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ چند ماہ کے قلیل عرصہ میں اس کا ایک ایڈیشن ختم ہوگیا اور دوسری بار طبع کرانا پڑا۔ دیوان مکمل ہے۔ جس میں مرزا مرحوم کا خود نوشتہ مقدمہ غزلیات قصاید اور رباعیات ہیں۔ جلد مطلا نہایت عمدہ سائز۔ قیمت صرف

دیوان شیدا

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم

کے

فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ

دنیا مسیح الملک کو طبیب، قومی رہنما عالم، ادیب اور حافظ کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن اس کا علم شاید خواص کے علاوہ کسی کو ہو کہ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم فارسی اور اردو کے ایک اعلیٰ پایہ اور کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔ آپ کا کلام استادانہ ہے اور رفعت خیالات اور سادگی اظہار کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر ہے۔ اس دیوان کا ایک ایک لفظ حکیم صاحب مرحوم کی ہمہ گیری نکتہ رسی اور قادر الکلامی کا شاہد ہے

مکتبہ جامعہ نے اس دیوان کو جرمنی میں طبع کرایا ہے۔ پاکٹ سائز جلد سنہری نقش نہایت خوبصورت اوراق مطلا رنگ سرخ۔ نیلا۔ سبز۔ قابل دید چیز ہے

قیمت صرف

مطبوعات مکتبہ جامعہ

ہمارے نبی بچوں کے لیے خدا
کے پیارے ہمارے نبی کی پاک زندگی کی
کہانیاں از پروفیسر سید نواب علی صاحب
ایم اے (طبع سوم) ۵ر

ہمارے رسول خواجہ عبدالحی صاحب
فاروقی نے بچوں کے لیے سہل اور موثر
ترین زبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے پاک حالات تحریر فرمائے ہیں قیمت ۱۰ر

سرکار کا دربار از احمد الیاس صاحب
مجیبی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی
سیرت پر ذرا بڑے لڑکوں کے لیے بیحد مفید
کتاب - عہر

دنیا کے بسنے والے دنیا کے
عجیب و غریب باشندوں کے حالات
تقریباً ۵۰ تصاویر از سید بشیر حسین صاحب
زیدی۔ ہیڈ ماسٹر مسلم یونیورسٹی اسکول
علی گڑھ قیمت ۶/۶ ر

ترکوں کی کہانیاں ترک بچوں کی
ہمت و جرأت کی سچی کہانیاں جن کے
پڑھنے سے بچوں میں قومی جوش پیدا ہوتا ہے
قیمت - ۵ر

ازہار العرب ہمت و شجاعت، سخاوت
و مروت اور علم و حکمت کے بہترین عربی
اشعار کا گلدستہ۔ قیمت ۱۰ر

انتخاب مضامین جوہر طلبا جامعہ کے
قلمی رسالہ "جوہر" کے منتخب علمی ادبی
اور تاریخی مضامین۔ قیمت عہر

اورنگ زیب عالمگیر مولانا شبلی کی
معرکۃ الآرا تصنیف، طباعت، کتابت
نفیس قیمت عہر

مقدمہ شعر و شاعری خواجہ حالی کے
دیوان کا مقدمہ۔ اردو شاعری کے اصناف
پر لطیف تبصرہ معہ فوٹو خواجہ مرحوم قیمت عہر

صلاح کار عنوان شباب کے جذبات
کے نشیب و فراز پر گہری نظر۔ اور
ازدواجی زندگی کے لیے دستور مشیر۔
از چودھری محمد علی صاحب تعلقہ دار ردولی قیمت عہر

جمال الدین افغانی اتحاد اسلامی
کے داعی اور مشرق کے مصلح اعظم سید
جمال الدین افغانی کے حالات زندگی
سید صاحب اور ان کے جانشین
شیخ محمد عبدہٗ کی تصاویر بھی شامل ہیں قیمت

عرض جوہر مجموعہ کلام مولانا
محمد علی صاحب۔ قیمت ۱۰ر

انتخاب میر زبان اردو کے زندہ
جاوید شاعر میر تقی میر کے کلام کا ایک
خاص نقطہ نظر سے انتخاب معہ مقدمہ و
حالات میر۔ مرتبہ مولوی نور الرحمن صاحب
بی اے (علیگ) قیمت عہر

دیوان غالب طلبہ کی سہولت
اور روزمرہ کے استعمال کے لیے بنا
قیمت ۱۰ر

مسدس حالی طلبہ کے استعمال کے
لیے مجلد ہونے کے باوجود قیمت ۱ر

مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ اس
رسالہ میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے
تعلیم کی غایت اور مسلمانوں کی موجودہ
تعلیمی ضروریات پر بیحد مفید بحث کی قیمت ۱ر

خطبہ صدارت شیخ الہند مرحوم
کا تاریخی خطبہ صدارت جو بتقریب
افتتاح جامعہ پڑھا تھا قیمت ۲ر/۶

خطبہ صدارت مسیح الملک مرحوم کا
عالمانہ خطبہ جو جلسہ اول تقسیم اسناد
میں پڑھا گیا۔ قیمت ۵ر

اسلامی تہذیب اور قومی تعلیم از ڈاکٹر
[illegible] بی، اے کے خطبہ صدارت

وجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پُر تاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ ہی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب و بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے۔ جو اقسام کے اعصابی و اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے۔ اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پُر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے۔ کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس۔ وجع مفاصل دمہ۔ درد سر۔ درد سول۔ بچھو کے زہر کے لئے اور زخم کے لئے اور جلے ہو جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال

تھوڑی دوا لیکر دن میں تین چار دفعہ مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھاپ دیں اور صاف کریں۔ جو اصحاب بغرض امتحان دوا طلب فرماویں بخوشی تعمیل کی جائے گی۔

نوٹ۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت مہیا رہتا ہے۔ اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں

المشتہر: جیمس اینڈ کمپنی سپنسٹ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن

افتخار الحکما نواب حاذق جنگ مرحوم سابق افسر الاطبا فرماتے ہیں

میں نہایت مسرت اور بڑی خوشی کے ساتھ محض بیماروں کی شفا کی غرض سے چند سطور سپرد قلم کرتا ہوں برص منتشر (یعنی کوڑھ اور سفید داغ) کا علاج نہایت مشکل ہے یہ مرض عموماً بڑھتا ہی جاتا ہے۔ حکیم مولوی محمد عبد القادر صاحب مددگار صدر مخزن الادویہ یونانی سرکار عالی ورکن دار التشخیص و انجمن اطبا و یونانی حیدرآباد دکن خصوصاً علاج برص میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ صاحب موصوف نے اکثر مرضا برص کا علاج بہت ہی کم مدت میں نہایت قابلیت سے کیا اور بفضلہ کامیاب ہوئے۔ میں نے بچشم خود مرضا برص کا معائنہ کیا ہے۔ بعد علاج جسم بالکل اصلی حالت پر ہو جاتا ہے۔ حکیم صاحب موصوف کی بہترین قابلیت اور مجرب دوا کا اثر ہے۔ میں حکیم صاحب موصوف کو ایسے کٹھن مرض کی دوائے مجرب کی ایجاد پر مبارکباد دیتا ہوں اور پبلک سے زور کے ساتھ سفارش کرتا ہوں کہ وہ برص کے مریضوں کو حکیم صاحب موصوف کے پاس رجوع ہونے کی ہدایت کریں اور مریضان برص کو چاہئے کہ وہ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر حکیم صاحب موصوف سے علاج کرائیں اور اس مرض منحوس سے غافل نہ رہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

(دستخط) افتخار الحکما حاذق جنگ

مطبوعات مکتبہ

دکن میں اُردو - مولفہ مولوی نصیرالدین ہاشمی صاحب منشی فاضل۔ جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی، عادل شاہی اور آصف جاہی دور ان میں اردو نظم و نثر کی حالت اور شعرائے اردو کا تذکرہ معہ نمونہ کلام ضخامت ۴۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا بار دوم قیمت عہ

خیابانِ اُردو - مرتبہ جناب محمد عارف صاحب جید آبادی ہندستانی کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور نامی گرامی شعرا کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے۔ ضخامت تقریباً ۲۲۵ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد مع ساده عمہ

روح تنقید - مصنفہ مولوی ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے، فن تنقید کے متعلق اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں ماضی و حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۲۵۶ سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ بار دوم قیمت عہ

تنقیدی مقالات - مصنفہ زور صاحب۔ یہ روح تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روح تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی، فارسی اور اُردو زبانوں کے مشہور اہل قلم کی قلمکاریوں پر تنقید کر کے ان کا استعمال دکھلایا ہے اور نیز بعض مشہور اردو انشا پردازوں کے طرز تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کئے گئے ہیں ضخامت ۵۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی وغیرہ عمدہ مجلد سلو ہے ۱/۴

اُردو کے اسالیب بیان - مصنفہ زور صاحب۔ نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت۔ ابتدا سے لیکر آج تک کے نثر نگاروں کے طرز تحریر و انداز بیان کا تذکرہ۔ خاص طرز تحریر کے اردو انشا پردازوں کے اسالیب بیان پر تبصرہ ضخامت ۴۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ ۱/۴ عہ

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب - مصنفہ ندوی صاحب۔ سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی، ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ضخامت ۱۲۰ صفحے۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲/

دنیائے افسانہ - مصنفہ مولوی محمد عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی، افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نویسی کے اصول و مبادیات یہ اردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۲۱۸ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت عہ

مبادی فلسفہ - مولفہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی، ڈاکٹر اے لیس راپورٹ پی۔ ایچ۔ ڈی کی پرائمر آف فلاسفی کا ملخص بامحاورہ اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۲/

اربابِ نثر اُردو - مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے۔ فورٹ ولیم کالج کے اردو اہل قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر نگاری کی تاریخ ضخامت ۲۰۴ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عہ

آثار الکرام جلد اول - مصنفہ شمس المورخین جناب حکیم سید شمس اللہ قادری ام آر اے ایس۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی محققانہ تاریخ ضخامت ۱۴۴ صفحے۔ سائز ۲۷×۲۶/۱۶ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی خاصی قیمت عہ ۱۲/

جواہر کلیات نظیر - نتیجہ جناب مولانا ذہین و سید مختار احمد نظیر اکبرآبادی کے کلیات سے اخلاقی۔ ادبی۔ نصیحت آموز، ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۸۰ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی خاصی قیمت عہ

عقائد امام - ترجمہ مولوی محمد عبدالغفور عابدی صاحب فقہ اکبر کا عام فہم اور بامحاورہ اردو ترجمہ۔ قیمت ۴/

اسوۂ حسنہ - مصنفہ مولوی احمد عبداللہ مسدوسی بی اے ایس بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۸/

دکنی لغت - مولفہ مولوی سید شعار احمد شعار ہاشمی۔ اردوئے قدیم یعنے دکنیات کا لغت جس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۸/

شاہ رفیع الدین قندھاری - مرتبہ مولوی محمد عبدالغفور صاحب عابدی۔ دکن کے ایک مشہور صاحب دل صوفی عالم کے دلچسپ حالات ضخامت ۴۸ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی قیمت ۵/

خزینۂ اخلاق - مصنفہ مولوی سید عبدالعزیز صاحب عزیز اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ۔ ضخامت ۶۴ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۶/

سیرت خیر البشر - و سیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالے جس میں آنحضرت صلعم کے مکارم اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ۱/

نیک بی بی - مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے۔ نیک خو بی بی کس طرح اپنے بدخو شوہر کو ٹھیک کر سکتی ہے۔ قیمت ۲/

چھوٹا شیطان - مصنفہ مولانا ذہین۔ منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ۱/

ملنے کا پتہ - انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ روبرو محکمۂ مالگذاری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام رام کشن لیتھوگرافر منیجر مطبع

مجلہ مکتبہ

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر
محمد عبدالقادر سروری
ایم اے، ال ال بی

مجلّۂ مکتبہ

۱۔ یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲۔ یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے
حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳۔ بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو
ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴۔ قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عالہ) فی پرچہ ۶/

۵۔ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (سے) اور چوتھائی
کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ ½ سے
۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے انکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی۔ جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلہ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کر دیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیلِ زر، و مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلہ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

رجسٹرڈ نشان پتہ سرکار آصفیہ (۶۵)

مجلہ مکتبہ

رجسٹرڈ نشان پتہ سرکار انگلشیہ (۰۰۰۰)

جلد (۲) بابتہ ماہ بہمن ۱۳۳۸ف م دسمبر ۱۹۲۸ء شمارہ (۳)

شبیہ مبارک اعلیحضرت سلطان العلوم خسرو دکن

فہرست

شذرات

۱۵ ر ڈسمبر کی شام کو سالگرہ ہمایونی کے دوسرے روز اعلیحضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ بغرض تفریح کلکتہ تشریف فرما ہوئے۔ جاتے ہوئے اعلیحضرت نے نئی قاضی پیٹھ بلہارشاہ ریلوے کا افتتاح بھی فرمایا۔ راستہ میں رعایائے حضور پرنور اور دیگر باشندگان ہند نے اپنی عقیدت کا اظہار طرح طرح سے کیا۔ آپ کی غیر معمولی سادہ زندگی سے لوگ بید متاثر ہو رہے ہیں دعا ہے کہ اس سفر سے اعلیحضرت نہایت کامران مراجعت فرمائے بلدہ ہوں۔

ریاست حیدرآباد کے سابق ناظم تعلیمات نواب مسعود جنگ بہادر کی وظیفہ پر علیحدگی کے بعد اس جگہ پر بذریعہ فرمان خسروی، خان فضل محمد خاں ام اے (رینگلر) کا تقرر ہوا تھا، خاں صاحب نے ۱۶ ر ڈسمبر کو فائز بلدہ ہوکر اپنی خدمت کا جائزہ حاصل کرلیا۔ خان صاحب پہلے بھی اسی سررشتہ کے عہدۂ نائب نظامت پر کارگزار رہ چکے ہیں لیکن اس وقت آپ کے خدمات کی نوعیت مستعار تھی۔ اب مستقل طور پر آپ ریاست کی تعلیمی خدمت انجام دیں گے آپ کی علمی قابلیت اور انتظامی تجربہ سے امید ہے کہ محکمۂ تعلیمات نہایت صحت بخش اصول پر ترقی کریگا۔

رسالہ کے کاروبار میں وسعت اور پریس کے گوناگوں دقتوں کے مدنظر یہ مناسب تصور کیا گیا ہے کہ رسالہ کے حلقۂ ادارت میں کچھ توسیع کی جائے۔ چنانچہ اس ضمن میں رسالے کے خریدار بزرگوں کو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ آئندہ مہینے سے مولوی عمر یافعی صاحب، جو رسالے کے اجرا سے اس وقت تک انتظامی اور علمی امور میں ہمارا ہاتھ بٹارہے ہیں اور جن کو انجمن ارباب اردو (سردرنگر) کے رسالے "تحفہ" مرحوم سے متعلق رہنے کی وجہ سے ان معاملات کا کافی تجربہ ہے، شریک مدیر کی حیثیت سے "مکتبہ" کی خدمت انجام دیں گے۔ توقع ہے کہ آئندہ رسالے کی دلچسپیوں میں مزید اضافہ اور ٹھیک وقت پر شائع ہونے کا انتظام ہو جائے گا۔

اورینٹل کانفرنس کا پانچواں اجلاس اس دفعہ لاہور میں ۱۹، ۲۰، ۲۱ اور ۲۲ ر نومبر کو منعقد ہوا تھا مختلف صوبوں سے شریک ہونے والے نمائندوں کی تعداد دو سو سے زیادہ تھی، جن میں پنجاب کے بہت سے تھے مشرقی علوم و فنون کی ترقی میں دلچسپی لینے والوں کا یہ مجمع پچھلے تمام اس قسم کے مجمعوں پر سبقت لے گیا۔ آخری وقت تک معتمد کے پاس مضامین پہونچتے رہے۔ جن کی مجموعی تعداد دو سو سے زیادہ تھی۔

حیدرآباد دکن سے بھی جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ میں سے ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب مولوی فاضل پی ایچ ڈی (کیمبرج) پروفیسر فارسی، ڈاکٹر عبدالحق صاحب بی لٹ ڈی فل (آکسفورڈ) پروفیسر عربی، مولوی سید سجاد صاحب ایم اے پروفیسر [illegible] اور مسٹر [illegible] راے پروفیسر تلنگی جامعہ کی نمائندگی کے لئے بھیجے گئے تھے۔ توقع ہے کہ اس اعلیٰ علمی اور ایک [illegible] الاقوامی اجتماع سے، ہندوستان خصوصاً ریاست ابدمدت کی علمی اور ذہنی ارتقا پر بہت سے علمی فوائد ان علماء کی بدولت مترتب ہو سکیں گے۔

سالگرۂ ہمایونی

اس ماہ میں بتقریب سالگرہ، اس عظیم الشان ہستی کے ذکر جمیل سے، جس کا نام گرامی تاریخ ہند کے اوراق میں عدیم المثال بنا رہیگا، ہم اپنے رسالہ کی زینت کو بڑھانے کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اعلیحضرت سلطان العلوم خسرو دکن کی یہ چوالیسویں (۴۴) سالگرہ کی مسعود تقریب ہے۔ آپ کو عنان حکومت ہاتھ میں لئے ابھی صرف (۱۷) سال کا عرصہ ہوتا ہے لیکن ریاست اس مدت میں جو ایک عظیم الشان تغیر پیدا ہو گیا ہے، اور یہ تغیر عجیب ارتقائی ہے کہ باوجود تدریجی ہونے کے ہم ماضی کے اثرات کو تاریخ کے اوراق پارینہ میں دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کونسا ایسا زندگی کا شعبہ ہے جس پر یہ ارتقائی تغیر مسلط نہیں ہوا۔ علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے موجودہ حیدرآباد گذشتہ کے مقابلہ میں بڑا اہمیت کا مرکز بن گیا ہے۔ یہاں ہم مغرب کے بعض مدبرین کی اس بحث سے قطع نظر کر لیتے ہیں کہ کسی ملک کی ترقی میں آیا حکومت کا حصہ بیش از بیش ہے یا رعایا کا۔ مشرقی ممالک خصوصاً ہماری مثال میں یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے اصولاً او رعملاً مختلف نہیں ہیں۔ اجنبی حکومت کے متعلق یہ بحث زیادہ درست ہو سکتی ہے۔ اپنا ملک اپنی حکومت اور اپنا ہر دلعزیز روشن خیال بادشاہ ہو تو پھر حکومت اور بادشاہ میں امتیاز کرنا لا حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سطح ارض کے تمام ممالک جن کو اپنے آپ پر حکومت کرنے کی خوش بختی حاصل ہے، جب ترقی کرتے ہیں تو اپنے ایک روشن خیال اور ہمدرد بادشاہ کے تحت۔ مثالیں گنانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ موجودہ دور میں ترقی پر گامزن ہونے والے ممالک ہی سے اس حقیقت کا انکشاف ہو سکتا ہے یہی تدبر تھا جس نے کسی مفکر مشرق سے "الناس علی دین ملوکہم" کے اس اصول کی تدوین کرائی۔

اسی کی مطابقت ہمارے پاس آجکل بھی ہو رہی ہے۔ ذات شاہانہ کی توجہ سے جو جو اصلاحات اور ارتقائی تغیرات ملک میں آئے دن ہو رہے ہیں رعایا اپنے آپ کو نہایت مسرت کے ساتھ ان کے مطابق کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

جس طرح اعلیحضرت کی ذات شاہانہ میں گوناگوں اوصاف اور خوبیاں جمع ہو گئی ہیں، اسی طرح آپ کا عہد مسعود بھی عجیب خصوصیات کا مرکز بن گیا ہے ہم اس اتحاد کو محض اتفاق نہیں کہہ سکتے۔ کیوں کہ نگاہ تجسس دوسری چیز کو پہلی کا لازمی اور ضروری نتیجہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ کافی ہے آپ کی علم دوستی اور علم کی سرپرستیوں نے ہند اور بیرون ہند سے علماء اور فضلا کو سلطنت میں کھینچ کر

بڑھالیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے لئے ایک مرکز بھی جامعہ عثمانیہ کی شکل میں فراہم کر دیا۔ اس کا نتیجہ اشاعت علوم کی صورت میں جلوہ گر نہ ہوتا تو فطرت کے خلاف تھا۔

ذاتی اعتبار سے آپ کی زندگی ایک عالمگیر کی، ایک سلطان ناصر الدین کی سادہ اور غیر معمولی سادہ زندگی ہے۔ لباس سادہ، خوراک سادہ، بود و باش سادہ، اس سادگی میں خدا کی عظمت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ آپ کے نظام زندگی میں بیشتر وقت ملک کے نظم و نسق کی اصلاح پر غور و فکر کا ہے اس سے جو وقت بچتا ہے۔ وہ دیگر مشرقی یا مغربی بادشاہوں کی طرح نغمہ و سرود جیسے حد سے زیادہ دلچسپ مشاغل میں نہیں بلکہ عربی فارسی اردو یا دوسری زبانوں کی علمی خدمت میں بسر ہوتا ہے۔ آپ کی فارسی شاعری کے متعلق بعض مبصرین کی رائے ہے کہ موجودہ ہند کی فارسی گویوں میں بلند ترین درجہ رکھتی ہے۔ اردو شاعری کا بھی یہی حال ہے۔ اخبار صبح دکن کے خسرو دکن نمبر میں ہم نے آپ کی فارسی شاعری کی خوبیوں پر تفصیلی نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ وہ آپ کی فارسی شاعری کی اہمیت کا ایک بڑی حد تک مظہر ہے۔ اتفاقی بات ہے کہ اسی ملک کے ایک دوسرے بزرگ عالیجناب مہاراجہ یمین السلطنت مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر نے اعلیٰحضرت کی اردو شاعری پر اچھی بحث کی ہے۔

آپ کا عہد مسعود ملکی نظم و نسق اور اصلاحات میں بھی خاص اہمیت رکھتا ہے علمی کارناموں میں دارالترجمہ اور جامعہ عثمانیہ کا قیام، اسلامی تاریخ کے شہنشاہ ہارون الرشید اور مامون الرشید کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ کر دیتا ہے۔ اشاعت علوم کے لحاظ سے روم کے شاہ آگسٹس کا ماحول پیش نظر ہو جاتا ہے۔

تاریخ ہند میں شاہجہاں کا عہد تعمیرات میں درخشاں ہے مورخ اس کو "عمارت ساز" کا لقب دیتے ہیں۔ تاریخ دکن میں شاہ دکن کا عہد شاہجہاں کے عہد کے مماثل ہے۔ اس "عمارت ساز" بادشاہ کے کارناموں میں موجودہ عمارات عدالت العالیہ، چوتحلہ مبارک، دواخانہ عثمانیہ، انٹرمیڈیٹ سٹی کالج ..... نوبل کالج، ٹاؤن ہال اور افضل گنج پارک، عثمان ساگر، حمایت ساگر، نظام ساگر اور دیگر بیشمار تعمیراتی کارنامے عرصہ دراز تک زبان حال سے اپنے موسس کی طرف اشارے کرتے رہیں گے۔ سینکڑوں عمارتیں اب تک بن چکی ہیں اور کئی ایک تیار ہو رہی ہیں۔ آرائش بلدہ شہر کے غلیظ اور تیرہ و تار محلوں کی صفائی میں مصروف ہے۔ شہر کی باطنی تعمیر کے علاوہ ظاہری شکل میں بھی اس قدر تغیر رونما ہو گیا ہے کہ ایک قرن ادھر کا شخص بمشکل اس کو پہچان سکیگا۔

نظم و نسق میں مال، فینانس، امن عامہ، عدالت، تعلیم، زراعت، صنعت و حرفت، تعمیرات وغیرہ میں جو جو ترقیاں اب تک ہوئی ہیں ان کا اجمالی ذکر بھی ایک کافی حجم کی کتاب کی وسعت چاہتا ہے۔ ان محکمہ جات

کے اعلیٰ عہدہ داروں کی رپورٹوں سے ان کی ترقیوں کا ایک اندازہ قایم ہوسکیگا۔

اعلیٰحضرت نے ملک کی معاشرتی اصلاح کی طرف بھی جس تدریجی رفتار کے ساتھ قدم اٹھایا تھا، اس کے مستحسن نتائج اب پوری طرح جلوہ گر ہوچکے ہیں۔ بزرگوں کی خانقاہوں میں عرصہ سے ناچ ورنگ کا دستور چلا آرہا تھا، اس کی بدنمائی میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے؟ اعلیٰحضرت نے اس قبیح دستور کا پورا پورا قلع قمع فرمایا۔ اسی طرح محرم کا قابل احترام مہینہ یہاں ایک بڑی حد تک طرح طرح سے دلچسپیوں کی پیدائش اور افزائش کا موقع بنا دیا گیا تھا، دن بھر سوانگ اور راتیں رقص و سرود میں بسر کی جاتیں، ملک میں اس کی قباحت سے بہت کم لوگ ہی واقف ہونے پائے تھے کہ اعلیٰحضرت نے ان افعال شنیعہ اور امور منہیہ کا استیصال فرماکر ملک اور قوم کو ایک بڑے اخلاقی جرم اور مذہبی گناہ کے ارتکاب سے روک لیا۔ اسی قسم کی کئی اور اصلاحات ہیں جو بخوف طوالت چھوڑ دی جاتی ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے "نظام گزٹ" کے ذریعہ ذات شاہانہ کی توجہ شادی بیاہ کی بے جا رسومات کی اصلاح کی طرف بھی منعطف کرائی ہے امید ہے کہ مناسب وقت میں حضور ان کی بھی بوجوہ احسن درستی فرمائیں گے۔

آخر میں ہم اعلیٰحضرت کی ہمدردی، رواداری، انصاف پسندی کو بھی نہیں بھول سکتے، جن کی بدولت آپ کو اپنے اسلاف کی روایتی ہردلعزیزی حاصل ہوگئی ہے۔ ہر طبقہ اور ہر عقیدے کی رعایا کے ساتھ آپ کے مراحم مساوی ہیں۔ ذاتی قابلیت آپ کی جانچ کا معیار ہے نہ کہ ذات۔ باوجود قلیل ترین تعداد میں ہونے کے پارسیوں میں سے ایک جوہر فرد آپ کے پاس اس قدر قدر حاصل کرتا ہے کہ اعلیٰ ترین عہدوں پر مرتے دم تک فائز رہتا ہے۔ آنجہانی سر فریدوں جی (نواب فریدوں الملک بہادر) عرصہ تک صدر اعظم رہے اور آخری ایام حیات میں اپنی قابلیت ہی کی وجہ سے صدر المہام اختصاصی شمار ہوتے رہے۔ آپ کے فرزند کروڑگیری کے اعلیٰ عہدہ دار ہیں۔ ایک دوسرے پارسی قابل فرد کے ذمہ مال کا اعلیٰ عہدہ ہے۔ یہ نمونے مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ تلاش کی ضرورت نہیں۔ دیکھنا چاہیں تو سینکڑوں مثالیں پیش نظر ہیں۔

آپ کی رعایا اہل ہنود پر زیادہ مشتمل ہے۔ موجودہ صدر اعظم باب حکومت جو اس ملت کے ایک حق میں جوہر فرد ہیں اعلیٰحضرت کی حق پسندی کے ہر وقت رطب اللسان ہیں۔ دیکھنے والوں کو یہ منظر دکھائی دیتا اور علانیہ نظر آتا ہے۔ عقل سے عشقہ روبرو تھا، دیکھکر بھی نہ دیکھے، تو اس کی مدد کون عقلمند ہوگا جو کریگا۔

یہ عجیب بات ہے کہ آپ کی ہندو رعایا مسلمانوں سے زیادہ آپ کی اور آپکے اسلاف کی گرویدہ ہے۔ اب تک وہ ضعیف العمر بقید حیات ہیں جو اپنے گذشتہ شاہجاہ نواب میر محبوب علی خاں بہادر غفران مکان کے خوارق عادات خصائل اور فرشتہ خصلت ہمدردیوں کا ذکر اس موثر پیرایہ میں کرتے ہیں کہ دل اس کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ ہر گاؤں میں اور ہر قصبہ میں حضرت غفران مکان کے مزار اور چلّے بنے ہوئے ہیں جن کا احترام وفا شعار ہندو اپنے اپنے طور پر طرح طرح کرتے ہیں۔

جس بادشاہ میں تمام خواص یکجا جمع ہوں، اس کے متعلق ہم کو یہ کہنے میں کیسے دریغ ہوگا کہ:-

سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے
خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

اور ایسے بادشاہ کی درازی عمر و بلندی اقبال کے لیئے کون خدا سے دعا نہیں کرے گا کہ یہ خود اپنی صلاح و ترقی ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(مدیر)

کلام الملوک ملوک الکلام

پردہ

نتیجۂ فکر بندگان متعالی اعلیحضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

جہاں شرم و حیا کا کمال سے یکتا ہے پردہ
کھٹکتا انکی آنکھوں میں مثال خار ہے پردہ

نگاہ بد کی پڑ سکتی نہیں کچھ سامنے اس کے
اگر شرم و ہیبت کچھ جب بھی ذمہ دار ہے پردہ

حقیقت میں اٹھا سکتی نہیں طاقت کوئی اسکو
بقائے عصمت و عفت کا اک اسرار ہے پردہ

جو نادانی سے کہتے ہیں کہ پردہ ہو نہیں سکتا
حیا کہتی ہے یہ دل ہی کہ کیا دشوار ہے پردہ

جو خوگر بے حجابی کے ہیں کچھ حاجت نہیں انکو
ہر اک پردہ نشیں کے واسطے درکار ہے پردہ

بسر کرتے ہیں اپنی زندگی جو پردہ میں
جو سچ پوچھو تو ان کا مونس و غمخوار ہے پردہ

نہ ہوں یاجوج ماجوج اس کے در پے کہہ دے اے عثمان
نہ چاٹا جائے گا وہ آہنی دیوار ہے پردہ

(بسلسلہ) حالی اور جدید شاعری (گذشتہ)

از جناب احمد عبداللہ صاحب المسدوسی۔ بی اے

دوسری بڑی اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حالی اس مشہور اصول "یہ جاننا نہایت اہم ہے کہ کب خاموش ہونا چاہیئے" کی پروا نہیں کرتے لانگ فلو (LONGFELLOW) کی آخری زمانے کی دو نظموں[۱] کے متعلق انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار نے تنقید کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ ان کی ناکامی کا سبب پیرانہ سالی ہے یہ نظمیں وہ ہیں جن کی تعریف میں وہ لکھتا ہے کہ

"ایک قسم کی جذباتی" اخلاقیت" بغیر کسی خوبی کے لیکن نیک اور قابل تعریف ارادہ کی حامل ہیں"[۲]

کس قدر عجیب طرح کسے یہ رائے مسدس پر صادق آتی ہے۔ حالی کی یہ نظم بھی اس وقت لکھی گئی ہے جبکہ طبیعت بجھ گئی تھی امراض کے متواتر حملوں سے دماغ بوسیدہ اور دل افسردہ ہوگیا تھا۔ باسی کڑھی میں اُبال آیا اور انہوں نے "ناصح" کی "دنیائے شاعری" کے اندر پہلی مرتبہ "نصیحت سنکر" جام و سبو کو توڑ پھوڑ ڈالا مے کشی سے توبہ کرلی، پیر مغان سے "فسخ بیعت" کی اور زنار توڑ سبحہ صد دانہ گلے میں ڈال کر زاہدانِ شب زندہ دار کی مجلس میں پہنچکر وعظ و نصیحت شروع کردی۔ مگر کیا یہ دلچسپ تجربہ کامیاب ثابت ہوا؟

اس بناء پر اگر کوئی شخص یہ صحیح رائے رکھے اور اس کا برملا اظہار کرے کہ حالی اخلاقی شاعری میں سخت ہیٹے ہیں تو کیوں ناک بھوں چڑھائی جائے اور کیوں کوئی آستین چڑھا کر مقابلہ پر اتر آئے ایک طرف وہ ساعی ہیں جو جائز و ناجائز طریقہ سے ایڑی چوٹی کا زور لگاکر زبردستی منوانا چاہتے ہیں کہ حالی بڑے زبردست شاعر تھے ان کی شاعری لٹریچر کا انمٹ (کلاسکل) حصہ ہے اور دوسری طرف خود حالی کے بیانات ہیں کہ وہ شاعر نہیں بلکہ "مشفق ناصح" ہیں، ان کو کلام کی داد لینی نہیں بلکہ اخلاق کی باتیں سکھانی ہیں جس اخلاقی شاعری کا سو فیصد حصہ علیگڈھ کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک سے متعلق ہو اور جس کے متعلق ذوؔر[۳] نے یہ بالکل صحیح رائے ظاہر کی ہو کہ۔

"جن خیالات کو سرسید نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ ظاہر کیا ان کو مولوی حالی نے مسدس میں گاکر بیان کیا"

اس کو شعر کا حقیقی جادو بنا کر اپنی سحر بیانیوں کے بل و بوتے پر پیش کرنا حالی پرستی میں تصرف درانہ کرنا ہے اور ع

پیران نمی پرند و مریداں می پرانند کے مصداق ٹھیرنا ہے۔

ایک نہایت اہم سوال یہاں پر پیدا ہوتا ہے کہ پھر کیوں حالی کی اخلاقی شاعری کو قومی شاعری کے پہلو بہ پہلو وہ حسن قبول حاصل ہوا جس کی وہ فی الحقیقت مستحق نہ تھی۔ اس سوال کے جواب ادا کرنے

---

(۱) ۱ے The Spanish student (2) A play in their acts

۲ے انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد ۱۶ صفحہ ۹۸ بار یازدہم۔ ۳ے مصنف روح تنقید مولوی سید غلام محی الدین قادری زورؔ ایم اے (ختم)

میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اگر اس امر کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ کل جدید لذید حالی نے پہلی دفعہ اس قسم کی شاعری کی مستقل کوشش کی اس لئے حسنِ قبول کا تاج ان کے سر پر رکھا گیا۔ اس کی مثال میں موجودہ شعراء میں پنجاب کے نوخیز و مشہور شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ آج سے چند سال پیشتر اوائل اول انہوں نے چھوٹی چھوٹی بحروں میں نئی نئی شاعری شروع کر کے جو شہرت حاصل کی تھی وہ آج انہیں جدید شعراء کے طبقہ میں حاصل نہیں ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ اب ان کا یہ رنگ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ متعدد ہونہار مگر تقلید پسند شعراء نے اسی کوچہ میں قدم رکھا ہے۔ اب ہمارا ذوق چھوٹی چھوٹی بحروں کے اندر خوبصورت الفاظ اور مترنم تراکیب کے سوا بھی ایک چیز کا طالب نظر آنے لگا ہے۔ اب ہم ابتداء کی طرح چھوٹی بحر سے جس میں معمولی درجہ کے خیالات ادنیٰ یا متوسط درجہ کے جذبات کے ساتھ ملا کر بیان کئے گئے ہوں مطمئن نہیں ہو سکتے' اب ہم اس شیشہ میں الفاظ و حروف کے تخیل کی لال پری کے جویا ہیں ہمارے دل کے اندر اب صرف وہی نظم اتر سکتی ہے جو تخیل کے اندر لپٹی اور بسی ہوئی ہو۔ بعینہٖ یہی حال حالی کی شاعری کا ہے۔ اب جبکہ متعدد شعراء نے ان سے زیادہ کامیابی کے ساتھ اخلاقی شاعری کے اس دشوار گزار مرحلہ کو طے کر لیا ہے۔ ایک مرتبہ ہم پھر حالی کی شاعری پر اپنی پرانی محویت کو یاد کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے پڑھنے سے وہی کیف دل و دماغ پر طاری ہو تو کیسے ممکن ہے؟

دوسری وجہ یہ ہے کہ حالی کی شاعری وقت کی سب سے اہم ضرورت اور مانگ کو پورا کرنے والی تھی۔ غدر کے بعد اپنی محکومی کی حالت اور برادرانِ وطن کو حصولِ تعلیم میں سرگرم دیکھکر ؎

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

مسلمان ایک دم چونک اٹھتے ہیں تو ؎

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

کا نقشہ نظر آتا ہے۔ ایسی حالت میں بھی بعض خدا کے بندے افسردگی اور یاس کی توسیع و اشاعت کو قومی زندگی کے حق میں سم قاتل سمجھکر "تعلیم تعلیم" کی صدا لگاتے اور اس طرح اس کے اندر ہنگامہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس گروہ کے علمبرداروں میں سب سے آگے رہنے والے اور پیش پیش گروہ کے حالی نقیب ہیں جو "وقت کے حکمِ ناطق" کی فرمانبرداری میں ؎

بس اب وقت کا حکمِ ناطق یہی ہے کہ جو کچھ ہے دنیا میں تعلیم ہی ہے

یہی آج کل اصل فرماندھی ہے اسی میں چھپا سِتر شاہنشہی ہے
ملی ہے یہ طاقت اسی کیمیا کو
کہ کرتی ہے یہ ایک شاہ و گدا کو

یہ نا اتفاقی ہے قوموں سے کھوتی یہ قومی محبت کا ہے بیج بوتی
یہ آپس کے کینے دلوں سے ہے دھوتی یہ دانے ہیں سب لڑی میں پروتی
یہ لفظوں پہ خط کی طرح ہے گذرتی
کروڑوں دلوں کو ہے یہ ایک کرتی

جہاں یہ نہیں واں قوم اور نہ ملّت نہ مُلکی حمایت نہ قومی حمیت
جدا سب کے رنج اور جُدا سبکی راحت الگ سب کی عزت الگ سبکی ذلت
خبر یہ نہیں واں کہ ہے قوم شئے کیا
چھپا سِرِّ حق اس تعلق میں ہے کیا

جنہوں نے نہ تعلیم کی قدر و قیمت نہ جانی - مسلط ہوئی ان پہ ذلت
ملوک اور سلاطین نے کھوئی حکومت گھرانوں پہ چھائی امیروں کے نکبت
رہے خاندانی نہ عزت کے قابل
ہوئے سارے دعوے شرافت کے باطل

یہ ہیں ترکِ تعلیم کی سب سزائیں وہ کاش اب بھی غفلت سے باز اپنی آئیں
مبادا رہِ عافیت پھر نہ پائیں کہ ہیں بے پناہ آنے والی بلائیں
ہوا بڑھتی جاتی سرِ رہ گذر ہے
چراغوں کو فانوس بن اب خطر ہے

بس اب علم و فن کے وہ پھیلاؤ ساماں کہ نسلیں تمہاری بنیں جن سے انساں
غریبوں کو راہِ ترقی ہو آساں امیروں میں ہو نورِ تعلیم تاباں
کوئی ان میں دُنیا کی عزت کو تھامے
کوئی کشتیٔ دین و ملت کو تھامے

علم کی دیوی "سرسوتی" کا پجاری بنکر نکلتا ہے - تعلیم جدید کی تحریک کی کامیابی کا یہ ثمرہ ہے کہ

حالی کی مسدس اور نظمیں حامیانِ تعلیم کی زبانوں پر۔ جو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں چڑھی ہوئی ہیں جو اپنے خطبات اور تقریروں کو رنگین یا موثر بنانے کے لئے ان کو سناتے پھرتے ہیں۔ چونکہ یہ ہنگامۂ تعلیم زور و شور کے ساتھ اور ایسے زور و شور کے ساتھ جس کی مثال ہندوستان کی گذشتہ تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ کامل نصف صدی تک گرم رہا ہے جس کے دوران میں حالی کی یہ نظمیں مختلف پلیٹ فارم پر مختلف زبانوں کے ذریعہ اتنی کثرت کے ساتھ دہرائی گئی ہیں کہ شاید ہی آج تک کوئی نظم اس کا مقابلہ کر سکے۔ علماء و واعظین کا طبقہ جو سرسید اور حالی کی تحریک تعلیم جدید کا مخالف رہا ہے اس نے بھی اس شہرت میں حصہ لیا ہے، ان کی مسدس کے نعتیہ اشعار وغیرہ کو گرمیٔ محفل کے لئے خوب گا گا کر سنایا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر مسلمان حالی سے واقف اور انکی شاعری کا مداح نظر آتا ہے اور چونکہ ابھی تک ایک بہت بڑا گروہ اس ہنگامہ کے تماشہ گروں یا تماشائیوں کا موجود ہے اس لئے حالی کی شاعری کا طلسم ٹوٹنے نہیں پایا۔ تعلیم جدید کی طرف سے بیزاری اور دیگر سیاسی، مذہبی اور معاشرتی تحریکوں اور مسائل کی طرف دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے اس لئے وقت قریب آ رہا ہے کہ یہ اشعار اور نظمیں اپنی ہنگامہ آفریں زندگی کے لئے خاموش اور پرسکون گوشہ تلاش کر لینگی ع جان بیٹا خلافت پہ دیدو۔ اور ع چل میرے چرخے چرخ چوں کا حشر ہمارے سامنے ہے

غور تو کیجئے؟ کیسے ممکن ہے کہ ایک غم انگیز پچھلی رات کو جو بھیرویں کا راگ اور پرحسرت نالہ دل کو بھا گیا تھا رزمِ جد و جہد کی دوپہر میں بھی سہانا معلوم ہو؟

تیسری وجہ یہ ہے کہ حالی کی شاعری کو ہمارے علیگڈھ کے قابل قدر تعلیم یافتہ بھائیوں نے اچھالا۔ یہ ان کی سعادتمندی کی دلیل ہے۔ حالی نے علی گڈھ کی تحریک کو جس طرح اسٹیم بن کر چلایا تھا اس کا نتیجہ یہ ہونا تھا کہ وہاں کی تعلیم یافتہ پود میں ان کی قدر و منزلت کا خیال جڑ پکڑ جاتا وہ اس عظمت و بزرگی کی عینک لگا کر ان کے اس کلام کو پڑھتے ہیں جو ان کے عزیز مادرِ کالج کے متعلق والہانہ انداز میں لکھا گیا اور جس میں تعریف و ثنا کے پل باندھے گئے ہیں تو ان پر عجیب اثر ہوتا ہے ایک طرف جذبۂ شکرگزاری بیدار ہوتا اور دوسری طرف اپنے محسن کے کلام میں اور اس کلام میں جو سراسر شعریت سے خالی ہے ان کو عجیب عجیب خوبیاں نظر آنے لگتی ہیں جس طرح کہ آج غالب کے مداحوں اور طرفداروں کو اس کی ابتدائی زندگی کے غیر مطبوعہ اشعار میں جن کو خود غالب نے قلمزد کر دیا تھا ایک عالمِ شاعری نظر آتا ہے۔ اس خیال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بے تکلف تحریر اور تقریر میں

حالی کے یاد کیے ہوئے اشعار استعمال کرتے اور رسائل و اخبارات میں ان کی اخلاقی شاعری کے اثرات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے۔ رائی کو پہاڑ بناتے ہیں۔ اور چونکہ گذشتہ سالوں میں علیگڑھ اور وہاں کا تعلیم یافتہ گروہ علمی اور سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کا رہنما رہا ہے اس لئے اس خیال کے دلوں میں جاگزیں کر دینے میں بڑی آسانی سے کامیابی حاصل ہوئی ہے اور آج بدقسمتی سے اس عام مرغوبیت اور رجال پرستی (ہیرو ورشپ) کے خلاف کوئی آواز بلند کرتا ہے تو چونکہ وہ عام عقیدہ کے خلاف ہے۔ اس لئے گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے۔

مجھے معاف رکھا جائے اگر یہ کہوں کہ اس غلط خیال کے پھیلانے میں اس لئے بھی کامیابی حاصل ہوئی کہ پبلک بے انتہا رجال پرست واقع ہوئی ہے۔ مذہبی مسائل میں تقلید کی ضرورت کے یہ معنی نہیں کہ ادبی معاملات میں بھی ہمیشہ تقلید کا جوا گردن میں پڑا رہے۔ حالی نے قوم پر احسان کیا اور اپنے پرسوز نالوں سے دلوں کو تڑپا دیا ہے تو آپ کو اختیار حاصل ہے کہ آپ ان کو قوم کا محسن اور مرثیہ گو کہیں، جیسکے ہم بھی کہتے ہیں کہ وہ بجا طور پر مستحق ہیں لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ آپ دنیا بھر کی فضیلتوں اور کمالات ادبی کا طرہ ان کے سر سجائیں اور اگر کوئی ان کی اخلاقی شاعری کو ذوق صحیح کی میزان میں رکھکر تولنا چاہے تو آپ اس کا ہاتھ پکڑ لیں۔

آئیے اس کے بعد ذرا حالی کی اخلاقی شاعری پر نظر ڈالیں۔

حالی سے پہلے غزل اردو و فارسی شاعری میں زیادہ تر داخلی شاعری کے لئے مخصوص سمجھی گئی اور عشق و محبت کے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنی رہی ہے۔ کہیں کہیں اس میں، شک نہیں کہ شعرا نے فلسفیانہ، صوفیانہ اور اخلاقی مسائل کو بیشتر تو ع پردہ پردہ میں جو ظاہر ہو وہ حال اچھا ہے پر عمل کرکے رمز و کنایہ، استعارہ اور مجاز میں اور کم تر صاف صاف بیان کیا ہے۔ حالی نے اردو شعرا کا حال دیکھکر کہ انہوں نے اخلاقی مسائل کا بیان کرنا بالکل ترک کر دیا ہے اس کی تلافی یوں کرنی چاہیئے کہ غزل کو مطلع سے لے کر مقطع تک اخلاقی مسائل کی صدہا جزئیات سے بھر دیا۔ اور اس امر کا بالکل خیال نہ رکھا کہ اس سے غزل کی لطافت اور شیرینی میں فرق آ جائیگا۔ اس شربت میں پانی اتنا ملانا چاہیئے کہ پھیکا نہ ہونے پائے۔ مگر اس کے برخلاف وہ عمل کرتے ہیں جس کی وجہ سے "غزل کا اسٹائل بالکل بدل گیا" ؎

کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر	ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر
جانتے ہیں آپ کو پرہیز گار	عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر
دوست اس کے ہیں شاکی اسکے آشنا	گو بظاہر سب سے ہیں شیر و شکر

اور اس ذریعہ کو کھو کر جو قوم میں جوشِ عمل پیدا کرنے کا سب سے کامیاب آلہ ہے اپنے پیروں پہ آپ کلہاڑی ماریں، ہم کو ابھی ابھرنے اور جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے ہم جب تک "مصاف زندگی میں سیرت فولاد" نہ پیدا کرینگے "شبستانِ محبت میں حریر و پرنیان ہونے" کا خیال سودائے خام ہے، یورپ جو آج "آرٹ کو آرٹ کی نظر سے جانچنا چاہیے" یا "حسن و خوبصورتی اور شعریت کو بذاتہا مقصود بنانا چاہیے" کا نعرہ لگا رہا ہے۔ اپنی موجودہ پرسکون درو انی زندگی کو پہنچنے کے بعد اس کا قائل ہوا ہے ورنہ وہ بھی کسی زمانہ میں ہماری طرح جیسا کہ انگریزی زبان کے مشہور شاعر و نقاد میتھو آرنلڈ نے لکھا ہے۔

"شاعری تہ میں زندگی کی ایک تنقید ہے اور کسی شاعر کی عظمت کا مدار اس امر پر ہے کہ وہ کس طرح قوی اور خوبصورت پیرایہ میں حیات پر خیالات کی روشنی ڈالتا اور اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ زندگی کس طرح بسر کیجائے، جو شاعری اخلاقی خیالات سے بغاوت کرتی ہے وہ زندگی سے بغاوت کرتی ہے جو شاعری اخلاقی خیالات سے بے اعتنائی برتتی ہے وہ زندگی سے بے اعتنائی برتتی ہے۔"

اس امر کا قائل تھا کہ اخلاق کو شاعری کی سرحد سے دور پار نہیں سمجھنا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ خیالات یورپ کی تباہی کے باعث ہیں۔ فنون لطیفہ کی کثرت، اسکی طرف میلان اور اس کی پیداوار قوموں کے زوال کی جیسا کہ لیبان نے اپنی مشہور کتاب "انقلاب الامم" میں ثابت کیا ہے علامتیں ہوتی ہیں۔ قومیں جب اپنی انتہائی رفعت وعروج پر پہنچ جاتی ہیں اور دولت و ثروت کی فراوانی ہو جاتی ہے تو وہ عیش و عشرت کی دلدادہ ہو جاتی ہیں اور داد نشاط دینے کے لئے جہاں مختلف طریقے ڈھونڈ نکالتی ہیں وہاں فنون لطیفہ کی پناہ بھی ڈھونڈھنے لگتی ہیں، ہر طرف فنون لطیفہ کا خیال کثرت کے ساتھ پھیل جاتا ہے۔ رات دن اس دھن میں مستعدی و محنت اور جستی اور چالاکی رخصت ہو جاتی ہیں اور قوم کے قوائے عمل سست پڑ کر ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر کوئی نوزائیدہ قوم اس کو دبوچ لیتی اور اس کی آزادی کو سلب کرکے اس کے تہذیب و تمدن کی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکدیتی ہے۔ یہی حال روما، یونان اور کسریٰ کی سلطنتوں کا ہوا، گذشتہ صدی میں ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی عظیم الشان حکومتوں کا ہوا اور آج دنیا کے ہر گوشہ میں مسلمانوں کا نظر آتا ہے پلاسیو والڈس لکھتا ہے

"ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ فنون لطیفہ کی پیدائش کی طرف اسی وقت توجہ کیجاتی ہے جب وہاں خوش حالی عام ہو جاتی ہے اور اس ملک کے باشندے

اپنی تمام مخالفانہ قوتوں پر غلبہ پاکر زندگی باطمینان گزارنی شروع کردیتے ہیں۔[1]

قصہ مختصر "اخلاق" کو شاعری کے اندر "اچھوت" سمجھنے کی ضرورت نہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس امر کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ "میتھو آرنلڈ کی زبان میں" شاعر کی عظمت کا مدار اس امر پر ہے کہ وہ کس طرح قوی اور خوبصورت پیرایہ میں حیات پر خیالات کی روشنی ڈالتا اور اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ زندگی کس طرح بسر کیجائے اور اگر بدقسمتی سے "قوی اور خوبصورت پیرایہ" کے اختیار کرنے میں پیروں کو لغزش ہوجائے تو پھر ناکامی کی خندق کا منھ کھلا ہوا ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح حالی جو "حیاتِ سعدی" کی تصنیف کے بعد سے بہت زیادہ سعدی کی اخلاقی شاعری کی نوعیت سے واقف ہوچکے تھے۔ اس قدر حقیقی راہ سے بھٹک گئے ہیں؛ ان کے لئے سعدی کا کلام مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی طرح نمونہ کا کام دے سکتا تھا اور وہ زیادہ کامیابی کے ساتھ اخلاقی شاعری کے ذریعہ لٹریچر میں کسی مفید عنصر کا اضافہ کرسکتے تھے۔

ہم جب ان کے دیوان میں اس قسم کی بے مزہ اور طویل غزلوں کو پڑھتے ہیں ؎

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہوجائے نفرت زیادہ

تکلف علامت ہے بیگانگی کی
نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ

کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزت
جو چاہو کریں لوگ عزت زیادہ

نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے
نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ

کرو علم سے اکتساب شرافت
نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ

فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو
اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ

جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے
نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ

مصیبت کا اک اک سے احوال کہنا
مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ

کرو ذکر کم اپنی داد و دہش کا
مبادا کہ ہوجائے خست زیادہ

پھر اوروں کی تکتے پھروگے سخاوت
بڑھاؤ نہ حد سے سخاوت زیادہ

کہیں دوست تم سے نہ ہوجائیں بدظن
جتاؤ نہ اپنی محبت زیادہ

---

[1] مقدمہ دی انٹرنیشنل لائبریری آف فیمس لٹریچر جلد ۲۰ صفحہ (۱۲) بحوالۂ "دنیائے افسانہ" مولفہ مسٹر عبدالقادر ایم۔ اے ایل ایل۔ بی (علیگ)

جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا　　نہ رکھو امیروں سے ملّت زیادہ
وہ افلاس اپنا چھپاتے ہیں گویا　　جو دولت سے کرتے ہیں نفرت زیادہ
نہیں چھپتے عیب اتنی ثروت سے تیرے　　خدا دے تجھے خواجہ ثروت زیادہ
ہے وحشت بھی اُلفت بھی دنیا سے لازم　　نہ اُلفت زیادہ نہ وحشت زیادہ
فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا　　مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ
بکے مفت ہم یاں زمانے کے ہاتھوں　　جو دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ
ہوئی عمر دنیا کے دھندوں میں آخر　　نہیں بس اے عقل مہلت زیادہ
غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی　　الاپیں نہ بس آپ دھرپت زیادہ

تو کوئی شبہ نہیں کہ بعض بعض لطیف شعر بھی نظر آجاتے ہیں، لیکن عام طور پر یہ خیال ہمارے دماغ پر اخلاقی مسائل کی ان جزئیات کی تفصیل کو دیکھکر مرتسم ہو جاتا ہے کہ مولانا شاید "اخلاقِ جلالی" و "اخلاقِ محسنی" کا نظم میں خلاصہ فرما رہے ہیں ایک اور غزل ملاحظہ ہو ؎

تمہیں خود پرستو طبیعت کے بندو!　　ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے
نہیں کام کا تم کو اندازہ ھر گز　　جدھر ڈھل گئے ہو رہے بس ادھر کے
جو مجرے میں بیٹھو تو اٹھو نہ جبتک　　کہ اٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کر کے
اگر پل پڑے چوسر اور گنجفہ پر　　تو فرصت ملے شاید اب تم کو مر کے
پڑا مرغ بازی کا لپکا تو جانو　　تو بس کٹ گئے عزمِ جنگِ تیتر کے
چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر　　تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے
جو ہے تمکو کھانے کا چسکا تو سمجھو　　تو چھوڑینگے بس آپ دوزخ کو بھر کے
جو پینے پہ آؤ تو پی جاؤ اتنی　　رہیں پاؤں کے ہوش جس میں نہ سر کے
جو کھانا تو بیحد جو پینا تو اتگت　　غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے

علی الخصوص ان اشعار کو پڑھ کر تو ؎

کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب　　کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر
نہیں چھپتے عیب اتنی ثروت سے تیرے　　خدا دے تجھے خواجہ ثروت زیادہ
جو ہے تمکو کھانے کا چسکا تو سمجھو　　تو چھوڑینگے بس آپ دوزخ کو بھر کے

جو کھانا تو بے جد جو پینا تو اُت گت	غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے

دماغ یہ سمجھنے سے عاجز رہ جاتا ہے کہ ان اشعار میں شاعرانہ اور ادبی غرض نہ سہی کیا اخلاقی غرض پنہاں ہے۔ غور کیجیے کہ کیا اسی قبیل کے اشعار کا مقصد جن سے ان کا دیوان بھرا پڑا ہے اخلاقی شاعری ہے؟ سچ کہا تھا ایک انشا پرداز نے کہ

"حالی اس وقت تک شاعر تھے جب کہ اُنھوں نے یہ شعر کہا تھا کہ ؎

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب	بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

سچ پوچھیے تو اس قسم کی شاعری اخلاقی شاعری نہیں بلکہ نِرا مُلّا وعظ ہے جو ادنیٰ درجہ کے پیشہ ور واعظوں کے ممکن ہے کام آتا ہو۔

شاید آپ کو ان کے قطعات اور ترکیب بندوں سے جہاں ان کو زیادہ آزادی فضا میسر آئی تھی کسی قسم کی کوئی امید ہو۔ اس کا نمونہ بھی دیکھ لیجیے، روسائے عہد کی فیاضی پر ایک قطعہ لکھا ہے ؎

کی رئیس شہر کی تعریف یاروں نے بہت	برسبیلِ تذکرہ باہم جو ذکر اس کا چلا
بولے آج اس کا نہیں یہاں نوازی میں نظیر	عاملانِ شہر معمور رہتے ہیں اس کے سدا
ضلع کے حکام کا ادنیٰ اشارہ چاہیئے	پھر کوئی دیکھے سخاوت اسکی اور بذل و عطا
یادگاریں جتنی ہیں اعیانِ دولت کی یہیں	ان میں صرف اسکی رقم ہے سب کے چندے سے سوا
پالکی یا ڈوگ کارٹ ہے جو سواری اسکے پاس	اہلِ کاروں کے لئے ہے وقف بیچون و چرا
کیا کلکٹر، کیا کمشنر، کیا سپاہی کیا عسس	اس کی ہمت کے ہیں سب مداح بے رو و ریا
جب یہ دیکھا مدح کا دفتر نہیں ہوتا تمام	جوڑ کر ہاتھ ان سے حالی نے بصد منت کہا
عیب بھی اس کا کوئی آخر کرو یارو بیاں	سنتے سنتے خوبیاں جی اپنا متلانے لگا

اگر اس نظم کا مقصد کسی رئیس کی ہجو جس نے علیگڈھ کالج کے لئے چندہ نہ دیا ہو مقصود تھی تو وہ بلاشبہ حاصل ہوگئی اور اگر کوئی ادبی غرض تھی تو افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ وہ حاصل نہ ہوسکی۔

یہ اُن کی غزلوں اور اخلاقی شاعری کا عام رنگ ہے لیکن خال خال ان کے دیوان میں کامیاب غزلیں بھی نظر آتی ہیں جن کا نمونہ یہ ہے ؎

کاٹئے دن زندگی کے اُن یگانوں کی طرح		جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح
منزلِ دنیا میں ہیں آٹھوں پہر پا در رکاب		رہتے ہیں جہاں سرا میں میہمانوں کی طرح
سعی سے اُکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں		جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح
رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا		نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح
شادمانی میں گزرتے اپنے آپے سے نہیں		غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح
رکھتے ہیں تمکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا		رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح
پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی		پر بھلا تکتے ہیں اک اک کا یگانوں کی طرح
آس کھیتی کے پنپنے کی انہیں ہو یا نہ ہو		ہے اسے پانی دیے جاتے کسانوں کی طرح
ان کے عنصر میں ہے دلسوزی ملامت میں ہے پیار		مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح
کام سے کام اپنے انکو گو ہو عالم نکتہ چیں		رہتے ہیں نکلیں دانتوں میں زبانوں کی طرح
طعن سُن سُن احمقوں کے اس طرح دیوانہ وار		دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح
کیجے کیا حالیؔ نہ کیجے سادگی گر اختیار		بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

کاش وہ اپنی تمام غزلوں اور اخلاقی نظموں میں "جب رنگیں بیانیوں کی طرح بولنا نہ آئے" کم از کم اسی قسم کی سادگی اختیار کرتے ! بہر حال اس قسم کی چند گنتی کی غزلوں کو مستثنےٰ کر دیجیے تو ان کے بقیہ کلام کے متعلق خود اُن کے قول کی تصدیق کرنی پڑتی ہے ۔ ؎

کیجے کیا حالیؔ نہ کیجے سادگی گر اختیار		بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

میں نے مسلسل کئی دن تک اس عقدہ کو حل کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیوں اخلاقی شاعری میں حالی کا درجہ اس قدر گرا ہوا ہے حالانکہ ان کا طرزِ تحریر نثر میں تمام پرانے انشار پردازوں یعنی ان کے ہم عصروں میں سب سے زیادہ بانکا اور البیلا ہے اور انکی غزلوں میں وہ درد و اثر اور سوز و گداز ہے جو میرؔ کی غزلوں کا امتیازی خاصہ سمجھا جاتا ہے ۔ ایسے شخص کی اخلاقی شاعری جس کی نظم میں ایسا پریم اور بانکپن ہو اس کی کیا وجہ ہے کہ ؟ اس قدر ادنیٰ درجہ کی ہے تو پتہ چلا کہ یہ رنگ انکی افتادِ طبیعت کے بالکل خلاف ہے جیسا کہ ایک قطعہ میں کہتے ہیں ؎

ناصح مشفق ہیں یاروں کے نہ مصلح اور رفیق		درد مندان کے نہ انکے درد کے درماں ہیں ہم
پھوٹ پڑتے ہیں تماشہ اس چمن کا دیکھکر		نالۂ بے اختیار ہیں بلبلِ نالاں ہیں ہم

زمانہ کی ضرورتوں اور ناصحوں کی نصیحتوں کو پیشِ نظر رکھکر مجبوراً ان کو "ناصح مشفق" بھی بننا پڑا اور "مصلح ورفیق" بھی" "دردمند" بھی بننا پڑا اور "درد کے درمان" بھی اس بنا پر ان کی اخلاقی شاعری سراسر آورد ہے۔ مولانا زندہ ہوتے تو دست بستہ نہایت ادب کے ساتھ ان کی جناب میں عرض کرتا کہ آورد کو ڈھکوسلا اور خیالی بات ثابت کرنیکی "مقدمہ" میں آپ نے جو کوشش کی ہے اُس میں اس فدوی کو کلام ہے اور ثبوت میں ان کی اخلاقی شاعری کو پیش کرتا۔ وہ چونکہ وسیع الخیال اور نیک آدمی تھے اس لئے اپنی مخالفت سے کبھی رنجیدہ نہ ہوتے۔

اس خیال کا مزید ثبوت اس طرح مل سکتا ہے کہ آپ ان کے قدیم کلام اور غزلوں کو پڑھیئے معلوم ہوگا کہ اخلاق کا عنصر اس میں ——— آٹے سے بھی کم ہے۔ پرانے شعراء نے اخلاقی شاعری کو مستقل عنوان نہیں قرار دیا لیکن جگہ جگہ پر وہ اخلاقی نکات بیان کرجاتے ہیں۔ حالی کو اس کوچہ سے دامن کشاں دیکھکر حکم لگانا پڑتا ہے کہ وہ فطری طور پر اُن اخلاقی مسائل سے اپنی فطرت کو کوئی لگاؤ نہ دیکھتے تھے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ انکی اخلاقی شاعری کا وہ حصّہ بھی جہاں "سعدی" کے رنگ میں قصوں اور لطیفوں کے ذریعہ کوئی اخلاقی سبق دینا چاہتے ہیں اگرچہ کہ یہ حصہ بھی کچھ زیادہ نہیں ہے خشک ہوجاتا ہے؟ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ براہِ راست ارشاد وہدایت شروع کردیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اخلاق کے سبق پڑھانے کا یہ طریقہ شاعرانہ نہیں ہوسکتا۔ یہ طریقہ تعلیم کچھ واعظوں اور پنڈتوں کے لئے زیبا ہے خود کہتے ہیں۔

"ناصح کی غرض براہِ راست ارشاد وہدایت ہوتی ہے بخلاف شاعر کے اصلی مقصود فطرتِ انسانی کی کرید ہے اور واقعاتِ دہر سے متاثر ہوکر دل کی بھڑاس نکالنی ہے اور بس"۔

براہ راست ارشاد وہدایت سے اصل یہ ہے کہ انسان کے اندر انانیت کا جذبہ ابھر آتا ہے اس لئے ایسی تعلیم وتلقین بجائے مفید ہونے کے نقصان پہنچاتی اور طبیعت میں ضد اور ہٹ پیدا کرتی ہے اسلئے فطرت انسانی کے رمز شناسوں کا یہ دستور ہے کہ وہ نصیحت براہ راست کرنیکے بجائے ہمیشہ رمز وکنایہ اور قصوں اور چٹکلوں کے پیرایہ میں بیان کرتے اور لوگوں کی اصلاح کرنیکے علاوہ اپنی کامیابی کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی اور زیادہ تر اکبر مرحوم۔ ہم دوسری جگہ پر تفصیل سے بحث کرینگے ——— اس طرز کے پیرو ہیں۔ حالی نے اس موثر حربہ سے بہت کم کام لیا ہے اور جہاں کام لیا ہے وہاں بھی اپنی فطری ناموزونیت کی بنا پر پوری طرح کامیاب نہ ہوسکے۔ خود کہتے ہیں " بعض قطعات ورباعیات میں اخلاقی مضامین کنایہ میں ادا کئے گئے جو شاید کہیں کہیں مطابقہ کی حد کو پہنچ گئے ہوں مگر انوری وسعدی وشفائی کے

مطائبات کے آگے یقیناً بے نمک معلوم ہونگے"۔

حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کی تعلیم کے لئے خصوصاً اخلاقی تعلیم کے معمولی مسائل کے لئے اس سے زیادہ بہتر اور موثر کوئی اور ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ آج سعدی علیہ الرحمۃ کی کامیابی کا سارا دارو مدار اسی پر ہے اس طرز کے اختیار کرنے سے ان کے کلام کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ ان کے بیسیوں اشعار اور مصرعے زبان زد ہو کر ضرب الامثال کا درجہ حاصل کر چکے اور فارسی اور اردو لٹریچر کا غیر منفک جزبن گئے ہیں لیکن اس کے برخلاف حالی کے اشعار دیوان کی زیب زینت یا حجم کو بڑھانے کا کام دیتے ہیں حالی کے اخلاقی اشعار میں دو چار سے زیادہ ایسے اشعار نہیں پیش کئے جا سکتے جو آج لوگوں کی نوک زبان ہوں اور ضرب الامثال کا مرتبہ رکھتے ہوں۔

ضرب الامثال کا یہ ظاہر ہے کہ وہی اقوال و اشعار درجہ حاصل کر لیتے ہیں جن میں زندگی کے اہم اصول اور صداقتوں کو نہایت جامع و مانع الفاظ میں خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اسی سے حالی کی اخلاقی شاعری کی ناکامی کا سب سے بڑا ثبوت ملتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ اخلاقی مضامین کو ظرافت کے پیرایہ میں بیان کرنے کی کوشش نہیں کرتے جو فروعات کے اظہار کے لئے سب سے کامیاب ذریعہ ہے جیسا کہ اکبر الہ آبادی کا طریقہ ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ حالی نے ان مسائل اخلاق کے بیان کے لئے جو زبان استعمال کی ہے وہ اس کے لئے سخت ناموزوں ہے سلیس، شیریں اور لوچدار زبان شاید عاشقانہ جذبات قلبی واردات اور رونے رلانے کے لئے نہایت مفید ثابت ہو۔ عوام پر ادعا زور اور طنطنہ کا زیادہ اثر ہوتا ہے نفسیات کا اصول ہے کہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے اور کسی رائے پر چلانے کے لئے ضروری ہے کہ انہیں مرعوب کیا جائے بہت سادے الفاظ ممکن ہے کہ ان کی تعریف میں کسی کی زبان سے "سلاست پسند" "صاف گو" کے خطابات دلا دیں لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اس سے بھی قطع نظر کر کے دیکھئے اخلاقیات (ETHICS) ہر شخص جانتا ہے کہ فلسفہ کی ایک شاخ ہے دنیا کی ہر زبان میں فلسفہ کے بیان کرنے کے لئے مخصوص زبان، تراکیب اور بندشیں استعمال کی جاتی ہیں، نثر میں بھی اور نظم میں بھی کیونکہ اس کے دقیق اور پیچیدہ مسائل کے لئے زبان میں جو اظہار خیالات کا ذریعہ ہے" مخصوص شان کا پیدا ہو جانا یقینی ہے اور جو لوگ اس طرز بیان کو چھوڑ سادہ زبان میں ان معانی و مطالب کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں وہ ان معانی و مطالب کی پوری روح کو بیان نہیں کر سکتے، کسی نہ کسی رخ اور پہلو کا نظر انداز ہو جانا ضروری ہے اس بناء پر ان فنون کے لئے لامحالہ

مخصوص زبان استعمال کرنی پڑتی ہے نظم میں تو اس کا خاص طور پہ التزام کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ بقول سوفٹ (SWIFT) موزوں الفاظ کا موزوں طریقہ سے استعمال کرنا نظم ہے۔"

دنیا کے تمام اخلاقی شاعری کے علمبرداروں نے یہی طرز بیان اختیار کیا ہے۔ براؤننگ کو پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ کس طرح مخصوص تراکیب اور غریب بندشوں کے دامن میں اپنے فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے لئے پناہ گیر ہونا پڑتا ہے۔ انگریزی کو چھوڑیئے غالب کو لیجئے جس کی فلسفہ دانی کے آج آپ قائل ہیں اس کا طرز بیان کس قدر پیچیدہ اور مغلق ہے ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

کے سجاؤ میں یہی عذر پیش کیا جاتا ہے کہ معمولی الفاظ و تراکیب ان نازک معانی کی متحمل نہیں ہوسکتیں کیا شاندار موضوع کے لئے شاندار اسٹائل کی ضرورت سے انکار کیا جا سکتا ہے ؟

بہرحال اخلاقی مسائل کے لئے ضروری ہے کہ شاندار اور مخصوص طرز بیان اختیار کیا جائے اقبال نے اس رمز کو سمجھا اور اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے جیب و دامن کو گل ہائے آرزو سے بھر لیا ہے۔ ہم اقبال کے ضمن میں اس پر سیر حاصل بحث کرینگے۔ مولنا حالی ایسا نہیں کرتے اور وہ مجبور بھی تھے۔ یہ مخصوص طرز بیان اخلاقی شاعری کے اندر اس وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ جبکہ کائنات کے متعلق کسی گہرے قانون قدرت کا اظہار یا زندگی کے کسی مہتم بالشان اصول کو تعبیر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ تمام مسائل اخلاق اور اسکی جزئیات کے لئے یہی معمولی طرز ادا کافی ہے لیکن یاد رکھئے کہ شاعری کو اخلاقی مسائل کی جزئیات اور فروعات سے آلودہ نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقی شاعری کو جو لوگ شاعری کا جزو سمجھتے ہیں ان کے نزدیک بھی سچ بولنا اچھا ہے، جھوٹ بولنا برا ہے، تکلف بیگانگی کی علامت ہے اس قسم کی تعلیم مزخرفات سمجھی جاتی ہے شاعر کو آزادی حاصل ہے کہ وہ تمام دنیا کی باتوں کو بیان کرے اس کے لئے کسی قسم کی رکاوٹ اور قید نہیں ہے، ہر جگہ پھرے اور ہر بات بیان کرے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ شاعر باقی رہے ان جزئیات اور اخلاقی مسائل کی فروعات میں شاعر شاعر باقی نہیں رہ سکتا اور شاعری ہیچ ہو کر کوئی اور شئے ہو جاتی ہے شاعری ایک ملکوتی اور لاثانی شئے ہے اسکو اخلاقی مسائل کی یہ بحثیں برباد کر دیتی اور فانی بنا دیتی ہیں جو لوگ اخلاقی شاعری کا یہ مفہوم سمجھے ہوئے نہیں ہیں ان کو شاعری پر رحم کرنا چاہیئے وہ غلطی پر ہیں مناسب ہوگا کہ ان "مسائل مہمہ" کے لئے جہاں قافیہ و ردیف کی عدم پابندی کے سبب ان کو زیادہ آزاد فضا مہیا ہوسکتی ہے نثر ہی کو نوازیں یہ پانچویں وجہ ہے ناکامی کی۔

چھٹی اور آخری وجہ یہ ہے کہ ان کی اخلاقی شاعری دفع الوقتی تھی۔ انہوں نے کبھی بھی اپنی اس

لیکر انتہائی تنقیح و تہذیب تک بہت سے مرحلے طے کرنے ہوتے ہیں جو کہ اب سامعین کو شائد محسوس نہ ہوں لیکن شاعر کو ضرور پیش آتے ہیں" کیا حالی اس اصول سے مستثنیٰ ہیں ؟ یہ ہیں وہ اسباب جنہوں نے مل جُل کر حالی کی اخلاقی شاعری کی ناکامی میں حصہ لیا ہے پس اگر اس سے پہلے حالی کی اخلاقی شاعری کی تعریف کے پل باندھے گئے تھے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ اعلیٰ درجہ کی لذیذ مٹھائیوں کا عادی مہمان کسی دسترخوان پر جوار کی روٹی تو تنوع پسندی یا بھوک یا میزبان کی خاطر پسند کرنے ایک روز کھالے اور تعریف سن کر اس سے یہ امید رکھنا کہ اس جوار کی روٹی کو وہ روز روز مزے لیکر کھائیگا اسکے اخلاق سے بیجا فائدہ اٹھانا ہے۔ ہم میٹھی میٹھی غذائیں کھاتے کھاتے یعنی عاشقانہ شاعری سنتے سنتے اکتا چلے تھے حالی نے ایسے عالم میں ہمارے سامنے جوار کی روٹی یعنی اپنی روکھی پھیکی شاعری رکھدی وہی اچھی معلوم ہوئی کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم اب بھی اسی کو زہر مار کریں؟ منظور ہے لیکن تعریف کی امید تکلیف مالایطاق ہے۔

اپ گذشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ پڑھ آئے ہیں کہ کس طرح حالی قومی شاعری کے اس حصہ کے سوا جس میں قوم کی تباہی اور بربادی کا دُکھڑا رویا ہے اپنی جدید شاعری میں ناکامیاب رہ چکے ہیں اور آنیوالے شعراء کے لئے اصلاح و تجدید کا راستہ صاف کرنے کے علاوہ انہوں نے اپنی شہرت اور قدر و منزلت کے لئے بہت کم سرمایہ چھوڑا ہے۔ میں اس بناء پر اپنی اس رائے کو ڈرتے ڈرتے ظاہر کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ حالی نے اپنی شاعری سے لٹریچر کو کوئی معتدبہ فائدہ نہیں پہنچایا اور ان کا نام چوٹی کے شاعر کی حیثیت سے جدید شاعری میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ واویلا مچانے سے پہلے اس امر کو یاد کرنیکی ضرورت ہے کہ میں نے خود ان کو اس حیثیت سے "زندہ جاوید" کہا ہے کہ انہیں سے جدید شاعری کا آفتاب طلوع ہوتا ہے اور جب کبھی اردو شاعری کے نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) کی تاریخ لکھی جائیگی حالی کا ذکر شاندار الفاظ میں کرنا پڑیگا مگر اس انقلابی شاعری کے لئے جیسے دل و دماغ، تعلیم و تربیت کے آدمی کی ضرورت تھی۔ میرا یہ پختہ یقین ہے کہ وہ اس کے ناقابل تھے اگرچیکہ آج تک ان کو اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں شخص سمجھا گیا ہے اور اس خیال کی خوب تبلیغ کی گئی ہے اس لئے مجھے شعر الہند میں یہ غلط الفاظ پڑھکر کوئی تعجب نہیں ہوا کہ " یہ اصلاح صرف وہی شخص کرسکتا تھا جو قدیم و جدید خیالات سے واقف ہو اور خوش قسمتی سے دورِ جدید نے جو مصلح پیدا کئے ان میں مولنا حالی کو یہ شرف حاصل ہوا[1]" اگر شعر الہند کے مؤلف کے ہاں ان کے جدید خیالات سے واقفیت کا کوئی ثبوت موجود ہے تو بڑا احسان ہوگا کہ وہ اس کو پبلک طور پر ظاہر کردیں۔ ان کی زندگی کے واقعات سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ علیگڈھ کے قیام کے زمانے میں شعر و شاعری کے متعلق تراجم کے ذریعہ بعض خیالات سے باخبر ہوگئے تھے اتنی سی واقفیت کسی طرح ان کے لئے رہنمائی کا کام نہ دے سکتی تھی۔

---

[1] شعر الہند جلد اول صفحہ ۳۶۰۔

اس انقلابی تحریک کی کامیابی کے لئے اصل میں ایک ایسے دل و دماغ کی ضرورت تھی جو انگریزی خیالات سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ پرانے مشرقی اصولوں سے بھی واقف ہو، شاعرانہ اپج رکھتا ہو اور عاشقانہ شاعری کے کوچہ کا پرانا پاپی نہیں نیا بادیہ نورد ہو تاکہ اس کی شاعرانہ قوت کے اندر ایک خاص قسم کا رجحان غالب نہ آجائے حالی پہلے تو انگریزی شاعری سے کماحقہ واقف نہ تھے دوسرے عاشقانہ شاعری کے دشت کی سیاحی میں عمر بیشت تو نہیں مگر تین دہائیوں سے زیادہ گذر چکے تھے اس لئے غزل کا رنگ طبیعت میں راسخ ہو چکا تھا اور آفتاب عمر کے ساتھ ساتھ آفتاب شاعری کا بھی زوال شروع ہو گیا تھا۔ ایسے عالم میں وہ اصلاح کا مطالبہ کرنیوالوں کے ہم نوا ہو کر نئی قسم کی شاعری کرنی چاہتے ہیں لیکن ع ساتھ سارنگی کا بلبل کے لئے دشوار ہے۔ ان کا قدیم رنگ جگہ جگہ پر نمایاں ہو جاتا اور نئی قسم کی شاعری کو برباد کر دیتا ہے۔

کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ حالی کے اس اصلاحی قدم سے اردو شاعری کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچا اگرچہ یہ یقین "عین الیقین" کے درجہ کو طے کر کے "حق الیقین" کے درجہ کو نہیں پہنچا تاہم اس کے متعلق بھی اپنے خیالات کا آزادانہ اظہار مناسب سمجھتا ہوں تاکہ پبلک کو مباحثہ کے ذریعہ اس کی تصدیق یا تصحیح ہو سکے۔

اردو شاعری کی تاریخ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہماری پرانی شاعری ترقی کے تمام مراحل طے کر چکی تھی، دکن کی سرزمین میں شعر و شاعری کی جو شمع روشن ہوتی ہے وہ ولی دکنی کے ذریعہ شمالی ہند کی محفلوں میں جا پہنچتی ہے، ولی اور ان کے ہمعصروں کے سادہ اور بے تکلف اشعار کے بعد قدماء آبرو، شاکر اور یکرنگ کا دور شروع ہوتا ہے جس کی اہم خصوصیت ایہام گوئی ہے۔ بعد کے مصلحین اور شعراء میر، سودا مصحفی و انشا وغیرہم اس خرابی کو دور کرتے اور حقیقی شاعری کے نمونے پیش کرتے ہیں ان کے بعد کے دور میں غالب فلسفہ و تخیل کو لے بھاگتے ہیں، نظیر اکبر آبادی دیہات میں شہروں کو چھوڑ کر جا بستے ہیں، دبیر و انیس مرثیہ گوئی کو معراج کمال پر پہنچاتے ہیں، لکھنوی شعراء کے جدت پسند طبائع عاشقانہ جذبات اور داخلی شاعری کے متعلق یہ دیکھ کر کہ ؎

حریفان بادہا خوردند و رفتند — تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

اپنی جولانی کے لئے نیا میدان تلاش کرتی ہیں ان کے بعد داغ آتے ہیں اور ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں است — خم و خمخانہ با مہر و نشاں است

کہتے ہوئے "خم و خمخانہ" کا مہر توڑ کر اپنی مخصوص شراب کا دور شروع کر دیتے ہیں اب میں پوچھتا ہوں کہ قدیم شاعری کے اندر اب کونسا "خم و خمخانہ با مہر و نشاں" باقی رہ گیا تھا جس کو کھول کر بعد کے شعراء بادہ خواروں کو پلا کر مست و سرشار کرتے۔ ماننا پڑے گا کہ بعد میں آنے والے جدت پسند اور اولوالعزم طبائع اپنے لئے نئی دنیا دریافت کر لیتے

یہ قدم ترقی کی راہ میں حقیقی قدم ہوتا اور چونکہ اپنے بل بوتے پر شروع کیا جاتا۔ اس لئے زیادہ مضبوط اور اہم ہوتا آپ کہینگے کہ اس سے اصل اعتراض کو کیا واسطہ؟ اس کا جواب ذرا ٹیڑھا ہے۔

حالی کے رنگ کی کامیابی اور پبلک حوصلہ افزائی نے جہاں ایک طرف ہزاروں تقلید پسند طبائع کو اس راستہ پر چلنے کا خوگر بنا دیا۔ وہاں بعض جدت پسند طبائع کی ہمتیں بھی پست کر دیں "کیونکہ جب صلے اور انعام مستحق اور غیر مستحق دونوں کو برابر ملنے لگے اور تحسین و آفرین کی بوچھاڑ محل اور بے محل ہر درجہ کے شعر پر ہونے لگی تو جو لوگ فی الحقیقت صلہ و تحسین کے مستحق تھے۔ ان کے دل بجھ گئے اور شاعری کی اعلیٰ لیاقتیں جو ان کی طبیعت میں ودیعت تھیں خریداروں کی بے تمیزی کے سبب جیسی چاہیئے ویسی ظاہر نہ ہونے پائیں اور جو مستحق نہ تھے اُن کے دل بڑھے اور ان کو قوم میں اپنی لسانی بھیلانے اور شاعری پر ظلم کرنے کا موقع ملا"[1] حقیقت میں ہر شخص غالب کا سا دل و گردہ تو نہیں لاتا کہ ع نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا۔ کہکر ابنائے زمانہ کی سرد مہری سے بددل ہوئے بغیر اپنے دل کو تسکین دے۔

مشرق کی سرزمین شعراء کے پیدا کرنے میں بڑی مردم خیز ثابت ہوئی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ پھر کیوں گذشتہ نصف صدی میں کوئی باکمال شاعر اس سرزمین سے نہ پیدا ہو سکا۔ اگر حالی و اکبر کا نام لیا جائے تو میں کہونگا وہ انگریزی تعلیم کی پیداوار ہیں۔ مشرقی تعلیم سے جس نے میر و سودا، غالب و مومن، ناسخ و آتش اور انیس و دبیر کو پیدا کیا وہ قوت سلب کر لی گئی ہے؟ ایسا نہیں ہو سکتا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جو اولوالعزم اور جدت پسند طبائع تھیں وہ اس رنگ کو دیکھکر روپوش ہو گئیں اگر یہ بے وقت کی راگنی نہ شروع ہو جاتی تو ممکن تھا کہ کوئی خدا کا بندہ ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند کے اصول پر آگے بڑھتا اور اردو شاعری کے اندر کوئی نیا اور کامیاب قدم اٹھاتا اب جو قدم اٹھایا گیا ہے۔ آپ پر۔ اس طویل تبصرے سے واضح ہو گیا ہوگا کہ وہ اصل راستہ سے بھٹکا ہوا ہے۔ جی۔ ایچ۔ میر ایک جگہ پوپ (Pope) کے متعلق لکھتا ہے:۔

"الگزنڈر پوپ کو اپنے زمانہ میں اس کے مداح ہماری زبان کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے تھے لیکن اب کوئی اس قسم کی رائے کے اظہار کا ارادہ بھی نہیں کر سکتا لیکن اس کی شہرت اور عظمت کو ورڈسورتھ اور اس کے ہم عصر رومانی شعراء (Romantics) کے ذریعہ جو دھکا پہنچا اس کی وجہ سے ہم کو نہیں بھلانا چاہیئے کہ باوجودیکہ وہ ہمارا سب سے بڑا شاعر نہیں ہے بلکہ بڑے شاعروں میں سے بھی نہیں ہے تاہم وہ ہماری زبان کا عدیم المثال اور فقید النظیر کامیاب ناظم ہے"[2]

یہی آخری رائے حالی کے متعلق آئندہ چل کر قائم کرنی پڑیگی۔

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ (۲۰)
[2] English literature modern by G. H. Mair Page 123

خاقانی

(سوانح حیات تحفۃ العراقین سے)

از آقا میرزا حسین خاں دانش، اصفہانی

(مترجمہ جناب محمد محسن خانصاحب متین)

بارہویں صدی عیسوی، کے پیشوایانِ ادب میں، خاقانی کو، جو درجہ حاصل ہوا، وہ کسی کو نصیب نہ ہوسکا۔ وہ ایسا بڑا جامع الاضداد اور بلند خیال شاعر تھا، جو اپنے ہم عصروں میں یکتا اور میدان بلاغت کا بینظیر شہسوار مانا جاتا ہے۔ اس کے قصائد شاہانہ طلاقت وطمطراق رکھتے ہیں، اس کی مثنوی "تحفۃ العراقین" اس کی زندگی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا، سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔

اس کا اسم گرامی افضل الدین ابراہیم ابن علی شروانی ہے۔ ابتداء میں اس کا تخلص "حقایقی" تھا، لیکن — کچھ عرصہ کے بعد جب منوچہر شروانشاہ کی طلبی پر، وہ اس کے درباری شعراء میں داخل ہوا تو اس نے اپنا تخلص بدل کر "خاقانی" رکھا۔ اس کی ولادت سنہ ۵۰۰ ہجری (۷ - ۱۱۰۶ عیسوی) کو قفقاس کے قریب شہر گنجہ (جو تبریز اور شروان کے درمیان واقع ہے) میں ہوئی۔ اس نے خود اپنے مولد ونشاء کا ذکر، ایک نئے انداز قیل وقال میں کیا ہے:—

گفتا چہ کسی وچیست نامت؟ اصلت زکجا، کجا مقامت؟

گفتم متعلمے سخنداں میلاد من از بلاد شرواں

اس قصیدہ میں، جس کی ردیف "صفاہاں" ہے، اس نے اپنی زندگانی اور اپنے عہد پر، ادائے خاص کے ساتھ اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

"تمسن" "ث دن" (سنہ ۵۵۱ ہجری)[1] میں موصل کی جانب روانہ ہوا۔"

ثنائے صفاہاں

پانصد ہجرت چو من نزاد یگانہ باز دوگانہ کنم دعائے صفاہاں

---

[1] سنہ ۵۵۱ ہجری ۱۲

مبدع فحلم بہ نظم و نثر شناسد | کم نکنم تا زیم ولائے صفاہاں

اس کے باپ کا نام علی تھا، جو نجاری کا پیشہ کرتا تھا۔ جس کو وہ خود بیان کرتا ہے۔

از بہر خلائقم سبکبار | بر مائدہ علیِ نجار

او ضامن من بنان و جامہ | من مادحش از بنان و خامہ

ہستم چو خلیل عہد اوّل | فرزند درو گری معطّل

در بتکدۂ بلا رسیدہ | برہم زدہ ہر بتے کہ دیدہ

اُس کے دُوسرے اشعار سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ اس کا باپ نرا نجار ہی نہ تھا، بلکہ۔ خاص کر وہ "تابوت گری" کا پیشہ کرتا تھا:

مردے ہنرے خلیل کردار | تابوت گرے مسیح کردار

خود تابوتیے کہ او تراشد | جز مرقدِ موسوی نباشد

لیکن ۔ اس کی ماں رابعہ جس کا پیشہ طباخی تھا، وہ موبد نژاد، راہبہ، عیسائی عورت تھی، جو بعد کو مسلمان ہوگئی ۔ جس کا ذکر وہ اپنے کلام میں کرتا ہے:

آں پیر زنے کہ مرد معنیٰ است | وآں رابعہ کہ ثانیش نیست

از رابعہ[1] در عیانت افزوں | بل رابعۂ بنات گردوں

بگرفتہ ز عیشش پنج روزہ | چوں مریم چہار ماہہ روزہ

نستوری و موبدی نژادش | اسلامی و ایزدی نہادش

بگریختہ از عتاب نسطور | آویختہ در کتاب مسطور

بگزیدہ بہ نور عقل و الہام | برکیش کشیش دینِ اسلام

از نورِ ضلالت آوریدہ | نخاس ہُدیش پروریدہ

تا مصحفِ لا الٰہ دیدہ | ز انجیل وصلیب در رمیدہ

صافی دم و صوفی اجتہاد است | مومن دل و مومن اعتقاد است

باطعنۂ جانیانِ جیفہ | بازو قوی ام بداں ضعیفہ

---

[1] اس سے مُراد "رابعۃ العدویہ" ہے۔

حالات من از رضاش مرضی — حاجات من از دعاش مقضی
پندش ہمہ سد اختیارم — نصحش ہمہ حصن روزگارم
الحق حق خدمتش قدیمست — ہمچوں حسنات عم عمیمست

خاقانی کا دادا ایک جولاہہ تھا، جیسا کہ وہ خود اپنے نسب کو دادا سے ملاتا ہے۔ "خیاط" اور "جولاہہ" کی مخصوص اصطلاح کو، اپنے کلام میں، استادانہ تصرف کے ساتھ استعمال کرتا ہے:۔

جولاہہ نژادم از سوئے جد — در صنعت من کمال ابجد
ہر شب کہ شود بہر کنارے — اطراف فلک چو پنبہ زارے
زاں پنبہ کنند ریسمانم — آرند بہ کارگاہ جانم
شاگرد ازل بہ کلبۂ من — ماشورہ کفست وریسماں تن
می بافم و تار و پود معنے — از بہر وطائے خضر و موسے
بافم پئے روح وقت پوشش — دستار سر و ردائے دوشش

باپ کے مرنے کے بعد، خاقانی کے چچا عمرو بن عثمان نے (جو طبیب تھا) اس کی تعلیم و تربیت کو اپنے ذمہ لے لیا۔ جس کی خود خاقانی نے تعریف کی ہے، اور اس میں اس نے طبی اصطلاحیں ماہرانہ انداز کے ساتھ استعمال کی ہیں۔ یہ امر، اہل سخن سے پوشیدہ نہیں کہ ادبی کمالات میں یہ ایک مشکل ہنر ہے، مگر اس کے لئے۔ طبیعت اور ذوق کا ہونا، اولین شرط ہے:۔

از سوئے عم طبیب گوہر — بقراط سخن بہ ہفت کشور
عقلم کہ ہزار بحر صافست — وادی شناسش کوہ قافست
موسئے سخنم نہ کوہ آوا — عیسئے نفسم نہ آسی آسا
ہر ادویہ کادم از جہاں خورد — تخمش بزمین طبعم آورد
زاں ادویہ ہائے صحت انگیز — ہستم بسخن مفرح آمیز
لفظم کہ شفائے ہمگنانست — طاعون رواں طاغیانست
روح اللہم محققاں را — ہی الروح منافقاں را
سحر دم من بوقت شبگیر — تسکین دہ صد ہزار تبگیر
از شربت لفظ من قوی داں — شریان حیات اہل شرواں

خاقانی، باوجود اس کے کہ وہ ایک موقع پر اپنے کلام میں، اپنے باپ سے اظہار خوشنودی کرتا ہے

اور کہتا ہے :-

جاں صرف کند در آرزویم گر خود ہمہ شیر مرغ جویم
مرغِ دلِ من گرفت پرواز از دانۂ آب آں نکوکار

دُوسری جگہ پر اس کی شکایت کرتا ہے اور کہتا ہے :-

مسکیں پدرم زجورِ ایام افگندہ مرا چو زال را سام
عم سیمرغے نمودہ در حال در زیر پرم گرفت چوں زال
آورد بکوہ قاف دانش پرورد مرا در آشیانش
آں کردہ پدر بمن کہ در پیش کردند عرب بدخترِ خویش
ایں حال درست کن ز قرآن آنگہ و اذا المؤدۃ برخوان

اس کے بعد اپنے چچا کی اس طرح تعریف کرتا ہے اور اس کو اپنا حقیقی سرپرست سمجھتا ہے :

بگریختہ ام ز دیو خذلاں در سایۂ عمر و ابن عثماں
ہم صدرم و ہم امام و ہم عم صدر اجل و امام اکرم
تا بردرِ عم مرا وقوف است آحاد نہاد من الوف است
بودم چو یکے دقیقہ خورد عم زیں درجات رفعتم برد
پس زاں درجات برج پرداخت زاں برج بیوت اختراں ساخت
با من بہ یتیمداری آں مرد آں کرد کہ عم مصطفےٰ کرد
عم داروے زندگیم دادہ پستاں رضام در نہادہ
خود بودہ برفق دایۂ من پروردہ مرا بزیر دامن
حافظ بدہ از پے کمالم از آتش و آب ہفت سالم

پھر خاقانی آپ خود کہتا ہے کہ اس کے چچا کی رحلت کے وقت، اس کی عمر ۲۵ سال کی تھی، انتقال کے وقت، خود اس کے چچا کی عمر ۴۰ سال کی تھی اور اس نے خود عمر بھر شادی نہیں کی تھی

لہ آیت " لاتقتلوا اولادکم خشیۃ املاق" کی طرف اشارہ ہے ۱۲

لہ اس سے مقصود یہ آیت ہے۔ " واذا المؤدۃ سئلت بای ذنب قتلت" ۱۲

لہ اس سے مقصود جناب " ابوطالب" پدر " علی المرتضیٰ" ہیں، جو رسول صلعم کے عم کرم تھے ۱۲

اتنی مدت میں، خاقانی بھی تحصیل علم سے فارغ ہو چکا تھا — جیسا کہ وہ خود بیان کرتا ہے :۔

چوں دید کہ در سخن تمام — حسان عجمم نہاد نامم
چوں پایۂ مرا بگنج در کوفت — سالم در بیت او پنج در کوفت
دانست کز اہل نطق بیشم — از شادی آں بمرد بیشم
زیں کلبہ بکلبۂ بقا رفت — زاں عالم بود باز جا رفت
یک عطسہ بداد و روح بنہفت — صد یرحمک اللّٰہ ملک گفت
آنجاش نکاح بست حورا — چل سال عزب نشست اینجا
آنکس کہ چناں عروس میند — بر حق بود ار عزب نشیند

۵۴۰ھ ہجری، ۱۱۴۵ء عیسوی کے قریب، خاقانی نے ترکِ وطن کیا اور شروانشاہ اختسان ابن منوچہر کی بارگاہ میں، جا کر پناہ لی — اس زمانہ میں، شاہ موصوف نے اپنے پایۂ تخت کو، شہر "گرشاسپ" سے آذربائیجان "بادکوبہ" میں منتقل کر دیا — خاقانی کے اکثر کلام سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ قفقاس میں اپنی زندگی سے، ہمیشہ بیزار رہتا تھا اور جس طریقے سے ہو سکے وہ اپنے وطن سے نکلنا چاہتا تھا جیسا کہ وہ کہتا ہے :۔

طوطی معانی آفرینم — شرواں قفسے است آہنینم
تنگ آمدہ بر دلم شماخی — گلخن جائے بدیں فراخی

ایک مدت تک، شروانشاہ کی بارگاہ میں، ملازمت کرنے کے بعد، خاقانی زیارت کعبہ کے ارادہ سے، رخصت ہوتا ہے — شروان سے نکل کر منزل مقصود کی طرف کوچ کرتا ہے "ساوالان" کی پہاڑیوں اور مدائن، بغداد اور نجف سے ہوتا ہوا کہ روانہ ہوتا ہے — خاقانی اس سفر میں جو اس کا دوسرا سفر ہے، مختلف منزلیں، کہ تکسطے کرتا ہوا، ہر ایک منزل کی تعریف میں، ایک ایک نظم کہتا گیا ہے، ان نظموں میں بعض بعض اشعار ایسے بھی نکلے ہیں، جو شاعر کی بلند خیالی اور قادر الکلامی کے سبب، پڑھنے والے کو حیرت میں، ڈالدیتے ہیں — اس سفر کے تحفوں میں سے "ایوان مدائن" پر اس نے جو شعر، لکھے ہیں، ان کا مجموعہ، ایک بہترین تحفہ ہے۔ نیز کچھ عرصہ کے لئے، خاقانی نے چاہا تھا کہ خراسان جا کر "سنجر" کے الطاف و نوازش کا مورد بنے، مگر یہ خیال اس کا پورا نہ ہو سکا — جیسا کہ اس نے کہا ہے :۔

چہ سبب سوئے خراسانم نگزارند — عندلیبم سوئے بستاں شدنم نگزارند

دوسری جگہ کہا ہے :۔

بخراسان شوم انشاء اللہ   از رہ آسان شوم انشاء اللہ

ایک اور جگہ پر کہتا ہے:۔

رہ روم مقصد امکاں بخراساں یابم   تشنہ ام مشرب احساں بخراساں یابم

چوں زمن اہلِ خراساں ہمہ عنقا بینند   من سلیمان جہاں باں بخراساں یابم

اسی قیاس کے مطابق اس کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ خاقانی شہر "رے" تک گیا ہے۔ لیکن ــــ "رے" کی حدود میں سے گزر کر اس طرف جانے کی ممانعت تھی، جس کو اس نے اپنے کلام میں اس طرح سے ظاہر کیا ہے:۔

چوں نیست رخصہ سوئے خراساں شدن مرا   ہم باز پس شوم، نکشم من بلائے "رے"

گر باز رفتنم سوئے تبریز اجازتست   شکرانہ گویم از کرم پادشائے "رے"

خاقانی کا تعلق، خوارزمشاہیوں کے ساتھ بھی رہا ہے، اس نے ان کی خدمات میں قصائد بھی لکھ بھیجے اس کو رشید الدین وطواط کے ساتھ، مشاعروں میں شریک ہونے کا اتفاق بھی ہوا۔ اس نے اپنے استاد ابوالعلاء گنجوی کے ساتھ مشاتہ اور جلال الدین عبدالرزاق اصفہانی کے ساتھ مشاجرہ اور اثیرالدین آخسیکتی کے ساتھ مشاعرے کئے تھے۔

جس وقت خاقانی کرے سے لوٹ رہا تھا، اس کو اصفہان پر سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ اہلِ اصفہان کی طرف سے اس کا نہایت گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا، لیکن ــــ چند دن نہ گزرے کہ ایک ہجو اس کے شاگرد، مجیرالدین بیلقانی نے اصفہانیوں کی مذمت میں، کہکر شائع کی، اور یہ ہجو، خاقانی کے نام کے ساتھ منسوب کردی گئی۔ جس پر جلال الدین عبدالرزاق نے خاقانی کا مقابلہ نہایت سخت ہجویات کے ساتھ کیا۔ اس کے بعد خاقانی اصفہانیوں کی دلجوئی کے لئے "صفاہاں" کی اس مشہور ردیف میں شعر لکھنے پر مجبور ہوا، جس کی چند ابیات یہ ہیں:۔

این ہمہ کردم برایگاں نہ بر آن طمع   کافر زر یابم از عطائے صفاہاں

دیو رجیم[1] آنکہ بود دزد بیانم   گردم طغیان زد از ہجائے صفاہاں

او یقیاست سپید روئے نخیزد   زانکہ سیہ بست برقفائے صفاہاں

خاقانی کے شروان واپس ہونے کے بعد، اختسان شروانشاہ نے کسی خاص وجہ سے اس کو معتوب کرکے

---

[1] دیو رجیم سے مراد "مجیرالدین بیلقانی" ہے۔

قید کر دیا۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ کتنی مدت تک قید میں رہا، لیکن ــــ اس کا قصیدہ "حبسیہ" بہت مشہور ہے۔ یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ خاقانی، اخستان کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک زندہ رہا۔ اس کے چند دن کے بعد اس کا ایک بیس سالہ لڑکا، جس کا نام رشید تھا، انتقال کرگیا۔ پھر ایک مدت کے بعد اس کے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جو ولادت کے تیسرے دن ہی گزر گئی۔ آخر کار خاقانی کی بیوی بھی ان دونوں بچوں کے غم میں اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئی۔ یہاں وہ اشعار بھی نقل کر دیے جاتے ہیں، جن کو خاقانی نے اپنی بیوی اور بچوں کے فراق میں لکھا ہے:۔

دریغ میوۂ جانم رشید کز سر پاے ــــ ببیست[۲۰] سال در آمد بیک نفس بگزشت
مرا ذخیرہ ہمیں یک رشید بود ز عمر ــــ نتیجۂ شب و روزے کہ در ہوس بگزشت
چو دختر آمدم از بعد اینچنیں پسرے ــــ سرشک چشم من از وادی ارس بگزشت
مرا فزود ز دختر غم رشید کہ آں ــــ نہ بر دلِ من و نے بر ضمیر کس بگزشت
چو دختر آمد و ایں سوگ دید صوفیوار ــــ سہ روز عدۂ عالم بداشت پس بگزشت

یہ اشعار بھی اس نے اپنی بیوی اور بچوں کے فراق میں کہے ہیں:

پسر داشتم چوں بلند آفتاب ــــ بنا کہ بناری مغاکش سپردم
بدرد پسر مادرش چوں فروشد ــــ بہ خاک آں تن دردناکش سپردم
یکے بکر چوں دختر نعش بودم ــــ بروشندلی ہم بخاکش سپردم
کنوں زاینہمہ ماندہ عبدالعزیزے[۱] ــــ ودیعت بہ یزدان پاکش سپردم
اگر کس پناہش نباشد بشروال ــــ پناہش بس است ایں خداش سپردم

خاقانی کے کلام میں، خاصکر اس کے مشہور "حبسیہ" میں، دین مسیحی سے متعلق اشارات اور تلمیحات بہت ہیں اور اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دین مسیحی سے جو اس کی ماں کا مذہب تھا اور اس دین کی عبادات کے طریقوں اور اس کی مقدس رسوم سے وہ بخوبی واقف تھا۔ نصرانی مذہب اور اس کی تاریخ سے متعلق اس قدر وسیع معلومات، ابتک کسی ایرانی شاعر نے حاصل نہیں کئے ــــ علاوہ اس کے ایران میں، شاید جس پہلے شخص نے دبدبہ الفاظ کو طنطنہ معانی کے ساتھ ادا کیا ہوگا، (ہماری نظر میں) وہ تنہا خاقانی ہی ہوگا، اور بس ــــ قرن آخر میں قاآنی کا طمطراق، خاقانی کی ایک بے موقع اور بے معنی

---

[۱] عبدالعزیز خاقانی کے اس لڑکے کا نام ہے جو اس کی باقیماندہ اولاد میں سے تھا ۱۲

خشک تقلید کے سوا اور کچھ نہیں۔

شروان کے شاعر کے مُنہ سے، وہ شور اور غرور سے بھری ہوئی پھونکیں، جو دنیا میں ہلچل ڈالنے والی صور کی فریاد کی مانند آفاق میں پھیلیں، ان کی مثال ایک ایسی ندا کی مانند ہے، جس کے سامنے دوسری تمام ندائیں خاموش ہیں۔ اور اس کی اثر آفرینیوں سے ہر صدی اور ہر زمانے کے صحیح المذاق اشخاص کے دل جوش و خروش سے پُر ہیں ـــــ اس ادیب کے روشن اشعار آج کے زمانہ میں، عام مستشرقین کے طبقے کی تاریک فہم و ادراک سے، بالاتر ہیں ـــــ اس میں کچھ شک نہیں کہ اب تک افکارِ عامہ کی کھیتیوں میں اس کے ذوق و ذہنیت کی تخم کاری نہیں ہوئی ہے، ـــــ لیکن ـــــ مشرق اور خاص کر ـــــ ایران میں، عنقریب اس کے کلام کے سمجھنے اور لطف اٹھانے والے پیدا ہونے لگینگے۔

خاقانی ایرانی احساسات اور اس کی قدیم رسم و رواج کے تعلقات کے اعتبار سے، ایک سچا وطن دوست ہے ـــــ کبھی وہ اپنے سمندِ خیال کو اس طرح جولانی میں لاتا ہے کہ پڑھنے والا اُونی میں اس سے عاجز رہ جاتا ہے اور پھر اس کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہ ذرا سی جنبش میں ملکوت کے فاصلے طے کر جاتا ہے اور روحانی آسمانوں کو جو دنیاوی آسمانوں سے کار فرما ہیں، منزل منزل کر کے طے کر لیتا ہے، ہم کور باطن زمینگیروں کو اپنے پیچھے تکتا اور آرزو مند چھوڑ جاتا ہے۔ کبھی وہ مسلمانوں کے ظلم و ستم کے بارسے عاجز آ کر چاہتا ہے کہ زنار گلے میں ڈالے اور بار دیگر ناقوس کو چومے، پھر پشیمان ہو کر اس خیال سے باز آتا ہے ـــــ باوجود ـــــ اس کے، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسے بہت کم شاعر ہونگے، جنہوں نے اسلام کے آداب اور حج بیت اللہ کے مناسک و شعائر اور اس کی پاک منزلیں اور ایمان و توحید کو اپنی عدیم المثال قادر الکلامی اور طلاقت لسانی کے ذریعہ سے بیان کیا اور ترنم ریز ہوا ہو ـــــ اس نے یونانی فلسفہ اور زرتشتی مذہب کے اسرار سے کماحقہ آگاہی حاصل کی تھی، لیکن ـــــ طبعی لگاؤ کی وجہ سے ان کی جانب سے مُنہ موڑ کر سمندِ فکر کو اسلام و ایمان کی وادیوں میں دوڑاتا ہے۔ جیسا کہ اس کے کلام سے ثابت ہے:

زہے دولت کز امکانِ ہدایت یافت خاقانی — کنوں صد فلسفی فلسے نیرزد پیش امکانش

توئی خاقانیا طفلے کہ استاد نودیں بہتر — چہ جائے زند او ستا ہست یا زردشت و نیرانش

ہدایت زاہلِ دیں آموز و قولِ فلسفی مشنو — کہ طوطی کاں زہند آید بجوید کس زحرزانش

فرو نقض ورز وسنت جو، اصول آموز و مذہب داں — مجسطی چیست اشکالش، قلیدش کیست قرانش

پھر "حبسیہ" میں کہتا ہے:

فلک کجرو تراست از خطِ ترسا — مرا دارد مسلسل راہب آسا

چو روح اللہ دریں دیر است چوں شد | چنیں دجال فعل ایں دیر مینا؟
تنم چوں رشتۂ مریم دو تا ہست | دلم چوں سوزنِ عیسیٰ است یکتا
من اینجا پابندِ رشتہ ماندم | چو عیسیٰ پابند سوزن آنجا

. . . . | . . . .

مرا اسلامیاں چوں داد ندہند | شوم برگردم از اسلام؟ حاشا
پس از تحصیل دیں از ہفت مرداں | پس تاویل وحی از ہفت قرا
پس از الحمد والرحمان و الکہف | پس از یاسین وطاسین میم وطاہا
پس از میقات و حج وطوف وکعبہ | جمار وسعی و لبیک ومصلا
پس از چندیں چلہ در عہد سی سال | شوم پنجاہ سہ گیرم آشکارا
بگردانم ز بیت اللہ قبلہ | بہ بیت المقدس ومحراب اقصا؟
مرا از بعد پنجہ سالہ اسلام | ز بید چوں صلیبی بہ بند بر پا
شوم ناقوس گویم زیں تحکم | روم زنار بندم زیں تعدا
دگر قیصر سگالد راز زردشت | کنم زندہ رسوم زند اوستا
مگو ایں کفر و ایماں تازہ گرداں | بگو استغفراللہ زیں تمنا

خاقانی، اپنے آثار میں کثیر التعداد دل ودماغ کو روشن کرنے اور طبیعت کو جوش وترنم میں لانے والے قصائد کے سوا، غزلیں، رباعیاں، اور عربی اشعار بھی رکھتا ہے ـــــ لیکن ـــــ یہاں اختصار ہی پر اکتفا کی گئی۔

خاقانی کی وفات، ۵۹۵ھ ہجری (۹۹ - ۱۱۹۸ء) کے قریب ہوئی اور تبریز کے مقام سرخاب کے مشہور قبرستان "مقبرۃ الشعرا" میں دفن ہے۔ خدا اس پر رحمت نازل کرے!

نظامی، جو خاقانی کے بعد گزرے ہیں، اس کی وفات حسرت آیات پر دل کو ہلا دینے والے، پر درد مرثیے کے ذریعہ سے جس کی ایک بیت یہ ہے، رنج وغم کا اظہار کرتے ہیں:-

گماں بردم کہ خاقانی دریغا گوے من باشد
دریغا من شدم اکنوں دریغا گوے خاقانی

(*)

ہندوستانی کاشتکاروں کی معاشی حالت

از
جناب قاضی وصیح الدین احمد صدیقی متعلم بی۔ اے

یہ امر مسلمہ ہے کہ ہندوستان کے کاشتکاروں کی معاشی حالت روز بروز بد سے بدتر اور نہایت ابتر ہو رہی ہے۔ ہندوستانی کاشتکاروں کی مالی حالت کا صحیح صحیح اندازہ لگانا نہایت مشکل کام ہے کیونکہ برخلاف یورپین ممالک کے یہاں ہندوستان میں معاشی حالت کا ٹھیک اندازہ لگانے کے صحیح ذرائع ہرگز حاصل نہیں ہو سکتے۔ حکومت اپنے فائدہ کو رعایا کے فائدہ پر ترجیح دیتی ہے اور جہاں تک ممکن ہو خود فائدہ حاصل کرنیکی کوشش کرتی ہے اس لئے جو سرکاری رپورٹیں شائع ہوا کرتی ہیں وہ بہت بڑی حد تک حکومت کے موافق ہوتی ہیں اور صحیح حالات کو پبلک سے حتی الامکان چھپایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہم کاشتکاروں کی مالی حالت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔

حکومت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ کاشتکاروں کی معاشی حالت بہ نسبت سابق کے بہت بہتر ہے اور روز بروز بہتر سے بہتر ہوتی جا رہی ہے اور اس دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتی ہے کہ اجناس کی قیمتوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اجناس کی قیمتوں میں اضافہ ہونے سے صاف ظاہر ہے کہ کاشتکار مالدار ہوتے جا رہے ہیں۔

حکومت کا یہ دعویٰ ایک بڑی حد تک غلطی پر مبنی ہے کیونکہ اجناس کی قیمتوں میں اضافہ ہونے سے کاشتکاروں کو مطلق فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک دوسرے درمیانی طبقے کو فائدہ حاصل ہوتا ہے جو کاشتکاروں سے بہت ارزاں قیمت پر اجناس خریدتا ہے اور گراں قیمت پر دوسروں کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔

حکومت کے برخلاف پبلک کا یہ دعویٰ ہے کہ حکومت برطانیہ جب سے ہندوستان پر حکمران ہوئی ہے اس وقت سے کاشتکاروں کی معاشی حالت خراب ہو گئی اور روز بروز اس خرابی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ حکومت برطانیہ کے قبل ہندوستان کے کاشتکار بہت مرفہ الحال تھے جس کا ثبوت تاریخ سے بخوبی ملسکتا ہے۔ پبلک اس خرابی کی وجہ حکومت کا طرز عمل بتلاتی ہے اور اس طرز عمل کو نہایت حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔

دونوں جانب کے دلائل دراصل قیاس پر مبنی ہیں۔ دونوں جانب نہایت افراط و تفریط پائی جاتی ہے اس میں شک نہیں کہ حکومت کے طرز عمل کی وجہ سے کاشتکاروں کی معاشی حالت بہت کچھ خراب ہو گئی ہے لیکن اس کا سبب صرف حکومت کا برا طرز عمل ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ پبلک کا خیال ہے اگر کافی مواد حاصل کرکے دیکھا جائے

تو اس خرابی کے اسباب کا بھی پتہ چل سکتا ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کاشتکاروں کی معاشی حالت بہ نسبت سابق بہت خراب ہے۔

سب سے پہلے ہم ہندوستان کے کاشتکاروں کی معاشی حالت خراب ہونے کا ثبوت بہم پہنچائینگے گورنمنٹ کے مقرر کردہ کمیشنوں کے بیانات اور رپورٹوں سے بھی کاشتکاروں کی معاشی حالت کی خرابی کا بہت کچھ پتہ چلتا ہے کمیشنوں کے ان بیانات پر گورنمنٹ کو کافی اعتبار ہے کیونکہ اسی کے مقرر کردہ اشخاص نے لکھا ہے اس لئے ہم ان ہی بیانات کو پیش کرتے ہیں:۔

۱۸۷۵ء میں فسادات دکن کی تحقیق کے لئے حکومت نے ایک کمیشن مقرر کیا تھا جس نے حسب ذیل رائے کا اظہار کیا ہے۔

"ہم بتا چکے ہیں کہ ان علاقوں میں کاشتکار عام طور پر قرضدار ہیں کچھ تو قدرتی اسباب کی وجہ سے اور کچھ ہمارے نظم ونسق کے باعث۔ یہ قرضداری گذشتہ چند سال کے عرصے میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ تقریباً ایک ثلث کاشتکار قرضداری کی مصیبتوں میں مبتلا ہیں اور ان کے قرضوں کا اوسط مالگزاری کی مقدار سے ۸ اگنا ہے اور اس قرضہ کا تقریباً دو ثلث حصہ زمین کو رہن رکھکر حاصل کیا گیا ہے"۔

۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن نے حسب ذیل الفاظ میں اس بیان کی تائید کی ہے:۔

"ہندوستان کے مختلف علاقوں سے شہادت جمع کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مالکان زمین کے طبقے میں تقریباً ایک ثلث تعداد ایسی ہے جو اسقدر زیادہ قرضدار ہے کہ ان کے لئے قرضداری سے نجات حاصل کرنا ناممکن ہے اور کم از کم اتنی ہی تعداد ان لوگوں کی ہے جو قرضدار تو ہیں لیکن جن کے قرضے ادا ہو سکتے ہیں"۔

۱۹۰۱ء کے قحط کمیشن نے بھی اسی صورت حال کی تائید کی ہے۔ ان تمام بیانات کا لحاظ کرتے ہوئے اور جو شہادت جمع کی گئی ہے اس سے ان کا مقابلہ کرتے ہوئے ہمارے خیال میں گمانِ غالب یہ ہے کہ بمبئی پریسیڈنسی میں کاشتکاروں کی کم از کم ایک چوتھائی تعداد اپنی زمینیں کھو چکی ہے اور صرف (۱/۵) تعداد ایسی ہے جو قرضدار نہیں ہے اور اس کے علاوہ بقیہ تعداد کم و بیش قرض میں مبتلا ہے۔

آنریبل مسٹر روجرس رکن مجلس وضع قوانین صوبہ بمبئی نے وزیر ہند کی خدمت میں ایک رپورٹ پیش کی تھی جس میں یہ درج تھا کہ ۱۸۹۰ء سے قبل گیارہ سال کے عرصے میں سرکاری مالگزاری وصول کرنے کی غرض سے تقریباً بیس لاکھ ایکڑ زمین فروخت کی گئی جو آٹھ لاکھ چالیس ہزار سات سو تیرہ اشخاص کے قبضے میں تھی۔ اس کے علاوہ تیس لاکھ روپیوں کی مالیت کی غیر منقولہ جائداد بھی اسی غرض سے فروخت ہوئی اس زمین کا (۶۰) فیصدی حصہ خود حکومت کو خریدنا پڑا کیونکہ ان کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ گویا باالفاظ دیگر

گیارہ سال کی مدت میں اس ضلع کی مجموعی آبادی کا ۱/۸ حصہ بے خانماں ہو گیا۔

پنجاب میں انجمن ہائے قرضہ امداد باہمی کے رجسٹرار صاحب نے ۱۹۲۰ء میں مقامی کاشتکاروں کی قرضداری کی تحقیق کی ہے اور معلوم کیا کہ صوبہ پنجاب کے کاشتکاروں کی مجموعی قرضوں کی مقدار ۳ کروڑ پونڈ یعنی ۴۵ کروڑ روپیہ ہے۔ اسی قسم کے واقعے اور صوبوں کے متعلق بھی معلوم کئے گئے ہیں جن سے یہ نتیجہ یقینی طور پر نکلتا ہے کہ ہندوستان کی زرعی آبادی قرضداری کی مصیبتوں میں بہت زیادہ مبتلا ہے۔

حکومت کے ان کمیشنوں کے بیانات کے پڑھنے سے کیا صاف اور صریح طور پر ظاہر نہیں ہوتا کہ ہندوستان میں کاشتکاروں کی معاشی حالت نہایت خراب ہے اور قرضداری بے انتہا بڑھی ہوئی ہے؟ جب پنجاب جیسے زرخیز اور خوش حال صوبہ کی ایسی بری کیفیت ہو تو دوسرے صوبوں کی جو پنجاب کی خوشحالی کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتے کس قدر افسوسناک اور ابتر حالت ہو گی؟

اب ہم معاشی حالت کی اس خرابی کے اسباب کی جستجو کریں گے۔

اس خرابی کا سب سے پہلا سبب پیشوں کے توازن کا بگڑ جانا ہے یعنی پیشوں کی تقسیم میں پہلے جو توازن قائم تھا وہ اب باقی نہیں رہا ہے اور اس توازن کے قائم نہ رہنے کا سبب صنعت وحرفت کا زوال ہے یوروپی ممالک کی مصنوعات کی درآمد کی وجہ سے ہندوستان کی صنعت وحرفت کو سخت نقصان پہنچا۔ کیونکہ یوروپی ممالک کی مصنوعات ارزاں ہونے کی وجہ سے ہندوستانی مصنوعات کی بے قدری ہونے لگی اور اس بیقدری اور طلب کی کمی کی وجہ سے ہندوستانی صناعوں اور کاریگروں کو نقصان برداشت کرنا پڑا اور رفتہ رفتہ یہاں کی صنعت وحرفت کو زوال آگیا اور صناع اور کاریگر صنعت وحرفت کو ترک کرکے زراعت کی جانب متوجہ ہونے لگے یہی وجہ پیشوں میں توازن قائم نہ رہنے کی ہے اور اس توازن کے قائم نہ رہنے کے سبب سے کاشتکار تعداد میں زیادہ ہو گئے اور زمین محدود اس لئے کھیتوں کی وسعت میں بہت کمی واقع ہوئی اور ہر شخص جس قدر بھی زمین کا چھوٹا ٹکڑا ہاتھ لگا قابض ہو گیا۔

ایک اور سبب ہندوستان کے کھیتوں کی وسعت میں کمی کا ہندوستان کا قانون وراثت ہے کیونکہ اس قانون کی رو سے باپ کی وفات کے بعد تمام جائداد (منقولہ وغیر منقولہ) اولاد میں مساوی تقسیم کی جاتی ہے اس کے برخلاف یورپ میں صرف اولاد اکبر مالک گردانا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں خاندانی جائداد نسلاً بعد نسلاً برابر چلی آتی ہے بلکہ اس میں بہت کچھ اضافہ ہو جاتا ہے اس کے برخلاف ہندوستان میں جائداد بے انتہا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ غائب۔

کھیتوں کے اس طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جانے کی وجہ سے ان پر کاشت عمیق نہیں کیجا سکتی کیونکہ

مصارف زیادہ لاحق ہونگے اور آمدنی نسبتاً بہت قلیل ہوگی۔ اور پیدائش بر پیمانہ کبیر کے فوائد تو کسی طرح حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ البتہ ایسے کھیتوں پر کاشت کرنے سے صرف مصارف پیدائش حاصل ہو سکتے ہیں۔ (مصارف پیدائش میں کاشتکار کی اپنی محنت اور اس کے اہل و عیال کی محنت کا معاوضہ بھی شامل رہتا ہے)

کاشتکاروں کی معاشی حالت کی خرابی کا دوسرا بڑا سبب ہندوستان کا طریقہ مالگذاری ہے مالگذاری وہ محصول ہے جس میں زمین کی پیداوار کا کچھ حصہ حکومت وصول کرتی ہے۔

زمین کی ملکیت کے متعلق ہندوستان میں دو طریقے رائج ہیں ایک وہ جس میں معاشی لگان کے حصہ دار صرف دو حکومت اور زمیندار ہوتے ہیں دوسرا وہ جس میں معاشی لگان کے حصہ دار تین، حکومت، زمیندار اور کاشتکار ہوتے ہیں (معاشی لگان وہ آمدنی ہے جو مصارف کاشت مہیا کرنے کے بعد کاشتکار کو حاصل ہوتی ہے)۔

مالگذاری کے دو محکمے ہیں ایک محکمہ بندوبست یعنی تشخیص مالگذاری دوسرا محکمہ مالگذاری یعنی تحصیل مالگذاری محکمہ بندوبست کا کام یہ ہے کہ مالگذاری کی مقدار بڑھائے یا گھٹائے یعنی مالگذاری مقرر کرے اور محکمہ مالگذاری کا کام یہ ہے کہ مالگذاری وصول کرے۔

مالگذاری کے متعلق حکومت کا دعوے یہ ہے کہ ہم مصارف پیدائش نکالنے کے بعد جو پیداوار باقی رہتی ہے (یعنی معاشی لگان) اس میں سے ایک حصہ وصول کرتے ہیں۔ اس لئے مالگذاری کے وصول کرنے سے کاشتکار کو ہرگز نقصان نہیں ہوتا البتہ فائدہ کسیقدر کم ہوتا ہے۔

پبلک حکومت کے برخلاف یہ دعویٰ کرتی ہے کہ حکومت کے مالگذاری وصول کرنے کی وجہ سے کاشتکاروں کی مالی حالت خراب ہو رہی ہے کیونکہ مالگذاری کے ادا کرنے سے کاشتکار کو سخت نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت جو مالگذاری وصول کرتی ہے وہ دراصل معاشی لگان کا ایک حصہ نہیں ہوتا کیونکہ ہندوستانی کاشتکاروں میں اتنی قابلیت نہیں ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک مصارف پیدائش مہیا کرکے معاشی لگان حاصل کریں بلکہ ان کے حاصل کردہ معاشی لگان میں بہت کچھ مصارف پیدائش شامل رہتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستانی کاشتکار معاوضہ تنظیم یعنی خود کی محنت کا معاوضہ اور اپنے اہل و عیال کی محنت کا معاوضہ ہرگز مہیا نہیں کرتا۔ اس لئے جو معاشی لگان اس کو حاصل ہوتا ہے وہ دراصل معاشی لگان نہیں ہوتا اور جب اس معاشی لگان میں سے بھی جس میں بہت کچھ مصارف پیدائش داخل ہیں حکومت اپنا حصہ نکالیگی تو یقیناً کاشتکار کو سخت نقصان ہوگا۔

پبلک کا دعویٰ بالکل ٹھیک ہے کہ فی الواقعی ہندوستانی کاشتکار خود کی محنت اور اپنے اہل و عیال کی،

محنت کا معاوضہ مصارف پیدائش میں شامل نہیں کرتے۔

حکومت اپنے اس دعوے کے ثبوت کے لئے رکارڈو کا نظریہ پیش کرتی ہے اور اس سے مدد لیکر یہ کہتی ہے کہ مالگزاری کے ادا کرنے سے کاشتکار کو ہرگز نقصان نہیں ہوتا۔

حکومت کے دعوے کو رکارڈو کا نظریہ ہرگز تقویت نہیں دے سکتا کیونکہ رکارڈو نے اپنے نظریہ کے ساتھ ساتھ چند مفروضے بھی لگا دیئے تھے اور یہ بتا دیا تھا کہ یہ نظریہ اس صورت میں منطبق اور صحیح ہوسکتا ہے جبکہ اس کے متعلقہ مفروضے بھی صحیح یا منطبق ہوں لیکن ہندوستان میں رکارڈو کے مفروضے منطبق نہیں ہوسکتے۔ اسلیئے یہ نظریہ بھی ہندوستان کے لئے ہرگز صحیح نہیں ہوسکتا۔

رکارڈو نے اپنے نظریہ کے ساتھ جو مفروضے پیش کئے تھے وہ حسب ذیل ہیں:۔

پہلا مفروضہ یہ ہے کہ "کاشتکاری کا کاروبار نفع بخش ہے"۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں کاشتکاری کا کاروبار ہرگز نفع بخش نہیں ہے۔ کیونکہ بہت سے کھیت ایسے ہیں جن سے صرف مصارف پیدائش حاصل ہوسکتے ہیں اور معاشی لگان ہرگز حاصل نہیں ہوتا۔ اور کثیر التعداد کھیت ایسے ہیں جو اختتام کاشت کی حد پر آگئے ہیں۔ اس لئے یہ مفروضہ ہندوستان پر ہرگز منطبق نہیں ہوسکتا۔

دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ ہر شخص وہی کاروبار اختیار کرتا ہے جس میں وہ سمجھتا ہے کہ اُس کو اس کاروبار میں زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہوگا۔ لیکن ہندوستان میں ہرگز یہ صورت نہیں نظر آتی۔ کیونکہ صنعت وحرفت کے زوال اور دوسرے پیشوں کے انقلاب اور ذات پات کے قیود کی وجہ سے صرف پیشہ زراعت ہندوستانیوں کے سامنے موجود ہے اور ہندوستانی اسقدر حوصلہ مند بھی نہیں ہیں کہ کسی اور جگہ وطن ترک کرکے چلے جائیں اور کوئی پیشہ اختیار کریں لہٰذا مجبوراً پیشہ زراعت اختیار کرتے ہیں اگرچہ یہ پیشہ موجودہ حالات کے لحاظ سے مطلق نفع بخش نہیں ہے لیکن پھر بھی اس سے دست بردار نہیں ہوتے کیونکہ اُن کو یقین ہے کہ اس پیشہ کے سوا اور کوئی پیشہ ملنا مشکل ہے اور اس پیشہ پر لوگ ٹوٹ پڑ رہے ہیں اگر وہ ترک کردیں تو زندگی محال ہوجائیگی۔ غرض یہ مفروضہ بھی ہندوستان کے لئے غلط ثابت ہوتا ہے۔

(۳) تیسرا مفروضہ یہ ہے کہ لگان (مالگذاری) سب سے آخری چیز ہے۔

یہ مفروضہ بھی ہندوستان پر منطبق نہیں ہوسکتا اسلیئے کہ زمین کی پیداوار پر سب سے

پہلا حق حکومت کا ہوتا ہے۔ اور یہ قانون ہے کہ "حکومت کے مطالبات سب سے پہلے ادا ہونے چاہئیں" گویا اس طرح یہ مفروضہ بھی ہندوستان کے لئے صحیح نہیں ہے۔

جب مفروضے اسطرح غلط ہوجائیں اور منطبق نہ ہوسکیں تو یقینی نظریہ بھی منطبق نہیں ہوسکتا کیونکہ نظریہ کے لئے متعلقہ مفروضوں کا منطبق ہونا لازمی ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ حکومت جو نظریہ اپنے دعوے کی دلیل میں پیش کرتی ہے بالکل غلط ہے اور ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے یہ نظریہ منطبق نہیں ہوسکتا۔ پبلک اور خیر خواہان ملک کا دعویٰ ہے کہ مالگذاری معاشی لگان کا ایک حصہ نہیں ہے بلکہ ٹکس ہے اور ٹکس سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور مشکل ہے۔

لگان (مالگذاری) اور ٹکس میں فرق یہ ہے کہ لگان کے ادا کرنے سے کاشتکار پر مطلق بار نہیں پڑتا اور اس کے برخلاف ٹکس کے ادا کرنے سے بار پڑتا ہے لیکن دریافت واقعات اور حالات سے پتہ چلتا ہے کہ لگان کے ادا کرنے میں ہندوستانی کاشتکار کو بار اٹھانا پڑتا ہے۔ لہذا یہ لگان دراصل ٹکس کی نوعیت رکھتا ہے اور چونکہ ٹکس میں جو سہولتیں موجود ہیں وہ اس ٹکس یعنی لگان میں ہرگز نہیں ہیں اس لحاظ سے لگان ٹکس سے بھی زیادہ سخت اور تکلیف دہ ہے۔

ہندوستان میں مالگذاری وصول کرنے کے لئے دو تاریخیں مقرر کی گئی ہیں اور ان تاریخوں کے اندر رقم مالگذاری داخل کرنا لازمی ہے ایک تاریخ ۱۵ر جنوری ہے اور دوسری تاریخ ۱۵ر مارچ ہے۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جبکہ فصلیں تیار رہتی ہیں۔

کاشتکاروں کو مالگذاری ادا کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ مالگذاری بشکل اجناس ادا نہیں کیجا سکتی۔ اسلئے کاشتکاروں کو فصل تیار ہوتے ہی روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ مالگذاری معینہ تاریخ کے اندر داخل کردیں لیکن اُن کے پاس روپیہ تو موجود نہیں ہوتا البتہ فصلیں تیار رہتی ہیں۔ اسلئے کاشتکار اجناس کو فوراً بازار لیجاتے ہیں تاکہ اُن کو بیچ کر روپیہ حاصل کیا جائے۔ چونکہ مالگذاری داخل کرنیکی تاریخ معین ہے اس لئے تمام کاشتکاروں کو ایک ساتھ روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ تمام کاشتکار ایک ساتھ اپنا غلہ بازار لیجاتے ہیں اور فروخت کرتے ہیں۔ تمام کاشتکاروں کا غلہ ایک ساتھ بازار آنیکی وجہ سے رسد بہت بڑھ جاتی ہے اور طلب حسب سابق کم رہتی ہے اسلئے قیمت بہت

گھٹ جاتی ہے اور کاشتکاروں کو مجبوراً اپنا غلہ ارزاں قیمت پر فروخت کرنا پڑتا ہے۔ اسطرح کاشتکاروں کو بہت نقصان ہوتا ہے۔ نقصان برداشت کرنے پر بھی وہ اپنا پیشہ جاری رکھتے ہیں کیونکہ ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

اگر کاشتکار اپنا غلہ کچھ دنوں محفوظ رکھکر فروخت کرتے تو یقیناً بہت فائدہ حاصل ہوتا لیکن مالگذاری داخل کرنیکی تاریخ مقرر ہوتے کی وجہ سے وہ مجبور ہیں اور ایسا نہیں کرسکتے البتہ ایک دوسرا طبقہ اس سے فائدہ ضرور اٹھاتا ہے یہ سرمایہ داروں کا درمیانی طبقہ ہے جو کاشتکاروں سے ارزاں قیمت پر غلہ خرید کر کچھ دنوں بعد جب رسد گھٹ جاتی ہے گراں قیمت پر فروخت کرتا ہے۔

ایسی حالت میں کاشتکاروں کو مجبوراً مہاجنوں سے روپیہ قرض لیکر اپنا کاروبار جاری رکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے کاشتکار بہت مقروض ہوجاتے ہیں، اور اُن کا قرضداری سے کبھی پیچھا نہیں چھوٹتا۔ کیونکہ اُن کو ہر سال قرض لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ قرض اداکرنیکی دیر نہیں کہ پھر قرض لینا لازمی ہوجاتا ہے۔

بعض ماہرین معاشیات کا خیال ہے کہ ہندوستان کے کاشتکاروں کی معاشی حالت کی خرابی کے صرف دو اسباب ہیں۔

(۱) بنیئے اور مہاجن وغیرہ (۲) دوسرے فضول خرچی۔

اگر کافی مواد حاصل کر کے دیکھا جائے تو ان ماہرین کا خیال بھی بڑی حد تک غلط ثابت ہوتا ہے۔ فضول خرچی تو زمانہ قدیم یعنی مغلوں کے زمانہ میں بھی تھی اُسوقت کاشتکاروں کی حالت کیوں خراب نہیں ہوتی اور اب کیوں خراب ہوگئی؟ معاشی حالت کی خرابی میں فضول خرچی کو زیادہ دخل نہیں ہے بلکہ اس کے دوسرے اسباب ہیں۔

اسمیں شک نہیں کہ بنئے اور مہاجنوں سے قرض حاصل کرنے میں بہت سی خرابیاں ہیں لیکن اس کے بغیر چارہ نہیں کیونکہ کاشتکار کو بعض ناگزیر ضروریات کا پورا کرنا لازمی ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کاشتکار کے بیل مرجائیں تو ایسی صورت میں دوسرے بیل خریدنا کاروبار چلانے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ کاشتکاروں کی مالی حالت تو ظاہر ہے لہذا بیل خریدنے کے لئے روپیہ کا قرض لینا لازمی ہے۔ اسلئے وہ مہاجن یا بنیوں سے روپیہ قرض لیتے ہیں اگرچہ مہاجن وغیرہ غیر ضروری کاموں کے لئے بھی قرض دیتے ہیں اور سود بہت زیادہ

وصول کرتے ہیں لیکن بغیر اس کے کوئی علاج نہیں۔ اور کہیں سے روپیہ نہیں مل سکتا۔ پہلے تو گاؤں میں بنک نہیں ہوتے اور اگر ہوتے بھی تو بنک چھوٹی چھوٹی رقموں کا لین دین نہیں کرتے اور پھر کاشتکاروں کی ساکھ اور ضمانت جیسی کچھ ہوتی ہے ظاہر ہے۔ اسلئے بنکوں سے کاشتکاروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ سوائے مہاجن کا دروازہ کھٹکھٹانے کے اور کوئی طریقہ نظر نہیں آتا۔ دراصل غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام قصور حالات کا ہے مہاجنوں کا کوئی قصور نہیں۔

سود کے زیادہ وصول کرنیکی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک گاؤں میں ایک یا دو سے زیادہ مہاجن نہیں ہوتے۔ اور کاشتکار بکثرت ہوتے ہیں اور تمام کاشتکاروں کو ایک ساتھ روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے تمام کاشتکار انہی مہاجنوں کے پاس روپیہ قرض لینے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں جبکہ روپیہ کی طلب بڑھ جائے اور رسد محدود رہے تو یقیناً سود کی شرح بڑھ جائیگی علاوہ ازیں کاشتکاروں کی ساکھ اور ضمانت نہایت معمولی ہوتی ہے اس لئے بھی سود کی شرح بڑھادی جاتی ہے۔

جہاں کہیں بھی امداد باہمی کی انجمن قرضہ عمدگی سے کام کر رہی ہیں وہاں مجبوراً مہاجنوں کو قرض کے لین دین کا کاروبار بند کرنا پڑرہا ہے اور مہاجن بجائے اس کام کے دوسرے کاروبار شروع کر رہے ہیں۔

کچھ تو مذہبی رسم ورواج اور کچھ غیر تعلیم یافتہ ہونیکی وجہ سے کاشتکار پیش بینی نہیں کرتے اور فضول مذہبی بیجا رسومات میں جن سے معیار زندگی ہرگز نہیں بڑھ سکتا کثیر مقداریں روپیہ صرف کرتے ہیں اور ان کاموں میں جن سے معیار زندگی بلند ہوتا ہے روپیہ صرف نہیں کرتے۔

زمانہ قدیم میں کاشتکار اپنے خدمات اور تعلقات کو محسوس کرتا تھا اور زمیندار بھی اپنا برتاؤ کاشتکار کے ساتھ بہت عمدہ رکھتا تھا۔ زمیندار اور کاشتکار کے تعلقات نہایت خوشگوار ہوتے تھے اس لئے کاشتکاروں کو بہت سہولتیں حاصل تھیں۔ زمیندار کاشتکار کو ہر قسم کی مدد دیتا تھا اگرچہ دونوں کے تعلقات خادم ومخدوم کے سے ہوتے تھے لیکن ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے کیوجہ سے دونوں خوشحال زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن آجکل کاشتکار اور زمیندار کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوتا صرف معاہدہ کی حد تک تعلق قائم رہتا ہے۔ زمیندار خود کو اس بات کا ذمہ دار نہیں سمجھتا کہ جب کوئی ضرورت پیش آئے کاشتکار کی مدد کرے اور نہ کاشتکار زمیندار سے مدد کی درخواست پیش کر سکتا ہے۔

متذکرۂ بالا اسباب ہیں جن کی وجہ سے کاشتکاروں کی معاشی حالت خراب ہوگئی اور ہوتی جارہی ہے۔ اب ہم کاشتکاروں کی معاشی حالت کی خرابی کو پیش نظر رکھکر یہ دریافت کریں گے کہ کیا تدابیر ان کی اصلاح کے لئے ہوسکتے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہونے سے وہ اپنی حالت درست کرنے کے قابل ہوجائیں۔ سب سے پہلے ضرورت اس بات کی محسوس ہوتی ہے کہ ان کو اپنی بری حالت سے خبردار کریں کیونکہ جن لوگوں کے حالات درست کرنا مقصود ہو تو یہ ضروری ہے کہ خود ان میں ان کی بری حالت کا احساس پیدا کیا جائے ایسی صورت میں ان کی اصلاح بہت ممکن ہے کیونکہ وہ خود اپنی اصلاح کی کوشش کریں گے۔ جب ہندوستانی کاشتکاروں کو اپنی بری حالت کا احساس ہوگا تو یقیناً ان کی اپنی کوشش سے بہترین نتائج برآمد ہوں گے اس احساس کے پیدا کرنے کا ذریعہ تعلیم ہے۔ اس لئے ہندوستانی کاشتکاروں کو تعلیم دلائی جائے جب وہ تعلیم یافتہ ہوں گے تو ان کو ہر قسم کے معلومات حاصل ہوں گے اور اس طرح وہ متمدن اور ترقی یافتہ ممالک کا مقابلہ اپنے ملک سے کریں گے تو ان کو معلوم ہوجائے گا کہ ان کی معاشی حالت کس قدر خراب ہے۔

کاشتکاروں میں بیجا مذہبی رسومات اور رسم ورواج کی پابندی سختی سے کیجاتی ہے اور ان رسومات کے ادا کرنے میں بہت فضول خرچی سے کام لیا جاتا ہے جس کا نتیجہ ظاہر ہے یہ فضول خرچی اور رسم ورواج کی بیجا پابندی تعلیم کی وجہ سے رفع ہوسکتی ہے۔

کاشتکاروں کی تعلیم کا معیار بلند نہیں ہونا چاہئے بلکہ ان کو کاروبار چلانے کے لایق تعلیم درکار ہے ورنہ زیادہ تعلیم سے خواہ مخواہ ان کو نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ بلکہ این ہم رفت و آن ہم رفت کا مضمون ہوجائے گا ایک تو اس کی عمر کا زیادہ حصہ تعلیم میں ضائع جائے گا اور دوسرے زیادہ تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے وہ کاشتکار نہیں رہے گا کیونکہ اس کو ہل جوتنا کھیت میں کام کرنا اور اسی طرح کے کام کسرشان معلوم ہونے لگیں گے اور وہ کاشتکاری کے پیشے کو بہت ممکن ہے کہ نظر حقارت سے دیکھے اور مذموم سمجھے اور کسی سرکاری ملازمت کے حاصل کرنے میں حیران وسرگرداں رہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ع وہ کھوئے گئے اور تعلیم پاکر۔ بیچارہ کاشتکاری سے تو ہاتھ دھو ہی بیٹھتا ہے۔ ملازمت بھی سخت کوشش کے بعد ملتی ہے تو نہایت ادنی درجہ کی کیونکہ رسد نہایت سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور طلب محدود بلکہ گھٹ رہی ہے جدھر دیکھو تخفیف کا مسئلہ چھڑا ہوا ہے۔

کاشتکاروں کو صرف اس قدر تعلیم دی جائے کہ وہ اپنا کاروبار عمدگی سے چلا سکیں اور ان کی تعلیم کی مدت بہت کم ہونی چاہئے۔ چار یا پانچ سال کی تعلیم بہت کافی ہے پہلے دو سالوں میں

ان کو کاشتکاری کے فن کی تعلیم دی جائے اور کاشتکاری کی تعلیم بھی خاص قسم کی ہونی چاہئے یعنی جس صوبہ میں خاص قسم کی پیداوار ہوتی ہے وہاں کے کاشتکاروں کو اسی پیداوار کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ اس پیداوار کو بہترین طریقہ پر پیدا کرسکیں۔

دوسری تدبیر یہ ہے کہ طریقہ مالگزاری اور بندوبست میں ترمیم کی جائے اور تحصیل مالگزاری میں جو سختیاں ہیں ان کو رفع کیا جائے۔ اور جہاں تک ممکن ہو کاشتکاروں کی سہولت کو مدنظر رکھا جائے۔

حکومت نے مختلف قوانین کاشتکاروں کی سہولت کیلئے رائج کئے ہیں۔ کاشتکاروں کے فائدے کے لئے حکومت نے ہندوستان کے سیول قانون میں کچھ ترمیم کی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ ان کی املاک کو خاص طور پر محفوظ رکھا جائے چنانچہ مجموعہ ضابطہ دیوانی کے ایک خاص دفعہ کی رو سے کاشتکاروں کے بعض املاک قرق ہونے سے مستثنیٰ کردیئے گئے ہیں۔ اسی طرح قانون امداد کاشتکاروں کے تحت کوئی کاشتکار کسی زر کی ڈگری کے لئے گرفتار نہیں کیا جاسکتا اور ہر کاشتکار کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنا قرضہ بااقساط ادا کرنے کا مطالبہ کرے۔ قانون ربع بھی کاشتکاروں کے لئے مخصوص طور پر وضع کیا گیا ہے۔ ملک کے بعض حصوں میں اس مسئلہ کی غیر معمولی اہمیت محسوس کرتے ہوئے حکومت نے چند اور قوانین نافذ کئے ہیں جن کی رو سے زمین کو منتقل کرنے یا رہن کرنے کے حق پر مختلف موانعات عائد کئے گئے ہیں چنانچہ پنجاب صوبہ جات متحدہ اور بمبئی میں یہ تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔

سنہ ۱۹۰۱ئ کے قحط کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ زرعی قرضداری کے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ سررشتہ بندوبست کی طرف سے زمین پر کاشتکار کا مالکانہ حق تسلیم کیا گیا ہے جب تک کہ ان حقوق میں رکاوٹیں پیدا نہ کی جائیں کاشتکار کو قرضداری میں مبتلا ہونے سے روکنا ناممکن ہے اسی وجہ سے قانون انتقال اراضی پنجاب کی رو سے انتقال اراضی کے حقوق میں بہت سخت رکاوٹیں پیدا کردی گئی ہیں کوئی کاشتکار عامل ضلع کی اجازت کے بغیر اپنی زمین کسی غیر کاشتکار کے ہاتھ فروخت نہیں کرسکتا۔ دکن کے بعض علاقوں میں بھی اسی قسم کے قوانین نافذ کئے گئے ہیں۔

اگرچہ زراعتی ترقی میں ان تدابیر سے کوئی خاص نتائج برآمد نہیں ہوئے تاہم ان سے اس قدر فائدہ تو یقینی ہے کہ زمین اس سرعت کے ساتھ منتقل نہیں ہونے پاتی اور کاشتکار اپنی اراضی کے بھروسے پر اسی طرح قرض داری میں مبتلا نہیں ہوسکتے پھر بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ معاشی حالت کی اصلاح کی حقیقی تدبیر یعنی قرضے کی فراہمی کا مناسب و معقول انتظام جلد سے جلد کیا جائے۔

ہندوستانی کاشتکاروں کی مالی حالت میں جو اصلاح فوری اور اہم ترین ہے وہ قرضہ کی فراہمی

کا مناسب انتظام ہے تاکہ کاشتکار مویشی، تخم، آلات و اوزار زراعت وغیرہ خرید سکیں اور کھاد استعمال کرکے اور کاشت عمیق کے دوسرے طریق اختیار کرکے زمین کی زرخیزی کو بڑھا سکیں۔ حکومت نے پہلے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اس کی تدبیر کے لئے ۱۸۸۳ء میں قوانین قرضہ جات اصلاح اراضی اور ۱۸۸۴ء میں قانون قرضہ جات کاشتکاران منظور و نافذ کیا جو روپیہ ۱۸۸۳ء کے قانون کے تحت دیا جاتا تھا اس کو اصلاح زمین پر صرف کرنا ضروری تھا مثلاً کوآں کھودنا، موریوں اور نالیوں کی تعمیر و مرمت کروانا وغیرہ برخلاف اس کے ۱۸۸۴ء کے قانون کے تحت جو روپیہ دیا جاتا تھا اس کے لئے لازمی تھا کہ وہ مویشیوں، تخم، آلات زراعت وغیرہ خریدنے میں صرف کیا جائے۔ اگرچہ کاشتکاروں کی ایک معقول تعداد ان قوانین سے اپنی حالت سدھارنے میں مدد لیتی رہی لیکن تاہم جو امداد بحیثیت مجموعی ان قوانین سے حاصل ہوئی وہ تقریباً ناقابل لحاظ ہے۔ ایک تو اس لئے کہ جو رقم دی جاتی ہے وہ مقدار میں بہت قلیل ہوتی ہے دوسرے یہ کہ شرح سود اتنا کم نہیں ہوتا جس سے کاشتکاروں کو قرضہ لینے کی کافی ترغیب ہو اور تیسرے یہ کہ ان قوانین کے تحت قرضہ حاصل کرنے کا جو طریقہ ہے وہ بہت ہی سخت اور تکلیف دہ ہے۔ یہی حال قرضہ ہائے تقاوی کا ہے ان کی بھی مقدار قلیل ہوتی ہے اور ادائی ایک مدت معینہ کے اندر لازمی قرار دی جاتی ہے۔ ان تمام خامیوں کے علاوہ ایک اور عام شکایت یہ ہے کہ قبل اس کے کہ قرضہ کی رقم کاشتکار کے ہاتھ لگے اُس کا ایک جز نامعلوم طریقہ پر مفقود ہوجاتا ہے۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ادنی شرح سود پر قرض دیا جائے اور کاشتکاروں کی ضرورت اور غرض کو اچھی طرح دریافت کرلیا جائے اور ان کی ضرورت کے موافق روپیہ دیا جائے نہ تو روپیہ ضرورت سے زیادہ دیا جائے کہ وہ فضول خرچ کرسکیں نہ کم کہ ضرورت رفع نہ ہوسکے اور ان خامیوں اور دقتوں کو رفع کیا جائے جو قرضہ ہائے تقاوی وغیرہ حاصل کرتے وقت کاشتکاروں کو درپیش ہوتی ہیں۔ کاشتکاروں کے سابقہ قرضہ کا معقول انتظام کیا جائے اور ان کی آئندہ مالی حالت کو درست رکھنے کا کافی خیال رکھا جائے۔

ان تمام انتظامات کے علاوہ ایک اور ضروری بات یہ بھی ہے کہ ملک میں صنعت و حرفت کو ترقی دی جائے تاکہ زراعت اور صنعت و حرفت کے پیشوں میں توازن قائم ہوجائے اور ملک کے قدرتی وسائل ضائع نہ جائیں کیونکہ ہندوستان میں زراعت کیلئے جس قدر قدرتی وسائل موجود ہیں اسی قدر صنعت و حرفت کے لئے بھی موجود ہیں۔ جہاں ہندوستان زراعت کے لئے موزوں ملک ہے وہاں صنعت و حرفت کیلئے بھی موزوں ہے اور وہی ملک زیادہ خوشحال ہوسکتا ہے جہاں زراعت کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت بھی ترقی پذیر ہو۔

غرض جب تمام متذکرۂ بالا امور کی طرف کافی توجہ کی جائیگی اور ان امور کا خاطر خواہ انتظام و بندوبست ہو جائیگا اور قوانین متعلقہ اراضی میں جہاں جہاں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت ہو اس پر عمل کیا جائیگا تو پھر کافی توقع ہے کہ ہندوستانی کاشتکاروں کی معاشی حالت بہت جلد درست ہوجائیگی

سفرنامۂ مصر جدید

مرتبہ

(میر دبیر قاضی مولوی ولی محمد صاحب بی۔اے سیکرٹری روبکاری تاجدار بھوپال)

از

"مُلّا رموزی"

اسلامی ہند کے لئے خصوصاً اور ہندوستان کے لئے عموماً مملکت مصر ایک ایسا دلچسپ ملک ہے جسکی مذہبی، سیاسی۔ اور اقتصادی، زندگی ہندوستان کی حیاتِ عامہ سے نہایت قریبی تعلق رکھتی ہے، صرف یہ سوال باقی رہجاتا ہے کہ آیا مصر ہندوستان کو متاثر کرتا ہے یا ہندوستان مصر کو؟ پس اس لئے بھی مصری حالات کا علم ہمارے لئے ضروری اور مفید ہے، لیکن ہندوستان میں تعلیم کے فقدان اور یہاں کی غیر سیاسی آب و ہوا کا جلاہاپن ہے کہ ہندوستانی لوگ مصری مسائل سے وہ دلچسپی نہیں لیتے جو اُن پر فرض ولازم ہے، اور ان مسائل سے ہندوستانی دلچسپی لیں تو کس طرح جبکہ اُن میں خود "کلرکانہ" تعلیم سے زیادہ کچھ ہے بھی نہیں، اس لئے وہ اگر ملک مصر کو سمجھتے بھی ہیں تو صرف اس قدر کہ یہ ایک ایسا شہر ہے جس میں ایک نہر بہتی ہے جسے سوئیز کہتے ہیں اور اُس کے بیچ میں سے انگریزی ڈاک کا جہاز ہندوستان آجاتا ہے جس میں ہندوستان کے "گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل" لنڈن سے آیا کرتے ہیں اور بس۔ حالانکہ مصر اور اور حالات مصر سے ہندوستان کے دُھنئے اور جلاہون تک کو بخوبی واقف ہونا چاہیئے تھا کیونکہ مصر میں روئی عمدہ اور بکثرت پیدا ہوتی ہے!

مملکت مصر اور اُس کے حالات ہندوستانیون کے لئے اِس لئے بھی قابل مطالعہ تھے کہ مصر انسانی تہذیب و تمدن، اور تاریخ انسانیت کا وہ نقش اولین ہے جس میں برتر از قیاس عظمت کے حامل انسانون کے علمی، عملی، سیاسی، عرفانی، اور فکری، احوال و سوانح نمایان اور موجود ہیں، لیکن جن ہندوستانیوں کو۔ اندر سبھا امانت، طلسم ہوشربا، اور گل بکاؤلی، ایسی تھیٹرانہ یعنی خیالی کتابین حفظ یاد کرلینے کا ذوق ارزانی ہوا ہو اُن کو مصری حالات سے

اُتنی ہی دلچسپی ہو سکتی ہے جتنی دیوبند والوں کو اخبار "پائینیر" سے؛ البتہ ہندوستانیوں کی ایسی ترچھی ذہنیت والی قوم میں ایک ذرا سیدھی ذہنیت والی جماعت وہ ہے جسے "کالج رسیدہ" عرف تعلیم یافتہ کہتے ہیں، لیکن اوندھے طریق تعلیم کے اثر سے اِس جماعت کے نزدیک بین الاقوامی سیاست، اور تاریخ و معارف کا مطالعہ ٹینس کرکیٹ اور فٹ بال سے کبھی افضل تھا نہ ہے، اِس لئے اس جماعت کو بھی مصری حالات کا اتنا ہی علم ہے کہ مصر ایک ایسے ملک کا نام ہے جہاں سے کیمبرج اور آکسفورڈ جاتے ہوئے گزرتے ہیں اور اس میں جہاز ٹھیرنے کی جگہ کو "پورٹ سعید" کہتے ہیں، ایک جماعت اللہ بخشے اپنے بڑے مولوی صاحب کے مزاج کی ہے جسے مصر کے متعلق صرف اِس قدر علم ہے کہ مصر کوئی شہر تھا جہاں حضور یوسف علیہ السلام اور زلیخا رہتی تھیں، اب اگر ہیں تو چند "گاندھیانہ دماغ" کے ہندوستانی لوگ ہیں جنہیں مصری حالات سے صرف چند دن سے اس لئے دلچسپی ہوگئی ہے کہ وہ سوراج کی تحریک میں مصری لوگوں کی نقالی چاہتے ہیں، یا پھر ہندوستانی اخبارات ہیں جو مصریات کے متعلق کبھی کبھی اتنا بتلا دیتے ہیں کہ

"اللہ غریق رحمت کرے زغلول پاشا مصری لیڈر تھے نیز
مصری طلبہ سیاسیات ملکی میں جتنا حصہ لیتے ہیں اُتنا حصہ علی گڈھ کے
طلبہ ویسے یونیورسٹی میں والنٹیر بنکر بھی نہیں لے سکتے، اور کہ جو مارشل لا
پنجاب میں نافذ ہو چکا ہے وہ مصر میں بھی نافذ ہو سکتا ہے بشرطیکہ
مصر کا وزیر اعظم مصری آزادی کا مطالبہ کرے"!

یہ تو اُن عام ہندوستانیوں کا تذکرہ تھا جو مصری مسائل وافکار اور احوال وسوانح سے بے خبر رہنا ہی اپنا تعلیم یافتہ پن سمجھے ہوئے ہیں، لیکن اب ذرا اپنے مسلمانانِ ہند پر ایک نظر ڈال لیجئے سو اُن کے ہاں بجز اس کے کچھ نہیں کہ صبح کی نماز کے وقت تک سوتے رہنا اور دس بجے دن کو اُٹھکر انگریزدن کی چائے پینا۔ دفتر جانا۔ شام کو۔ ہاکی اور ٹینس کھیلنا، اور رات کو تھیٹر یا سینما دیکھکر سو جانا اور پھر وہی "گذشتہ سے پیوستہ والی صبح" یہ اُن مسلمانانِ ہند کا نظام اوقات ہے جو چشم بدور تعلیم یافتہ تو کیا البتہ انگریزی یافتہ ہیں اور یہی ہیں وہ جو دنیا جہان کی تمام بیداری، روشن خیالی، ترقی، اور سیاست آگاہی، کو صرف اپنے لئے خاص سمجھے ہوئے ہیں، اب رہے عام مسلمانانِ ہند سو اُن کا علم ممالک اسلامیہ کی ذیل میں صرف اسقدر ہے کہ

"حکومت ترکی وہ جہان چندہ بھیجا جاتا ہے"!

"اور ملک مصر وہ جہاں یوسف علیہ السّلام بادشاہ ہوئے تھے"۔

حالانکہ مملکت اسلامیہ مصر کی تاریخ اپنی اسلامی روایات، دینی آثار و اثرات، اور عباسی عروج و فتوحات کے لحاظ سے مسلمانان ہند کے لئے "دعائے گنج العرش" سے زیادہ حفظ یاد کرلینے کے قابل تھی، لیکن مسلمانانِ ہند کی موجودہ پستی تاریخ اِسلام ہی بھول جانے کا نتیجہ ہے، وہ اگر اپنی قومی تاریخ کو اپنی محافل و مجالس اور اپنے مطالعہ میں باقی رکھتے تو اُنہیں اپنے اسلاف کے عروج و اقبال کا اندازہ کرکے اپنی موجودہ پستی کے ازالہ کی فکر پیدا ہوتی، لیکن اُنہیں تاریخ کے صحیح فوائد و اثرات ہی کے سمجھنے کی توفیق نہیں۔ اور یہ سب کچھ اثر ہے علوم اسلامیہ دینیہ سے گریز و غفلت کا جس نے اصل میں علی گڈھی مسلمانوں کی صحبت کے اثر سے تمام مسلمانوں کا بیڑہ غرق کرڈالا۔ اور وہ وقت دور نہیں جب ہندی مسلمان بھی اپنے قومی شعائر کو خیر باد کہکر مصطفٰے کمالی اور امان اللہ خانی ہیٹ پوشی اور سوٹ پسندی کو عین اسلامیت سمجھیں گے۔ اللّٰھم احفظنا۔

تاریخ کے بعد سیر و سیاحت یا سفرنامہ خوانی کا رتبہ ہے جو اصل میں تاریخ ہی کا ایک جزو اور حصہ ہے، لیکن ہندوستان میں اول تو سفرنامہ نویسی "دہلوی روزنامچہ نویسی" کے رنگ میں ڈھل چکی ہے یا پھر سفرناموں میں یہ لکھا جاتا ہے کہ

"جب میرا جہاز عدن سے سویز میں داخل ہوا تو پورٹ سعید پر مسٹر قریشی ملے اور اُنہوں نے لکھنؤ کے آم کھلائے لندن میں مسٹر ہاشمی نے چائے پر بلایا، یہ علی گڈھ میں میرے کلاس فیلو تھے، ہائیڈ پارک میں مسٹر قادری ملے جو عرصہ سے کیمبرج میں فن غلامی کی تعلیم پا رہے ہیں، رہے چشتی اور نقشبندی سو وہ شام کو سیسل ہوٹل میں مل جایا کرتے ہیں"۔

اب اگر اس سلسلہ میں روشن خیالی یا قومیت کا بڑا تیر مارا تو سفرنامہ میں اتنا اور لکھدیا کہ

قیام لندن کے زمانے میں مسٹر ریمیزے میکڈانلڈ لارڈ برکن ہیڈ اور سر مائیکل اوڈوائیر سے مین نے جو ملاقاتین کین اُن سے اندازہ ہوا کہ یہ سب کے سب ہندوستان کو عمر بھر غلام رکھنا چاہتے ہیں"۔

اور جو یہ سفرنامہ لکھنے والے مسلمان ہوئے تو یہ ضرور لکھیں گے کہ

لنڈن سے ووکنگ جاکر میں نے خود دیکھا کہ خواجہ کمال الدین تبلیغ اسلام کے نام سے جو چندہ وصول کرتے ہیں اُس سے یہاں وہ مرغی انڈا خرید کر کھا جاتے ہیں"۔

جس کا خلاصہ یہ نکلا کہ انگلستان میں رہے سہے اسلامی تبلیغ کے سلسلہ کو بھی ختم ہی کر دیا جائے اور احمدیوں کو جھنجی کوڑی بھی نہ دی جائے، یا پھر سفرنامہ کی تیسری ترکیب یہ ہے کہ اس میں لکھدیا کہ۔

"ہر اسٹیشن پر میرے اس قدر مریدوں نے استقبال کیا ہاتھوں کو بوسہ دیا اور ناشتہ پکا کر لائے"

مگر یہ کہیں نہیں لکھیں گے کہ۔ اسقدر روپیہ نذرانے میں وصول ہوا۔



اِن حالات میں ایک سفرنامہ حضرت محترم مولوی قاضی ولی محمد صاحب مدظلہ کا نظر سے گزرا جو اصل وحقیقت میں مصر جدید کی ایک محققانہ تاریخ ہے واضح ہو کہ اس اہم علمی سفرنامہ کا مطالعہ جس کامل سکون و فراغت کو چاہتا ہے اُس کو ملحوظ رکھتے ہوئے ملاحظہ کیجئے کہ جب ہم اسے غور سے پڑھنے بیٹھے تو آواز آئی "ذرا زور سے پڑھو تو ہم بھی سنتے جائیں" آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ آواز اُن کی تھی، اِس فقرہ پر ہمیں اُن پر کئی قسم کا تاؤ آیا۔ مثلاً

تاؤ نمبر اول اِس خیال سے کہ وہ اِسقدر تاریک خیال کیوں واقع ہوئی ہیں کہ جب ہم کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہونے کے قریب پہنچتے ہیں تو ان سے بولے بغیر کیوں نہیں رہا جاتا۔

تاؤ نمبر دو اِس خیال سے آیا کہ "ذرا زور سے پڑھو ہم بھی سنتے جائیں" کا جو مطالبہ ہم سے کیا گیا اس حساب سے یہ اہم علمی کتاب خاصی طلسم ہوشربا ہو گئی جسے محفل میں چلا چلا کر پڑھنا ہی کمال قابلیت سمجھا جاتا ہے اور محلے والے اُسی کو قابل ترین "منشی جی" سمجھتے ہیں جو ہر کتاب کو ۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا چلا کر پڑھے، اور ہاں یہ بھی سوال فرمایا کہ۔ کتاب پڑھتے وقت یہ سُرخ پنسل لیکر"

"کیوں بیٹھا کرتے ہو؟؟؟

کہیئے کل کلاں کو یہی دریافت کر گزرینگی کہ تم کتابیں ہی کیوں پڑھا کرتے ہو؟؟؟

ہم نے بھی یہ ترکیب اختیار کی کہ فوراً عرض کیا کہ

کچھ نہیں اس کتاب سے اپنے ننھے میاں کے کھیلنے کے لئے عمدہ عمدہ تصویریں چھانٹ رہے ہیں

اِس جواب سے اُن کو جو اطمینان حاصل ہوا اُسے وہی لوگ جان سکتے ہیں۔ جنہیں ایک ایک

ننھے میاں اور ایک ایک "گرلز اسکول" عطا ہوئی ہیں، اور چونکہ اِس جواب سے ہمارا مقصد اُن کو خموش کر دینا تھا سو الحمد للہ کہ وہ اب سکون سے گھر کے کام کاج میں مصروف ہوگئیں، اور ہم نے نہایت آن بان سے۔ سفرنامۂ مصر کا پہلا صفحہ آنکھوں کے سامنے تان لیا اور پڑھتے پڑھتے ابھی اس کی فہرست مضامین تک ہی پہنچے تھے کہ آواز آئی۔

"دس بج گئے دس"

مطلب یہ تھا کہ تم جو علّامہ شبلی بنے بیٹھے ہو یہ اس لئے مناسب نہیں کہ علامہ سفعور ایسی فراغت نصیب دوست تمہیں حاصل نہیں۔ لہٰذا اُٹھو اور مطالعہ چھوڑ کر دفتر جاؤ اور نوکری بجالاؤ اس آواز پر قریب تھا کہ ہمیں پھرتا ؤ آجائے مگر فوراً ہی خیال آیا کہ اگر ہمیں کسی کتاب کو پڑھنا ہی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں روک نہیں سکتی، ورنہ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ ہر مطالعہ کرنے والا نظام حیدر آباد کا علمی وظیفہ خوار ہو کر ہی کامل سکون سے مطالعہ کر سکتا ہے اور جو وظیفہ نہ ہو تو مطالعہ ناممکن۔ لہٰذا ہم فوراً دفتر کے لئے اُٹھے مگر اس طرح کہ سفرنامہ کو آنکھوں اور ہاتھوں سے جدُا نہ کیا اور کھانا طلب کیا، اور شروع کر دیا مگر سفرنامہ کو علیحدہ نہ کیا۔ کھانا کھانے میں مطالعہ جاری رکھنے سے صرف یہ ہوتا ہے کہ بعض نوالے بغیر ترکاری لگائے کھانا پڑتے ہیں سو کھائے مگر سفرنامہ کو جدا نہ کیا۔ پھر نہایت غصہ کے لہجہ میں کہا۔ لاؤ شیروانی، پان کھلاؤ۔ ارے موزے بھی پہناؤ گی یا نہیں؟ دیکھو ننھے میاں گھر سے باہر کھیلنے نہ جانے پائیں کیونکہ آج کل فرسٹ کلاس موٹر ڈرائیور وہی مانا جاتا ہے جو خلاف قانون نہایت تیز موٹر چلائے۔ ایسے احکام صادر کرتے وقت ہم نے لہجہ اس لئے غضبناک بنا لیا تھا کہ وہ کچھ نہ کہہ سکیں کیونکہ کھاتے وقت مطالعہ جاری رکھنے سے وہ بہت ناراض ہوا کرتی ہیں لہٰذا جب ضروریات سے فارغ ہو گئے تو دفتر جانے کے لئے بھی اِس طرح باہر نکلے کہ سفرنامہ کو جدا نہ کیا، تمام راستہ یہی حال رہا کہ سفرنامہ ہاتھوں پر اور آنکھیں سفرنامہ پر اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ تمام راستہ کسی کو سلام بھی نہ کرنا پڑا۔ بلکہ لوگوں نے اُلٹا ہم کو ہی سلام کیا اس پر بھی ہم نے سفرنامہ کو جدا نہ کیا راستہ چلتے چلتے کتاب یا اخبار پڑھنے میں بے شمار فائدے ہیں، مثلاً ایک فائدہ یہ ہے کہ شناسا حضرات اور احباب کے اِس تقاضے سے مطالعہ کرنے والا محفوظ رہتا ہے کہ

"امان اب تو تم عید کے چاند ہو گئے"

"آخر کہاں رہتے ہو؟"

"اچھا تو گھر پر ملنے ہی کا وقت بتلا دو ہم خود آجائیں گے؟

"اب کہاں جا رہے ہو؟ اور گھر میں تو سب طرح خیریت ہے؟

دوسرا فائدہ یہ کہ مطالعہ کرنے والا سرِراہ کسی موٹر کے تصادم پر بازاری ہجوم اور میرے کے سرمہ اور دانتون کے منجن فروخت کرنے والے لیکچرر کے بازاری لیکچر اور مداری کے تماشہ میں نہیں ٹہرتا۔ صرف موٹر میں بیٹھنے والے لوگ سرراہ مطالعہ کرنیوالے کو بیوقوف سمجھتے ہیں مگر یہ نہیں سمجھتے کہ یہ سرِراہ مطالعہ کرنے والا علمی آدمی ہے مگر ملازمت سے مجبور رہے'

تیسرا فائدہ یہ کہ راستہ میں مطالعہ کرنے سے آدمی منزل مقصود تک جانے سے تھکتا نہیں بعض وقت راستہ میں اُسپر غنودگی طاری ہو جاتی ہے' اور اُس کی رفتار خودبخود کم ہوتی چلی جاتی ہے' پس اِن فوائد کے لحاظ سے ضرورت ہے کہ تمام علمی لوگ سڑکوں بازاروں اور گلی کوچوں میں مطالعہ فرمایا کریں' اب ذرا تصور کیجے اُس پُرلطف وقت کا جب ان فوائد کے لئے ایک سڑک پر مولانا ابوالکلام آزاد کوئی کتاب پڑھتے چلے جا رہے ہوں تو کسی بازار میں گاندھی جی کھڑے اخبار پڑھ رہے ہوں' لیکن چونکہ سرراہ مطالعہ کرنا صرف رسم کے خلاف سمجھا گیا ہے اِس لئے بیوقوف لوگ اِسے بیوقوفی سمجھیں گے ورنہ مطالعہ کے شوقین لوگ دل سے یہی چاہتے ہیں۔ اور جو ابھی ویسرائے ہند کسی سڑک پر کھڑے ہوئے اخبار پڑھتے نظر آجائیں تو اُسی وقت سے ہندوستان کے بڑے بڑے وقارالملک اور بڑے بڑے وہم اقبالہ قسم کے لوگ سڑکوں ہی پر مطالعہ کرنا فخر سمجھیں' دور کیوں جاتے ہو اس نقالی میں ذرا امیر امان اللہ خان ہی کی وہ نقلی کینچلی ملاحظہ فرمالیجے جو سوٹ اور ہیٹ کے متعلق اُنہوں نے مغربی لوگوں کو دیکھکر حال ہی میں بدلی ہے' ورنہ آپ ہی بتلائیے کہ افغان ایسی اسلام شعار قوم کہیں قومی شلواروں کو مغربی پتلون سے بدل سکتی تھی؟

الحاصل دفتر کے دروازہ تک سفرنامہ کو آنکھوں سے جدا نہ کیا۔ آپ سمجھے ہوں گے کہ واقعی مُلا رموزی صاحب کوئی ایسے ہی تھرڈ کلاس قسم کے بزرگ ہیں جنہیں گھر میں سکون سے بیٹھکر مطالعہ نصیب نہیں ہوتا! لاحول ولا ! ماں یوں کیوں نہ سمجھو کہ سفرنامہ ہی اِس قدر دلچسپ تھا کہ اسے شروع کرکے بغیر ختم کئے چھوڑ دینا اُتنا ہی دشوار تھا جتنا کسی

گمشدہ عزیز کی تلاش" کا اعلان پڑھ کر گمشدہ کا حلیہ اور انعامی رقم کا نہ پڑھنا۔

سفرنامہ کی اغراض تو بے شمار ہیں مثلاً اور کچھ نہیں۔ تو سائمن کمیشن کی خوشامد ہی میں لاہور سے لنڈن چلا جانا۔ یا دوسرے کے علاج کے لئے ہندوستان کے "کوفتہ بیختہ جوشاندہ حکیموں" کو چھوڑ کر لندنی ڈاکٹروں سے علاج کے لئے لندن جانا بھی سفر ہوتا ہے' یہ بھی سفر ہے کہ پیرس میں ایک ہوٹل کرایہ پر لیکر بس اُس میں ٹھیرے ہوئے ہیں اور ہندوستان آنے کا نام بھی نہیں لیتے۔ یہ بھی سفر ہے کہ امریکہ کی کسی عورت سے ہندوستان میں نکاح کیا اور پھر پیرس کے کسی ہوٹل میں جا بسے' یہ بھی سفر ہے کہ خلافت کمیٹی کے چندہ سے حج کو چلے گئے اور راستہ میں جس شہر میں چاہا ہندوستان کے نمایندے بنکر ٹھیر گئے' یہ بھی سفر کہلاتا ہے کہ رات دن کسی انجمن یا یتیم خانے کے نام سے شہر بہ شہر گھومتے پھرے' یہ بھی سفر ہے کہ کسی قومی لیڈر کی نگرانی کرتے ہوئے کانگریس کے سالانہ اجلاس تک جا پہنچے' لیکن ایسے سفر کرنے والوں کو حق نہیں کہ وہ اپنا سفرنامہ لکھ سکیں' البتہ سفرنامہ وہ شخص لکھ سکتا ہے جو سرکاری خرچ سے سفر کرے اور سفر کے حالات میں اپنی قوم کو یہ بھی بتا دے کہ فلاں ملک میں تجارت اور فوج کشی کے بہت کافی مواقع موجود ہیں ایسے سفر کرنے والوں کا نام عام طور پر مسٹر فلبی یا سر گلبرٹ کلیٹن ہوا کرتا ہے۔ مگر ہمارے خیال میں تمام قسم کے سفرناموں میں یورپی قوموں کے سفرنامے نہایت مکمل اور منفعت بخش ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ ان سفرناموں کی غرض ایک اور صرف ایک ہوا کرتی ہے اور وہ یہ کہ ان میں ایشیا کے کسی نہ کسی ملک یا شہر پر قبضہ کرنے کا طریقہ ضرور بتلا دیا جاتا ہے' یا پھر یہ لوگ جس ملک میں سفر کر کے جاتے ہیں وہاں کے عام حالات اور عام لوگوں کو عبارت اور تصاویر سے اسقدر ذلیل ثابت کرتے ہیں کہ دنیا جہان میں اُن کی رسوائی ہوتی ہے جیسے ایک "امریکہ زادی" نے۔ مدر انڈیا۔ کے نام سے ہندوستان کا سفرنامہ لکھکر تمام ہندوستانیوں کو قلی مزدور ثابت کر کے رکھدیا' یورپ کی قومیں جب ایشیا کے کسی ملک کو فتح کرنا چاہتی ہیں تو پہلے وہ سفرنامہ لکھنے والوں ہی کو روانہ کرتی ہیں مثلاً فرض کیجیے کہ اگر جرمن قوم ہندوستان پر حملہ کرنا چاہے تو وہ پہلے ہندوستان کے راستہ سے ایک جماعت روانہ کریگی اور مشہور یہ ہوگا کہ جرمن کی یہ جماعت کوہ ہمالہ کی بلند ترین چوٹی تلاش کرنے حاضر ہوئی ہے اِسی طرح اٹلی والے کہیں گے کہ ہم تو ہوائی جہاز پر قطب جنوبی کی تلاش میں نکلے ہیں لیکن کوئی ان سے دریافت کرے کہ کیوں صاحب یہ قطب جنوبی اور قطب شمالی کی تلاش میں حضرت

جنرل نوبائیل کی کیا ضرورت ہے؟ امریکہ کو اگر فرانس پر چڑھائی کرنے کی ضرورت ہوگی تو وہ ایک شخص کو ہوائی جہاز پر سوار کر کے بحر اوقیانوس پر سے فرانس بھیجیگا اور اعلان یہ کریگا کہ اس شخص کو ہوائی جہاز پر ایک ہی پرواز میں فرانس تک پہنچنے کا بیحد شوق ہے، اِسی طرح اگر برطانیہ ایران پر نہر سویز کی طرح اقتدار رکھکر ہندوستان کو غلام بنائے رکھنے کا طالب ہوگا تو چند لوگوں کو ایران میں رہنے کے لیے بھیجیگا اور بیان یہ کریگا کہ یہ لوگ صرف ایران کے راستہ سے ہندوستان ہوائی ڈاک لیجایا کریں گے، اِس لئے خلیج فارس پر ایک ہوائی مرکز بناتے ہیں اور کرتے ہی کیا ہیں؛

لیکن اپنے ہندوستان کے لوگ اول تو مارے اہل وعیال کے سفر ہی نہیں کرتے اور جو سفر کرتے ہیں تو ان تمام منافقانہ اغراض سے قطع نظر کر کے صرف علم وتمدن اور دین وملت کے پرانے کھنڈر دیکھنے جایا کرتے ہیں اور اِسی لئے ہندوستانی سیّاح ہمیشہ اُنہی ممالک تک جاتے ہیں اور ایسے ہی ممالک کے سفرنامے لکھتے ہیں جہاں اُن کی قومی روایات کے آثار موجود ہوں، اور بشرطیکہ یہ ممالک اتنے قریب ہوں کہ سوسوا سو روپیہ میں آدمی وہاں پہنچ جائے، ورنہ کیا وجہ ہے جو کوئی ہندوستانی صحرائے افریقہ یا کوہ قاف کا سفرنامہ نہیں لکھتا؛ یہ تو صرف انگریز قوم کی بلند پایہ ہمت ہوتی ہے جو ارض سبا کی ڈوبی ہوئی عمارتوں کو بھی آج تلاش کرنے میں مصروف ہے۔

پس مسلمانانِ ہند کو اگر کوئی جذبہ آمادہ سفر وسیاحت کرتا ہے تو وہ صرف قومیت کا روحانی جذبہ اور بس، لہذا یہی جذبہ اگر دوسرے ممالک کے مسلمان بھائیوں کے صحیح اور تاریخی وتمدنی علمی وسیاسی، اور اجتماعی حالات وافکار کو ہم تک پہنچا دے ایسی صورت میں کہ اُسے کوئی سرکاری خرچ اس سفر کے لئے نہ ملے تو وہ یقیناً ہزاروں شکرگذاریوں کا مستحق ہے۔

پس ایسے مسلمان سفرنامہ نگاروں میں حضرت محترم مولوی قاضی ولی محمد صاحب بی، اے۔ ایک امتیازی حیثیت رکھنے والے سیّاح ہیں جو باوصف اپنی گوناگوں اور ناگوار ذمہ داریوں کے اسلامی ممالک کی سیاحت اور وہاں کے تاریخی حالات کی قلمبندی سے اِسی طرح نہیں چوکتے جس طرح ہم مضمون نگاری سے عوام کی نظر میں تو ایسے لوگ صرف "اہل قلم" ہی سمجھے جاتے ہیں لیکن ارباب علم وفضیلت کے نزدیک یہی لوگ ہیں جنکے دماغ وقلم کی کاوشیں اقوام وملل کی تاریخی بنیادیں مضبوط کرتی رہتی ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ لالہ سری رام مؤلف "خمخانۂ جاوید" اسقدر مالدار ہوجائیں کہ بنارس یونیورسٹی کو پانچ لاکھ روپیہ دے مریں اور حضرت سدرشن فسانہ نگاری ہی سے پنجاب یونیورسٹی سے پانچ سو روپیہ نقد انعام لے مریں۔

اور حضرت قاضی صاحب اور آپ کے ضیاء الملک ملّا رموزی صاحب کو ایک فورڈ موٹر بھی نہ ملے صرف فرق یہ ہے کہ لالہ سری رام جی اور لالہ سدرشن جی نے جو کچھ لکھا وہ اُس ہندو قوم کے لئے جو آج معارف پسندی کے اثر سے دنیا کی سربلند اقوام کے ساتھ دوڑ رہی ہے اور حضرت قاضی ولی محمد صاحب اور حضور ملّا رموزی صاحب اُس مسلمان قوم کے لئے لکھ رہے ہیں جس کی آل انڈیا ٹورنامنٹ پسندی' یا تھیٹر اور سینما بینی ذلت و خواری کے ایک ایسے تاریک غار میں لے جارہی ہے جسکی ہولناکی سے اُس کا ہر فرد ابھی بے خبر ہے لاحول ولا۔

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ ہنر ہند تھے ہم

بہر حال حضرت گرامی قاضی ولی محمد صاحب کی سالہا سال کی جگر کاوی اور بادیہ نوردی اب "مصری سفرنامے" اور "سفرنامۂ اُندلس" کی مطبوعہ صورت میں اسوقت ہمارے سامنے ہے' حضرت قاضی صاحب نہ فقط مغربی و مشرقی علوم کے ماہر ہیں بلکہ ممدوح پاک باطنی' خلوص' تاریخ دانی' اور مسلم پرستی کا ایک ایسا نمونہ ہیں جو خال کم بدھن اِس سفلہ پرور مسلم قوم میں اگر ہوتے تو اچھا تھا آہ. مجھے معلوم ہے اور اچھی طرح معلوم ہے کہ عالی جناب قاضی صاحب نے محض قومی و مذہبی جذبہ کے تحت برسوں سے اپنے شب کے آرام اور اپنی دولت کو اسلامی آثار و روایات کے بقا و تحفظ کی خاطر قربان کر رکھا ہے لیکن مسلمانوں کو اتنی بھی فرصت نہیں کہ وہ قاضی صاحب کے ان جواہر سفرناموں کو ملاحظہ ہی فرمالیں' حضرت قاضی صاحب نے متعدد بار بذات خود سفر فرما کر ۱۹۲۶ء میں دولت شاہانہ اسلامیہ اُندلس کا جو سفرنامہ مرتب فرمایا ہے وہ ادبیات اُردو اور اسلامیات ہند کا ایک ایسا عزیز و محبوب ذخیرہ ہے جس کی شکر گذاری سے کم ازکم راقم الحروف کا قلم عہدہ برآ نہیں ہوسکتا' اور اسی لئے اس جلیل الشان سفرنامۂ اُندلس پر اظہار خیال کو کسی کافی فرصت کے لئے محفوظ رکھا ہے؛



اسوقت قاضی صاحب قبلہ کا وہ نظر نواز و نظر آرا سفرنامۂ مصر ہمارے سامنے ہے جو صفحہ اول سے صفحہ آخر تک فن طباعت و کتابت' کاغذ اور مصوری کے جلوہ پرور نمونوں سے مزین ہے' اور حق یہ ہے کہ مطبع نظامی لکھنؤ نے اس سفرنامہ کو حسین و جمیل بنانے میں فن طباعت کا وہ تمام سلیقہ صرف کردیا ہے جو اپنے علی گڈھ کے مشہور مولانا مولوی باہتمام محمد مقتدیٰ خان شروانی ہی کو حاصل تھا' کتابت کی دیدہ زیبی' کاغذ کی چمک اور صفائی پھر تصاویر کی نفاست کو

اپنی اپنی جگہ پر کچھ اس خوش اسلوبی سے باقی رکھا ہے کہ آنکھیں اس کتاب کے ہر صفحہ میں ڈوب جانا چاہتی ہیں، یہ سفر حکمت اثر کتاب کے (۲۴۲) صفحات پر ختم ہوتا ہے تصاویر کی تاریخی اور معنوی اہمیت اور بلند پائیگی کا وہ عالم ہے کہ اگر زبان اُردو میں فن مصوری صرف بند آنکھوں والے "عمل چغتائی" ہی کے لئے محفوظ و مخصوص نہیں ہوگیا ہے تو مان لیجیے کہ اس کتاب کی تصاویر ہی ایک مستقل نگارخانہ چینی و نقش ارژنگ ہے جو ارباب ذوق سلیم کے لئے سامان صد نظارہ فراہم کرتا ہے۔ ان جمال افزا اور تاریخی تصاویر کی تعداد ( ) ہے۔ پھر یہ تصاویر وہ نہیں۔ جو محترم مؤلف نے کسی "ہر مال ساڑھے پانچ آنہ" والی دہلوی دکان سے خرید کر چپکا دی ہوں، بلکہ ان میں سے ہر تصویر مؤلف کتاب کے بذات خود معاینہ کر کے موقع پر کھینچی ہے، اور اسی لئے تمام تصاویر نہایت صحیح اور برمحل ہیں۔ اور حقیقت میں صرف ان تصاویر ہی کو یکجا جمع کر لینے سے ہندوستان ہی میں مصر نظر آجاتا ہے، اور ہم کہیں گے کہ اگر پنجاب میں ڈاکٹر سر اقبال اپنا کوئی لکچر لالٹین کے ذریعہ اچھی طرح سمجھا سکتے ہیں تو حضرت مؤلف سفرنامہ مصر نے مصری تصاویر سے اس علمی و تاریخی سفرنامہ کو اُن سے زیادہ آسانی سے سمجھا دیا ہے ایسے اور بات ہے کہ عفرلہ اور عفی اعنہ قسم کے لوگ میجک لالٹین کو جائز اور تصاویر کو ناجائز کہدیں۔

ترتیب سفرنامہ میں "عرض حال" کے عنوان سے پانچ صفحات میں ضروری اسباب تالیف جمع ہیں اور ان میں انتہائی عجز و انکسار سے وہی کام لیا گیا ہے جس پر مشرق کے نہ فقط سلف صالحین بلکہ ہمارا ارباب فضل و کمال فخر کرتے رہے ہیں یہ نہیں لکھا کہ

"جب میں ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو احباب کا اس قدر ہجوم تھا کہ تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی اچھن صاحب ناشتہ لائے تھے، جمیلا بانو نے امام ضامن باندھا تھا۔ اور فرسٹ کلاس کی ایک سیٹ آنریبل سر ملک عمر حیات خان ٹوانہ نے پہلے ہی محفوظ کرائی تھی، جہاز کا ٹکٹ مولانا شوکت علی لئے کھڑے تھے، پلیٹ فارم پر گروپ لیا گیا اور میں بلدیہ بمبئی کا ایڈریس سنکر جہاز پر سوار ہوا"

عرض حال۔ کا یہ حصہ مصر کے اون مشائخ اور اکابر افراد کے اسمار گرامی پر ختم ہوتا ہے جن سے اس کتاب کی ترتیب اور واقعات کی تصحیح میں امداد دیگئی ہے، اور مصری اکابر و اعاظم افراد کے یہی وہ جلیل العظمت نام ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کی تاریخی عظمت اور واقعی صحت کے بقاء کے لئے محترم مؤلف نے کسقدر کوشش و کاوش سے کام لیا ہے!

اِس کتاب میں مصر قدیم اور مصر جدید کی مکمل تاریخ مع جغرافی احوال کے جمع کردی گئی ہے اور علم و تمدن، تہذیب و معاشرت، زراعت و تجارت اور اخلاق کے ہر شعبہ پر نہایت درجہ تکمیل کے ساتھ حالات بیان کیے گئے ہیں، ان واقعات کو ذہن نشین کرانے کے لئے مؤلف نے جو طرز تحریر اختیار کیا وہ اس درجہ سہل۔ عام فہم اور لطافت بار ہے کہ ہر حیثیت کا قاری اس سے مستفید ہوسکتا ہے اور مزید آسانی کے لئے محترم مؤلف نے برمحل اشعار سے اسقدر کام لیا ہے کہ تمام اشعار کو ایک جگہ جمع کر لینے سے انجمن حمایت اسلام لاہور کی قومی نظموں کا مجموعہ نہیں تو۔ مسدس حالی۔ ضرور بن سکتا ہے اور اس سے مؤلف کے ادب اُردو سے انتہائی واقفیت یا اصول خطابت کے کمال کا پتہ چلتا ہے؛

آج کل تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں علی گڈہ والوں نے اخبار پا نیر سے یہ بات سُن لی ہے کہ

"مورخ کو غیر جانب دار ہونا چاہیئے۔ عام اس سے کہ واقعات اُس کی قوم سے متعلق ہوں یا کسی غیر قوم سے"۔

اور اسی لئے کسی تنقید و تبصرہ کے وقت اس اصل کار پر بہت زور دیا جاتا ہے لیکن ہم بے حد خوش ہیں کہ اس کتاب میں اس لغو و لایعنی اصل کی دھجیاں اُڑا دی گئی ہیں اور کتاب سرتاسر قومی جذبہ عصبیت میں ڈوبی ہوئی ہے، اور یہ اس لئے کہ یہ ضابطہ تحریر تو صرف اُن کتابوں کے لئے ہے جنکی غایت صرف تحریر واقعات ہو، اور فطری طور پر یہ طریق غیر جانب داری صرف موسیقی کی ایسی تجارتی کتابوں ہی میں برتا جاسکتا ہے جن کا مقصد گوہر جان کلکتے والی، پیارے صاحب، اور جانکی بائی الہ آباد کی ٹھمریاں جمع کر دینا ہو۔ لیکن جس اہل قلم کا مقصد ہی قومی تاریخ نگاری ہو اُس سے نہ کہو کہ وہ غیر جانب داری کے اصول پر کاربند رہے، اس سے نہ چاہو کہ وہ غیر متعصب بن جائے ورنہ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ جس شخص کا گھر جلے آپ اُس سے کہتے ہیں کہ تو بھی اس بربادی پر اُتنا ہی افسوس کر جتنا کہ عام تماشائیوں کو ہے، اور یہ امر واقع ہے کہ تعصب و غیر جانب داری کی اس غلط فہمی نے مسلمانان ہند کو دشمنوں کے مقابل بے انتہا نقصان پہنچایا ہے جس کی تلافی آج اُن کے بس کی بات نہ رہی، اِس لئے بالغ نظر مؤلف سفر نامہ مصر نے تعصب و رواداری کے اس باریک فرق کو محسوس کرتے ہوئے مصر کے ہر اسلامی حادثہ پر آتنے ہی آنسو بھائے ہیں جتنا کہ اس حادثہ کا حق تھا، پھر یہی نہیں کہ مؤلف نے اِس کتاب کو۔ مرثیہ مصر۔ بنادیا

بلکہ جن مواقع پر مصری حالات دل خوش کن ہیں وہاں مؤلف کا قلم بھی بے انتہا مسرور و شادمان نظر آتا ہے مگر ان صحیح اسلامی تاثرات کا مورخانہ کمال یہ ہے کہ اسقدر جذباتی تحریر کی مشتعل رَو کو ہر جگہ آسانی سے قابو میں بھی کرلیا ہے، اور مساوات و رواداری کے صحیح معیار کو سامنے رکھتے ہوئے واقعات نگاری کی دیانت کو نہایت فراخ حوصلگی سے ادا کیا ہے، مثلاً مؤلف نے مصر سے تعلق رکھنے والی یورپی اقوام کی بدسلوکی کے سلسلہ میں جہاں یونانی قوم کو۔ کذاب ! فرانسیسی قوم کو مکار۔ اور اطالوی قوم کو غدار لکھا ہے وہاں بربنائے واقعات انگریزی قوم کو۔ غیور۔ اولوالعزم اور معارف پسند لکھنے میں کسی قومی تعصب اور عداوت کو راہ نہیں دی ہے۔

طرز تحریر یا تالیفی دیانت کی اس خوش اسلوبی کے بعد سفرنامۂ مذکور میں ایک اور قابل قدر جوہر بھی ہے۔ اور وہ انداز بیان ہے، جو انشار وانشاد کے اس رنگین اصول کے تحت ہے کہ واقعات کو ایسے الفاظ میں بیان کیا جائے کہ واقعات قاری کی نظر سے اُتر کر اس کے دل میں بیٹھ جائیں، اور اس مقبول اصول کے لئے فن انشاء نے ظرافت کو جگہ دی ہے لہذا مؤلف جہاں واقعات نگاری میں دیوبندی متانت اور خشکی سے کام لیتا ہے وہاں وہ ایسے جملے بھی جڑ دیتا ہے جنکی طراوت و لطافت سے خوش طبعی اور تفنن کا وہ جذبہ اُبھر آتا ہے جو کسی خشک کتاب کے مطالعہ کی گرانی کو دور کردیتا ہے، اور پھر کمال یہ کہ یہ ظرافت اُردو اخبارات کے ظریف کالموں کی سی جبری اور مصنوعی ظرافت نہیں بلکہ اسقدر معنی آفرین اور دلپسند ہے کہ باید وشاید مثلاً وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ۔

"مدا دکانیں اس قمر طلعت گروہ سے بھری ہوئی ہیں جو گاہک کی اچھی طرح حجامت کرنے میں طاق ہیں"

گو یہ عبارت واقعی معنی میں استعمال ہوئی ہے یعنی حجاموں کی دکانوں کے سلسلہ میں یہ فقرہ لایا گیا ہے لیکن اُردو زبان والے جانتے ہیں کہ۔ حجامت کرنا۔ لوٹنے یا دھوکہ دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

"مسز ڈنسٹن کی ملاقات ہوئی اُنھی کے بعد ان کے شوہر لارڈ کرنرون سے یاد اللہ ہوئی۔"

لفظ حجامت کے بعد لفظ یاد اللہ ہوئی، کسقدر معنی آفرین اور ظریف ہے۔

یہ ہے وہ انداز تحریر اور طرز تالیف جس نے اس سفرنامہ کو ہر اردو دان کے لئے مفید و ضروری بنا دیا ہے، اور مصری حالات و مقامات کے اس دلنواز مجموعے کا مطالعہ ہر اس ہندوستانی پر فرض ہے جو ایشیائی سیاست و قومیت کا دلدادہ ہے عام اس سے کہ وہ ہندو ہو

یا مسلمان۔

"واقعات نگاری کے سلسلہ میں فاتح ریف غازی محترم محمد بن عبدالکریم اسیر فرانس کہا کرتے ہیں (خدا انہیں فرانس اور اسپین پر لشکر کشی کا پھر موقع عطا فرمائے) کہ سفرنامہ میں بہترین چیز دقت نظر۔ یا تحقیق ہے۔ سو اس کلیہ کو حقیقت میں مؤلف سفرنامۂ مصر نے جس درجہ پورا کیا ہے اس کا اندازہ سفرنامہ کی اس فہرست مضامین سے کیجئے۔

ملک مصر جغرافی لحاظ سے۔ نہر سویز۔ خدیو اسمٰعیل پاشا۔ بندر سعید۔ بحری سفر مابین عدن وقاہرہ۔ مساجد قاہرہ۔ مضافات قاہرہ۔ اہرام مصر۔ ابوالہول۔ حلوان ممف۔ دمیاط۔ منصورہ۔ محلتہ الکبریٰ۔ مدینۃ الفیوم۔ ابوصیر بھنسہ۔ زقازیق بلبس۔ منہا۔ طنطہ۔ دمن ہور۔ اسکندریہ۔ مضافات اسکندریہ، سیدی جابر۔ الرشید۔ ابوقیر۔ عربی موسیقی۔ رملہ۔ پیکر لطیف۔ خصائل اقوام مغربی۔ حکومت مصر در عہد اسلام۔ شجرۂ خاندان خدیوی۔

مقامات مصور۔ کے حالات میں ذیل کی فہرست مضامین ملاحظہ ہو۔

محمد علی پاشا۔ توفیق پاشا۔ اسمٰعیل پاشا۔ عباس حلمی پاشا۔ سلطان حسین۔ سلطان فواد۔ ملا مفتی عبدہٗ۔ احمد عربی پاشا۔ خواتین مصر۔ صفیہ زغلول پاشا۔ آمنہ بی صدیقی۔ بیگم ہدیٰ شعراویہ خاتون ریاض فانوس۔ اہلیہ یوسف بے غالی۔ بیگم بطرس۔ شامی عورت۔ مصری خاتون۔ متوسط الحال خاتون۔ غربا بدوی کا گھر۔ دہقان کی لڑکی۔ کاشتکاران مصر۔ تھیٹر۔ مصری بزم نشاط۔ رقص۔ دمشق۔ رملہ ہول۔ معاشرت مصر۔ مصری خاندان۔ مساجد مصر۔ مسجد حضرۃ عمرو بن عاص۔ جامع ازہر منارہ۔ درس جامع ازہر۔ مسجد قلاون۔ مسجد قائیت بے۔ مسجد حضرت دانیال۔ مقابر سلاطین مملوک۔ مقبرہ حضرۃ امام شافعی۔ قلعہ وغیرہ۔ قلعہ قائیت بے اسکندریہ۔ قلعہ سلطان صلاح الدین قاہرہ۔ دیار دامصار۔ شارع محمد علی اسکندریہ، قاہرہ۔ القنطرہ۔ پل نہر وغیرہ۔ پل دریائے نیل بند نیل۔ بند نیل قلیوب۔ نہر سوئیز۔ از سوئیز تا بند رسعید۔ نہر سوئیز پر جہاز رانی۔ آثار قدیمہ۔ اہرام مصر۔ زینہ اہرام۔ اہرام مصر۔ ابوالہول۔ شبیہ فرعون موسیٰ از مومیائی۔ تابوت سلطان توت انخ عمون۔ مناظر قدرت۔ بادیہ مصر از ساحل نیل۔ آثار اسلامیہ۔ مقیاس النیل قاہرہ۔ باب العذب قلعہ صلاح الدین۔ مجسمہ محمد علی پاشا۔ دیباچہ اقتدار برطانیہ۔ قتل اسکندریہ۔ بازار۔ شارع محمد علی۔ اسکندریہ۔ بازار قاہرہ۔ عدن۔ چوراہہ عدن۔ حوض شداد۔ سقہ مصری۔ مصری پنہارن۔

اس مکمل تحقیق کی کیا حد ہے کہ ان حالات کے لئے مؤلف کبھی صحرائے مصر کی گرمائی ہوئی وسعتوں خوفناک کھنڈرون تاریک قبرستانون، اور دور دراز دیہات اور جنگلوں میں رہ کر داد تحقیق دیتا ہے اور کبھی محلات شاہی، بازار اور تھیٹرون کے اون مظاہرون میں شریک ہوتا ہے جہاں علاوہ تاریخی آثار واثرات کے مصر کے موجودہ باشندون کی تہذیب اخلاق معاشرت۔ اور قومی خصائص کا جیتا جاگتا مطالعہ حاصل ہوتا ہے، اور یہ بھی تحقیق کی حد ہے کہ مؤلف اپنے ذوق کے خلاف مصری میلوں بازاروں ہوٹلوں اور رقص وسرود کی ان محافل میں شریک ہوتا ہے جن کی عمومیت مؤلف کے وقار ومتانت کے لئے ہر طرح گراں ہے مگر وہ ایک جلسہ رقص میں محض اس لئے شریک ہے کہ مصری اور ہندی موسیقی کے اصولی فرق کا چشم دید اندازہ مکمل ہو جائے اس جلسۂ رقص وسرود میں شریک ہو جانا تو اس قدر دلچسپ بات نہیں۔ لیکن اس جلسہ میں شریک ہو کر عوام مصر کے جذبۂ آزادی کو یوں معلوم کر لینا کس قدر قابل وقعت تحقیق ہے کہ

"جب مصری طوائف نے مصر کا قومی ترانہ گایا تو میں نے مجمع میں نوجوانوں بوڑھوں عورتوں اور خوانچہ فروشوں تک کو جوش اور فرط جوش سے از خود رفتہ پایا، اور مجمع کے بچوں تک کی زبان پر یہ فقرہ رواں تھا کہ"

"میں مصری آزادی کے لئے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں"،

دیکھئے اس بازاری جلسہ سے کس قدر کار آمد اور معنی آفریں بات تلاش کر لی، اور یہی رتبہ ہوا کرتا ہے کسی بلند نظر محقق کا

پھر اولوالعزم مؤلف نے تحقیق حالات کے سلسلہ میں مصر کا ایک ایک چپہ چھان مارا ہے گویا وہ خود مصر کے باشندے ہیں اسی لئے جس حصۂ ملک پر قلم اوٹھایا ہے اس جامعیت سے جس طرح کوئی دہلوی باشندہ اپنی دیرینہ سکونت کی بنا پر یہ بتا سکے کہ خواجہ حسن نظامی پیر صاحب کیسے بن گئے اور ان کے بھیا احسان کی دکان جامع دہلی کے پاس ہے۔

مصری آثار عتیقہ پر جو کچھ لکھا ہے وہاں حق تاریخ دانی و تاریخ نگاری ادا کر دیا ہے، کوئی کھنڈر کوئی عمارت، اور کوئی تاریخی واقعہ نہیں لکھا جب تک کہ اوس کی مکمل تاریخ نہ لکھدی، مصری فرمانروایان قدیم کے حالات میں ایک ایک بادشاہ کی تاریخ پیدایش سے لیکر تاریخ وفات تک کے جملہ حالات ہر بادشاہ کے ساتھ لکھدئے۔ مصر جدید میں خصوصیت سے دو چار چیزیں خاص تھیں۔ مثلاً خواتین مصر کی بیداری اور خواتین کی جد وجہد کا اثر مصری تاریخ پر، یا طلبہ کا مصری سیاسیات میں دخل وغلبہ، یہ ایسے موضوعات

ہیں جو مصر جدید کے ابواب تاریخ کو آج جگمگا رہے ہیں لہذا مؤلف نے ان حالات کی تحقیق میں جامعہ ازہر کی تحقیق کی اُس کے اُن دروس علمیہ و دینیہ میں بذات خاص شریک رہے جن کا صحیح طرز تعلیم ان طلبہ کو بیدار کر رہا ہے مصری خواتین کے حالات کے لئے وہ مصر کی نامور اور ذمہ دار خواتین سے بذات خاص حالات معلوم کرنے میں کامیاب رہے، عوام مصر اور خواص مصر کے حالات میں تعلیمی، سیاسی، تجارتی اور فکری تمدن سے لیکر دیہاتی معاشرت اور رسم ورواج تک کا مطالعہ لکھدیا بین الاقوامی مسائل اور اثرات پر اس قدر عالی تحقیق کی گویا دہ برسوں سے یورپی اقوام اور مصری تعلقات کے مطالعہ میں مصروف تھے اور کمال یہ کہ اُن مغربی کفن چوروں کے حالات اس قدر بے باکی جرأت اور دلیری سے لکھے کہ اگر اپنے پیسہ اخبار والے محبوب عالم صاحب سن لیں تو مارے خوف کے اُسی وقت کچھ ہو جائیں سب سے آخری بات یہ ہے کہ وہ تکمیل تحقیق کے لئے مصر میں اس طرح رہے یا اس قدر رہے کہ انھوں نے خود کو مصری باشندہ بنا لیا اور اسی لئے مصری خواص و عوام میں گھل مل جانے سے انہیں مصریوں کے محاسن کے ساتھ ہی اُن کے معائب اور کمزوریوں کے مطالعہ کا بھی موقع ہاتھ آگیا اور ان کے اخلاق و خواص کا جو تجربہ مؤلف نے ذاتی ذمہ داری پر قلمبند کیا وہی ان کی آخری تحقیق ہے، جس پر وہ ہزاروں ستائشوں کے مستحق ہیں پھر کمال دیانت یہ ہے کہ مصری لوگوں کے محاسن کے ساتھ ان معائب کو آزادی سے لکھ کر مؤلف نے خود کو غیر جانب دار محقق بھی ثابت کردیا جو باوصف کٹر مسلمان ہونے کے اُنہی کے ضبط نفس کا کام تھا اور اسی لئے یہ سفرنامہ ہر قوم وجماعت کے مطالعہ کے قابل ہو گیا۔



اس قدر حالات کے بعد فاضل مؤلف کی ذمہ داری کی وسعت یا کتاب کا علمی و تاریخی وقار یا اُس کی ادبی بلند پایئگی اور ہماری تنقید کا آزاد اصول چاہتا ہے کہ ہم چلتے چلتے اس معرکتہ الآرا کتاب پر دو چار اعتراضات بھی جڑ دیں اس سے دو چار فائدے ہیں، مثلاً پہلا فائدہ تو یہ کہ اس قدر عظیم القدر علمی کتاب پر اعتراض کرنے سے ہماری قابلیت کا اظہار بھی ہو جائیگا اور ہر شخص سمجھ جائے گا کہ ماشاء اللہ اپنے ملا رموزی صاحب بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ دوسرے اس بات کا بھی اعلان ہو جائے گا اور لوگ باگ آپس میں کہیں گے کہ

"دیکھو ملا رموزی صاحب سوائے گورنمنٹ آف انڈیا اور پولیس آف انڈیا کے کسی سے ڈرتے بھی نہیں اور نہ کسی کی بیجا خوشامد کرتے"

پس ان معقول وجوہ کی بناء پر موقع تھا کہ ہم کتاب پر اعتراضات کرتے لیکن بجز اس کے کچھ

نہیں کہ کاتب کتاب پر قیمت لکھنا بھول گیا اس لئے ہر خریدار کو پہلے مولف سے قیمت دریافت کرنا ضروری ہے لیکن ہم لکھے دیتے ہیں کہ اس کتاب کی قیمت (عہ) روپیہ ہیں پس اگر خدا اس بلند پایہ کتاب کی خریداری کی توفیق دے تو تمام ہندوستانی کتب خانے، لائبریریاں، ریڈنگ روم، بک ایجنسیاں، ڈیلر بک اسٹال، ایجنٹ اخبارات، مدارس، کالج، یونیورسٹیاں، دار العلوم، مساجد، علماء، مشائخ، ادبا، اطباء ایڈیٹر، لیڈر، حاکمان گورنمنٹ و حاکمان کانگریس، ارکان سائمن کمیشن، ارکان نہرو کمیٹی، صدر اسمبلی دہلی اور گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل تک اس کتاب کی خریداری کے وقت کارڈ پر یہ پتہ لکھ دینا چاہئیے کہ

بخدمت شریف میر دبیر حضرت مولوی قاضی ولی محمد صاحب بی اے سکریری روبکاری

بھوپال" دام اقبالہٗ۔

یہاں لفظ "دام اقبالہٗ" بھوپال سے نہیں بلکہ قاضی صاحب سے متعلق ہے زیادہ حد فقط

فکر عالیہ

از

مولوی سید ابو محمد ثاقب کانپوری

کہاں لیجاؤں امیدوں کی دنیا بزم امکاں سے
کہ قسمت کو شکایت ہے فراوانیٔ حرماں سے

ملا ہے وہ گداز عشق و ذوقِ دردِ جاں کاہی
فضائیں دم بخود ہیں سب مرے جذبات پنہاں سے

مری ہر سانس ہے ڈوبی ہوئی زہرابۂ دل میں
حذر اے چارہ گر اندیشہائے فکر درماں سے

ترا جلوہ تو بیشک جلوہ بار عام تھا لیکن
شکایت کر رہا ہوں خود میں اپنی چشم حیراں سے

میں صدقے جلوہ آرا تیرے ذوق خود نمائی کے
مرتب کر دیا ہستی کو اجزائے پریشاں سے

نہ چھیڑ اے مطرب وارفتہ میرے ساز عشرت کو
کہ دلچسپی نہیں مجھ کو سکونِ دل کے ساماں سے

میں وہ لذت شناسِ بیکسی ہوں گر مرا بس ہو
بدل لوں صبح عشرت کو میں اپنی شام ہجراں سے

ہر اک ذرہ ہماری وحشت پیمائی کا شاہد ہے
سنو گے داستانیں تم ہر اک خار بیاباں سے

ٹھہر کر دیکھتا جا، بیکسیٔ خانہ ویرانی
ارے او جانے والے شام کو گور غریباں سے

مجھے بربادیٔ ہستی کی کچھ پروا نہیں ثاقب
میں پھر ترتیب دوں گا دل کے اجزائے پریشاں سے

حسن کار

از

جناب منشی سدرشن

(مترجمہ جناب غلام رسول صاحب (سٹی کالج)

(۱)

کھٹ، کھٹ، کھٹ!

کسی نے نیچے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ٹھاکر سنگھ تصویر بنانے میں منہمک تھے۔ انہوں نے آواز نہیں سنی گجری نے آہستہ سے کہا "کوئی آیا ہے"

ٹھاکر سنگھ نے تصویر پر برش پھیرتے پھیرتے مسکرا کر جواب دیا "تو چلو، اڑکر اپنے گھونسلے میں چھپ جاؤ ورنہ کوئی دیکھ لے گا تو کہے گا جس کی عورت کے کپڑے بھی صاف نہیں۔ وہ تصویر کیا بناتا ہو گا؟"

گجری نے رنگ کے پیالے میں انگلی ڈبو کر اپنے حسن کار شوہر کی قمیص پر داغ لگا دیا۔ اور شوخی سے بولی "سنگھ جی! پہلے اپنے کپڑے تو دیکھ لو، پھر مجھے کچھ کہنے کی ہمت کرنا"

ٹھاکر سنگھ چونک کر پرے سرک گئے اور بولے۔ "ارے! میرا قمیص خراب کر دیا۔ کیسی پگلی ہے؟ باہر ملنے والے کھڑے ہیں۔ یہ اندر پھاگ کھیلتی ہے"

گجری نے رنگ سے بھری ہوئی انگلی ٹھاکر سنگھ کے منہ کے پاس لے جا کر کہا "سنگھ جی! خبردار! خبردار! تم بولے، اور میں نے تمہارا سارا منہ رنگ دیا!"

ٹھاکر سنگھ "میرا ہی منہ رنگنا جانتی ہو۔ یا کچھ اور بھی سیکھا ہے؟ اگر کسی تصویر کا چہرہ رنگ سکو تو چار پیسہ نہ کما لو"

گجری۔ "تم پھر بولو"

ٹھاکر سنگھ۔ (دب کر) "بہت اچھا جمعدار صاحب! آپ معاف کریں کیا مجال جو ایک بھی لفظ بول جاؤں۔ واہ وا!

بھئی عورت تو ہمیں ملی ہے۔ عورت بھی ہے۔ جمعدار بھی ہے۔

گجری۔ (مصنوعی غصہ سے) "تم پھر بولنے لگتا چپ رہو۔ کوئی لوگ آیا ہے"

ٹھاکر سنگھ گجری کی اس محبت آمیز سادگی پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ وہ اُسے اٹھا کر کلیجے میں بٹھا لینا چاہتے تھے جہاں اُسے دنیا کی گرم ہوا بھی نہ لگے۔ اتنے میں دروازے پر پھر کھٹکا ہوا۔ گجری نے دبے پاؤں جا کر زینہ کی زنجیر کھول دی، اور بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ٹھاکر سنگھ نے اونچی آواز سے کہا "چلے آئیو! دروازہ کھلا ہے"

اجنبی قیمتی پوشاک پہنا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ریاست کا عہدہ دار ہے شکل صورت سے رعب ٹپکتا تھا۔ اُس نے ٹھاکر سنگھ کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا "میں سردار ٹھاکر سنگھ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں"

ٹھاکر سنگھ کی آنکھیں جھک گئیں، خیال آیا میرے کپڑے اتنے صاف نہیں جتنے ہونے چاہئیں۔ انہیں ایسا معلوم ہوا، جیسے منہ پر مٹی لگی ہے۔ جیسے بازار میں جاتے جاتے کپڑا پھٹ گیا ہے۔ لیکن کیا ہو سکتا تھا؟ آہستہ سے بولے "فرمائیے! خادم حاضر ہے۔" یہ کہکر انھوں نے اجنبی کے بیٹھنے کو کرسی سامنے رکھ دی۔

اجنبی کرسی پر بیٹھ کر بولا "خوب! میں سمجھتا تھا آپ بوڑھے ہونگے۔ مگر میرا قیاس ٹھیک نہ نکلا۔ آپکی عمر تو بہت کم معلوم ہوتی ہے پچیس چھبیس سال سے زیادہ نہ ہوگی"

ٹھاکر سنگھ۔ "جی نہیں، میری عمر تیس سال کے لگ بھگ ہے۔"

اجنبی۔ "اس عمر میں بھی ایسی تصویر بنا لینا آپ ہی کا کام ہے۔ میں نے آپ کی کئی تصویریں دیکھی ہیں۔ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا وہ تصویر نہیں، جیتی جاگتی چیز ہے۔ کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ ابھی منہ کھول کر بولنے لگیں گی، ابھی چلنے لگیں گی۔ مجھے آپ سے ملنے کی آرزو تھی، آج چلا آیا۔"

ٹھاکر سنگھ "یہ آپ کی نوازش ہے۔ میں تو حسن کار کہلانے کا بھی مستحق نہیں ہوں۔ یہ بڑا بھاری علم ہے اس کا کنارہ کس نے پایا ہے۔"

اجنبی۔ (سنا ان سنا کر کے) "آپ کی تصویریں خوب بکتی ہوں گی ایسی اچھی چیز نہ بکے گی تو اور کیا بکیگی؟ مگر (کمرہ دیکھ کر) آپ نے مکان اچھا نہیں لیا۔ یہ آپ جیسے حسن کار کے لائق نہیں۔ جو دیکھے گا یہی کہے گا کہ نام بڑے اور درشن تھوڑے۔"

ٹھاکر سنگھ۔ "دیکھئے کوئی اچھی سی جگہ مل جائے۔ تو بدل لوں گا"

اجنبی۔ "مال پر چلیئے، مال پر، وہاں آپ کا کاروبار اور بھی چمک جائے گا۔ یہاں جو تصویر پچاس کو بکتی ہے وہاں سو سو کو بکے گی۔ موتی کو مخمل کے ٹکڑے پر رکھ دیا جائے، تو اس کی چمک نہیں بڑھتی، مگر قیمت بڑھ جاتی ہے۔ میرا خیال ہے مال پر چلکر آپ تھوڑے ہی عرصے میں کہیں سے کہیں پہنچ جائیں گے"

ٹھاکر سنگھ۔ "آپ جیسے حضرات کی قدردانی ہو جائے تو ایک مہینے میں سونے کا محل کھڑا کر لوں۔ مگر اندھی

دنیا پیسے کی قدر کرتی ہے حسن کاری کی نہیں۔ یہاں حسن کاری قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے۔"

اجنبی نے تعجب کی نظر سے نوجوان حسن کار کی طرف دیکھا اور کہا "جب تک کسی شوقین کی نظر نہ چڑھ جائے"۔

ٹھاکر سنگھ نے برش ہاتھ میں لیا اور تصویر کی طرف دیکھ کر بولا۔ "مگر شوقین لوگ دنیا میں کہاں؟ آب حیات کے مثل اس چیز کا بھی نام سنا ہے۔ اسے دیکھا نہیں ہے"

یہ الفاظ نہیں تھے، حسن کار کے دل کے گھاؤ تھے۔ اجنبی کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ ضرور یہ شخص بے رحم دنیا کا شکار ہے، یقینی اس کا دل دکھا ہوا ہے، ورنہ اسکے منہ سے یہ الفاظ کبھی نہ نکلتے۔ تھوڑی دیر کے بعد اجنبی نے کہا "میں ریاست سکندر کا دیوان ہوں۔ میرا نام ہربنس رائے ہے۔ مہاراج صاحب شوقین آدمی ہیں۔ تصویروں کا تو انھیں خبط ہے۔ انہیں خوش کرنا ہو تو کوئی بڑھیا تصویر ان کے نذر کردو پھر جو چاہو کرالو۔ ذرا انکار نہ کریں گے۔ دو مہینے کے بعد ان کی سالگرہ ہے۔ میں اس موقع پر انھیں ایک بہت ہی اعلےٰ درجہ کی تصویر نذر کرنا چاہتا ہوں۔ قیمت کی پروا نہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔ مگر تصویر ایسی ہو کہ ایک بار مہاراج پھڑک جائیں، کہیں یہ تصویر تجھے کیسے مل گئی۔ بس میں مہاراج کے ان چار لفظوں کا بھوکا ہوں"

ٹھاکر سنگھ کے دل میں امید کی گدگدی ہونے لگی۔ دیوان صاحب کی طرف دیکھ کر بولے "اپنی عمر میں مجھے پہلی بار ایسے معزز آدمی کے درشن ہوئے ہیں، جس کے پاس حسن کاری دیکھنے والی آنکھیں اور قدر کرنے والا دل ہے"

دیوان صاحب "بس! ایسی چیز بناؤ کہ مہاراج اچھل پڑیں"

ٹھاکر سنگھ۔ "اپنے منہ سے اپنی بڑائی کرنا اچھا نہیں لگتا۔ مگر میں آپ کو ایسی چیز دوں گا کہ آپ خوش ہو جائینگے"

دیوان صاحب۔ "آپ کی جو تصویریں اس وقت تک دیکھ چکا ہوں ان سے بڑھیا ہوگی نا؟"

ٹھاکر سنگھ۔ "اس کی فکر نہ کریں، راگی کو جب بچھر لگ جائے گا کہ اس کے سامنے راگ ودیا (علم موسیقی) کے ماہر بیٹھے ہیں اس وقت وہ معمولی چیز بھی نہیں گائے گا"

دیوان صاحب کھڑے ہو گئے اور بولے "تو آپ کب تک مجھے تصویر دے دیں گے؟"

ٹھاکر سنگھ بھی رخصت کرنے کھڑے ہو گئے اور دل میں حساب کر کے بولے "ایک مہینے سے کم مدت میں تو تیار نہ ہو سکے گی"

دیوار پر جلی حرفوں میں لکھا تھا "نصف رقم پیشگی" دیوان صاحب نے یہ شرط آتے ہی پڑھ لی تھی۔ ٹھاکر سنگھ دل میں سوچتے تھے ابھی بٹوا کھولتے ہیں۔ ابھی نوٹ نکالتے ہیں۔ دیکھیں کیا دیتے ہیں۔

امیر آدمی ہیں۔ روپیہ پیسہ کی کمی نہیں، اور کام اعلےٰ درجہ کا چاہتے ہیں۔ پانچ سات سو سے کم کیا دیں گے!
گردیوان صاحب اُٹھے اور پھر آنے کو کہکر نیچے اتر گئے۔ ٹھاکر سنگھ دیکھتے ہی رہ گئے اُمڈی ہوئی کالی گھٹا
دیکھ کر کسان کا دل ناچنے لگا تھا۔ اُسے کیسی خوشی ہوئی تھی۔ مگر ہوا کے جھونکوں نے گھٹا کو اڑا دیا۔
پانی کا ایک قطرہ بھی نہ برسا۔

(۴)

گجری اپنے کمرے کے اندر سے سب کچھ دیکھ رہی تھی دیوان صاحب کے جاتے ہی اسنے کمرے سے نکل کر زینہ کا
دروازہ بند کر دیا۔ اور جا کر پیار سے اپنے مایوس شوہر کا ہاتھ تھام لیا۔ ٹھاکر سنگھ کی آنکھیں تر ہو گئی تھیں گویا
ہاتھ آیا ہوا مال نکل گیا ہو۔ گجری نے ہمدردآمیز لہجہ میں کہا "تم فضول اپنا جی چھوٹا کرتے ہو اس وقت
روپیہ نہیں ملا۔ نہ سہی۔ گھبرانے کی کیا بات ہے۔ مجھے تو ذرا بھی دکھ نہیں ہوا۔ الٹی خوشی ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ
یہ آدمی ہمارا سچا خیر خواہ ہے۔ میرے دل میں کوئی کہہ رہا ہے کہ اس سے ہمیں فائدہ پہنچے گا۔ اُسے کیا معلوم کہ یہ پورے
کنگال ہیں، ان کے پاس پیسہ بھی نہیں۔ یہ مکان، یہ اسباب یہ بجلی دیکھ کر کسی کو یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا"

ٹھاکر سنگھ نے گجری کی طرف اس طرح دیکھا جیسا کوئی مجرم منصف کی طرف دیکھتا ہے۔ اور ٹھنڈی سانس
بھر کر جواب دیا "آج کروا چوتھ ہے تم نے سہاگ کا برت رکھا ہے۔ اور ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں لوگ
خوشیاں منا رہے ہیں اور ہم بیٹھے قسمت کو رو رہے ہیں۔"

گجری۔ "مگر یہ اپنا اپنا نصیبہ ہے۔ جو قسمت میں لکھا ہے اُسے کون مٹا سکتا ہے۔ باقی رہی کروا چوتھ کے برت کی بات
اس کی فکر نہ کرو۔ کہیں سے آجائے گا کھالیں گے۔ نہ آئے گا بھوکے سو رہیں گے۔"

ٹھاکر سنگھ۔ "اور نوکر کو کیا کھلائیں گے؟ وہ بچہ ہی سمجھتا بھی نہیں کہ ہاتھ تنگ ہے۔ چپ بنا رہوں ہماری بھی کیا
شان ہے۔ اپنے کھانے کو روٹی نہیں۔ نوکر سو بنا ہی ہوا ہے۔"

گجری۔ "اُس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ تم اپنا دل خراب نہ کرو۔ ورنہ بیمار ہو جاؤ گے۔"

ٹھاکر سنگھ کو بیوی کی ان سے باتوں سے تسلی ہوئی۔ وہ سمجھتے تھے کہ دیوان صاحب جاتے ہی گجری
انھیں گالیاں دینے لگے گی، تقدیر کو کوسنے لگیگی۔ مگر شوہر کو اداس دیکھ کر وہ اُمید و توکل کی دیوی بن گئی
جو کبھی مایوس نہیں ہوتی ٹھاکر سنگھ نے اسے متوکل دیکھ کر کہا "جی چاہتا ہے ان تصویروں کو آگ لگا کر
کہیں نکل جاؤں۔ کام کرانے کو سبھی ہیں پیسے دیتے وقت دم نکلتا ہے۔ کبھی کہتے ہیں کل آؤ، کبھی کہتے
ہیں پرسوں دیں گے۔"

گجری "یہی تو خرابی ہے۔ ورنہ ہمیں ذرا بھی تکلیف نہ ہو۔ دیکھو گنگو آیا ہے۔ کچھ لاتا ہے۔ یا سب پھر آنے کو کہتے ہیں"
ٹھاکر سنگھ "مجھے خوف ہے آج کوئی بھی نہیں دے گا۔"

گجری۔ "واہ خدا پر بھروسہ رکھو (تصویر کی طرف اشارہ کرکے) یہ تصویر کس کی ہے؟"

ٹھاکر سنگھ۔ "ایڈیٹر شوکت ہند کی ہے!"

گجری۔ کیسا آدمی ہے؟"

ٹھاکر سنگھ۔ بہت شریف آدمی ہے!"

گجری۔ "پیسہ والا بھی ہے یا ہمارے جیسا ہے؟"

ٹھاکر سنگھ۔ "آدمی تو خاندانی ہے۔ آگے ہماری قسمت!"

گجری۔ "تصویر بنا کر لے جاؤ۔ تو پیسے دے دے یا نہیں؟"

ٹھاکر سنگھ۔ "اب میں کسی کے دل کا حال کیا جانوں، ہاں اُمید ہے دے دیگا"

گجری۔ "تو اسے ختم کیوں نہیں کرتے؟ کتنے روپیہ مل جائیں گے؟"

ٹھاکر سنگھ۔ "میں نے تیس مانگے تھے۔ اُس نے بیس سنائے پچیس پر فیصلہ ہو جائے گا۔" گجری کے چہرہ پر امید کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ہنس کر بولی جلدی ختم کرو، ورنہ جمعدار خفا ہو جائیگا، اب وہ پھر وہی ہنس مکھ، وہی پروا گجری تھی جو بھوک کی پرکو بھی ہنستی تھی۔

ٹھاکر سنگھ تصویر بنانے لگے۔ کل رات سے کچھ کھایا نہیں تھا۔ صبح بھوک معلوم ہوئی تھی مگر اس وقت پیاس بھی نہیں تھی۔ انہیں جسم میں ایک نئی تحریک محسوس ہوتی تھی۔ کبھی یہ رنگ گھولتے کبھی وہ۔ اور تصویر بناتے جاتے تھے۔ ان کا ہاتھ آج کیسا تیز چلتا تھا۔ دل کام میں ایسا لگا ہوا تھا جیسے دوستوں میں بیٹھے شطرنج کھیل رہے ہیں۔ اتنی ایک دلی ان میں کبھی نہ تھی۔ یہاں تک کہ پانچ بج گئے۔ اور انھوں نے سر نہ اٹھایا۔ دفتروں کے اہلکاروں کو چھٹی ہو گئی۔ پرندے بھی اپنا بسیرا لینے لگے۔ گائیں اور بھینسیں بھی اپنے گھروں کو آگئیں۔ مگر ٹھاکر سنگھ کو آرام کہاں؟ وہ ابھی تک اسی لگن سے تصویر بنانے میں لگے تھے آس میں کتنی زندگی ہے کتنی بیداری اور کتنا زور ہے۔ یوں کہنے کو تو ایک کچا دھاگا ہی۔ مگر اسی کچے دھاگے میں وقت آنے پر کیسی قوت آجاتی ہے۔ اتنے میں گنگو آگیا۔ میاں بیوی کا دل دھڑکنے لگا۔ کچھ لایا ہے۔ یا نہیں؟ ایک میٹھا بول سن کر دونوں کے دل باغ باغ ہو جائینگے۔ اگر وہ خالی لوٹا ہو تو؟ آدمی کتنا محتاج کیسا دوسروں کے بس میں ہے۔ ٹھاکر سنگھ اُس سے پوچھتے بھی ڈرتے تھے۔ مگر بیوی عورت ہونے پر بھی ہمت نہیں ہارتی۔ اُس نے گنگو سے کہا "تو نے سارا دن باہر گنوایا۔ بول کچھ کام بھی کیا یا نہیں" گنگو نے جواب دیا۔ کہیں سے بھی نہیں ملا" ٹھاکر سنگھ کے دل میں جیسے کسی نے چھرا بھونک دیا تلملا کر بولے "اچھا تو کارخانہ والوں نے کیا کہا؟" گنگو نے کہا کہ سردار صاحب اُنکے باہر گئے ہیں آئینگے تو بھجوا دینگے"

ٹھاکر سنگھ "اور لندن واچ کمپنی والے؟"

گنگو۔ "بولے آج بکری نہیں ہوئی کل آنا"

ٹھاکر سنگھ۔ "اور رائے صاحب ہو تو رام؟"

گنگو۔ "وہ ابھی کراچی سے نہیں آئے"

ٹھاکر سنگھ۔ (غصہ سے) "اور تو اب تک کہاں مر گیا تھا۔ پہلے چلا آتا تو کہیں اور ہی بھیج دیتا اب میں کیا کروں"

گنگو نے سہم کر جواب دیا۔ "میاں یعقوب کی طرف گیا تھا۔ انہوں بٹھا لیا کہ ابھی منی آرڈر آتے ہیں تو لے کر جانا۔ وہیں بیٹھا رہا۔ آخر اٹھ آیا وہ تو اب بھی نہ آنے دیتے تھے کہتے تھے ذرا اور ٹھہرو شاید کوئی دینے والا ہی آجائے"

گجری رونے لگی، شام ہو چلی تھی، سہاگن عورتیں اپنے اپنے تھال میں مٹھائی بادام اور گھی کے چراغ رکھ سہاگن رانی کی کتھا سننے جارہی تھیں۔ اس وقت ان کے چہرے کیسے بشاش تھے۔ آنکھیں کیسی چمکدار تھیں آج انہوں نے سہاگ کا برت رکھا تھا۔ آج شوہر کی منگل کامنا کرنے کے لئے جارہی تھیں۔ مگر گجری کیا کرے؟ اس کی جان پنجرے میں پھنسی ہوئی پرندوں کے مانند پھڑپھڑا رہی تھی مگر اڑنے کی طاقت نہیں تھی اس نے ٹھنڈی آہ بھری اور چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ اتنے میں اس کی پڑوسن نے ساتھ چھجے سے پکار کر کہا۔ "کیوں بہن گجری کتھا سننے چلو گی؟" گجری پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جیسے کسی نے پکا ہوا پھوڑا پھوڑ دیا ہو وہ کیسی بدبخت ہے جو سہاگ برت کے دن سہاگ کتھا بھی نہیں سن سکتی مگر پڑوسن پر اپنی بے بسی ظاہر کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ آواز سنبھال کر بولی "بہن جی! میں تو سن آئی"، پڑوسن چلی گئی۔ گجری پھر اداس ہو گئی۔ اسے بے رحم امیروں پر رہ رہ کر غصہ آتا تھا۔ جو غریب مزدوروں سے کام کرا لیتے ہیں۔ پیسے وقت پر نہیں دیتے اس وقت وہ چندریکا دیوی ہو رہی تھی۔ اگر کوئی امیر آدمی اسکے سامنے آجاتا تو اس کا خون پانی ایک کر دیتی وہ سوچتی تھی سب نے انکار کر دیا۔ کسی نے یہ بھی نہ سوچا کہ چلو دے دو۔ تیوہار کا دن ہے۔ اسے بھی ضرورت ہوگی۔ ایسے ہی پانی کے سبب بارش نہیں ہوتی۔ اس لئے تو قحط پڑتے رہتے ہیں۔ آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ گجری اسی طرح بیٹھی رہی۔ اس کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ مگر اس نے بتی نہیں جلائی۔ یہ باہر کا اندھیرا اس کے دل کے اندھیرے کے سامنے کتنا ہیچ تھا۔ اتنے میں گنگو نے آکر کہا۔ "بی بی جی! کچھ کھانے کو ہے، یا نہیں۔ بڑی بھوک لگی ہے"۔

بات معمولی تھی، لیکن گجری کے بدن میں آگ لگ گئی جیسے سوکھی بارود گرد سے بھی جل اٹھتی ہے۔ گرج کر بولی۔ "تو آدمی ہے یا گدھا؟ دیکھتا نہیں، کہیں سے بھی پیسے نہیں ملے۔ مروت تو ان لوگوں کو چھو بھی نہیں گئی۔ مالک مرے یا جئے۔ ان کی بلا سے۔ انہیں اپنے کام سے کام ہے"

گنگو کھانے کے بدلے گالیاں کھا کر چپ ہو کر جا بیٹھا۔ وہ اپنی حماقت پر پشیماں ہو رہا تھا تھوڑی دیر بعد گجری ہمت کر کے اٹھی۔ اور پڑوسن کو بلا کر بولی۔ "بہن ذرا ایک چار آنہ کے پیسے دینا وہ باہر گئے ہیں۔ میرے

پاس دس روپیہ کا نوٹ ہے ابھی لوٹا دونگی،، مگر اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا کہ اگر اس نے بھی نہ دیا تو کیا عزت رہ جائیگی۔ مگر پڑوسن نے چوّنی دے دی۔ گجری کو ایسا معلوم ہوا جیسے یہ چوّنی نہیں چار سو روپیہ ہے گویا وہ ڈوبتے ڈوبتے بچ گئی ہے۔ چوّنی لے کر بھاگی بھاگی اوپر چڑھ گئی اور گنگو سے بولی "جا۔ جا کر دو آنے کے چاول لے آ ایک آنے کا دودھ، ایک آنہ کی شکر۔ مگر جلدی آنا۔ تیری عادت ہے جہاں چار آدمی دیکھے وہیں کھڑے ہو گیا" گنگو نے چوّنی لی اور نیچے اتر گیا۔ ادھر گجری نے جلدی جلدی آگ جلائی اور گنگو کا انتظار کرنے لگی۔ مگر آدھا گھنٹہ گذر گیا اور گنگو نہ آیا۔ آخر کہاں چلا گیا؟ اتنی دیر کہاں لگ گئی؟ بنیئے کی دکان تو دور نہیں تین چار منٹ کا رستہ ہے ضرور کہیں کھڑا ہو گیا ہو گا۔ اتنا بھی خیال نہیں کہ آج تیوہار کا دن ہے۔ سردار صاحب آتے ہیں تو کبھی میوں میں باز آئی ایسے نوکر سے اسے جواب دو۔ اسے تو اچھے اور برے وقت کا بھی خیال نہیں۔ یہاں آگ لگ رہی ہے وہ وہاں کہیں کھڑا وقت ضائع کر رہا ہو گا۔ مگر آدھا گھنٹہ اور گذر گیا۔ اور گنگو بھی نہ آیا۔ اب گجری کے غصہ نے تفکر اختیار کر لیا سوچنے لگی، کہیں کسی گاڑی تلے نہ آگیا ہو۔ آنکھیں بند کر کے چلتا ہے سامنے تو دیکھتا نہیں۔ گجری کا دل دہل گیا۔ گویا گنگو سچ مچ گاڑی تلے کچلا گیا ہے۔ اتنے میں گنگو سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور سسک سسک کر رونے لگا۔ گجری نے گھبرا کر پوچھا "بول، کیا ہوا؟" گنگو نے ہاتھ باندھ کر روتے روتے جواب دیا۔ "چوّنی کہیں گر گئی" گجری نے ٹھنڈی سانس بھری اور مایوسی سے پریشان ہو کر وہیں بیٹھ گئی۔ اُس کے منہ سے ایک بھی لفظ نہ نکلا اندھیری رات میں مسافر کو ایک چھوٹی سی پگ ڈنڈی ملی تھی۔ کتنی محنت، کتنی مصیبت کے بعد، دیکھتے دیکھتے وہ بھی جھاڑیوں میں گم ہو گئی۔ اب مسافر کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ روشنی کہیں بھی نہیں تھی۔

(۳)

اُدھر ٹھاکر سنگھ تصویر لے کر شوکت ہند کے دفتر میں پہنچے۔ اور ایڈیٹر سے بولے "لیجئے جناب! تصویر تیار ہو گئی"

ایڈیٹر صاحب نے تصویر کو اُچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ اور بے پروائی سے میز کے کونے کی طرف اشارہ کر کے کہا "رکھ دیجئے،، اور یہ قدر تھی اُس چیز کی۔ جسے حسن کار نے بھوکا رہ کر بنایا تھا جس میں اس نے اپنا دل لگایا تھا جس پر اس نے اپنی جان چھڑکی تھی۔ کیا اس کے لئے اس سنگدل اندھے معاملہ والے کے پاس تعریف کے دو لفظ بھی نہ تھے۔ صرف دو لفظوں سے ان کی تسکین ہو جاتی وہ اپنی تھکاوٹ کو بھول جاتا۔ سمجھتے کہ دنیا ابھی قدر والوں سے خالی نہیں ہو گئی۔ روپیہ نہیں دیتے تعریف تو کرتے ہیں۔ اہل کمال کے لئے یہی بہت ہے مگر یہاں وہ بھی نہ تھا۔ ٹھاکر سنگھ کے جی میں آیا کہ تصویر اُٹھا لوں اور کہوں جناب میں تصویر آپ کے ہاتھ نہ بیچوں گا۔ اگر آپ کو میری حسن کاری کی پروا نہیں۔ تو مجھے بھی آپ کے پیسے کی ضرورت نہیں۔ مگر جھٹ گھر کا اور گھر کی پریشان کن حالت کا خیال آ گیا۔ غریبی نے آن کا گلا گھونٹ دیا۔ تصویر کو ہاتھ میں لیکر "لیجئے ذرا دیکھ تو لیجئے"

ایڈیٹر: "کل دیکھونگا اس وقت رہنے دیجئے"

ٹھاکر سنگھ: "بہت اعلیٰ درجہ کی ہے آپ خوش ہو جائیں گے"

ایڈیٹر: "یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں آپ جس چیز کو ہاتھ لگائیں گے وہ خوبصورت بن جائیگی خوبصورتی تو آپکے ہاتھ کا میل ہے"

ٹھاکر سنگھ: (شرما کر) "آپ تو مجھے بناتے ہیں"

ایڈیٹر: "جی نہیں، میرا سچ مچ یہی خیال ہے"

ٹھاکر سنگھ: "اس پر پورے تین دن لگے ہیں"

ایڈیٹر: "آپ چاہتے تو ایک دن میں بنا لیتے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے آپ ڈٹ کر بیٹھ جاتے تو تین چار گھنٹوں سے زیادہ کا کام نہ تھا"

ٹھاکر سنگھ: "جی نہیں اچھی چیز کافی وقت صرف کئے بغیر عمدہ نہیں بنتی"

ایڈیٹر: "ارے! آپ تو شاعری بھی شروع کرنے لگے"

ٹھاکر سنگھ: (مسکرا کر) آپ کی نظر عنایت ہو جائے تو شاعری بھی کرنے لگوں گا۔ اب اجازت دیجئے اندھیرا ہو رہا ہے۔"

ایڈیٹر: "بہت اچھا! پھر کسی دن آئیے گا۔ ایک اور بھی تصویریں بنوانی ہیں"

ٹھاکر سنگھ: "کہئے کل ہی آجاؤں (تکلف سے) اور اس تصویر کے روپئے؟"

ایڈیٹر: (سن کر) "اتنی جلدی؟"

ٹھاکر سنگھ: "بہت ضرورت ہے"

ایڈیٹر: "تو دو چار دن میں مل جائیں گے"

ٹھاکر سنگھ: "نا صاحب! ایسا ظلم نہ کیجئے گا۔ بڑی آس لے کر آیا ہوں ابھی دلوا دیجئے"

ایڈیٹر: (کرسی سے اٹھتے ہوئے) "دو چار دن سے پہلے تو کسی حالت میں نہ دے سکوں گا"

ٹھاکر سنگھ: "بڑی ضرورت تھی، پانچ روپیہ ہی دے دیں"

ایڈیٹر: (مسکرا کر) "اس وقت تو پانچ پیسے مانگو وہ بھی نہ ملیں گے"

ٹھاکر سنگھ: "آپ نے تو کہا تھا تصویر بنا کر لاؤ۔ روپئے اسی وقت مل جائیں گے"

ایڈیٹر: "معلوم ہوتا ہے آپ ہمیں چور سمجھ رہے ہیں جو آپ کی تصویر لے کر بھاگ جائیں گے۔ یہاں چھ چھ مہینے گذر جاتے ہیں کوئی تنگ و دو بھی نہیں کرتا"

ٹھاکر سنگھ: "ان کے پاس کھانے کو ہوگا۔ تقاضہ نہ کرتے ہوں گے۔ ہم مزدور آدمی ہیں جو کماتے ہیں وہی کھاتے ہیں"

ایڈیٹر۔ "آپ تو نیچے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئے۔ ایک بار کہہ دیا اس وقت نہیں ہیں معاف کرو۔ مگر جناب اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔"

اب ٹھاکر سنگھ بھی تیز ہو گئے۔ بولے "اگر آپ کے پاس روپیہ نہ تھے تو آپ نے کام کیوں کرایا؟ میں یوں ہی تو نہ ہوتا ناموں" ایڈیٹر صاحب سناٹے میں آ گئے۔ سوچنے لگے یہ آدمی کتنا کمینہ ہے۔ مگر عزت اور بے عزتی کا ذرا بھی خیال نہیں۔ تھوڑی دیر بعد بولے "اپنی تصویر اٹھا کر لے جائیے مجھے اسکی ضرورت نہیں۔"

ٹھاکر سنگھ۔ (تعجب سے) "آپ نے کام کر بنوایا ہے۔"

ایڈیٹر۔ "مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ ایسی خراب چیز بنالائیں گے! اس سے اچھی تصویر تو اسکول کے لڑکے بھی بنا سکتے ہیں۔ اور یہ بھی کسی لڑکے ہی کی بنائی ہوئی ہے۔ آپ کی نہیں۔ چلیں ہیں ہمیں چکمہ دینے لیکن ہم بھی جناب ہاتھ پہچانتے ہیں، ہا ہا!"

ٹھاکر سنگھ۔ "مگر تصویر تو آپ نے ابھی دیکھی ہی نہیں۔"

ایڈیٹر۔ "آتے ہی دیکھ لیا مجھے ذرا بھی پسند نہیں۔ اخبار میں شائع کر دوں تو لوگ کہیں ایڈیٹر پاگل ہو گیا ہے۔"

ٹھاکر سنگھ کا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ تصویر لیکر چپ چاپ باہر نکل آئے پچھتا رہے تھے کہ فضول بات بڑھائی۔ روپئے آج نہ ملتے دو دن بعد مل جاتے۔ اب وہ بھی گئے۔ تصویر اُن کی ہے۔ دوسرا کوئی اس کے لئے پیسہ بھی نہ دیگا۔ وہ چاہتے تھے ایڈیٹر پاس بلا کر تصویر مانگ لیں۔ تو چپ چاپ دیدیں۔ چوں بھی نہ کریں لیکن وہ دور چلے آئے اور انہیں کسی نے بھی نہ بلایا۔ اب چاروں طرف اندھیرا تھا۔ کیا کریں کیا نہ کریں۔ بہت سوچتے تھے۔ مگر انہیں کوئی آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جو اس مصیبت کے وقت ان کی امداد کرے۔ انہیں گھر جاتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ گجری کو کیا منہ دکھائیں گے"

آج کرواچوتھ کا برت ہے۔ عورتیں چاند کو دیکھ کر مٹھائی اور پھل کھائیں گی۔ ہمارے گھر آ ابھی نہیں بد قسمتی تو دیکھو گھر میں سوائے لکڑیوں کے اور کوئی بھی چیز نہیں بچی۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ ٹھاکر سنگھ شہر سے باہر نکل گئے اور ریت میں بیٹھ کر سوچ بچار میں غرق ہو گئے۔ کبھی سوچتے راوی میں ڈوب مریں، ایسی زندگی سے تو موت ہی بھلی۔ کبھی خیال آتا، سادھو ہو جائیں۔ گجری کو اس کا باپ لے جائیگا۔ چار دن یاد کر کے روئیگی پھر بھول جائے گی۔ مگر ان میں اتنا تحمل بھی نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اُٹھے۔ اور شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ جیسے کوئی فقیر بھیک مانگنے جا رہا ہو۔ پہلے آہستہ آہستہ چلے پھر تیز ہو گئے۔ اُمید کے قریب پہنچ کر ہم بے قرار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا صبر و شکیب ہوا ہو جاتا ہے۔ اب انہیں ایک دوست کا خیال آ گیا تھا۔ شاید وہ دو چار روپیے دیدے۔

(۴)

رات کے ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا کرواچوتھ کا چاند طلوع ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ ہر مکان پر عورتیں

کھڑی تھیں اور آسمان کی طرف دیکھتی تھیں کہ چاند نکلا ہے یا نہیں۔ جو چھوٹی لڑکیاں بھوک سے بے چین ہو رہی تھیں وہ کہتی تھیں چاند کو بھی آج ہی بیر لینا تھا۔ پہلے تو اتنی دیر کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جو سیانی تھیں وہ کہتی تھیں ذرا اور صبر کرو مگر گجری اپنے اندھیرے کمرے میں اوندھے منہ لیٹی تھی۔ وہ چاند کا کیا انتظار کرتی غریب کے پاس ادھریے دینے کے لئے کچی لسی بھی نہ تھی۔ نہ برت کھولنے کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا تھا۔ مایوس ہو کر لیٹی تھی اور اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔ اتنے میں ٹھاکر سنگھ نے آکر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اور پیار سے کہا "اٹھو! چاند نکل آیا ہے چل کر ادھریے دے لو۔ لسی اور گنڈیریاں نہیں ہیں ٹھنڈا پانی تو ہے۔ دیوتا لوگ کچھ کھاتے پیتے تھوڑے ہی ہیں! عقیدہ دیکھتے ہیں اور اس کی تمہارے پاس کمی نہیں"

گجری چپ چاپ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ تصویر کے دام ملے یا نہیں۔ سمجھ گئی نہ ملے ہونگے ملے ہوتے تو ناچتے ہوئے آتے۔ وہ بے دلی کے ساتھ شوہر کے ساتھ اوپر چلی گئی اور نل سے ہاتھ منہ دھو کر بولی "پوتر جل (اچھوتا پانی) کا ایک لوٹا منگوا دو تو ادھریے دے لوں"

ٹھاکر سنگھ "وہ دیکھو چوکی پر دھرا ہے۔ اٹھا لو"

گجری نے جا کر لوٹے میں لسی دیکھی تو اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اس میں جان سی پڑ گئی جیسے کڑی دھوپ میں چلتے ہوئے کسی ادھ موئے مسافر کو راستہ کی ٹھنڈی چھاؤں مل جائے۔ تنک کر بولی "تم نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔ پہلے کیوں نہ کہا کہ سب کچھ لے آیا ہوں۔ یہ تو بہت کچھ ہے"

ٹھاکر سنگھ "پہلے چندرما کو ادھریے دے لو پھر باتیں کریں گے"

گجری "کیسے چھوٹے آدمی ہیں کہتے تھے پانی ہی سے ادھریے دے لو"

ٹھاکر سنگھ "مگر اب تو چاول اور گنڈیریاں بھی ہیں"

گجری نے لسی، چاول اور گنڈیریوں سے چندرما کو ادھریے دیا اور ہاتھ باندھ کر شوہر کی درازی عمر کے لئے دعا کی اس وقت اسے چاند مسکراتا ہوا دکھائی دیا جیسے مبارکباد دے رہا ہو۔ اسے کہہ رہا ہو فضول گھبراتی تھی اب کہو! گجری کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ہوا میں تیر رہی ہے۔ اس کے منہ سے ہنسی پھوٹ پھوٹ کر نکلتی تھی۔ گجری روکتی تھی مگر ہنسی رکتی نہ تھی وہ اٹھلاتی ہوئی شوہر کے پاس آئی اور پاس بیٹھ کر بولی "کیا کچھ لائے دیکھوں"

ٹھاکر سنگھ نے بنگالی مٹھائی کی ٹوکری سامنے رکھ کر کہا "نمبر ایک" گجری نے مٹھائی دیکھی تو منہ میں پانی بھر آیا۔ مگر شانتی سے بولی "اتنی کیوں لے آئے؟ دو روپئے سے کم کی نہ ہو گی"

ٹھاکر سنگھ "روپیہ کی تو میں ہی کھا جاتا شاید اس سے بھی زیادہ کھا جاؤں۔ کل سے بھوکا ہوں اور کیا! دیکھنا کیسے بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارتا ہوں صرف اجازت ملنے کی دیر ہے"

گجری (مسکرا کر) "اور کیا لائے؟" ٹھاکر سنگھ پھلوں کی ٹوکری سے کاغذ اٹھا کر کہا "نمبر دو" کچھ سیب تھے، کچھ انار

آدھا سیر انگور اور ایک سروہ گجری کا دل کھل گیا جیسے پودے کو پانی مل جائے۔ بولی "اب معلوم ہوا آج گرد اپوتھ کا برت ہے۔"

ٹھاکر سنگھ نے جیب سے ایک بنڈل نکال کر کھولا۔ اس میں ایک ریشمی ساڑی تھی گجری کی آنکھیں چمکنے لگیں ٹھاکر سنگھ نے کہا۔ "بھرتین" گجری نے اپنا سر شوہر کے کندھے پر رکھدیا اور آنکھیں موندلیں۔ خوشی اتنی تھی کہ سینے سے بھی نہ نکلتی تھی۔ سارے دن کی تھکن دیکھتے دیکھتے دور ہو گئی ٹھاکر سنگھ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "اب بھی خوش ہوئی یا نہیں"

گجری نے "زبان سے کیا کہوں میرا منہ دیکھ لو" یہ کہہ کر گجری نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اور مسکرانے لگی۔ ٹھاکر سنگھ گجری کا منہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور کہا "اب ہمارا بھی چندرما (چاند) نکلا" مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ مجھ سے باتیں کر رہا ہے" گجری "(شرارت سے) وہ کہتا ہے تجھے دیکھو" ٹھاکر سنگھ "نہیں کہتا ہے مجھے ادھرے دو" یہ کہتے کہتے ٹھاکر سنگھ نے ایک رس گلا اٹھا کر گجری کے منہ میں دیدیا۔ وہ "نانا" کرتی ہی رہی مگر ٹھاکر سنگھ نے ایک نہ سنی۔ کہا "تم نے اپنے چندرما کو ادھرے دیا ہے یا نہیں۔ ہم اپنے چندرما کو ادھرے دئے بغیر کیسے کھائیں" گجری بھی ایک رس گلا شوہر کے منہ میں دے دیا۔ میاں بیوی دو نو کھانے لگے۔ اتنے میں گنگو نے آکر کہا۔ "میاں یعقوب کا آدمی بیس روپیہ دے گیا ہے" ٹھاکر سنگھ کا چہرہ اور بھی چمکنے لگا۔ گجری نے گنگو سے روپیہ لے لئے۔ اور شوہر کی طرف دیکھ کر کہا "پہلے مل جاتے تو اتنی تکلیف نہ ہوتی"

ٹھاکر سنگھ۔ "اس حالت میں یہ پھل ایسے میٹھے کبھی نہ لگتے"

یکایک کسی نے نیچے دروازہ کھٹکٹایا "کون ہے؟ ذرا نیچے آئیے"

گجری نے سنبھال کر کہا "اس وقت کون آگیا۔ بیٹھے رہو۔ گنگو خبر لے آتا ہے"

ٹھاکر سنگھ۔ (ہنس کر) "گھبراتی کاہے کو ہو۔ میں نیچے جارہا ہوں دلی نہیں جارہا ہوں۔ ابھی آیا۔

گجری۔ "اس وقت ایک منٹ بھی گھنٹے سے کم نہیں"

ٹھاکر سنگھ نیچے گئے اور تھوڑی دیر بعد لوٹے تو چہرہ پر عجیب چمک تھی۔ گجری نے پوچھا "کون تھا؟"

ٹھاکر سنگھ "دیوان ہرجس رائے کا آدمی تھا"

گجری۔ کون ہرجس رائے؟ وہی تو نہیں جو دوپہر کو آیا تھا؟

ٹھاکر سنگھ۔ "بس بس وہی! اسی نے تصویر کے لئے پیشگی روپیہ بھیجا ہے"

گجری کے دل میں گدگدی ہونے لگی، جلدی سے ٹھاکر سنگھ کے پاس آکر بولی "کتنا روپیہ؟" ٹھاکر سنگھ نے ایک ایک لفظ پر رک رک کر کہا "اڑھائی سو روپیہ" گجری کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ بولی جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو"

ٹھاکر سنگھ۔ "جھوٹ بولوں گا تو میرا جمعدار ناراض نہ ہو جائیگا۔ یہ تمہارا چیک رہا۔"

یہ کہہ کر ٹھاکر سنگھ نے چیک گجری کے ہاتھ میں دے دیا۔ گجری چیک اور ریشمی ساڑی لیکر جلدی جلدی نیچے اتر گئی۔

(دوشالہ بھارت)

آمد شاہ

از جناب مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب اے۔ آر۔ سی۔ ایس (لندن)
بی۔ ایس۔ سی آنرز (لندن) فیلو آف دی فزیکل سوسائٹی (لندن)
(صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ)

صدر صاحب نے یہ نظم حضرت اقدس و اعلیٰ کی مراجعت دہلی کے موقع پر فارسی کے اولین اور مشہور شاعر رودکی کے "موسے جولیاں" والے قصیدہ پر لکھی تھی۔ جو "مکتبہ" میں شائع کرنے کی غرض سے عنایت کی گئی ہے۔ صدر صاحب کو فارسی قدیم سے خاص شغف ہے۔ جس کا ایک مظہر یہ نظم ہے اپنے علم نواز اور ہر دلعزیز بادشاہ کے متعلق ایک علمی ادارے کے صدر کے یہ مخلصانہ جذبات قابل تحسین ہیں۔
(مجلۂ مکتبہ)

قم مسیحائے زماں آید ہمے　　　در تن فرسودہ جاں آید ہمے
میر عثماں علی شاہ دکن　　　خرم از ہندوستاں آید ہمے
اے دکن آسودہ زی آباد باش　　　شاہ پشتیت شادماں آید ہمے
بر اولو العزمی و عالی ہمتش　　　مرحبا از آسماں آید ہمے
خلق در وجد است و جشن اندر جہاں　　　شاہ عثماں کامراں آید ہمے
رود موسیٰ از فروغ شمعہا　　　جلوہ گر چوں کہکشاں آید ہمے
شاہ شمس و حیدرآباد آسماں　　　شمس سوئے آسماں آید ہمے
حیدرآباد است باغ عدل و داد　　　شاہ چوں نوشیرواں آید ہمے

از در و دیوار برخیزد صدا
باز در دل دلستاں آید ہمے

عمل



انہ

جناب نواب ضیاء یار جنگ بہادر۔ سابق رکن عدالت العالیہ

کراست فرصت گلگشت در دیار عمل　　بیا کہ فاتحہ خوانیم بر مزار عمل
ز چشم سازی دہقان روزگار چہ شود　　کہ نیست قطرہ آبے بجو ئبار عمل
زدامگاہ نفاق آگہ ہست پنداری　　کہ رمز سایہ خود می کند شکار عمل
چگونہ پائے بدامن کشند دلم کہ ہنوز　　نہ رفت موسم گل چیدن بہار عمل
بپیچ دست ارادت در آستین کیں دست　　کشند بچشم فلک سرمہ غبار عمل
خطر ز فتنہ جاہ است اہل دولت را　　جز ایں دگر ہنود خار رہگذار عمل

ضیا چہ زندہ نمائیم مردہ قومی را
کہ نیست قابل احیاء روزگار عمل

بادۂ دکن

لچھمی نراین صاحب شفیق اورنگ آبادی

(۳)

غزل گوئی کے معنے بالکل معشوق سے باتیں کرنے کے ہیں، صاحب کی غزل گوئی بھی رہین منت ہے ان کے نام صاحب نے احسان شناسی کے طور پر نہایت پر لطف کنایوں کے ساتھ بیان کر دیے ہیں، کبھی پردگی سے کام لیا ہے اور کبھی بے پردگی سے بھی، جن کے حسن تصدق میں غزل گوئی ہوئی ہے، ان کے نام بیرھان، شکرو میاں، ثابت علیخاں، پھند میاں، روپ چند ہیں (عمر یافعی)

(بیرھان)

(۱) بے وفا بے مہر وہ دلدار ہے — نت نیا طرّاف اور طرار ہے
(۲) یک جگہ الفت نہیں رکھتا ہے وُہ — دل بری کے فن میں کیا ھشیار ہے
(۳) ربط رکھتا ہے تمام عالم کے ساتھ — دوست ہے سب سے سبھوں کا یار ہے
(۴) بھوت ہیں گی شوخیاں گستاخیاں — بات میں انکار ہے اقرار ہے
(۵) ہر کسے لیتا ہے باتوں میں لبھا — کس طرح کا شوخ ہے عیار ہے
(۶) اب تو اوروں ساتھ الفت ہے اُسے — کچھ ہمارے سے تو وے بیزار ہے

(ن) نام جو چاہے تو ہر اک بیت سے
حرف لے صاحب تو پھر اظہار ہے

(شکرو میاں)

(۱) شکر حق دل بر ہمارا رام ہے — کچھ تو الفت ساتھ اُس کو کام ہے (۲)
(۳) ربط رکھتا ہے ہمارے سی بہت — وہ ہماری جان کا آرام ہے (۴)
(۵) مہربانی ہے سدا ہم پر اُسے — یہ سخن مشہور خاص و عام ہے (۶)

(۱) اس سر مصرع سے لے صاحب حروف
(۲) نادر اُس پیارے کا اس میں نام ہے

(ثابت علیخاں)

(۱) ثانی ترا خدا نے تجھی کو بنا چکا — آئینہ نے بھی شکل کو تیری دکھا چکا (۲)

(ب) باد رہ تجھے تو بات مری ہوئے یا نہ ہو — تیرا تو میں نے آپ کو بندہ کہا چکا (ت)

(ع) عاجز ہوں سخت عشق کی بیتابیوں سے میں — لاچار اب تو جان سے میں ہاتھ اٹھا چکا (ل)

(ی) یارب! کوئی بھی عشق میں بدنام یوں نہ ہو — خوبوں کی گالیاں میں کئی بار کھا چکا (ی)

(ا) ان مصرعوں کے جس نے سر حرف کو لیا

(ن) نام اُس کا صاحب اب تو بلا شبہ پا چکا

(چھبیلا دل)

تو ہے میرا دل ربا پھندو میاں! — تو نے میرا دل لیا پھندو میاں!

تیرے پھاندے میں ہزاروں دل پھنسے — نام ہے تیرا بجا پھندو میاں!

بس کہ شوخی سے ہی تجھ میں دم کو دھند — اس سبب کہنا روا پھندو میاں!

انتظاری میں ترے بے تاب ہوں — جلد آ تو جلد آ پھندو میاں!

توصفا میرے سے رکھ جس طور ہے — تیرے عارض پر صفا پھندو میاں!

حق تعالیٰ نا کرے میرے تئیں — ایک پل تجھ سے جدا پھندو میاں!

میرے دل سے بھولتی ہرگز نہیں — وہ تری پیاری ادا پھندو میاں!

حسن تیرا روز افزوں نت رہے — یہ ہی (رہے) میری مدعا پھندو میاں!

تیری خدمت میں یہی ہے التماس — دوستی مجھ سے نبھا پھندو میاں!

صاحب دل خستہ پر لازم ہے لطف

ہے غلام باوفا پھندو میاں!

(روپ چند)

غنچہ لب، رنگیں ادا ہے روپ چند — سرو قد، نسریں قبا ہے روپ چند

لے گیا دل کو مرے جھمکی بتا — کس طرح کا دل ربا ہے روپ چند

روپ اُس کو چاند سا حق نے دیا — نام اُس کا کیا بجا ہے روپ چند

چاند کم دِستا ہے جوں برسات میں — اس طرح سے کم نما ہے روپ چند

ریختہ فرما اُنشی صاحب کہا

آشنا کا آشنا ہے روپ چند

تنقیدیں

جدید رسالے

العراقی | تقطیع رائل ۱/۸ حجم تین جز قیمت سالانہ (عہ) پتہ تقفی منزل لار گورکھپور۔ یہ ایک فرقہ واری ماہوار رسالہ ہے جو گورکھپور کے قصبہ لار سے ابو المعانی علی احمد تقفی کی ادارت اور مولانا نیاز فتحپوری کی نگرانی میں ماہ ربیع الاول سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے اجرا کے مقاصد جناب مدیر کے قول کے مطابق عراقیوں میں علمی ادبی، تمدنی، معاشرتی، اقتصادی اور تواریخی (؟) مذاق از سر نو پیدا کیا جائے۔

پہلے رسالے میں چار مضامین، تین نظمیں ہیں۔ مضامین میں ایک افسانہ بھی ہے "شوہر کا چور"۔ رسالے کی افتتاحی رسم جناب مدیر کی ایک نظم "بیاض ازاہر" سے ہوتی ہے۔ قصبہ لار کی تاریخ کے ساتھ ساتھ رسالے کے اجرائی کے مقاصد بھی بیان کر دئے گئے ہیں۔ گویا یہ رسالہ اس برادری میں علمی ترقی کا معاون اور اتحادی روابط کو بڑھانے والا ہوگا۔ یہ خوب آغاز ہے جس کی ابتدا "القریش" سے ہوئی۔ اگر کسی قوم کے مختلف فرقے علم و عمل میں ترقی یافتہ ہو جائیں تو اس کے معنی خود قوم کی ترقی کے ہیں۔ رہنمایان قوم کو اس حقیقت کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔ کہ قومیں کبھی اپنے ماضی کی طرف واپس نہیں ہوتیں۔ بلکہ وہ نمونوں سے سیکھتی ہیں۔ اس لئے جدید اثرات سے بچنے کی کوشش کے بجائے ان کو قبول کر کے "خذ ما صفا دع ما کدر" کے اصول پر عمل ہو۔

رسالہ کیمیا ماہوار | زیر نگرانی سید جالب صاحب ایڈیٹر "ہمدم" لکھنو سے شائع ہوتا ہے۔ چندہ سالانہ معہ محصول ڈاک (للعہ) زمانہ قدیم اور بالخصوص قرون وسطیٰ کے لوگ دو چیزوں کے بے حد متلاشی تھے، ایک چشمہ آب حیات۔ اور دوسرے کیمیا کا صحیح نسخہ۔ لیکن باوجود ان کی ان تھک کوششوں کے یہ دونوں چیزیں دستیاب نہ ہوسکیں۔ مگر موجودہ تمدن نے ان دونو چیزوں کو بلا واسطہ حاصل کر لیا ہے۔ اور یہ بتلا دیا ہے کہ انسان کی کوششوں کا نتیجہ ابدی حیات کا سرچشمہ ہے۔ اور کیمیا کا صحیح نسخہ تجارت اور صنعت و حرفت ہے۔ مغربی ممالک کی روز افزوں ترقی کا راز اسی قیمتی نسخہ میں مضمر ہے بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان بھی اب اس نسخہ کو اس طریقے پر حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس کا زندہ ثبوت رسالہ "کیمیا" کے مطالعہ سے ملتا ہے۔ اس رسالہ میں صنعت و حرفت اور تجارت سے متعلق مضامین درج ہوتے ہیں ہندوستان کی صنعتی اشیاء پر کافی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ چنانچہ ایڈیٹر صاحب کا مضمون "ہندوستان میں صنعت نمک سازی" اسی قبیل سے ہے۔ اس کے علاوہ "سونے کی کان" کے تحت جو دلچسپ نسخے درج ہیں ضرور قابل قدر ہیں۔

(ان نسخوں کے درج کرنے میں ایڈیٹر صاحب کو کافی احتیاط کی ضرورت ہے۔) علاوہ ازیں اس رسالے میں جو افسانے درج ہیں ان کا موضوع بھی صنعت و حرفت اور تجارت کی تبلیغ سے متعلق ہے"، ہماری رائے ہے کہ اگر ایڈیٹر صاحب کے پیش نظر سائنٹیفک امریکن اور "پاپولر سائنس" جیسے رسالے بھی ہوں تو پرچہ اور شاندار بن سکتا ہے بہر حال ہم سید جالب صاحب دہلوی کی اس کوشش پر مبارکباد دیتے ہیں۔ کہ انہوں نے ہندوستان میں اس نوعیت کے واحد رسالہ کا اجرا کیا۔ اُردو داں پبلک اس سے بہت کچھ مستفید ہوسکتی ہے۔

مبادی نباتات تقطیع $\frac{20\times30}{16}$ حجم ۱۰۳ صفحے مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔ قیمت عصہ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ نباتات کا ایک ابتدائی رسالہ ہے جس کو مسٹر جگ موہن لال۔ بی۔ ایس سی۔ ایل۔ ٹی نے مختلف انگریزی کتابوں سے مواد لے کر اور جامعہ عثمانیہ کی وضع کردہ اصطلاحات کو کام میں لاکر سلیس اردو میں تالیف کیا ہے۔ یہ رسالہ کئی اعتبار سے قابل قدر ہے۔ ایک تو یہ کہ اُردو زبان میں اپنی نوع کا یہ پہلا رسالہ ہے۔ (یوں تو اس سے قبل بھی دو ایک رسالے اس نوع کے شائع ہو چکے ہیں لیکن اس کا طرز بیان اُن سب سے جدا اور بہتر ہے) دوسرے یہ کہ اس کو نہایت سنجیدگی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ابتدائی ابواب میں بیجوں کی ساخت اور پودوں کے اُگنے سے بحث کی گئی ہے۔ پھر اس کے بعد جڑوں کے اقسام اور ان کے کاموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور پھر پھولوں اور پتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سب سے آخر میں "پودوں کے احساسات" کے عنوان سے ایک باب لکھا گیا ہے جس میں مثالوں کے ذریعہ یہ سمجھایا گیا ہے۔ کہ انسانوں اور جانوروں کی طرح پودوں میں بھی احساس ہوتا ہے۔ مصنف کی اس کوشش پر ہم مبارکباد دیتے ہیں۔ اور اُمید کرتے ہیں کہ آپ کی کوشش سے اس قبیل کی دیگر کتابیں بہت جلد منظر علم پر آجائیں گی۔ آخر میں ہم مشورہ دیتے ہیں کہ آپ جامعہ عثمانیہ ہی کی وضع کردہ اصطلاحات پر قانع نہ ہوں۔ بلکہ اپنی طرف سے بھی کچھ نہ کچھ اضافہ کرکے اُردو زبان کی ساخت میں ہاتھ بٹائیں۔ یہ کتاب نصاب کے لئے بھی موزوں معلوم ہوتی ہے۔

مقنن تقطیع $\frac{20\times30}{8}$ حجم ۱۰۰ صفحے لکھائی چھپائی عمدہ چندہ سالانہ عسہ ملنے کا پتہ:- منیجر مقنن۔ نامپلی نمبر (۵۰۷) حیدرآباد دکن۔ حیدرآباد دکن کا ایک تازہ قانونی ہفتہ وار رسالہ ہے۔ اس کے مدیرین سید محمد حسن صاحب۔ بی۔ اے ایل ایل۔ بی، میر حسن الدین صاحب بی۔ اے ایل ایل۔ بی اور محمد عبد الرحمن صاحب رئیس ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ملک کی آئندہ ترقی بالکل جامعہ عثمانیہ کی پیداوار پر منحصر ہے۔ چنانچہ ان دنوں ہر قسم کے مشاغل میں جامعہ کے تعلیم یافتہ نہایت خوش اسلوبی سے حصہ لے رہے ہیں۔ یہ اتفاقی بات ہے کہ اس رسالہ کا پورا ادارہ جامعہ کے فارغ التحصیل نوجوانوں ہی پر مشتمل ہے۔ اس لئے یہ رسالہ صحیح معنوں میں جامعہ عثمانیہ کی پیداوار کا ایک حقیقی نمونہ ہے۔ اس کے پہلے نمبر کو دیکھ کر اس کے شاندار مستقبل کا خاکہ ہماری ذہن میں آجاتا ہے۔ رسالہ کی ترتیب خوبی کے ساتھ ہوئی ہے۔ اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں قانونی مقالات ہیں۔ دوسرا حصہ جو دیوانی فوجداری اور عثمانیہ عدالت العالیہ کی نظائر سے متعلق ہے۔ اور تیسرے حصے میں عدالتہائے عالیہ ہند کی نظائر درج ہیں۔ ضروری اور اہم قانونی مسائل پر مضامین بھی لکھے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ رسالہ ساری ہندوستان کی قانونی دنیا پر حاوی ہے۔ لہذا قانون سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے اس کا مطالعہ یقیناً مفید ثابت ہوگا۔

ویجیٹال بام

بیرونی استعمال کیلئے پُر تاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات سے بہترین اجزاء سے مرکب ہو بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے۔ جو اقسام کے اعصابی و اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے۔ اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کمال یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں جس سے زیادہ پُر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا قریباً غیر ممکن ہے۔ کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس۔ وجع مفاصل دمہ۔ درد سر۔ درد سول۔ بچھو کے زہر کے لیے اور زخم کے لیے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال

تھوڑی دوا لیکر دن میں تین چار دفعہ مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھاپ دیں اور صاف کریں۔ جو اصحاب بغرض امتحان دوا طلب فرماویں بخوشی تعمیل کی جائے گی۔

نوٹ۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت ہوشیار رہتا ہے۔ اور نسخہ جات نہایت احتیاط کیساتھ تیار کئے جاتے ہیں

المشتہر جیمس اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن۔

افتخار الحکما نواب حاذق جنگ مرحوم سابق افسر الاطبا فرماتے ہیں

میں نہایت مسرت اور بڑی خوشی کے ساتھ محض بیماروں کی شفا کی غرض سے چند سطور سپرد قلم کرتا ہوں۔ برص (شر دیعنی کوڑ اور سفید داغ) کا علاج نہایت مشکل ہے۔ یہ مرض عموماً لا علاج سمجھا جاتا ہے۔ حکیم مولوی محمد عبد القادر صاحب مددگار صدر مخزن الادویہ یونانی سرکار عالی و رکن دار التشخیص و انجمن الاطبا یونانی حیدرآباد دکن خصوصاً علاج برص میں ید طولیٰ رکھتے ہیں صاحب موصوف نے اکثر مرضا برص کا علاج بہت ہی کم مدت میں نہایت قابلیت سے کیا اور بفضلہ کامیاب ہوئے۔ میں نے بچشم خود مرضا برص کا معائنہ کیا ہے۔ بعد علاج جسم بالکل اصلی حالت پر ہو جاتا ہے۔ حکیم صاحب موصوف کی بہترین قابلیت اور مجرب دوا کا اثر ہے۔ میں حکیم صاحب موصوف کو ایسے کشف مرض کی دوائے مجرب کی ایجاد پر مبارکباد دیتا ہوں اور پبلک سے زور کے ساتھ سفارش کرتا ہوں کہ وہ برص کے مریضوں کو حکیم صاحب موصوف کے پاس رجوع ہونے کی ہدایت کریں اور مریضان برص کو چاہئے کہ وہ اس موقع کو غنیمت سمجھکر حکیم صاحب موصوف سے علاج کرائیں اور مرض منحوس سے غافل نہ رہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

(مہر دستخط افتخار الحکما حاذق جنگ)

مطبوعات جامعہ ملیہ - دہلی

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جہاں مسلمانان ہند کے احیاء بقا کے لئے بہت سے کام اپنے ذمہ لئے ہیں وہاں اس کا ایک اہم کام اردو زبان میں اعلیٰ لٹریچر بہم پہنچانا بھی ہے۔ چنانچہ ابتدا ہی سے اس نے اپنے ہاں تصنیف و تالیف کا ایک شعبہ قایم کیا تھا جو اب اردو اکاڈمی کے نام سے موسوم ہے۔ اردو اکاڈمی مختلف علوم و فنون پر چند نہایت مفید کتابیں شایع کر چکی ہے۔ جن کی فہرست ہم آیندہ صفحات میں درج کرتے ہیں نیز ان کتابوں کی بھی ایک فہرست درج کر رہے ہیں جو مکتبہ جامعہ نے مفید سمجھ کر خود شایع کی ہیں۔ قدر دانان علم سے ہمیں امید ہے کہ ان مطبوعات کی قدر افزائی فرمائیں گے۔

سلسلہ اردو اکاڈمی

تاریخ الامت مصنفہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری۔ تاریخ اسلام کا یہ سلسلہ صحیح تاریخی اصول اور تحقیق و تنقید کے ساتھ اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہر شخص نہایت آسانی سے مسلمانوں کے تاریخی کارناموں سے واقف ہو سکتا ہے۔ جامعہ ملیہ اور صوبہ متوسط و برار کے محکمۂ تعلیم نے اسے اپنے مدارس کے لئے بھی پسند کیا ہے۔ ابتک چھ حصے شائع ہو چکے ہیں جو حسب ذیل ہے:-

(۱) حصہ اول سیرۃ الرسول عہ
(۲) حصہ دوم خلافت راشدہ عہ
(۳) حصہ سوم خلافت بنی امیہ عہ
(۴) حصہ چہارم خلافت عباسیہ جلد اول عہ
(۵) حصہ پنجم " جلد دوم عہ
(۶) حصہ ششم عباسیہ مصر عہ

تاریخ الدولتین اس کتاب میں خلافت بنی امیہ و بنی عباس کے حالات پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ مصر کے مشہور اہل قلم جرجی زیدان کی تصنیف ہے جسے مولانا نیاز فتحپوری نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ قیمت عہ

مبادی معاشیات یہ علم المعیشت پر ایڈون کینین کی مشہور و معروف تصنیف ہے جس کا ترجمہ پروفیسر ذاکر حسین خاں صاحب نے نہایت سلیس اردو میں کیا ہے یہ کتاب فن کے مبتدیوں کے لئے مفید ہے قیمت عہ

تاریخ ہند قدیم قدیم ہندوستان کی تاریخ کا ایک مختصر لیکن نہایت جامع خاکہ شعبہ تصنیف نے کے، ایم، پانیکر صاحب ایم۔ اے (آکسن) سے انگریزی میں لکھا کر اردو میں ترجمہ کرایا قیمت عہ

ذکر تفسیر پارہ عم مصنفہ خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی استاد تفسیر جامعہ۔ سلسلۂ تفسیر "الفرقان فی معارف القرآن" کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ کتاب بھی اسی مفید سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں پارہ عم کی تفسیر خواجہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز سے امت اسلام کے لئے پیش کی ہے۔ قیمت عہ

عبرت تفسیر سورۂ یوسف سلسلۂ تفاسیر کی ایک اہم جلد جس میں احسن القصص یعنی سورۂ یوسف کی تفسیر نہایت خوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور اس کے عبرت انگیز نتائج کو بہت موثر

طریقہ پر پیش کیا گیا ہے قیمت عہ

برہان سورۂ نور کی مکمل اور مبسوط تفسیر نہایت پر زور اور دلکش طرز تحریر قیمت عمہ

قواعد عربی (حصہ اول) کتاب الصرف اردو میں عربی صرف کی مستند کتاب جسے ہندوستان کے مشہور عربی ادیب مولانا ابو عبداللہ محمد بن یوسف السورتی استاذ عربیات جامعہ نے نہایت تحقیق سے مرتب کیا ہے۔ قیمت ۸؎

تاریخ فلسفہ اسلام از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (برلن) ہالینڈ کے مشہور فلسفی اور مستشرق ٹ۔ ج۔ دی بور کی گرانقدر تصنیف کا براہ راست جرمن زبان سے ترجمہ۔ تاریخ فلسفہ اسلام پر اردو میں یہ پہلی قابل قدر کتاب ہے۔ قیمت ۱۲؎

عربوں کا تمدن ڈاکٹر جوزف ہیل پروفیسر میونخ یونیورسٹی کی مشہور و معروف تصنیف (RULTUR BER AEABER) کا ترجمہ از سید نذیر نیازی صاحب بی اے (جامعہ) مترجم نے کتاب کی قدر نہایت مفید ضمیمہ لکھکر اور بھی بڑھا دی ہے جو تاریخ اسلام پر یوں بھی نہایت محققانہ اور بصیرت افروز مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت ۸؎ عہ

دیوان غالب

طبع ثانی

مطبوعہ برلن (جرمنی)

ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر و ادیب مرزا غالب کا کلام جو شان رکھتا ہے اور جس قدر و منزلت کا وہ مستحق ہے ہم نے اسی حسن و خوبی اور لطافت و نفاست کے ساتھ مرزا کے کلام کا مجموعہ ارباب ذوق کے سامنے پیش کیا ہے۔

یہ دیوان نہایت اہتمام کے ساتھ جرمنی میں طبع کرایا گیا ہے خوبصورت ملائم جلد اسپر سنہرے دلفریب نقش نگار طلائی اوراق اور سب سے زیادہ مرزا غالب کی لاثانی عکسی تصویر جرمن ہنرمندی اور کمال کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

ہمارے اس دیوان کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ چند ماہ کے قلیل عرصہ میں اس کا ایک ایڈیشن ختم ہو گیا اور دوسری بار طبع کرانا پڑا۔ دیوان مکمل ہے جس میں مرزا مرحوم کا خود نوشتہ مقدمہ غزلیات قصاید اور رباعیات ہیں۔ جلد مطلا نہایت عمدہ سائز ۲۰×۳۰ قیمت صرف ۵؎

دیوان شیدا

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم

کے

فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ

دنیا مسیح الملک کو طبیب، قومی رہنما عالم، ادیب اور حافظ کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن اس کا علم شاید خواص کے علاوہ کسی کو ہو کہ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم فارسی اور اردو کے ایک اعلیٰ پایہ اور کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔ آپ کا کلام استادانہ ہے اور رفعت خیالات اور سادگی اظہار کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر ہے۔ اس دیوان کا ایک ایک لفظ حکیم صاحب مرحوم کی ہمہ گیری نکتہ رسی اور قادر الکلامی کا شاہد ہے

مکتبہ جامعہ نے اس دیوان کو جرمنی میں طبع کرایا ہے۔ پاکٹ سائز جلد سنہری منقش نہایت خوبصورت اوراق مطلا رنگ سرخ۔ نیلا۔ سبز قابل دید چیز ہے۔ قیمت صرف عہ

مطبوعات مکتبۂ جامعہ

ہمارے نبی | بچوں کے لئے خدا کے پیارے ہمارے نبی کی پاک زندگی کی کہانیاں از پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم اے (طبع سوم) ۵ر

ہمارے رسول | خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی نے بچوں کے لئے سہل اور موثر ترین زبان میں رسول اللہ علیہ وسلم کے پاک حالات تحریر فرمائے ہیں قیمت ۱ر

سرکار کا دربار | از احمد الیاس صاحب مجیبی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر نوبر بڑے لڑکوں کے لئے بہت مفید کتاب - عہ

دنیا کے بسنے والے | دنیا کے عجیب و غریب باشندوں کے حالات تقریباً ۵۰ تصاویر از سید شبیر حسین صاحب زیدی - ہیڈ ماسٹر مسلم یونیورسٹی اسکول علی گڑھ قیمت ۶ر / ۶ر

ترکوں کی کہانیاں | ترک بچوں کی ہمت و جرات کی سچی کہانیاں جن کے پڑھنے سے بچوں میں قومی جوش پیدا ہوتا قیمت ۔ ۵ر

ازہار العرب | ہمت و شجاعت و سخاوت و مروت اور علم و حکمت کے بہترین عربی اشعار کا گلدستہ - قیمت ۱۰ر

انتخاب مضامین جوہر | طلباء جامعہ کے قلمی رسالہ جوہر کے منتخب علمی ادبی اور تاریخی مضامین قیمت عہر

اورنگ زیب عالمگیر | مولانا شبلی کی معرکۃ الآراء تصنیف، طباعت کتابت نفیس - قیمت عہر

مقدمہ شعر و شاعری | خواجہ حالی کے دیوان کا مقدمہ اردو شاعری کے متعلق بے نظیر تبصرہ معہ فوٹو خواجہ مرحوم قیمت عہر

اصلاح کار | عنوان شباب کے خدمات کے نشیب و فراز پر گہری نظر - اور ازدواجی زندگی کے لئے دلسوز مشیر - از چودھری محمد علی صاحب تعلقہ دار ردولی قیمت ۱۲ر

جمال الدین افغانی | اتحاد اسلام کے داعی اور مشرق کے معلم اعظم سید جمال الدین افغانی کے حالات زندگی سید صاحب اور ان کے جانشین شیخ محمد عبدہ کی تصاویر بھی شامل ہیں قیمت ۱ر

عرض جوہر | مجموعہ کلام مولانا محمد علی صاحب قیمت ۱۰ر

انتخاب میر | زبان اردو کے زندۂ جاوید شاعر میر تقی میر کے کلام کا ایک خاص نقطۂ نظر سے انتخاب معہ مقدمہ و حالات میر - مرتبہ مولوی نور الرحمن صاحب بی اے (علیگ) قیمت عہر

دیوان غالب | طلبہ کی سہولت اور روزمرہ کے استعمال کے لئے مناسب قیمت ۱۰ر

مسدس حالی | طلبہ کے استعمال کے لئے - مجلد ہونے کے باوجود قیمت ۱ر

مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ | اس رسالہ میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے تعلیم کی غایت اور مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی ضروریات پر مفید بحث کی ہے قیمت ۱ر

خطبہ صدارت | شیخ الہند مرحوم کا تاریخی خطبہ صدارت جو تقریب افتتاح جامعہ پڑھا تھا قیمت ۲ر

خطبہ صدارت | مسیح الملک مرحوم کا عالمانہ خطبہ جو جلسہ اول تقسیم اسناد میں پڑھا گیا - قیمت ۵ر

اسلامی تہذیب اور قومی تعلیم | ڈاکٹر سرپی سی رائے کے خطبہ صدارت

مطبوعاتِ مکتبہ

دکن میں اُردو ۔ مولفہ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب منشی فاضل۔ جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی، عادل شاہی او آصف جاہی دوران میں اُردو نظم و نثر کی حالت اور شعرائے اُردو کا تذکرہ مع نمونہ کلام ضخامت ۴۸۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا بار دوم قیمت ؁۳

خیابانِ اُردو ۔ مرتبہ جناب محمد عارف صاحب حیدرآبادی ہندوستان کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور نامی گرامی شعرا کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۵۴۴ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ؁۳ سادہ ؁۲

روحِ تنقید ۔ مصنفہ مولوی ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے، فن تنقید کے متعلق اُردو زبان میں پہلی کتاب ہے جسمیں ماضی و حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور اِن اُصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۲۵۵ سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ بار دوم قیمت عہ

تنقیدی مقالات ۔ مصنفہ زور صاحب ۔ یہ روحِ تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روحِ تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی، فارسی اور اُردو زبانوں کے مشہور اہلِ قلم کی قلمکاریوں پر تنقید کرکے ان اصولوں کا استعمال دکھلایا ہے اور نیز بعض مشہور اردو انشا پردازوں کے طرزِ تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کئے گئے ہیں ضخامت ۵۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی وغیرہ عمدہ مجلد ساڑھے ۲ روپے

اُردو کے اسالیبِ بیان ۔ مصنفہ زور صاحب ۔ نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت ۔ ابتدا سے لیکر آجتک کے نثر نگاروں کے طرزِ تحریر و اندازِ بیان کا تذکرہ ۔ خاص طرزِ تحریر کے اُردو انشا پردازوں کے اسالیبِ بیان پر تبصرہ ضخامت ۴۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ساڑھے عہ

سلطان محمود غزنوی کی بزمِ ادب ۔ مصنفہ زور صاحب سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی، ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیاتِ ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ۔ ضخامت ۱۲۰ صفحے ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲ ار

دنیائے افسانہ ۔ مصنفہ مولوی محمد عبدالقادر سروری ایم اے ۔ ایل ایل بی، افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ ۔ اور افسانہ نویسی کے اصول و مبادیات یہ اُردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۲۱۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت ؁۴

مبادی فلسفہ ۔ مولفہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی، ڈاکٹر اے ایس راپورٹ پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی پرائمر آف فلاسفی کا مختصر با محاورہ اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۴ ار

اربابِ نثرِ اُردو ۔ مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے ۔ فورٹ ولیم کالج کے اُردو اہلِ قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر نگاری کی تاریخ ضخامت ۲۴۰ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عاں

آثار الکرام جلد اول ۔ مصنفہ شمس المورخین جناب حکیم سید شمس اللہ قادری ام آر اے ایس ۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی محققانہ تاریخ ضخامت ۱۴۴ صفحے ۔ سائز ۲۶×۲۰/۱۶ کاغذ چکنا ۔ لکھائی چھپائی خاصی قیمت ۱۲ ار

جواہرِ کلیاتِ نظیر ۔ منتخبہ جناب مولانا ذہین و سید ممتاز احمد نظیر اکبر آبادی کے کلیات سے اخلاقی ۔ ادبی ۔ نصیحت آموز، ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۸۰ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی خاصی قیمت عہ

عقائدِ امام ۔ مترجمہ مولوی محمد عبدالغفور عابدی صاحب فقہ اکبر کا عام فہم اور با محاورہ اردو ترجمہ ۔ قیمت ۴ ر

اسوۂ حسنہ ۔ مصنفہ مولوی احمد عبداللہ مسدوسی بی اے ۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۸ ر

دکنی لغت ۔ مولفہ مولوی سید شاہ احمد شعار ہاشمی ۔ اردوئے قدیم یعنے دکنیات کا لغت جس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا ۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۸ ر

شاہ رفیع الدین قندھاری ۔ مرتبہ مولوی محمد عبدالغفور صاحب عابدی ۔ دکن کے ایک مشہور صاحبدل صوفی عالم کے دلچسپ حالات ضخامت ۸۰ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا ۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۵ ر

خزینۂ اخلاق ۔ مصنفہ مولوی سید عبدالعزیز صاحب عزیز اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ ۔ ضخامت ۶۴ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۶ ر

سیرتِ خیر البشر و سیرتِ مبارک ۔ مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالے جس میں آنحضرت صلعم کے مکارمِ اخلاق بیان کیے گئے ہیں ۔ قیمت ۱ ر

نیک بی بی ۔ مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے ۔ نیک خو بی بی کس طرح اپنے بدخو شوہر کو ٹھیک کرسکتی ہے ۔ قیمت ۲ ر

چھوٹا شیطان ۔ مصنفہ مولانا ذہین ۔ منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ۱ ر

ملنے کا پتہ ۔ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ روبرو محکمۂ مالگزاری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعہ مطبع مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام محمد عبد اللطیف لیتھوگرافر منیجر مطبع

مجلہ

مکتبہ

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر

محمد عبدالقادر سروری

ایم اے ال ال بی

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار آصفیہ — رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار انگلشیہ

مجلّۂ مکتبہ

(۶۵) (......)
جلد (۲) بابتہ ماہ اسفندار ۱۳۳۸ ف سنہ م جنوری سنہ ۱۹۲۹ء شمارہ (۴)

تصویر۔ نواب سر فریدون ملک آنجہانی۔

فہرست

شذرات

اعلیحضرت سلطان العلوم ۲۶ رجب کو کلکتہ سے مراجعت فرمائے بلدہ ہوئے۔ اعلیحضرت کا سفر کلکتہ خانگی اور تفریحی تھا۔ وہاں آپ کی خوش گوار مصروفیتوں پر مقامی اور بیرونی اخباروں سے روشنی پڑ چکی ہے۔ اس سفر میں آپ کا ایک درخشاں کارنامہ بنگال کے مفلوک الحال لوگوں کی امداد کے لئے ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ ہے۔ جو گورنر صاحب بنگال کو حسب صوابدید صرف کرنے کے لئے دیا گیا۔ اعلیحضرت کے اس سفر سے ملک اور اہل ملک کے لئے مفید اور عظیم بالشان نتائج برآمد ہونے کی توقع ہے۔

اس سال حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا نواں اجلاس دار البلدیہ عام (ٹاؤن ہال) میں ۹ اور ۱۰ اسفندار کو منعقد ہوا۔ حاضرین کی تعداد چار سو کے قریب تھی۔ جو اکثر و بیشتر ملک کے بہی خواہان تعلیم پر مشتمل تھی۔ مولوی حبیب الرحمان خان شیروانی (نواب صدر یار جنگ بہادر) نے عین وقت پر صدارت قبول فرما کر بڑی آسانی پیدا کر دی۔ نواب فخر یار جنگ بہادر کی افتتاحی تقریر مختصر لیکن نہایت سبق آموز اور لائحہ عمل بننے کے قابل تھی۔ آپ نے ذہنی ارتقا اور روحانی اعتلا کے اسباب ایک ساتھ اختیار کرنے اور آزادی اور حریت کا دم بھرنے والوں کو نمود و نمائش سے پاک رہنے کی ضرورت پر زور دیا۔ نواب صدر یار جنگ بہادر نے جس قدر قلیل عرصہ میں خطبہ صدارت کو کامیاب بنانے کی سعی کی۔ وہ نواب صاحب کی کہنہ مشقی کی دلیل ہے۔ ابتدائی حصے میں آپ نے جامعہ عثمانیہ کے وہ درخشاں نتائج شمار فرمائے جو ہر جامعہ کے لئے اس قلیل عرصہ میں باعث عزت ہیں۔ کاش! ملک کے ارباب حل و عقد ان نتائج کو ضائع ہونے سے بچا کر عملی طور پر ملک و ملت کے لئے مفید بنانے کی کوشش کریں۔

مولوی سید خورشید علی صاحب معتمد کانفرنس کی روئداد بھی مختصر لیکن ضروری امور پر حاوی تھی۔ اس سے یقیناً اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ کانفرنس کی اہمیت اور اس کا وزن عملاً بڑھتا جا رہا ہے۔ اختلاف پسند طبائع انانیت کو مجموعی اور ملکی مفاد کے پیچھے ڈال کر اسی کے ذریعہ ملکی نظام تعلیم کی تعمیر میں حصہ لیں اور تخریبی قوتوں کو اپنوں کے بجائے غیروں کے مقابلے میں استعمال کریں تو ہم کس قدر جلد ایک مرکز تک پہونچ سکتے ہیں!

کانفرنس کے تینوں اجلاسوں میں چند اہم تحریکات اور مفید تقریریں پیش ہوئیں مولوی محمد مرتضیٰ صاحب مرحوم اولین معتمد کی یادگار میں چندہ فراہم کیا گیا۔ تحریکات میں نواب ناظر یار جنگ بہادر کی تحریک تعلیم نسواں کا نصاب اپنی ضروریات کے مطابق مرتب کرنے کے متعلق جس قدر اہم ہے اس سے ہر شخص واقف ہے یا پولٹ صاحب مکرجی بی اے بی سی ای کی تحریک ملک میں اعلیٰ اور ادنیٰ پیشوں کی تعلیم کی جلد سے جلد ترویج کے متعلق تھی۔

کیونکہ ابھی ہر ملک کی آئندہ فلاح اور بہبودی کا انحصار ہے تعلیمی کتابوں کی قیمت کے تعین کا سوال بھی جو چوتھی تحریک کی صورت میں پیش ہوا، عاجلانہ توجہ کا محتاج ہے۔ اور حقیقت میں مصنفین اور ناشرین کی سہولت سے زیادہ متعلمین کی سہولت پیش نظر ہونی چاہیئے امید ہے کہ ارباب حل وعقد کی نظر میں اس کی اہمیت نمایاں ہو چکی ہوگی۔

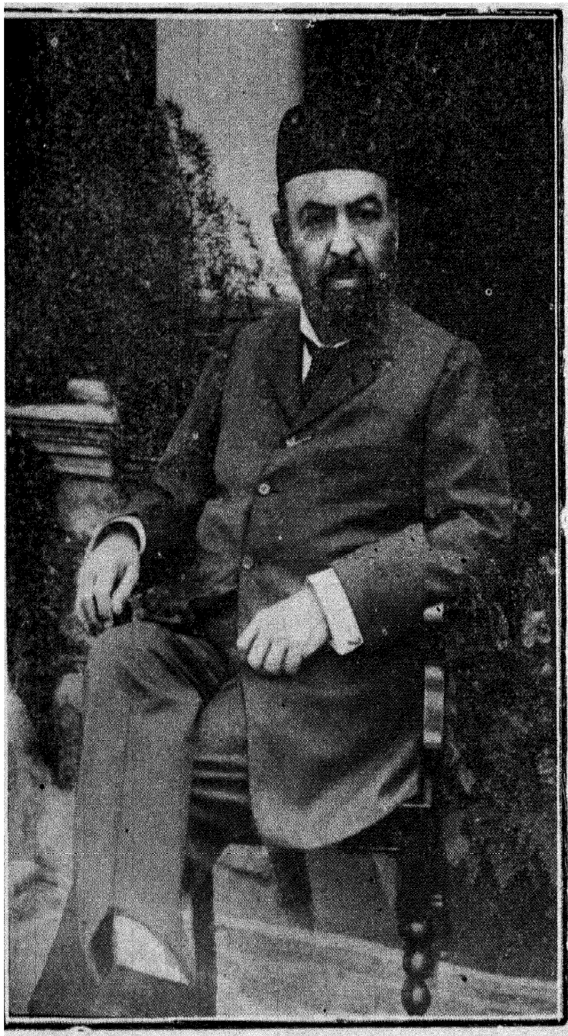
جامعہ عثمانیہ کے ایک قدیم طالب علم مولوی سید محمود عالم صاحب نے نہایت عمدگی سے مشرق و مغرب کے تمدن کا موازنہ کیا۔ اور "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے اصول پر عمل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مولوی یعقوب حسن صاحب نے بھی جو اتفاق سے اس موقع پر بلدہ ہی میں قیام فرما تھے "ہندوستانی کلچر" پر بڑی دلچسپ اور کارآمد تقریر کی۔ یقیناً کسی خاص تہذیب و تمدن کی اشاعت میں زبان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ہمارے ملک میں انگریزی تہذیب کے وہی لوگ مقلد ہیں جو انگریزی زبان کے حامی ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کی تقریر کا مفید موضوع یونیورسٹی کی حقیقی تعلیم اور نظام تعلیم میں موزوں اشخاص کی ضرورت تھا۔ جو یقیناً بڑی کاوش کا نتیجہ ہے۔ دوران تقریر میں جن مفید پہلوؤں پر ڈاکٹر صاحب نے روشنی ڈالی ہے اس کا شمار بھی یہاں ناممکن ہے۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ کاش ہم اس مسئلہ پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنا شروع کریں۔

اس قسم کی سنجیدہ محفلوں کے کاروبار سے حاضرین کی طبیعت عموماً اکتا جاتی ہے، ایک دو نظمیں خصوصاً جبکہ خوش الحانی کے ساتھ پڑھی جائیں، بہترین وقفہ سمجھی جاسکتی ہیں اس لیئے کانفرنس کے نظام میں اس کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا تھا۔

ہمیں امید ہے کہ آئندہ سالوں میں، کانفرنس اپنے وجود کو پچھلے سالوں سے زیادہ مفید ملک اور ہر دلعزیز بنانے کی کوشش کرے گی۔

جنوبی ہند کے سفر مدراس اور میسور کے بعد پنجاب کے مایۂ ناز شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنی تشریف آوری سے حیدرآباد کو بھی زینت بخشی۔ جامعہ عثمانیہ نے جو ہند کے ارباب علم کی قدردانی میں امتیاز رکھتی ہے آپ کے خیالات سے ملک کو فائدہ پہونچانے کی غرض سے مدعو کیا چنانچہ جامعہ کی سرپرستی میں ۱۵، ۱۶، اور ۱۷ جنوری کو آپ کے تین لکچر مابعد الطبیعات پر انگریزی میں ہوئے۔ بہت سے لوگ جو انگریزی سے ناواقف بھی تھے، صرف دیکھنے ہی کی خاطر جمع ہوئے تھے۔ پانچ روز کے مصروف قیام کے بعد آپ راہی وطن ہوئے۔



نواب سر فریدون ا املک انجهانی

فریدون ملک آنجہانی

گذشتہ مہینے میں ملک کے ایک اعلیٰ ترین عہدہ کو بہ احسن الوجوہ انجام پہونچانے والی ہستی یعنے سر فریدون جی جمشید جی (نواب فریدون ملک بہادر) کے انتقال کی خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی گئی تھی اس ماہ میں ہم انہیں کی مختصر اور حالات پیش کر رہے ہیں۔

نواب سر فریدون ملک دکن کے ایک پارسی نژاد قابل فرد تھے جن کا وطن جالنہ (ضلع اورنگ آباد) تھا آپ کی ولادت ستمبر ۱۸۶۹ء کو ضلع اورنگ آباد ہی میں ہوئی! اور تعلیم جالنہ میں پائی۔ نوعمری ہی میں سرکار عالی کے سررشتہ بندوبست میں ملازمت اختیار کی لیکن بعد میں محکمہ مالگزاری میں منتقل ہو کر نمایاں خدمات انجام دیں۔

آپ کی ترقی کا زمانہ نواب محسن الملک مرحوم معتمد مالگزاری و ناظم بندوبست کے عہد سے ہوتا ہے، جنہوں نے آپ کی قابلیت کا اندازہ کر کے آپ کو ضلع اورنگ آباد کی مہتمی بندوبست کا کام سپرد کیا۔ نواب سر سالار جنگ بہادر مرحوم کی وزارت میں آپ نے صوبہ بمبئی کے محکمۂ بندوبست کے اصول پر اورنگ آباد میں کام شروع کیا۔ اور اس کی کامیابی پر اضلاع بیڑ اور پربھنی کے علاقے بھی سپرد کئے گئے۔ اس اصول کے تحت رعایا کی حالت بہتر اور آمدنی میں بھی اضافہ ہو گیا۔

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد موصوف کو نظامت بندوبست کا عہدہ عطا ہوا لیکن اس خدمت پر آپ عرصہ تک نہیں رہنے پائے تھے کہ مدار المہام کے سرکاری پرائیوٹ سکرٹری کے عہدہ پر آپ کا انتخاب نواب سر سالار جنگ بہادر نے فرمایا۔ اس خدمت پر آپ نواب سر آسمان جاہ، نواب سر وقار الامراء، مہاراجہ سر یمین السلطنت بہادر اور نواب سر سالار جنگ ثالث کے عہد وزارت میں بھی فائز رہے۔ مہاراجہ بہادر کے عہد وزارت میں معتمد سیاسیات کا عہدہ بھی آپ کے سپرد کیا گیا وظیفہ کے قبل آپ صدر المہام سیاسیات ہو گئے تھے۔

وظیفہ پانے کے بعد بھی سر فریدون ملک کا تعلق سرکاری خدمات سے منقطع نہیں ہوا بلکہ باب حکومت کے قیام پر آپ کو رکن اختصاصی کی حیثیت سے قائم رکھا گیا! اور سر علی امام بہادر کے یورپ جانے اور پھر خدمت صدارت عظمیٰ سے علٰحدگی اختیار کرنے کے بعد آپ صدر اعظم کے اہم فرائض سال بھر تک انجام دیتے رہے۔

اس طرح گویا چالیس سال تک مسلسل آپ نے ملک اور ملت کے خدمات انجام دیئے۔ اہم ترین ذمہ داری کے عہدوں پر فائز اور آخر دم تک رکن حکومت رہے۔

نواب فریدون ملک کو مصنفین اور مولفین کے زمرہ میں بھی شریک ہونے کا فخر حاصل ہے! آپ نے کئی مفید کتابیں لکھیں جن میں سے ایک اورنگ آباد کے کاشتکاروں کی معاشرتی اور معاشی حالت سے متعلق ہے، ہندوستان کے مشہور انگریزی اخباروں میں آپ کے مضامین بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ آپ کے فرزند مسٹر رستم جی ملک سرکار عالی کے ناظم کروڑگیری ہیں آپ کے انتقال سے ملک ایک ذمہ دار اور تجربہ کار ہستی سے محروم ہو گیا۔

سلہ مشاہیر الکرام مطبوعہ عماد پریس (۱۳۴۵ھ) صفحہ ۲۱ و ۲۲۔

قطبی نور

از جناب عبدالوہاب صاحب کلیۂ جامعہ عثمانیہ

مظاہر قدرت کی لاانتہا نیرنگیاں انسان کے دل ودماغ کو ایک غیر محسوس قوت کے ساتھ اپنی طرف جذب کرتی ہیں اور ایک سچا انسان ان بوالعجبیوں اور گوناگونیوں کے مطالعہ میں غرق ہوکر آخر ش پکار اٹھتا ہے ربنا ما خلقت ھذا باطلاً۔ حوادث عالم کا جس قدر گہرا مطالعہ کیجیئے اسی قدر ان میں وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ عقل انسان اپنی درماندگی کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جیسے جیسے سائنس ان مظاہرات قدرت کو بے نقاب کرتی چلی جاتی ہے چشم بصیرت پر ان کے پس پردہ کارفرما ازلی اور ابدی قوت کا راز منکشف ہوتا چلا جاتا ہے۔ کون ہے جس نے بجلی کی چمک نہ دیکھی ہو اور بادلوں کی گرج نہ سنی ہو؟ مگر ذرا غور تو کیجیے کہ کیا ہر شخص نے غور وتامّل سے کام لے کر ان کی اصلیت اور حقیقت کے معلوم کرنے کی کوشش کی؟ ہاں آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ جس طرح دیگر عام مظاہر فطرت کی اصلیت بھوت اور پریت سے منسوب تھی اسی طرح بجلیوں کی چمک اور بادلوں کی گرج کے علحدہ علحدہ خدا یا دیو مقرر تھے۔ یہی حال قطبی نور کا بھی ہے قطبین کے وہ تمام علاقے اور قطبین سے ہٹ کر یورپ اور امریکہ کے وہ تمام ممالک (مثلاً فرانس، انگلستان، اور کینیڈا وغیرہ) جہاں اس نور کی تجلی سے ساری فضا منور ہو جاتی ہے اس نور کو بھی ابتداءً ایک ایسے خدا یا دیو سے منسوب کر دیا گیا تھا جو بہت ہی پر رونق اور سکون بخش ہو چنانچہ یورپ کے قدیم ترین اور مشہور شاعر ورجل نے جہاں اس نور کا ذکر کیا ہے تو اس کو ایک دیوتا کی شکل میں پیش کیا ہے۔ غرض اس کے بعد بھی عرصہ دراز تک قطبی نور اوہام پرستوں کے نزدیک ایک بہت بڑے خدا یا دیوتا سے کچھ کم نہ تھا لیکن جس طرح دیگر حقائق کو سائنس نے اوہام پرستی کے پردہ سے نکال کر ان کو اصلی صورت میں جلوہ گر کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح قطبی نور کے متعلق بھی محققین نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔

دیگر مظاہرات فطرت کی طرح قطبی نور بھی ایک منظر ہے جو کرۂ ارض کے خاص خاص حصوں پر نمودار ہوتا ہے۔ کرۂ ارض کے یہ حصے قطبین سے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر ہم قطعی طور پر یہ نہیں بتلا سکتے کہ قطبین سے کس قدر فاصلے تک یہ نور دکھلائی دیتا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف قطبی نور ممالک یورپ میں فرانس میں دکھلائی دیتا ہے تو دوسری طرف ایشیا میں یہ چین میں نظر نہیں آتا۔ محققین نے اس کی باضابطہ حدبندی کی کوشش کی ہے اور نقشے بھی تیار کر لیئے ہیں کہ کرۂ ارض کے کن کن ممالک میں یہ نور نظر آتا ہے اور اس کے ظہور کی اوسط سالانہ کیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل آگے آئے گی۔

قطبی نور کو عموماً نورِ شمالی اور نورِ جنوبی میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نورِ شمالی سے مراد وہ نور ہے جو کرہ ارض کے شمالی قطب کی سمت میں اور اس کے ملحقہ حصوں میں نظر آئے۔ اسی طرح نورِ جنوبی کے متعلق قیاس کر لیجئے۔

قطبی نور فطرت کے تمام مظاہر میں سب سے خوبصورت ہے۔ اس کی روشنی مختلف الالوان ہوتی ہے اور ہر وقت ایک نئی شان اور نرالی وضع میں نمودار ہوتی ہے۔ اس کی خاص خاص شکلیں یہ ہیں۔

(۱) قوسین: قطبی نور جب قوسین کی شکل میں نمودار ہوتا ہے تو عموماً اس کی شکل قطع دائرہ سی ہوتی ہے یا بیضوی بعض اوقات ان کے حدود نہایت بے ڈھنگی شکل کے ہوتے ہیں۔ قوسین کے کنارے افق تک کھلے ہوئے ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات ایک سرا یا قوسین کے ہر دو سرے افق تک نہیں پہنچتے۔ بیک وقت بہت سی قوسیں بھی نظر آتی ہیں۔ قوس کا وہی حصہ عموماً زیادہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے جو مقعر یا اندرونی سمت میں ہو۔ ان حصوں کے پاس آسمان نسبتاً زیادہ تاریک نظر آتا ہے۔

(۲) دھاریاں: بعض اوقات یہ بالکل سیدھی ہوتی ہیں اور ان کے کنارے نہایت نمایاں ہوتے ہیں عموماً یہ لہردار پٹیوں کی شکل میں دکھلائی دیتی ہیں۔

(۳) شعاع: عموماً ہر قوس یا ہر دھاری کے ساتھ نور کی بہت سی شعاعیں نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جن میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے کم منور خطوطِ نور ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہ شعاعیں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ علیحدہ تمیز کی جا سکتی ہیں۔ نور کی ان شعاعوں کی وضع دھاریوں یا قوسین کے کم و بیش علی القوائم ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ شعاعیں ایک دوسرے کے بالکل متوازی ہوتی ہیں اور بسا اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ ایک نقطہ پر مشترک نظر آتی ہیں۔ جو شعاعیں طویل ہوتی ہیں وہ بذاتِ خود قائم ہوتی ہیں یعنی اس وقت دھاریوں یا قوسوں کا وجود ضروری نہیں۔ شعاعِ نور بالعموم قوس کے اوپری کنارے سے نکل کر سمت الراس کی طرف پہنچتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ شعاعِ نور کا اس قسم کا اجتماع بسا اوقات نہایت خوبصورت پنکھے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ان شعاعِ نور کا طول تغیر پذیر ہوتا ہے۔ اس میں فوری تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ طویل ہو ہو کر افق تک پہنچ رہی ہیں اور پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد سمت الراس کی طرف چڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ منظر نہایت دلفریب اور جاذبِ نظر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اس کو بعض وقت (MERRY DANCER) کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

(۴) پردے: قطبی نور بعض اوقات اس شکل میں بھی نظر آتا ہے کہ گویا آسمان سے زمین تک نور کے پردے چھوڑ دئے گئے ہیں۔ قطبی نور کی یہ شکل بہت ہی شاذ ہے اور صرف حدودِ شمالی میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ سب سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ ان نوری پردوں کا اوپری حصہ شعاعوں سے بنا ہوا ہوتا ہے جو

نہایت نمایاں ہوتی ہیں۔ جوں جوں نیچے دیکھتے چلے جائیے نور مسلسل ہوتا ہوا معلوم ہوگا۔ یہ سارا منظر بحیثیت مجموعی ایک ہی چیز ہے اور ایک ایسے پردے کی طرح معلوم ہوتا ہے جو متواتر روشن اور تاریک حصوں میں منقسم ہو۔ ان پردوں میں کرنیں نمایاں طور پر چھپی نظر آتی ہیں اور ان کا آخری کنارہ دھاری دار پردہ (DRAPERY) کی طرح معلوم ہوتا ہے۔

(۵) کارونا:- (CORONA) یعنی تاج نما جب مکمل حالت کو پہنچ جاتا ہے تو بہت ہی خوشنما منظر پیش کرتا ہے۔ نام سے خود ظاہر ہے کہ یہ روشنی یا نور کی ایک تاج نما شکل ہے جو ایک تاریک مرکزی حلقہ کو محیط کئے ہوئے ہوتی ہے۔ جوں جوں اس تاریک مرکز سے فاصلہ بڑھتا جاتا ہے، شعاعِ نور کی ساخت زیادہ واضح ہوتی جاتی ہے۔ یہ شعاعیں یا تو بہت گھنی ہوتی ہیں یا ان کے درمیان فصل زیادہ ہوتا ہے۔

(۶) بعض اوقات قطبی نور چند غیر منظم رقبوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جو کبھی کبھی پھیلے ہوئے منور بادلوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اس شکل کو (PATCHES) کہتے ہیں۔

(۷) منفوذ نور:- بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کے ایک بہت بڑے حصہ پر نور منتشر ہوگیا ہے بعض جگہ یہ زیادہ اور بعض جگہ کم منور معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی کوئی خاص حدبندی نہیں کی جاسکتی یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ قطبی نور کی یہ مختلف شکلیں کس حد تک ان کے فطری اختلاف کو بتلاتی ہیں اور یہ مقام مشاہد کی کہاں تک پابند ہیں کیونکہ بعض اوقات کئی شکلیں بیک وقت مشاہد ہو چکی ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکلیں خاص حد تک نظام مشاہد

آئی سوچازم (ISOCHASM) ادنیٰ عرض البلد میں قطبی نور بہت کم دیکھا گیا ہے۔ نصف کرۂ جنوبی کے اعلیٰ عرض البلد کے علاقوں میں آبادی زمین نسبتاً مفقود ہے جس کی وجہ سے اس امر کا مشاہدہ بھی غیر ممکن ہے کہ عرض بلد اور طول بلد کا اختلاف نور شمالی کے تعدد پر کس طرح اثر ڈالتا ہے۔ لیکن تاہم مشہور مشاہد فرٹز (FRITZ) نے چند ایسے منحنیات کھینچے ہیں جن سے نور شمالی کے ظہور کا اختلاف تعدد بلحاظ مقام مشاہدہ بیک نظر واضح ہوجاتا ہے۔ مگر فرٹز کے یہ خطوط یا منحنیات بھی محض نصف کرۂ شمالی تک ہی محدود ہیں۔ فرٹز کے ان منحنی خطوط کو آئی سوچازم (ISOCHASM) کہتے ہیں جو یونانی زبان کا ایک لفظ ہے "جو قطبی نور" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فرٹز نے کثیر مشاہدات کی مدد سے اُن رقبوں کی صحیح حدبندی کی کوشش کی ہے جہاں نور شمالی نظر آتا ہو۔ فرٹز کے تیار کردہ نقشہ کی مدد سے ہم یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ کسی خاص مقام پر نور شمالی کے نظر آنے کی سالانہ اوسط کیا ہے۔ مثلاً اسپین کے جنوبی علاقہ میں اوسطاً دس سال میں ایک بار قطبی نور نظر آتا ہے لیکن رفتہ رفتہ شمالی خطۂ فرانس میں سالانہ پانچ کی اوسط ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ آئرلینڈ کے شمالی حصوں میں رہنے والے اوسطاً ایک سال میں تیس بار اسی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اگر اسی طرح بڑھتے چلے جائیے تو

شٹ لینڈ میں ایک شاہد سالانہ اوسطاً ایک سو بار اِن کا مشاہدہ کرتا ہے فرٹز کے منحنیات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آئیس لینڈ اور شٹ لینڈ کا درمیانی منحنی نور شمالی کے اعظم تعدّد کا منحنی ہے یعنی اس کے بعد شمال کو اور جنوب کو تعدّد کم ہوتا جائے گا۔ اعظم تعدّد کا منحنی غیر منتظم شکل کا ناقص ہے۔ فرٹز کے منحنیات امریکہ میں یورپ کی بہ نسبت زیادہ نیچے کو اترے ہوئے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ قطبی نور کا تعدّد کینیڈا اور ممالک متحدہ امریکہ میں زیادہ ہے۔ بہ نسبت اُن ممالک یورپ کے جو اُن ہی عرض بلد میں واقع ہیں۔

نور شمالی کے نظر آنے کے لئے سب سے اہم شرط یہ ہے کہ آفتاب اُفق سے چند درجہ نیچے ہو جائے یہی وجہ ہے کہ بالکل شمال میں واقع ہونے والے ممالک میں عرصہ دراز تک کوئی نور نظر نہیں آتا۔ اسی وجہ سے قطبی نور کے تعدّد میں سالانہ تبدیلیاں مشاہدہ میں آتی رہتی ہیں۔ وسطِ گرما میں تو یہ قطعاً مفقود ہوتے ہیں۔ اِن تبدیلیوں کی وجہ محض سورج کی روشنی ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی مطلع کے ابر آلود ہونے یا نہ ہونے سے بھی قطبی نور کے تعدّد پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ راسِ تھارسڈن (THORDSEN) میں جو شمالی نصف کرہ میں ۶۹° عرض بلد پر واقع ہے متواتر مشاہدات سے معلوم ہوا ہے کہ جب مطلع بالکل صاف ہو تو قطبی نور کی رویت کا اضافی تعدّد ایک سو ہوتا ہے لیکن جوں جوں مطلع ابر آلود ہوتا جاتا ہے اس تعدّد میں معتدبہ کمی ہونے لگتی ہے یہاں تک کہ جب ساری فضا پر بادل چھا جاتے ہیں تو ان کی تعداد اقل ترین ہوتی ہے۔ اگر آسمان کے بالکل صاف ہونے کی حالت کو صفر سے اور بالکل ابر آلود ہونے کو ۱۰ سے تعبیر کیا جائے تو

بادلوں کی تعداد	۰	۱، ۲	۳، ۴	۵، ۶	۷، ۸	۹، ۱۰
اضافی تعداد	۱۰۰	۸۲	۵۷	۴۶	۲۶	۸

مشاہدات کی یہ فہرست جو راسِ تھارسڈن پر حاصل کی گئی ہے اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ قطبی نور میں جو سالانہ تبدیلیاں ہوتی ہیں اُن کی ایک وجہ فضا میں بادلوں کا اٹھنا بھی ہے ماہر مشاہدین نے مفصل جداول تیار کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص مہینہ سے لے کر دوسرے اور تیسرے سال پھر اسی مہینہ تک ان کے دکھائی دینے کی تعداد کا اوسط حاصل کیا جائے تو ایک سال سے دوسرے سال تک کس قدر فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ فرق بھی باضابطہ اور منتظم شکل میں پیدا ہوتے ہیں، یعنی ان کے ادوار معین ہیں۔ یہ دور دہ سالہ یا بیست سالہ ہوتے ہیں کہ اس زمانہ کے گذر جانے کے بعد وہی کیفیت دوبارہ عود کر آتی ہے۔

ان سالانہ تبدیلیوں کے ساتھ ہی قطبی نور کے تعدّد میں روزانہ تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اکثر جگہوں پر جو مشاہدات حاصل کئے گئے ہیں اُن پر دن کی روشنی کا اثر غالب ہے کیونکہ روشنی کے اثر سے

قطبی نور کی رویت میں اختلاط پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہم اُن اسباب کا مشاہدہ کرنا چاہیں جن کی وجہ سے قطبی نور کی رویت اور قیام پذیری رات کے وقت زیادہ ہوتی ہے تو اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ عرضِ بلد کے مقامات پر موسم سرما میں قطبی نور کے تعدّد میں روزانہ تبدیلیوں کو بالتفصیل مشاہدہ کرنا چاہیئے۔ اس قسم کی کوششوں سے جو مشاہدات راس نفارسٹڈن اور جان مین (JAN MAYEN) پر حاصل ہوئے ہیں اُن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نومبر، دسمبر اور جنوری میں اس منظر پر جو اثر پڑتا ہے وہ زیادہ تر دن کی روشنی کی وجہ سے ہے کیونکہ ایسے مہینوں میں جبکہ دن اور رات مساوی ہوتے ہیں۔ جو مشاہدات حاصل کئے گئے اُن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مندرجۂ بالا ہر دو مقامات پر نتائج ایک ہی ہیں۔ ہم بالکلیہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ قطبی نور کے تعدّد میں جو روزانہ تبدیلی مشاہدہ ہوتی ہے اُس کی وجہ محض روشنی ہی ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو صبح یعنی قبل زوال اُسی قدر مشاہدات حاصل ہونے چاہئیں جس قدر کہ شام میں یعنی بعد زوال حاصل ہوتے ہیں لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ تمام موسموں میں شام کو نظر آنے والی تعداد صبح میں نظر آنے والی تعداد سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ تجربہ سے یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کے ایک ہی شمار والے عرضِ بلد پر شام کو نظر آنے والے قطبی نور کی تعداد ایک ہی ہوتی ہے۔ مثلاً البجیکا (BELGICA) اور جان مین (JAN MAYEN) پر مشاہدات کی فہرست ایک ہی ہوگی۔ قدرت کا یہ بھی ایک قانون پایا گیا ہے کہ شام میں نظر آنے والی تعداد، صبح میں نظر آنے والی تعداد سے ہمیشہ زیادہ ہو۔ محققین کی ایک جماعت نے ۱۹۰۴ء میں یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ان کا ہ، فی صدی نصف شب سے اول ہی ظاہر ہو جاتا ہے۔

مندرجہ بالا بحث قطبی نور سے بحیثیت مجموعی متعلق ہے لیکن اگر قطبی نور کی مختلف اقسام کیلئے علٰحدہ علٰحدہ مشاہدات حاصل کئے جائیں تو معلوم ہوگا کہ مختلف شکلیں، روزانہ تبدیلی میں بہت بڑی حد تک ایک دوسرے سے اختلاف رکھتی ہیں۔ قوسوں، دھاریوں یا اگر عمومیت کے رنگ میں دیکھا جائے تو قطبی نور کی زیادہ دیرپا اور منضبط شکلوں کا تعدّد رات کے پہلے حصہ میں عام طور پر زیادہ ہوتا ہے۔

قطبی نور پر چاند کی روشنی کا بھی قابلِ لحاظ اثر ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی رویت کا ایک قمری دور بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی چاند کی روشنی میں کمی اور اضافہ سے قطبی نور کا اختلافِ رویت ایک باضابطہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ قمری روشنی کی وجہ سے قطبی نور کی رویت پر جو اثر پڑتا ہے وہ دراصل خود قطبی نور کی ذاتی چمک اور وقت و مقام کے تابع ہے۔ بعض ماہرینِ فن نے اس دور

کی مدت ۲۷ دن بتلائی ہے۔

قطبی نور کا تعدد کسی سال زیادہ اور کسی سال کم ہوتا ہے۔ اکثر مقامات پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تعدد کی تبدیلی سورج میں ظاہر ہونے والے داغوں کے بالکل مشابہ ہے۔ ایسے مبسوط جداول مرتب ہو چکے ہیں جن سے ہم عصری معطیات کا پتہ چلتا ہے اور سورج کے داغ اور مشاہدہ شدہ قطبی نور کے تعدد کا ربط معلوم ہوتا ہے۔ ان جداول کی مدد سے ہم پر یہ واضح ہوتا ہے کہ جن سالوں میں سورج کے داغ زیادہ نظر آئے ہیں اُن ہی سال میں قطبی نور بھی زیادہ مرتبہ نظر آیا ہے۔ اور اس کے برعکس بھی درست ہے۔ لیکن اس سے اِن تعددوں کے درمیان کوئی رشتہ نہیں پیدا ہوتا کیونکہ اکثر اِن ہر دو مظاہر کے اعظمات اور اقلات ایک ہی سال میں نہیں واقع ہوتے۔ لیکن اس کے برخلاف بعض بعض سال ایسے بھی ہیں جن میں قطبی انطباق ہو جاتا ہے۔

قطبی نور کا نصف النہار۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب کوئی نوری قوس نمودار ہو تو اس کی چوٹی مشاہد کے مقناطیسی نصف النہار میں ہوتی ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد جو کچھ بھی ہو مگر یہ خیال غیر معمولی اہمیت رکھتا اگر در اصل ایسا ہی ہوتا۔ معتدل عرض البلد پر قوسین سمت الراس کے بہت کم دکھائی دیتی ہیں لیکن وہ عموماً کافی بلندی پر ہوتی ہیں۔ اعلیٰ عرض البلد پر اوسط بلندی کم ہوتی ہے۔ مقناطیسی سوئی کی سمت عرض البلد اور طول البلد کی تبدیلی سے بدلتی جاتی ہے اور اس میں روزانہ تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ پس عام طور پر مشاہد کے مقناطیسی نصف النہار اور وقت و مقام کے لحاظ سے سوئی کی سمت میں فرق ہونا چاہیئے۔ مشاہدات یہ بتلاتے ہیں کہ قطبی نور کے قوس کا راس (AZIMUTH) مقناطیسی نصف النہار سے ہٹا ہوا ہوتا ہے۔ دھاریوں کے لئے بھی یہی بات دیکھنے میں آئی ہے۔

قطبی نور کا سمت الراس:۔ قطبی نور کی ایک ایسی وضع بھی ہے جس کا تعلق قریبی طور پر ارضی مقناطیسیت سے پایا جاتا ہے۔ مشاہد کی آنکھ اور تاج نما (CORONA) کے مرکز استراق کو ملانے والا اخط عام طور پر میلانی سوئی (DIP NEEDLE) کی سمت سے منطبق ہوتا ہے۔

قطبی نور اور مقناطیسی طوفان:۔ معتدل عرض البلد میں جب قطبی نور دکھلائی دیتا ہے تو اس سے ارضی مقناطیسیت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ یورپ کے ایک کثیر عصہ پر دکھائی دینے والے نور کے ساتھ ساتھ ہمیشہ مقناطیسی طوفان اور ارضی رَو بھی ہوتی ہیں۔ سب سے بڑے طوفان اور سب سے بڑے قطبی نور ایک ساتھ مشاہدہ ہو چکے ہیں۔ ۱۸۵۹ء سے لے کر ۱۹۰۵ء

تک اس کی مختلف مثالیں ملتی ہیں کہ جب کبھی قطبی نور نہایت نمایاں طور پر نمودار رہا ہے تو اس کے ساتھ ہی مقناطیسی طوفانوں کی شدت بھی پائی گئی ہے۔ ان میں تو بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ شمالی اور جنوبی ہر دو نصف کروں پر ایک ساتھ اس قسم کے مظاہر کے پیدا ہونے سے ساری روئے زمین پر مقناطیسی طوفان برپا ہو گئے۔ اعلیٰ عرض بلد پر جہاں "نور" اور مقناطیسی طوفانوں کی کثرت ہے اس میں یکسانیت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ شمالی حصوں میں انگریز اور ڈینی سیاحوں نے یہ دیکھا ہے کہ قطبی نور کے ظاہر ہونے کے باوجود کوئی مقناطیسی ہیجان پیدا نہیں ہوا اور یہ حالت عموماً اس وقت مشاہدہ ہوئی جبکہ نور منفوذ تھا جب قطبی نور میں نمایاں حرکت ہو اور رنگ میں بھی معتدبہ تبدیلی ہوتی رہے تو مقناطیسی طوفان ہی لازمی طور پر مشاہدہ ہوئے ہیں سنہ ۱۸۹۲ء میں ایک خاص بات مشاہدہ میں آئی ہے لفٹننٹ ویڈل (VEDEL) کی جماعت نے اسکورسبی ساونڈ (SCORESBY SOUND) پر یہ دیکھا کہ ایک نوری پردہ معتدبہ رفتار کے ساتھ جنوب کی طرف سے روانہ ہوا اور ان کے سروں پر سے ہوتا ہوا شمال کی طرف چلا گیا۔ جوں جوں پردہ قریب ہوتا گیا قطب نما کی سوئی مغرب کی طرف ہٹنے لگی اور جب وہ بالکل سمت الراس پر آگیا تو اہتزاز ہونے لگے۔ بعد ازاں جب شمال کی طرف اتر آیا تو سوئی مشرق کی طرف منصرف ہو گئی۔ پالسن (PAULSEN) کا خیال ہے کہ سوئی کا یہ عمل ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح کہ ایسی حالت میں ہونا چاہئے جب نوری پردہ فضا میں حرکت کرے اس وقت فضا میں ایسی برقی رویں گزرتی ہیں جو زمین سے نکلتی ہوئی معلوم ہوں۔ (TASINSAK) میں اس سے کسی قدر مختلف واقعہ دیکھا گیا۔ عموماً پردہ سمت الراس پر پہنچنے کے بعد اسی طرف واپس ہو جاتا ہے جس طرف سے آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مقناطیسی سوئی مشرق یا مغرب کی طرف منصرف ہوتی ہے بلحاظ اس کے کہ پردہ شمال یا جنوب سے آتا ہوا دکھائی دے۔ جب پردہ واپس ہوتا ہوا دکھلائی دیتا ہے تو اس انحراف میں بھی انخلاط واقع ہوتا ہے۔

قطبی نور کا تعلق مقناطیسیت سے اس طرح پر بھی واضح ہے کہ آئی سو حیازم (ISOCHASM) میں جو منطقہ شمالی نصف کرہ کے اعظم تعدد کو ظاہر کرتا ہے اس میں نظر آنے والے قطبی نور عموماً مقناطیسی شمال کی سمت میں ہوتے ہیں۔ اس سے بلند تر عرض بلد پر نور جنوبی سمت میں نظر آتا ہے۔ ان ہر دو حصوں میں اضافی تعدد کا انحصار وقت رویت، قسم نور

موسم اور سورج کے داغوں کے دور میں اُس سال کے مقام پر ہوتا ہے۔ جان مین (JAN MAYEN) میں ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۳ء تک نظر آنے والے ،، قطبی نوروں میں ۸۸ ایسے تھے جو جنوب میں دکھلائی دئیے۔ ۴۴ شمالی سمت میں اور باقی ۵۴ سمت الراس پر (TASINSAK) میں نظر آنے والے قطبی نوروں کا اوسطاً فی صد حسب ذیل ہے۔

شمال ۱۰ فی صد، شمال مشرق ۹ فی صد، مشرق ۹ فی صد، جنوب مشرق ۶ فی صد، جنوب ۲۴ فی صد، جنوب مغرب ۹ فی صد، مغرب ۹ فی صد، شمال مغرب ۵ فی صد، اور باقیوں میں سے ۱۵ فی صد سمت الراس پر پائے گئے اور ۴ فی صد سارے آسمان پر پھیلے ہوئے تھے۔

قطبی نور کی حرکت کے متعلق بھی معلومات حاصل کئے گئے ہیں (JAN MAYEN) پر نظر آنے والے نوروں میں قوسوں کا ۶۲ فی صد شمال سے جنوب کی طرف حرکت کرتا ہوا پایا گیا اور (THORDSEN) پر ۸۰ فی صد بعض بعض اوقات قوسین کی ظاہری حرکت بہت ہی پیچیدہ ہوتی ہے۔ مثلاً بعض وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک سرا حرکت کر رہا ہے گویا دوسرے سرے کے اطراف گردش ہو رہی ہے کبھی دونوں سرے متضاد سمتوں میں گردش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے وسط میں سے گزرنے والے انتصابی محور کے گرد گردش ہو رہی ہے۔

بلندی:۔ فن انجینیرنگ میں مساحت کا ایک خاص اور مستند طریقہ ہے جس کو تھیوڈولائٹ سروے (THEODOLITE SURVEY) کہتے ہیں۔ اسی کے ذریعہ قطبی نور کے ارتفاع کی پیمائش کی گئی ہے۔ قوسوں کے نچلے سرے کی بلندی بعض بعض دفعہ سطح زمین سے ایک سو میل تک پائی گئی (THORSDEN) اور (BOSSEKOP) پر ان کی بلندی ۳۶ میل سے لے کر ۱۳۱ میل تک پائی گئی۔

چمک:۔ قطبی نور کی چمک جلد جلد بدلتی رہتی ہے۔ بعض اوقات اس کی چمک اس قدر زیادہ پائی گئی ہے کہ چاند کی روشنی، معمولی گیس شعلہ کی طرح معلوم ہوتی تھی جبکہ یہ (گیس شعلہ) برقی روشنی میں دیکھا جائے لیکن ایسے چمکدار قطبی نور شمالی منطقوں میں بھی شاذ و نادر دکھلائی دیتے ہیں۔ دھاریوں اور شعاعوں کے زیرین حصے عموماً زیادہ چمکدار ہوتے ہیں اور قوسین افق کے قریب زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ قوسوں اور دھاریوں کی صورت میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ ان میں روشنی کی موجیں دوڑتی ہوئی معلوم ہوں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ان موجوں کی روانی کی سمت کوئی لزمی

یا اختیاری چیز نہیں ہے۔ بعض صورتوں میں تبدیلیٔ مدت قطبی نور کے راس کے گرد ہوتی ہے۔ اور اس صورت کے مشابہ ہوتی ہے جبکہ کسی منور جسم کو تدویری گردش دی جائے (PATCHES) کی صورت میں روشنی کا اُتار چڑھاؤ ایسی کیفیت پیش کرتا ہے گویا سرچ لائیٹ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ڈالی جا رہی ہے۔

رنگ: قطبی نور کا عام اور معمولی رنگ سفید ہے۔ زیادہ چمکدار ہونے کی صورت میں زرد رنگ کی جھلک پیدا ہو جاتی ہے لیکن مدھم صورت میں چاندی کی طرح سفید ہوتا ہے۔ جب روشنی کی حدت زیادہ ہو اور جلد جلد بدلتی رہے تو سرخی بھی پیدا ہو جاتی ہے خصوصاً زیریں کناروں پہ ایسی صورتوں میں بعض بعض اوقات راس کی طرف سبز رنگ بھی دکھائی دیتا ہے پس قطبی نور کی ایک چمکدار شعاع کا زیریں حصہ سرخ یا لالی حصہ سبز اور درمیانی حصہ زردی مائل نظر آئے گا بعض اوقات زرد رنگ محض تقابلی طور پر پایا جاتا ہے۔ بنفشئی رنگ کبھی کبھی نظر آجاتا ہے عام طور پر نہیں۔

طیف: قطبی نور کے طیف میں بہت سے خطوط دکھائی دیتے ہیں۔ نہایت چمکدار نور کے لئے طول موج کی بھی پیمائش کی گئی ہے۔ مناظری نقطہ نظر سے ان خطوط میں ایک خط اس قدر ممتاز حیثیت رکھتا ہے کہ اس کو قطبی نور کا خط کہا جاتا ہے۔ یہ خط کریٹن (KRYPTON) کے نمایاں طیفی خط کے بالکل قریب واقع ہے گو اس پر منطبق نہیں۔ اس خط کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس کا وجود یا عدم اس بات کی ضمانت ہے کہ فضا میں نظر آنے والا نور قطبی ہے یا نہیں۔

اصوات: یہ مسئلہ متنازع فیہ ہے کہ آیا قطبی نور کے ساتھ فضا میں کوئی خاص آواز بھی سنائی دیتی ہے یا نہیں سب سے پہلے تو یہ امر قابل غور ہے کہ اگر کوئی آواز ہو بھی تو اس وقت تک سنائی نہیں دے گی جب تک کہ قطبی نور سطح زمین سے بہت قریب نہ ہو اور ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی نہ ہو۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ قطب شمال کے قریب ان آوازوں کی سماعت کا امکان ہے۔ کپتان ڈاسن (DAWSON) کا بیان ہے کہ خلیج ہڈسن کے قریب یہ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے اور اس میں شک نہیں کہ بعض صورتوں میں واضح اور صاف طور پر آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ آواز کوڑے کی شپاشپ کے مشابہ ہوتی ہے یا جہاز کے سب سے اونچے بادباں کی ہوا سے رگڑ ہونے پر جس قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے قطبی نور کے دکھائی دینے کے وقت اسی قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جوں جوں نور کی حدت میں کمی یا زیادتی ہوتی ہے، آواز بھی گھٹتی بڑھتی جاتی ہے۔ کپتان ڈاسن کا خیال ہے کہ اگر یہ آوازیں

محض قطبی نور کی وجہ سے تقیں تو پھر اس کو نہایت قریب ہونا چاہیئے۔

مصنوعی مظہر:۔ برک لینڈ (BIRKLAND) نے ایسی شکلیں مصنوعی طور پر پیدا کی ہیں جو مختلف قسم کے قطبی نوروں سے مشابہ ہیں۔ اس کے آلے میں ایک خلائی برتن ہے جس کے اندر ایک مقناطیسی کرہ ہوتا ہے۔ یہ کرہ زمین کو ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ کیفیت اس خلاء میں سے برقی اخراج کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے۔

نظریات:۔ فضائی برق میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ جوں جوں زمین سے فاصلہ بڑھتا جاتا ہے برقی قوۃ (ELECTRIC POTENTIAL) کی قیمت بڑھتی جاتی ہے اور مثبت ہوتی ہے۔ ارضی برق کو عموماً منفی خیال کیا جاتا ہے۔ اکثر مشاہدات سے جو شمالی منطقے میں حاصل کئے گئے ہیں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ فضا میں برقی قوت کی قیمت بلندی کے اضافہ سے بڑھنے کی بجائے گھٹتی جاتی ہے اور بعض اوقات گھٹ کر منفی ہو جاتی ہے۔ پالسن اور دیگر محققین قانونِ فطرت کی اس اہم تبدیلی کو محض قطبی نور کے وجود کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔

قطبی نور کے متعلق اکثر اختلافِ رائے ہے بعض محققین کا خیال ہے کہ قطبی نور بھی ایک خاص قسم کا فضائی اخراج برق (ATMOSPHERICAL ELECTRIC DISCHARGE) ہے۔ برک لینڈ ان کیتھوڈ (CATHODE) شعاعوں کو اس کی علت غائی بتلاتا ہے جو سورج سے خارج ہوتی رہتی ہیں۔ ناڑدمین (NARDMAN) کیتھوڈ شعاعوں کی بجائے ہرٹیزی امواج (HERTZIAN WAVES) کو اس کا اصلی سبب سمجھتا ہے۔ اس اختلافِ خیال کے علاوہ ارہی نیس (ARRHENIUS) کا بیان کچھ اور ہی ہے اس کا خیال ہے کہ منفی ذراتِ برق سورج کی فضا سے فضا میں پہنچتے ہیں۔ برک لینڈ اور ناڑدمین کے نظریات کی بنا پر ہم یوں تصور کر سکتے ہیں کہ سورج سے نکلنے والا برقی ہیجان ارضی فضا میں ثانوی کیتھوڈ شعاعیں پیدا کرتا ہے۔ یا یہ کہ ارضی فضا میں اس طرح رَوان (IONS) پیدا ہو جاتے ہیں کہ قدرتی اختلاف توی کے پیدا ہونے سے اخراج برق میں شدت پیدا ہو جائے۔ اس روانی حالت (IONIZED CONDITION) کو بہت زیادہ عرصہ تک قایم رہنا چاہیئے ورنہ قطبی نور کے گھنٹوں نظر آنے کی کوئی توجیہہ نہیں ہو سکتی۔ ان واقعات کی مدد سے کہ اکثر مقامات پر صبح میں قطبی نور کی حدّت اور تعدد میں نمایاں انحطاط ہوتا ہے اور رات میں رویت نور کا اوسط بڑھا ہوا ہوتا ہے اُن نظریات کو زیادہ تقویت پہنچتی ہے جو سورج سے نکلنے والے برقی ہیجان کی وجہ سے فضا میں رَوانوں کے پیدا ہونے کو ممکن اور قطبی نور کو اس کا لازمی نتیجہ بتلاتے ہیں۔

نفسیاتِ کھیل

از

محمد مظہر حسین صاحب بی۔ اے

تخیل[1]، تلازم اور توجہ کی طرح بعض مرتبہ "آزاد" ہوتا ہے اور بعض مرتبہ "مقید" یعنی ہم ان تخیلات کو جن میں صرف اُن واقعات کا احیا ہوتا ہے جو ہمارے پیش نظر مقصد کے لئے مفید ہوتے ہیں "مقید"۔ اور وہ جن میں ہمارا ذہن آزادی کے ساتھ عمل کرتا ہے اور جس میں کوئی متعین مقصد مد نظر نہیں ہوتا "آزاد" کہتے ہیں۔ اگر "مقید تخیل" کو خارج از بحث ہونے کی وجہ سے نظر انداز کر کے "آزاد تخیل" کی تحلیل کریں تو اس کی کئی صورتیں نظر آئیں گی جن میں "کھیل" بھی داخل ہے۔ "کھیل" کی مروجہ تعریف میں بقول اینجل اس کو ارادی عضلات کی آزاد لذت آفریں اور خود رو فعلیت کہا گیا ہے[2] جس میں تخیلات زیادہ عمل کرتے ہیں عام طور پر حکمائے نفسیات اس کا ذکر نہیں کرتے لیکن باوجود اس بے توجہی اور دانستہ نظر پوشی کے یہ "صورت" حکمائے جدیدہ کی نظروں سے اوجھل نہ ہو سکی اور بالآخر منوا ہی لی کہ اس کی بحث اتنی غیر اہم اور سادہ نہیں ہے جتنی کہ زمانہ سلف کی تنگ نظروں نے اسے بے اعتنائی کی مستحق سمجھ رکھا تھا۔ اس لئے اب ہم اجمالاً اس کے مختلف اہم نظریات کو بیان کریں گے اور دیکھیں گے کہ متأمل ذہن کے لئے کونسا نظریہ فطری اور عسیر الفہم ہے تاکہ اس کی مدد سے اس کی تمام گتھیاں سلجھ سکیں۔

قبل اس کے کہ ہم مختلف مقبول عام نظریات کے نکات مبہمہ پر انتقادانہ نظر ڈالیں یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ ہیجات یا محرکات اور جوابات کے غیر مشتبہ انکشافات کو ہماری رہنمائی اور صداقت تک رسائی کے لئے مع ان کے علائق اور وابستگیوں کے پیش نظر کر دیں تاکہ بحث ما بعد زیادہ سلیس اور عام فہم ہو سکے۔ کیوں کہ ہمارے تمام حرکات و سکنات، ہمارے تمام تخیلات و ارادات، غرض ہر ذہنی اور بدنی فعلیت کسی نہ کسی ہیج اور جواب کا

---

[1] ملاحظہ ہو وڈورتھ کی کتاب "(STUDY OF MENTAL LIFE)" باب ۱۹ صفحہ ۳۸۵

[2] اینجل کی نفسیات (PSYCHOLOGY) باب ۱۲ صفحہ ۳۵۹

مجموعہ ہوتی ہے بعض ماہرین نفسیات کی رائے ہے کہ کھیل کی کوئی مخصوص جبلت نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک خلقی میلان[1] ہوتا ہے ہم ان کے اس بیان پر قناعت نہیں کرسکتے تاہم اس پر غور کرنے سے پہلے ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے جیسا ہم نے ابتدا ہی میں کہا ہے کہ کھیل "آزاد تخیل" کی ایک صورت ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ اس میں "تخیل"[2] اور اختراع کے اجزا بھی پائے جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہم بچوں کے افعال کا ناقدانہ مشاہدہ کریں تو یہ عیاں ہوجائیگا کہ بچے یا تو کھیلنے کے لئے ایک نئی سادہ صورت ایجاد کرلیتے ہیں یا اپنے ماحول کے بدلنے کی صورت میں خود کو حالات کے موافق بنا لیتے ہیں[3]۔

یوں تو محقق کو انسانی زندگی کے مختلف مدارج میں اکثر "کھیل" دکھائی دیں گے لیکن فی الحال ہم دانستہ طور پر آسانی مفہوم اور وضاحت مطالب کی خاطر صرف بچوں اور حیوانوں کے کھیلوں کی طرف متوجہ ہوں گے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ ان مہیجات کی کیا نوعیت ہوتی ہے اور رجوابات کس قسم کے صادر ہوتے ہیں یعنی مہیجات سے جو حرکات صادر ہوتے ہیں ان کی غایت کیا ہوتی ہے۔ مہیجات یا محرکات اور جوابات کے متعلق سوالات کرنا تو بے حد آسان ہے لیکن ان کے جوابات حاصل کرنے میں لاانتہا دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے تاہم بچوں کے افعال کے مہیجات کے متعلق نہایت اطمینان کے ساتھ یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ کھلونا ہی اصلی چیز ہوا کرتی ہے[4] جو قوی ترین محرکات کا کام دیتی ہے۔ لیکن یہاں پر یہ اعتراض عائد ہوسکتا ہے کہ "کھلونے" سے کیا مراد ہے اور اس کی کس طرح تشریح کی جائیگی۔ یوں تو مختلف محققین نے مختلف طریقوں سے اس مشکل کو حل کرنے کی کوششیں کی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عامیانہ نقطہ نظر سے بلا پس و پیش آسانی سے یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ ہر وہ چیز جس سے بچہ کھیل سکے اس کے لئے کھلونا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تعریف بھی غیر منطقی ہے اور زیادہ تر معمولی اور پیش پا افتادہ باتوں پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہدینے سے ان روزمرہ چیزوں کی تشریح تو ہوجاتی ہے لیکن ان کی کوئی منطقی تعریف نہیں ہوتی۔

اگرچہ یہ نہاں راز آشکار ہوتا نہیں معلوم ہوتا تاہم وڈورتھ نے اس کو کسی قدر واضح کرنے کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے کہ جب کسی معروض میں حسب ذیل مشترک صفات پائے جاتے ہیں تو وہ مہیج کا کام دیکر "جواب" کا متمنی ہوسکتا ہے[5] اور یہی "کھلونا" ہے۔ وہ مشترک صفات کا سنگ اساس اس عام ترین خصوصیت کو قرار دیتا ہے کہ سب سے پہلے اس معروض کا حجم اتنا ہونا چاہئے کہ بچہ اس کو بلا تکلف متحرک کرسکتا ہو۔ گو اپنے معانی

---

[1] NATIVE [2] انگریزی میں اس کے مقابل کا لفظ (IMAGINATION) ہے

[3] وڈورتھ کی نفسیات باب ۱۹ صفحہ ۵۰۴ [4] اینجل کی نفسیات باب ۱۶ صفحہ ۳۵۹ [5] وڈورتھ کی نفسیات باب ۱۹ صفحہ ۵۰۹

کے لحاظ سے یہ بیان بھی اول الذکر کا نقشِ ثانی ہے لیکن اس کی تشریح میں ایسے لوازمات اور قیود وعائد کئے گئے ہیں کہ اس کے تمام عیوب دور ہو جاتے ہیں چنانچہ وہ خصوصیات اور اوصاف لاینفک حسب ذیل ہیں۔

(۱) ہر وہ چیز جو بالغ العمر انسانوں کے کسی چیز کا نمونہ ہو بچوں کے لئے "کھلونا" بن جاتی ہے۔ مثلاً ٹین کے سپاہی، ٹین کی موٹر، ٹین یا کافور کی گڑیا وغیرہ۔ اس قسم کے محرکات جو جوابات بچوں سے حاصل کرتے ہیں وہ ایک حد تک تقلیدی ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض دقیق النظر ماہرین کی رائے ہے کہ کھیل ایک ہیجانی وظیفہ ہے جس کا مصرف ان افعال کو پیدا کرنا ہے جن کی ضرورت بچوں کو آئندہ زندگی میں پڑنے والی ہے لہٰذا کھیل کی ان معنوں میں حیاتیاتی اہمیت رہ جاتی ہے[1]۔ اس پر ہم آگے چلکر مفصل بحث کریں گے۔

(۲) ہر وہ چیز جو شور پیدا کرتی ہے بچوں کے لئے بطور کھلونا کام آسکتی ہے۔ مثلاً سیٹی اور جھنجھنا وغیرہ۔

(۳) ہر وہ چیز جس سے بچہ کے حرکات کی رفتار میں اضافہ ہوتا ہے کھلونا بن جاتی ہے۔ مثلاً چکر کا جھولا وغیرہ۔

(۴) ہر وہ چیز جو بچوں کے دائرۂ عمل میں وسعت پیدا کر دے بچوں کے لئے کھلونے کے کام آسکتی ہے مثلاً گیند وغیرہ۔

(۵) ہر وہ چیز جو بالقوۃ متحرک ہو جائے بچوں کے لئے کھلونا ہو جاتی ہے مثلاً ٹین کی کلدار موٹر وغیرہ

(۶) ہر وہ چیز جو صورت پذیر ہو کھلونا بن جاتی ہے۔ مثلاً مٹی، برف وغیرہ۔ کیونکہ بچوں کی خوشی اس میں ہوتی ہے کہ وہ نئی چیزیں تعمیر کریں۔ اگرچہ والدین اسے محض کفایت شعاری قرار دیتے ہیں لیکن نفسیاتی حیثیت سے اس میں تعمیریت کا حقیقی میلان ہوتا ہے[2]۔

(۷) ہر وہ چیز جس کو بچہ بہ آسانی کھول یا بند کر سکے کھلونا بن جاتی ہے۔ مثلاً کتاب وغیرہ۔

(۸) اب سب سے آخری صفت یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو کشش ثقل کے مخالف کام کرے کھلونے کا کام دیتی ہے مثلاً کنکوا اڑانا وغیرہ۔

یہی وہ خصوصیات ممیزہ ہیں جن کے وجود پر وڈورتھ نے زور دیا ہے اور ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ بعض صورتوں میں محض ساتھی کا وجود کھلونے کے طور پر کام دیتا ہے۔ گویا اس لحاظ سے ساتھی بھی ایک طرح کا مہیج ہوتا ہے۔

اس موقع پر اس کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ حقیقی اور صحیح علم کا ایک ایسا مستحکم نظام جو

---

[1] میکڈوگل کی نفسیات (INTRODUCTION OF SOCIAL PSYCHOLOGY) باب سوم

[2] انجل کی نفسیات صفحہ ۳۶۱۔

تشکیک کے حملوں سے متاثر نہ ہوسکے قائم کرنا بے حد مشکل اور اہم ہے۔ لیکن وڈورتھ نے مہیجات کے متعلق قابل قدر بیان دیکر اعتراض کی بہت کم گنجائش رکھی ہے بنابریں جب تک اس سے زیادہ تشفی بخش بیان کوئی اور متائل ذہن ہمارے سامنے پیش نہ کرے اس وقت تک وڈورتھ کا یہ بیان ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔ یہاں تک تو مہیجات کی بحث تھی اب ہم دیکھیں گے کہ یہ مہیجات اپنے ایک کُن یا اشارہ سے کس قسم کے جوابات خلق کرسکتے ہیں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم اس ضمن میں کچھ اور کہیں یہاں پر کھیل اور "خود نمائی" کی لزومیت کی غلطی رفع کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا یہ تجربہ ہے کہ کھیل میں اکثر خودنمائی کی جبلت اگرچہ اور بھی جبلتیں پائی جاتی ہیں لیکن تمام جبلتوں سے زیادہ نمایاں رہتی ہے[۱]۔ اسی لئے بعض ماہرین نے نہ صرف اس حقیقت کی تائید ہی کی بلکہ اس امر کا دعویٰ بھی کیا کہ یہی ایک ایسی مشترک جبلت ہے جو کھیل کا لازمی عنصر ہے اور جو تمام کھیلوں میں پائی جاتی ہے۔ اس عقیدہ کی تائید میں وہ کہتے ہیں جب بچہ کسی مہم میں فتحمند ہوتا ہے تو خود کو بہادر تصور کرتا ہے۔ کیونکہ اس سے اس کے تصرف اور طاقت کا اظہار ہوتا ہے جس سے اسے بیحد خوشی ہوتی ہے اور وہ احترام کا طالب ہوتا ہے یہی اس کی خودنمائی ہے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں کہ خوشی یا خودنمائی کھیل میں اکثر نمایاں رہتی ہے لیکن یہی وہ اہم چیز نہیں جس پر کھیل کا کلیۃً انحصار ہو کیونکہ بعض مرتبہ عرق ریز کوششوں کے باوجود ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس وقت (اس میں شک نہیں کہ) گو احترام کا طبعی میلان مفقود ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس فقدان سے اگر قطع نظر کرلیا جائے تو کھیل بہ حیثیت کھیل ضرور موجود ہوتا ہے مثلاً اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض اشخاص ناکامی کے باوجود نہایت اطمینان کے ساتھ اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ گو نتیجہ ان کے حق میں ناموافق تھا لیکن کھیل کی فعلیت بیحد پرلطف تھی علاوہ ازیں خودنمائی میں شعورِ ذات کا دخل ہوتا ہے لہذا اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کا کوئی شعور حیوانات یا اطفال میں نہیں موجود ہوتا باوجود اس علم کے ڈاکٹر میکڈوگل کہتا ہے کہ حیوانات یا اطفال میں رقابت یعنے اپنے ابنائے جنس اور ہم رتبہ پر فوقیت لیجانے کا خیال پایا جاتا ہے۔ مثلاً مقابلہ کی دوڑ میں بچہ اس بات میں کوشاں نظر آتا ہے کہ وہ ساتھیوں پر سبقت لیجائے تاکہ اور وں کی نظروں میں خود پست ہمت اور کمزور نہ معلوم ہو اب اس کی ماہیت کے متعلق کہا یہ جاتا ہے کہ بلحاظ اصلیت اس میں اور کھیل اور مبارزت میں گہرا تعلق ہے حتیٰ کہ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ رقابت اور مبارزت ہم معنیٰ ہوتے ہیں لیکن میکڈوگل

---

[۱] یہ امر آگے واضح ہوگا کہ آیا اور بھی جلبتیں کھیل میں پائی جاتی ہیں یا نہیں لیکن سردست یہ تسلیم کرلینا چاہئے کہ کھیل کے ساتھ ایک مخصوص جبلت منلز ہوتی ہے۔

کہتا ہے کہ اگر رقابت اور مبازرت کو ہم معنی قرار دیا جائے تو رقابت کا فطرتی میلان یہ ہونا چاہئے کہ اپنے مخالف کا خاتمہ ہو جائے۔ بخلاف اس کے جب ایک چھوٹا بچہ اپنے ہم جماعت کو مشہور ہوتے دیکھتا ہے تو اس کا خون جوش کھانے لگتا ہے اور وہ رقیب کہلایا جاتا ہے لیکن اس رقابت کے یہ معنی نہیں کہ اس کا رجحان اپنے حریف کو برباد کرنے کا ہو یہی وجہ ہے کہ ہم جبلتِ مبازرت اور جبلتِ رقابت کو ہم معنی قرار نہیں دے سکتے کیوں کہ دونوں کے میلانات اور مہیجات مختلف اور علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ مہیجات کے متعلق یہ کہدینا کافی ہے کہ رقابت کسی ادنیٰ یا اعلیٰ کی ترقی سے رونما نہیں ہوتی بلکہ جب ہمارا ہم رتبہ کسی مہم میں کامیاب ہو جاتا ہے یا ترقی پاتا ہے جس کی وجہ سے ہم ہیچ نظر آتے ہیں تو بس یہی رقابت کا بدیہی مہیج بن جاتا ہے لیکن اس کے برخلاف جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے مبازرت کا مہیج مختلف تو ضرور ہوتا ہے لیکن یہ اختلاف زیادہ اہم نہیں ہوتا تاہم مبازرت اور رقابت میں اساسی فرق یہ ہے کہ مقدم الذکر کا لازمی عنصر غصہ ہے جس کی اہمیت کا پتہ ارتقا کے ابتدائی منازل میں چلتا ہے کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ غصہ اور لڑائی سوانح حیات کا ایک مستقل جزو رہی ہے لیکن موجودہ زمانہ میں تہذیب و تمدن کے مصلحانہ اثر سے یہ جزو ایک حد تک معدوم کر دیا گیا ہے یا بعض صورتوں میں اس کی شکل اس طرح بدل دی گئی ہے کہ قدیم حیوانی خط و خال کا پتہ بھی نہیں چلتا کیونکہ اب گالی گلوج اور معمولی لڑائی کی جگہ اخباری اشتہار بازی نے لے لی ہے لہذا آج کل مروجہ رقابت کو قدیم مبازرت سے ممتاز کرنا بعید مشکل ہے کیونکہ یہی آج کل قدیم مبازرت کی قائم مقام ہے تاہم اپنے اصلی معنی میں رقابت اخلاقی نقطہ نظر سے بعید بلند پایہ چیز ہے اور سمجھی بھی جاتی ہے۔ اس کی ماہیت کے متعلق امریکہ کے مشہور ماہر نفسیات ولیم جیمس[1] کو اختلاف ہے اس لئے وہ کہتا ہے کہ رقابت بعینہ وہی چیز ہے جس کو ہم "تقلید" کہتے ہیں۔ بلاشبہ تقلید اور رقابت میں بعید قریب کا رشتہ ہے لیکن متجسس دماغ کبھی دونوں کو ہم معنی قرار نہیں دے سکتا۔ کیونکہ بعض مرتبہ تقلید میں رقابت کی جبلت قطعی نہیں پائی جاتی اور جب ایسی صورت ہوتی ہے تو اس میں رقابت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں کہ بعض مرتبہ رقابت کی ابتدا تقلید سے ہی ہوتی ہے۔

جیمس کے اس خیال کو پیش نظر رکھکر انجیل بھی کہتا ہے کہ "رقابت تقریباً وہی ہے جس کو ہم عام طور پر کھیل کہتے ہیں اور جب کھیل کے ہیجان پر بحالت ترقی غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت جلد تقلید کی شکل و شباہت اختیار کر لیتا ہے اور کچھ مدت بعد اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کو تعبیری کہا جا سکے"[2]

[1] ولیم جیمس کی نفسیات (TEXT BOOK PSYCHOLOGY) باب ۱۲ صفحہ ۸۶۔

[2] "اصول نفسیات" باب شانزدہم۔

تو بہ الفاظ دیگر اس کے معنی یہ ہوئے کہ اینجل نے بھی ضمناً جیمس کے نظریہ کو قبول کر لیا ہے اس لئے جو اعتراض جیمس کے نظریہ پر وارد ہوتا ہے وہی اینجل پر بھی صادق آتا ہے کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ہر کھیل میں رقابت کا لازمی طور پر وجود ہو۔ بہر حال ان مشکلات کی بنا پر رقابت اور تقلید کو ہم معنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر میکڈوگل کہتا ہے کہ رقابت میں جو حالت ہوتی ہے اگر اس کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ جو حرکات جبلّت مبازرت میں سرزد ہوتے ہیں وہی رقابت میں بھی صورت پذیر ہوتے ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ اول الذکر کا میلان فنا کا ہوتا ہے اور ثانی الذکر کا غیر فنا کا۔

اگرچہ گزشتہ صفحات میں اس کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن وضاحت کی خاطر یہاں پر ایک مثال دیدینا غالباً غیر ضروری نہیں۔ میکڈوگل کہتا ہے کہ مقابلہ کی صورت میں ہمیشہ ایک پارٹی دوسری پر غلبہ حاصل کرنے کی خواہشمند ہوتی ہے۔ اس کے لئے پہلے ایک مدافعانہ پہلو اختیار کرتی ہے اور دوسری محارحانہ لیکن کچھ دیر بعد ممکن ہے کہ انقلاب کی کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ کایا پلٹ جائے اور وہ جو مغلوب ہوا تھی غالب ہو جائے اور غالب مغلوب۔ ایسی صورت میں کشمکش زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہے اور بالآخر کسی ایک پارٹی کو شکست ماننی پڑتی ہے۔ اس مثال میں میکڈوگل کہتا ہے کہ غالب و مغلوب کی جو دو صورتیں ہیں وہ جبلّت مبازرت کے مظاہرات کے بالکل متوازی ہیں۔ کیونکہ ان میں مدافعانہ اور محارحانہ دونوں صورتیں پائی جاتی ہیں لیکن فنا کا میلان مفقود ہوتا ہے۔ پس یہی رقابت ہے۔ اسی لئے بالکل سچ ہے کہ اگر رقابت میں غصہ کا عنصر شامل ہو جائے تو نفس رقابت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بہر کیف رقابت مبازرت تقلید اور کھیل میں بلحاظ اصلیت قریب کا رشتہ ہے۔

بہر حال یہ تو ایک ضمنی بحث تھی اور ہم کہہ یہ رہے تھے کہ خود نمائی یا داد خواہی کی جبلّت مبنی ہوتی ہے شعور ذات پر لہٰذا اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہی کھیل کی اہم مشترک جبلّت ہوتی ہے تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بچہ میں شعور ذات بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ ہمارا عقیدہ ہی نہیں بلکہ تجربہ بھی ہے کہ بچوں میں اس قسم کا کوئی شعور نہیں ہوتا اس لئے یہ دعویٰ کہ تمام کھیلوں میں جبلّت خود نمائی کا وجود ہوتا ہے ایک بے معنی اور مستلزم متناقص مفروضہ نظر آتا ہے۔ بلاشبہ اس سے قطعی انکار نہیں کہ بعض حالتوں میں بچوں کی اس سے تشفی نہیں ہوتی کہ دوسرے ان کی خواہشات کو عملی جامہ پہنائیں بلکہ وہ اپنی قدرت کا اظہار کر کے دوسروں کی داد کے خواہاں ہوتے ہیں لیکن اس قسم کے مستثنیات سے یہ کلّیہ قائم کرنا کہ تمام کھیلوں میں خود نمائی کی جبلت پائی جاتی ہے محیر العقل ضرور ہے۔ کیونکہ اکثر مثالوں میں "خود نمائی" کے بجائے "راز جوئی" "تجسس" اور خوف وغیرہ کی جبلّتیں اصلی عمود اور سہارا لیتی ہیں۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کھیلوں کے حرکی[1] جوابات کسی ایک جبلت کا نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف جبلتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اور خود کھیل کی کوئی مستقل بالذات جبلت نہیں ہوتی بعض متجسس دماغوں کو اس سے اتفاق نہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ اختلاف اور تنوع کے باوجود کھیل کی ایک مستقل اور علحدہ مخصوص جبلت ہوتی ہے اس دعوے کے موافقین اور مخالفین دونوں کے استدلالات پر نہایت احتیاط کیساتھ آئندہ بحث کیجائیگی۔ بالفعل ہم ماہیت کھیل کے مختلف نظریات پر غور کریں گے۔

کھیل کے نظریئے

(الف) شلر و اسپنسر کا نظریہ ماہیت کھیل کے جدید نظریات میں سے سب سے قدیم نظریہ جرمن کی مایۂ ناز ہستی شلر[2] کا ہے۔ حسن اتفاق ہے کہ شلر کی متجسس نگاہوں نے اپنی کاوشوں کی مسافت کو طے کر کے جس نقطہ کو آخری منزل قرار دیا تھا اسی کو اسپنسر[3] نے بھی اپنا گوشۂ قناعت سمجھا اسپنسر کہتا ہے کہ اگر ہم حیوانات کے تمام افعال پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ادنیٰ درجہ کے حیوانات کی زندگی اس قسم کی ہوتی ہے کہ اُن سے صرف اپنی ضروریات کو رفع کرنے کے لئے افعال سرزد ہوتے رہتے ہیں اور بعض صورتوں میں وہ بڑی دقتوں کے باوجود اپنی تشنگی کو بجھا نہیں سکتے کیوں کہ ان کی ضروریات ان کے قوی سے زیادہ ہوتی ہیں۔ اس کے برخلاف ارتقاء کے اعلیٰ منازل میں معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض حیوانات میں قویٰ زیادہ نظر آتے ہیں اور ضروریات کم معلوم ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ نظام قدرت میں جو چیزیں یا مظاہرات وقوع پذیر ہوتے ہیں ان کے علل و اسباب بھی ضرور ہوتے ہیں چنانچہ اسی بنا پر اگر حیوانات کے اس تفاوت کی وجہ سے ان کی امتیازکن خصوصیات کو معلوم کرنے کی کوشش کریں تو اس حقیقت کو بلا پس و پیش ماننا پڑیگا کہ ترقی یافتہ طبقہ میں توانائی ضرورت سے زیادہ اور ادنیٰ طبقہ میں ضرورت سے کم ہوتی ہے اسی مظاہرہ کی بنیاد پر اسپنسر نے اپنا ایک نظریہ قایم کیا ہے جس کی رُو سے وہ کہتا ہے کہ جب فاضل

---

[1] Motor

[2] جرمنی کا مشہور شاعر اور ڈرامانویس (J. C. FREEDRICK VON SCHILLER) سنہ ۱۷۵۹ء تا سنہ ۱۸۰۵ء

[3] انگلستان کا شہرہ آفاق فلسفی (HERBERT SPENCER) سنہ ۱۸۲۰ء تا سنہ ۱۹۰۳ء

توانائی زیادہ عرصہ تک مستعمل نہیں ہوتی تو کھیل کی فعلیت کے ذریعہ اس کا اخراج کیا جاتا ہے۔[1] اپنے اس بیان کو اس نے چند مثالیں دے کر زیادہ عسیر الفہم بنانے کی کوشش کی ہے چنانچہ وہ پالتو بلی کی مثال دے کر کہتا ہے کہ بلی ایک شکاری جانور ہے اور پالتو ہونے کی وجہ سے اس کی توانائی محفوظ رہتی ہے لیکن یہ فاضل جمع کردہ توانائی کے راستے بالآخر معمولی ہیجان سے کھل جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایسی صورت میں وہ بعض مرتبہ درخت کو کھرچتی یا زمین کو نوچتی ہے یا اور اسی قسم کے مختلف حرکات کرتی ہے لیکن یہ یاد رہے کہ اس کے اس قسم کے تمام افعال غیر ارادی ہوتے ہیں۔ اسی طرح اسپنسر نے ایک اور مثال چوہے کی دی ہے جس کی بابت وہ کہتا ہے کہ جب وہ مقید کر لیا جاتا ہے تو مختلف چیزوں کو نوچنا شروع کرتا ہے۔ حالانکہ اس فعل سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا تاہم وہ زائد یا فاضل عضوی توانائی کو خارج کرنے کا یہی طریقہ سمجھتا ہے یہی حالت اطفال کی بھی ہوتی ہے مثلاً بچی جب گڑیوں سے کھیلتی ہے تو وہ اپنی صلاحیت یا توانائی کا یہی مصرف قرار دیتی ہے کیونکہ جونہی وہ سنجیدہ اور متین افعال میں مشغول ہونے کے قابل ہوجاتی ہے اس میں اس قسم کے اصراف کی فعلیت تجربہ میں نہیں آتی۔ بہرحال مختصراً یہ کہ اسپنسر کے نزدیک کھیل ایک طریقہ ہے زائد اور فاضل توانائی کے اخراج کا لیکن اس کے کہنے کے مطابق اس بے ربط سلسلہ میں کسی نہ کسی قسم کی حسیت کا پایا جانا لازمی ہے۔

اسپنسر کے نظریہ پر تنقید یہ صحیح ہے کہ ظاہری طور پر یہ نظریہ عیوب سے دور معلوم ہوتا ہے۔ اور کھیل فاضل توانائی کے اخراج کی ایک صورت دکھائی دیتی ہے لیکن اگر باریک بینی سے کام لیا جائے تو دو نقائص کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کیونکہ اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت تک توانائی قائم رہے گی اسی وقت تک کھیل کی فعلیت بھی جاری رہے گی اور جب جمع خرچ مساوی ہوجائے تو اس فعلیت کا بھی خاتمہ ہوجائے گا۔ حالانکہ ہمارا یہ تجربہ ہے کہ بعض مرتبہ بچہ اس وقت تک کھیل کو جاری اور باقی رکھتا ہے جب تک کہ تکان سے مغلوب نہیں ہوجاتا اس تجربہ کی تشریح اور توضیح اسپنسر کے نظریہ کے بموجب یہ ہوگی کہ ایسی مثال میں فاضل جمع کردہ توانائی خرچ سے بہت کم ہوتی ہے۔ لہذا اس لحاظ سے یہ نظریہ مشاہدات کے خلاف پڑتا ہے کیونکہ اس سے مقابل کے اس اعتراض کی کہ بچہ توانائی کے ختم ہوجانے کے بعد تکان تک کیوں کھیلتا ہے؟ تشریح نہیں کی جاسکتی۔ اس نظریہ میں اس نقص کے علاوہ ایک اور اہم نقص یہ ہے کہ اگر ہم کسی نہ کسی طرح قصداً اس نقص کے نظر انداز کرنے پر خود کو دھوکہ بھی دے لیں تو بھی ہم کھیل کے تنوعات کی اس نظریہ سے توجیہہ نہیں کرسکتے دوسرے الفاظ میں اگر یہ سوال کیا جائے

---

[1] ملاحظہ ہو اسپنسر کی کتاب (PRICIPLES OF PSYCHOLOGY) حصہ دوم باب نہم صفحہ ۶۹۳۔

کہ مختلف عمر کے انسان کیوں کھیلتے ہیں؟ تو اس نظریہ کی مدد سے ہم اس کا جواب دینے سے قطعی معذور ہیں۔

(ب) کالگروس[1] کا نظریہ | اسپنسر کے ان تمام نقائص کو پیش نظر رکھتے ہوئے کالگروس نامی ایک جرمن فلاسفر نے اور ایک نظریہ قایم کیا جس کی بنا پر اس نے اپنے پیشرو کی تمام کمزوریوں کو رفع کرنے کی ممکنہ کوشش کی ہے۔ اس کے نزدیک کھیل "ایک[2] ہیجانی وظیفہ ہے جس کا مصرف یہ ہے کہ ان فعلیتوں کو پیدا کرے جن کی ضرورت آیندہ زندگی میں پڑنے والی ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ بچوں کے تمام افعال آیندہ زندگی کے سنجیدہ افعال کے لئے بطور تیاری سرزد ہوتے رہتے ہیں۔

اس نظریہ پر تنقید | ہو سکتا ہے کہ ان افعال کی اہمیت اس وجہ سے ہو کہ ان کی ضرورت بالغ العمری میں پڑے لیکن ڈاکٹر میکڈوگل جو اس نظریہ کا سب سے زیادہ مخالف ہے اعتراض کرتا ہے کہ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اس نظریہ کو صحیح ہی تسلیم کرلیں اور یہ مان لیں کہ کھیل میں سنجیدہ افعال کی ابتدائی مشق ہوتی ہے تو پھر یہ مشکل آپڑتی ہے کہ اگر یہ فعلیت فی الواقع مشق کے لئے ہے تو ہمیں ان تمام وازمات و علائم کے مظاہرات بھی لازمی اور ضروری ہیں جو اس وقتی جبلت میں قطعی پائے جاتے ہیں مثلاً غصہ کا فطرتی میلان یہ ہے کہ وہ حریف کو نقصان پہنچانے کی خواہش کرے اب جب کھیل میں اس کی تیاری کی جاتی ہے تو ضروری ہے کہ اس کے میلان کا بھی وجود ہو کیوں کہ بصورت دیگر اس کے معنی یہ ہوئے کہ مشق ناممکل اور ناقص ہوتی ہے۔

جب اس مشکل کی توجیہ کالگروس کے نظریہ سے نہیں ہوسکتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کھیل کی توجیہ نہیں ہوسکتی۔ اس مطالبہ کا جواب انگلستان کا مشہور فلسفی براڈلے[3] یوں دیتا ہے کہ اگر کھیل میں علائم و لوازمات رونما نہیں ہوتے یعنے فنا کے میلان و تاسف وغیرہ کا مظاہرہ نہیں ہوتا اور حریف مضر حرکات نہیں کرتا تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس تقلید میں اپنے حرکات کو قابو میں رکھا جاتا ہے تاکہ مہلک حرکات سرزد نہ ہونے پائیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ہر فرد کی دانستہ کوشش ہوتی ہے تاہم ان کے خلقی مظاہرات کو قطعی طور پر روک نہیں دیا جاتا اس لئے وہ رونما ضرور ہوتے ہیں لیکن نہایت ہی مبہم صورت میں جیسے جب دو بچے آپس میں لڑتے ہیں تو ایک دوسرے پر ضرب لگاتے ہیں لیکن نہایت احتیاط کے ساتھ صرف ایسے مقامات پر جہاں نقصان کا اندیشہ نہیں رہتا۔ میکڈوگل کو اس جواب سے تشفی نہیں ہوتی اس لئے وہ کہتا ہے کہ ترقی یافتہ یعنے بالغ العمر

---

[1] ملاحظہ ہو میکڈوگل کی کتاب (INTRODUCTION OF SOCIAL PSYCHOLOGY) باب سوم۔ نیز ہنٹر کی کتاب (PSYCHOLOGY) باب شانزدہم

[2] ملاحظہ ہو ہنٹر کی کتاب اصول نفسیات مترجمہ پروفیسر ولی الرحمن صاحب اسلیٹ نصاب جامعہ عثمانیہ[3] F.H. BRADLEY

اور عمر رسیدہ انسانوں میں ضبط یا قابو کی صلاحیت بلاشبہ پائی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ کس طرح ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اطفال میں بھی ضبط یا قابو کی صلاحیت ہوتی ہے جب کہ ان میں شعور ذات کا فقدان ہوتا ہے اس کے علاوہ ایک اور قباحت یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس لحاظ سے بچوں کے حرکات و سکنات کو متعین ماننا پڑتا ہے حالانکہ ہمیں اس کا بخوبی علم ہے کہ بچوں کے حرکات کا دارومدار صرف وقتی تہیجات پر ہوتا ہے یعنی وہ شتاب کار ہوتے ہیں۔

بہرکیف اس میں شک نہیں کہ براڈلے نے ایک حد تک میکڈوگل کے اعتراض کو معدوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس صورت میں بھی اعتراض اصلی حالیہ باقی رہتا ہے۔

پھر ڈاکٹر میکڈوگل کا دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ بعض کھیلوں کی اس نظریہ کے مطابق توجیہ ہو جاتی ہے لیکن بعض کھیل کی ایسی مخصوص صورتیں بھی تجربہ میں آتی ہیں جن کی نفسیاتی توجیہ اس سے نہیں ہوسکتی۔

قطع نظر اس نقص کے ایک اور نقص یہ ہے کہ اس نظریہ کا اطلاق صرف بچوں یا حیوانوں کے افعال پر ہوتا ہے جس کی وجہ سے کھیل کا دائرہ اس قدر محدود ہو جاتا ہے کہ بالغ العمر انسانوں کے افعال (کھیل) اس میں داخل نہیں کئے جاسکتے اس لئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے افعال کی کس طرح توجیہ کی جائے گی اور ان کو کس چیز کی تیاری کہا جائے گا۔ علاوہ ازیں میکڈوگل کے اعتراضات یہیں ختم نہیں ہوتے بلکہ وہ آخر میں یہ بھی پوچھتا ہے کہ ہم کھیل میں اکثر اپنے ساتھی کو شکست دینا چاہتے ہیں جو کم و بیش ہر کھیل کا لازمی عنصر ہے تو اب اس کی کس طرح توجیہ کی جائے گی۔ اس کے جواب میں کالگروس خاموش نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر شانڈ کا نظریہ[1] کالگروس کے ان تمام نقائص کو ڈاکٹر شانڈ نے ایک نیا نظریہ قایم کرکے رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کھیل "مسرت"[2] کے ایک مخصوص کردار کا نام ہے اور اپنی تائید میں کہتا ہے کہ اگر ہم قدما کے خیال کے مطابق بازیچہ افعال کو زندگی کے سنجیدہ و رتین افعال کی نقل کہیں تو یہ سوال عائد ہوسکتا ہے کہ اس تقلید میں اور سنجیدہ افعال میں امتیاز کیسے قایم کیا جاتا ہے جبکہ دونوں صورتوں میں ایک ہی مقصد کے تحت حرکات سرزد ہوتے ہیں۔ اس کا جواب اسپنسر نے یوں دیا تھا کہ کھیل غیر ضروری اور خود رو حرکات کا مجموعہ ہوتا ہے جن کا کوئی لازمی مقصد نہیں ہوتا بخلاف اس کے سنجیدہ افعال متین اور نصب العین کو لئے ہوئے ہوتے ہیں بعض ماہرین کی اس سے تشفی نہیں ہوتی لہذا انہوں نے اس فرق کی گتھی کو اس طرح سلجھانے کی کوشش کی کہ گو کھیل میں مختلف جبلتیں روبکار ہوتی ہیں لیکن ان کی بصورت

---

[1] DOCTOR SHAND

[2] اردو میں JOY کے مماثل کوئی لفظ نہ مل سکا اس لئے ہم نے "مسرت" ہی پر اکتفا کیا ہے۔

موجودہ کوئی عملی اور مفید غایت نہیں ہوتی۔ یعنی بہ الفاظ دیگر ان کا کوئی عینی مقصد نہیں ہوتا۔ یہ بیان کالگروس کے نظریہ کے بالکل منافی ہے کیونکہ اس کی رُو سے کھیل کی فعلیت بیکار نہیں ہوتی بلکہ مستقبل کی تیاری ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں بفرضِ محال اگر اس بیان کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ ہم ایک طرف تو یہ کہہ رہے ہیں کہ کھیل میں مختلف جبلتوں کی تقلید ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ ان کی اصلی غایت مفقود ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کھیل کی کوئی متعین غایت نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے فقدان کا یہ مطلب نہیں کہ ہر قسم کی غایت مفقود ہوتی ہے۔ بلکہ غایت کسی نہ کسی قسم کا ضرور پائی جاتی ہے لیکن اس کی نوعیت بدل جاتی ہے اور موجودہ فعلیت کی غایت بعینہ وہ نہیں ہوتی جو اصل جبلت کی ہوتی ہے اسی بنا پر اب سوال ہوتا ہے کہ اس اختلاف کی کیا وجہ ہے۔ یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جذبہ کی حالت میں ہم جب اپنے مخالف کے مقابلہ کے قابل نہیں ہوتے تو اس سے بچنے کے لئے بھاگتے ہیں لیکن جب کھیل میں بھی فعلیت صورت پذیر ہوتی ہے تو اس کا مقصد عملی حالیہ وہی نہیں رہتا اس لئے یہاں سوال ہو سکتا ہے کہ اب ایسی صورت میں اس کی غایت کس قسم کی ہوتی ہے اس کا جواب عموماً یہ دیا جاتا ہے کہ اور جبلتوں کی طرح کھیل کی بھی ایک خاص جبلت ہوتی ہے اور جس طرح مختلف جبلتوں کے امتزاج میں جو جبلت نمایاں ہوتی ہے اس کی غایت دوسری غایتوں کو مغلوب کر لیتی ہے۔ بالکل اسی طرح جب کھیل کی جبلت غالب ہوتی ہے تو اس کو کھیل کی اصطلاح سے موسوم کیا جاتا ہے مثلاً چھپنے کی ایک آزاد جبلت ہوتی ہے اور اس کے خاص خاص مظاہرات ہوتے ہیں جس کی غایت بھی علیحدہ ہوتی ہے لیکن جب اس میں خوف کا جز شامل ہو جاتا ہے تو اس امتزاج سے اس مجموعہ کی غایت بھی وہ نہیں رہتی جو انفرادی طور پر خوف یا چھپنے کی ہوتی ہے بلکہ کلیتہً تبدیل ہو جاتی ہے اسی طرح جب کسی جبلت میں کھیل کی جبلت شامل ہو جاتی ہے تو اس مجموعہ سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ ان کے انفرادی اور خود مختار غایتوں کا قائمقام ہو جاتا ہے اس مندرجہ بالا بیان کی بنا پر بظاہر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کھیل کی بھی علیحدہ ایک جبلت ہوتی ہے کیونکہ بصورت دیگر غایات کے اختلاف کی توجیہہ ناممکن نظر آتی ہے۔

ان دشواریوں کو رفع کرنے کے لئے ہمیں یا تو کھیل کی جبلت کو ثابت کرنا پڑے گا (اس پر آگے بحث ہوگی) یا کوئی ایسی اہم خصوصیت دریافت کرنی پڑے گی جس سے اس اختلاف غایات کی تشفی بخش توجیہہ ہو سکے اس گتھی کو سلجھانے کی ڈاکٹر شانڈ نے ایک حد تک کوشش کی وہ کہتا ہے کہ ہر کھیل کی روح رواں مسرت ہے اور مسرت کی ماہیت کے متعلق اس کا خیال ہے کہ بلا شبہ عامیانہ نقطہ نگاہ سے "خوشی" اور "مسرت" کی نوعیت ایک ہی ہے اور ہم عام طور پر شدید خوشی کو مسرت یا مسروریت کہتے ہیں اور اس کے برخلاف شدید درد یا دکھ کو رنج لیکن نفسیاتی نقطہ نگاہ سے ایک مکمل اور منظم ذہنی کیفیت کو مسرت یا رنج کہا جاتا ہے جیسے زمانہ

کے بچھڑے ہوئے دو دوست جب آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو "مسرت" ہوتی ہے یہاں پر ملاقات ایک مرکب فعلیت ہے کیونکہ اس میں ادراک، شعور، تعلقات وزمان اور شناخت وخوشی کے عناصر شامل ہیں اور ہم اس پورے مرتب اور منظم مجموعہ کو مسرت کے نام سے یاد کرتے ہیں جس میں کئی عناصر کے ساتھ خوشی کا بھی ایک عنصر داخل ہوتا ہے یہی صورت رنج کی ہوتی ہے اس لحاظ سے یہ ظاہر ہے کہ خوشی کا عنصر صرف موجود ہی نہیں ہوتا بلکہ اکثر اس کا لازمی جز ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مسرت اور خوشی دونوں ہم معنی ہوتے ہیں۔ اس فرق کے علاوہ ایک اور مابہ الامتیاز یہ ہے کہ خوشی کو ہم کسی نہ کسی حصہ جسم کے ساتھ منسوب کر سکتے ہیں لیکن مسرت یا شادمانی کی حالت کے لئے کوئی حصہ متعین نہیں ہو سکتا جیسے خوشی حواس خمسہ میں سے کسی ایک کی فعلیت سے حاصل ہوتی ہے لیکن مسرت "ہم" میں ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور فرق یہ ہے کہ خوشی کی مفرد حالت میں شدت کی وجہ سے ہماری تمام تر توجہ سمٹ کر مجموعی حالت کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر مسرت شدید ہو جائے تو ہماری توجہ نفس مسرت کی جانب نہیں جائے گی بلکہ معروض پر زیادہ جمے گی۔ ان تمام امتیازات کے ساتھ ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسرت کی حالت میں معروضات متعین نہیں ہوتے بلکہ اس خصوص میں اس کی صورت بعینہ وہی ہوتی ہے جو جذبی حالتوں کی ہوتی ہے یعنی وہ خود اکثر معروضات کی تلاش کر لیتی ہے جیسے کہ غصہ کی حالت اختلال طبعی کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ اپنے خلقی رجحان کی بنا پر معروضات کو تلاش کرے یہی صورت "مسرت" کی ہوتی ہے اسمیں بھی اگر معروض موجود ہوتا ہے تو اس کو متعین کر لیا جاتا ہے یا اگر موجود نہیں ہوتا تو ہم کا خلقی مہیج معروضات کی تخلیق کی طرف راغب ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم شادی منانا چاہتے ہیں تو اس کے فطری رجحان کی بنا پر دوسروں سے ملاقات کرنا شروع کر دیتے ہیں یا تفریح کے لئے جا نکلتے ہیں۔ بہر حال مسرت کی زیادہ سے زیادہ تشریح ہو سکتی ہے نہ کہ اس کی منطقی تعریف کیوں کہ یہ ہمارے امکان سے باہر ہے اگرچہ دور جدید کے مشہور فلسفی اسپینوزا[1] کا خیال ہے کہ جب ایک تجربہ کے بعد دوسرا تجربہ امید کے مطابق ہوتا ہے تو ہم مسرور ہوتے ہیں اور یہی مسرت ہے لیکن یہاں اسپینوزا نے وہ مسرت، کو "امید" تک محدود کر دیا ہے اس لئے ہمارا خیال ہے کہ مندرجہ بالا امتیازات اسپینوزا کے ذہن میں قطعی نہیں تھے لہذا اب واحد صورت یہی ہے کہ ہم مسرت کی مختلف صورتوں پر ایک اجمالی نظر ڈالیں تاکہ مسرت محصور کی جا سکے لیکن یاد رہے کہ یہ بھی کوئی تعریف نہ ہوگی بلکہ تشریح۔

تنوعات مسرت | اس موقع پر اس کا اظہار ضروری ہے کہ جذبات میں ذہن اور جسم متحد العمل ہوتے ہیں لیکن

---

[1] BARUCH SPINOZA سنہ ۱۶۳۲ء تا سنہ ۱۶۷۷ء۔ دور جدید کا مشہور وحدت الوجودی فلسفی۔

جب ہم اپنی حرکی سازوسامان پر سرسری نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی فعلیت میں مکمل عصبی نظام متہیج نہیں ہوتا ہے بلکہ صرف نظام عصبی کے ایسے راستہ متحرک ہوتے ہیں جو اس فعلیت کیلئے معین اور منفرد ہو چکے ہوتے ہیں اور ان ہی کے ذریعہ احساسی تحریکات خارج ہوکر کامیاب مظاہرات پیدا کرتے ہیں اسی کو ہم عام طور پر "فعلیت" کہتے ہیں اب اگر مسرت کے متعلق بھی یہی کہا جائے کہ وہ بھی اسی کی پیداوار ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر ہمارے عضلات خواہ مخواہ بلا ارادہ متحرک ہو جائیں تو ان کی یہ فعلیت بھی مسرت کا باعث ہوتی ہے لیکن ہمارا یہ عینی مشاہدہ ہے کہ اس قسم کی بیکار حرکات میں مسرت کا نقدان ہوتا ہے لہذا یہ کہنا کہ مسرت اس قسم کے عضوی اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے قطعی غلط ہے مزید برآں اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ جب کسی فعل میں عضوی نظام بقات کے علاوہ خاص غایت بھی مدنظر ہوتی ہے تو اس میں ضرور ایک کیفی خصوصیت صورت پذیر ہوتی ہے جس کو اگر مسرت کہا جائے تو نامناسب نہیں یہ الفاظ دیگر مسرت نفس فعلیت میں نہیں بلکہ اس کے قبل یا بعد کے خیال میں پائی جاتی ہے مثلاً ڈاکٹر شانڈ کہتا ہے کہ کرکٹ ایک منظم فعلیت ہوتی ہے جس میں امید و بیم اور فکر و اندیشہ کا غلبہ رہتا ہے لیکن کھیل شروع ہونے سے پہلے یا جب کھیل ختم ہو جاتا ہے اور کامیابی حاصل ہو جاتی ہے جو اس فعلیت کی غایت ہوتی ہے تو مسرت ہوتی ہے بعینہ یہی صورت دیگر انواع مسرت کی ہوتی ہے یعنی یہ کہ مسرت کی انشراحی کیفیت یا تو فعلیت کے پہلے ہوتی ہے یا فعلیت کے بعد۔

شانڈ کے اس پیش کردہ اصول کے خلاف یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ بعض صورتیں ایسی بھی دکھائی دیتی ہیں جن کے نفس خیال میں مسرت کا نقدان ہوتا ہے جیسے بعض مرتبہ "آرام" میں بجائے مسرت کے کوفت کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً جب ہم کسی روز اپنا وقت بیکاری میں گنوا دیتے ہیں اور پھر شام کے وقت جبکہ سورج اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر آرام کے لئے پابہ رکاب ہوتا ہے تو ہمیں خیال آتا ہے ع۔

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ اس صورت میں مطالعہ باطن سے معلوم ہوتا "مسرت" کی بجائے کوفت موجود ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہمیں ناگواری محسوس ہوتی ہے اس کے جواب میں ڈاکٹر شانڈ کہتا ہے کہ جس حالت پر ہم حکم لگا رہے ہیں اگر اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں صرف آرام کا خیال ہی نہیں بلکہ کمزوری کا احساس بھی پایا جاتا ہے لہذا یہی وجہ ہے کہ نفس خیال سے ہمارے اصول کے موافق خوشگواری نہیں بلکہ ناگواری محسوس ہوتی ہے ورنہ اگر نفس خیال پر غور کیا جائے تو وہ ہر حالت میں یقینی خوشگوار ہوتا ہے اسی بنا پر مسرتوں کو "ابتدائی" اور "ثانوی" صورتوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور اس اصطفاف کی وجہ یہ ہے کہ بعض وجدان یا جذبہ پر موقوف ہوتے ہیں اور بعض قائم بالذات لہذا اول الذکر کو اصلی اور آخر الذکر کو ثانوی کہا جاتا ہے لیکن ہماری یہ تقسیم کسی اصول پر مبنی نہیں ہے اس لئے اس سے کوئی سائنٹفک صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ بہرحال مسرت

ذہنی صورتوں میں پائی جاتی ہے اور جب جذبہ یا وجدان کی آمیزش ہوتی ہے تو الم یا ناگواری کا پتہ چلتا ہے۔

ایک مشکل کا ازالہ اب موقع آیا ہے کہ ہم ڈاکٹر شانڈ کا بیان اختلاف غایات کے متعلق سنیں۔ وہ کہتا ہے کہ مسرت کی ایک علیحدہ غایت ہوا کرتی ہے کیونکہ بصورت دیگر اس کو نظام جذبی نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی غایت کے متعلق کہتا ہے کہ مسرت جسم کی طبعی فعلیت کو پیدا کرتی ہے اور یہی اس کی بالراست غایت ہوتی ہے۔

اب سوال ہوتا ہے کہ یہ غایت کیا ہے اور کن قوانین کے تحت یہ ظہور پذیر ہوتی ہے؟ اس کے جواب سے پہلے ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ خوشی اور مسرت کا رشتہ لازم و ملزوم کا نہیں کیونکہ بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جن میں آمیزش کی وجہ سے خوشی مسرت کی ضامن نہیں ہوتی بلکہ اکثر جسمانی یا ذہنی درد یا دکھ کا لگاؤ مسرت میں پایا جاتا ہے مثلاً ایک قومی لیڈر کا منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کو غلامی کی زہر آلود زنجیروں سے آزاد کر دے۔ اس نصب العین کی کامیابی کے لئے اکثر وہ طبعی اور جسمانی تکالیف کو برضا و رغبت برداشت کرتا ہے گو یہ تکالیف بظاہر ناقابل برداشت ہوتے ہیں اور دوسرے اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس کی اس کو پرواہ نہیں ہوتی اور "کئے جاؤ کوشش" پر کاربند ہوتا ہے۔ اب یہاں اس مثال میں خوشی کے عنصر کی بجائے رنج و مصیبت کے عناصر موجود ہوتے ہیں لیکن اس حالت سے بھی اسے "مسرت" ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہم خوشی کے وجود کو ہمیشہ قطعی طور پر سرور یت یا مسرت کا منطقی فعل قرار نہیں دے سکتے۔ اس تنبیہ کو پیش نظر رکھکر اگر ہم قوانین مسرت کو معلوم کرنے کی کوشش کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری طور پر تمام "مسرت" کے افعال بلا غایت اور بلا ہیجان نظر آتے ہیں لیکن اگر ان کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ غایت و ہیجان معدوم نہیں ہوتے بلکہ غیر شعوری طور پر نظر انداز کر دئے جاتے ہیں مثلاً ساکت و ساکن آرام کی مسرت کو بھی لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اصلی غایت میلاں مفقود نہیں ہوتے بلکہ موجود رہتے نہیں جیسے اگر آرام لینے والے کو اس کے میلان کے خلاف دق کیا جائے تو ایسی حالت میں وہ ہماری تمام کوششوں کا مقابلہ کرکے اصلی حالت کو بلا تغیر و تبدل برقرار رکھنے کی طرف مائل نظر آتا ہے لہذا یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مسرت کا سب سے اہم خلقی میلان یہ ہوتا ہے کہ خارجی معروض کو بلا تغیر برقرار رکھے اور اس کے اور ذہنی موضوع (خود) کے تعلق کو تا دیر قائم رکھے یہی مسرت کی بقا کے دو اہم قوانین ہیں۔ اس حقیقت کے واہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسرت جس کو ہم نے زود متغیر اور ساکن سمجھ رکھا تھا بقا کی تمنی اور تعلق کے اختتام کی دشمن ہوتی ہے کیونکہ بصورت دیگر بے چینی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ ماتھیو آرنلڈ[1] نے محض اسی بنا پر اپنی قوم کو بہت کچھ برا کہا ہے کہ اس کی قوم کے افراد صرف فطرتی مناظر کو فنا کرکے مصنوعی مناظر کو آراستہ کرتے تھے فطرتی مناظر ارنلڈ

---

[1] MATHEW ARNOLD

کی "مسرت" کے معروضات میں اس لئے وہ نہیں چاہتا کہ اپنے معروضات میں تغیر واقع ہو بس یہی اس کی غایت ہے

ان کے علاوہ ایک اور تغیر ناقابل لحاظ اساسی میلان یہ ہوتا ہے کہ مسرت کا معروض ہماری توجہ اور فکر کو اپنی طرف اس وقت تک قایم رکھتا ہے جب تک کہ مسرت فی نفسہ فنا نہیں ہو جاتی۔

ہمارے ان بیانات سے اس میں شک نہیں کہ "مسرت" کی غایت اور میلان کا پتہ چل گیا جو ایک اہم مرحلہ تھا لیکن قارئین کو یہ بھلانا نہیں چاہئے کہ معروض ذہنی اور خارجی دونوں طرح کا ہو سکتا ہے لہذا یہ مسئلہ حل طلب رہ جاتا ہے کہ اگر ذہنی معروض ہو تو اس کے میلان اور غایت کے وجود کی کیا صورت ہوگی؟ شانڈ کے خیال کے مطابق اس قسم کی تشکیک نے کئی وہم پرستوں کی بنا ڈالی ہے تحقیقات کی بنا پر یہ صاف دکھائی دیتا ہے کہ معروض کے ذہنی ہونے کی صورت میں ہم اس کو تمثال کی صورت میں باقی رکھتے ہیں اور یہی اس کا میلان بھی ہوتا ہے مثلاً کسی مہم کی کامیابی کی مسرت کو لیجیے یہ ایک ذہنی کیفیت ہے جس کو اگر ہم برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی تمثال قایم کر لیتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس پر سب کا اتفاق ہے کہ صحیح وقت پر موزوں حالات نہ ہونے کی وجہ سے بعض مرتبہ مسرت کی فعلیت میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے ایک دوسرا جذبہ رونما ہو جاتا ہے جس کو عام طور پر "غصہ" کہا جاتا ہے اسے مسرت کی بقا کے حق میں مضر ہونا چاہئے کیونکہ اس کا فطری خاصہ یہ ہوتا ہے کہ معروض کو تباہ کرے اور ہم نے ابھی کہا ہے کہ مسرت کی اہم خصوصیت بلکہ غایت یہ ہوتی ہے کہ معروض کو غیر متغیر صورت میں باقی رکھے لہذا جب غصہ کا عنصر شامل ہو جاتا ہے تو اس مزاحمت کے معنی یہ ہوں گے کہ تعلقات کو برقرار رکھنے کی خاصیت کا خاتمہ ہو جائے جس کا مطلب یہ ہے کہ "مسرت" کی کیفیت فنا ہو جائے۔ گو یہ خیال عام طبائع کے بالکل مناسب ہے لیکن ذرا تامل کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مزاحمت سے تعلق فنا نہیں ہوتا بلکہ زیادہ مستحکم اور نمایاں ہوتا ہے یعنی جتنی مزاحمت قوی ہوتی ہے اتنی ہی نمایاں رغبت ہوتی ہے یہاں تک کہ بالآخر مزاحمت کا خاتمہ ہو جاتا ہے تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہماری مسرت کی خواہش کو شعوری بنا لیا جائے۔

غرض یہی وہ اجزائے ترکیبی ہیں جن کی مدد سے غایت مسرت کو محسوس کیا جاتا ہے اور یہی وہ اہم خصوصیات ہیں جن کو قوانین مسرت کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

جب یہ ثابت کر دیا گیا کہ مسرت کی غیر شعوری غایت ہوتی ہے تو ضرور ہے کہ کھیل کی بھی کوئی غایت ہو کیونکہ ڈاکٹر شانڈ کے بیان کے بموجب مسرت کے ایک مخصوص کردار کا نام کھیل ہوتا ہے ابتدا میں یہ دقت پیش آتی ہے کہ اگر کھیل میں مختلف جبلی حرکات ظہور پذیر ہوتے ہیں تو اس اجتماع کی غایت کس نوعیت کی ہوگی کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ ان حرکات کی انفرادی غایات کا بالکلیہ فقدان ہوتا ہے۔ اسی دقت کو رفع کرنے کیلئے ڈاکٹر شانڈ کہتا ہے کہ ہم عام طور پر

تمام جبلتوں میں ان کے اپنی غایات کے علاوہ مختلف مظاہرات دیکھتے ہیں جو عام طور پر مشترک ہوتے ہیں لیکن جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہو جاتے ہیں تو انکی غایات میں بھی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اور اس امتزاج میں جو غالب جبلت ہوتی ہے اسی کی غایت دوسروں کی بھی غایت بنجاتی ہے بالکل اسیطرح جب فعلیت ایک نئے نظام جذبی میں جس کو مسرت کہا جاتا ہے داخل ہوتی ہے تو اس کی غایت بھی اس نظام جذبی کی غایت میں ضم ہو جاتی ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ کھیل کی غایت بھی وہی ہے جو "مسرت" کی ہوتی ہے یہی وہ پریشان کن مسئلہ تھا جس نے اکثر ماہرین کو بھٹکا دیا تھا چنانچہ ہم نے دیکھا کہ اسپنسر نے اس قسم کی فعلیت (کھیل) کو بیکار حرکات کا مجموعہ کہا ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ حرکات فعلی جب مختلف نظامات جذبات میں منسلک ہو جاتے ہیں تو انکی غایات مفقود نہیں ہوتیں بلکہ بدل جاتی ہیں ہاں اس موقع پر معترض کو ضرور موقع ہے کہ وہ اس تبدیلی کی نوعیت کے متعلق سوال کرے جسکے جواب میں شانڈ کہتا ہے کہ بلاشبہ مظاہرات کی اصلی غایات مفقود ہوتی ہیں لیکن ایک دوسری غایت ان کی قایم مقام بنجاتی ہے جس کی نوعیت وہی ہوتی ہے جو مسرت کے "نظام" کی غایت کی ہوتی ہے اور یہی وہ اہم غایت ہے جو ہر کھیل میں غیر شعوری طور پر موجود رہتی ہے کیونکہ ہم مسرت کے حصول میں اسقدر محو ہو جاتے ہیں کہ اس کے شعور کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔

اگرچہ ڈاکٹر شانڈ کی فکر و اجتہاد نے جس حسن خوبی سے اس مرحلہ کو طے کیا وہ قابل تحسین ضرور ہے لیکن معترضین کا ایک اور مطالبہ یہ ہے کہ کھیل میں عموماً دیکھا گیا ہے کہ اکثر حرکات یا مظاہرات کا اعادہ ہوتا ہے تو اب اس کی کس طرح توجیہ کیجائیگی۔ اس کے جواب میں شانڈ کہتا ہے کہ ہمارے تجربہ کی بنا پر ہم مسرت کے معروض کی دو صورتیں جیسا کہ گذشتہ صفحات میں کہا جا چکا ہے فرض کر سکتے ہیں ایک تو خارجی جو ہم سے آزاد ہوتی ہے اور دوسری ذہنی جس کا انحصار خود ہماری ذات پر ہوتا ہے۔ اب ہمارے عقیدہ کے مطابق خارجی معروضات کے متعلق نہایت آسانی کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انکو بلا اعادہ قائم رکھا جا سکتا ہے لیکن دوسری صنف کے ذہنی معروضات جن کو ہم عموماً کھیل کے زمرہ میں داخل کرتے ہیں بقا میں دقت پیش آتی ہے کیونکہ ان کے تغیر کا بیحد اندیشہ ہوتا ہے اسی لئے ہم مسرت کے رجحان کے موافق بقا کے لئے اکثر حرکات کا اعادہ کرتے رہتے ہیں مثلاً جب کسی شعر سے ہم زیادہ محظوظ ہوتے ہیں تو اسے بار بار دہراتے ہیں۔

بہرحال ماحصل یہ کہ کھیل کی غایت کے متعلق معترضین نے جن شکوک کا اظہار کیا تھا اس کا اسطرح ازالہ ہو جاتا ہے کہ کھیل میں اسکی غایت صریحاً شعوری طور پر ہمارے پیش نظر نہیں ہوتی لیکن غیر شعوری طور پر تمام صورتوں میں موجود رہتی ہے جس کا عام طور پر مزاحمت سے پتہ چلتا ہے۔

یہاں تک کھیل کی ماہیت کی بحث تھی جسکے متعلق مختلف نظریات بیان کئے گئے جن کے کذب و بطلان پر کافی بحث کر چکنے کے بعد ہماری نظر نے ڈاکٹر شانڈ کے نظریہ کو اعلیٰ منتخب کیا ہے جسکی بموجب اگرچہ بآواز بلند نہیں لیکن بقول کسی ظریف کے چشم و ابرو کے اشاروں سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ "کھیل کی بھی ایک مخصوص جبلت ہوتی ہے"

لہذا اب ایک عام صدا کا جواب دینا ہے کہ آیا کھیل کی کوئی خاص جبلت ہوتی ہے یا نہیں اس لئے اب ہم باقی ماندہ مضمون کو اسی بحث کے لئے وقف کرتے ہیں۔ (باقی آئندہ)۔

گنبدِ خضرا

(از جناب حاجی علی شبیر صاحب سررشتہ دار عثمانیہ عدالت العالیہ)

ذیل کا مضمون ہمارے کرم فرما مولوی علی شبیر صاحب کی کتاب "تاریخ مزاراتِ حرمین" کا (جو زیرِ طبع ہے) ایک پارہ ہے۔ مولوی علی شبیر صاحب اُن افراد سیر میں سے ہیں جنہوں نے ارضِ حجاز کے چپہ چپہ کی جغرافیائی اور وہاں کے قبور کی ایک ایک اینٹ کی، اپنے عینی مشاہدہ کے ذریعہ تاریخی تطبیق کی ہے" (مجلۂ مکتبہ)

حجرۂ شریف جسمیں حضورِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا مزارِ مبارک اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی قبریں ہیں، سب طرف سے بند ہے۔ قبروں تک کسی کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ اس حجرے کی چھت مدوّر کی قبہ نما ہے اس کے اُوپر ایک بلند قبہ ہے جس کا رنگ سبز ہے اسی وجہ سے اس کو گنبدِ خضرا کہتے ہیں۔ آنحضرتؐ کے زمانہ میں حجرۂ شریف پر ایک پست چھت تھی جو کھجور کی کڑیوں سے پٹی ہوئی تھی۔ بعد وفات جب آنحضرتؐ اس حجرے میں دفن ہوئے اسوقت بھی یہی چھت قایم رہی سنہ ۱۳ ہجری میں حضرت ابوبکرؓ یہاں دفن کئے گئے۔ اس کے بعد ۱۷ ہجری میں حضرت عمرؓ نے حجرۂ شریف کی دیواروں کو جو ٹہنیوں کی تھیں کچی اینٹوں سے بنوا دیا مگر حیثیت وہی رہی۔ سنہ ۲۴ ہجری میں حضرت عمرؓ اسی حجرے میں دفن کئے گئے لیکن قبروں پر ابھی تک کوئی گنبد نہ بنا۔ اور یہ حالت تقریباً اسی ۸۰ برس تک قایم رہی۔

سنہ ۹۰ ہجری میں جب عمرؓ بن عبد العزیز[1] نے بزمانہ ولید[2] بن عبد الملک مسجدِ نبویؐ کی توسیع کی تو اس حجرے کو بھی داخلِ مسجد کر کے تعمیر کرایا۔ حجرۂ شریف کی اصل دیواریں کچی اینٹوں کی رکھیں اور اُن کی اطراف ایک مخمس احاطہ نقشی پتھروں کا تیار کرایا۔ مگر دونوں میں سے کسی میں بھی دروازہ نہ تھا۔ حجرۂ شریف پر

---

[1] عمرؓ بن عبد العزیز خاندانِ بنی امیہ کے آٹھویں خلیفہ تھے۔ زمانہ ولید بن عبد الملک میں مدینے کے والی تھے مسجدِ نبویؐ کی تعمیر انہی کی زیرِ نگرانی ہوئی تھی جس کی ابتدا ۸۸ ہجری میں اور اختتام سنہ ۹۱ ہجری میں ہوا۔ اس کام پر تین سَو رومی و قبطی عیسائی مامور کئے گئے تھے اسی زمانہ میں مزاراتِ اقدس کا حجرہ بھی تعمیر کرایا گیا تھا۔ عمر بن عبد العزیز ڈھائی سال خلیفہ رہے۔ سنہ ۱۰۱ ہجری میں وفات ہوئی۔

[2] ولید بن عبد الملک خاندانِ بنی امیہ کا چھٹا خلیفہ تھا۔ سنہ ۸۶ ہجری میں تختنشین ہوا۔ سنہ ۹۷ ہجری میں وفات پائی۔

معمولی چھت کے علاوہ مسجد کی چھت سے کوئی سوا گز بلندی پر تختوں کا ایک سائبان پختہ اینٹوں کی منڈیر پر ڈالا جو مسجد کی چھت سے علیحدہ اونچا نظر آتا تھا اور اُس پر موم جامہ پڑا رہتا تھا۔ ساتویں صدی کے وسط تک مزار اقدس کی چھت کی یہ حالت رہی۔ اور اس پر قبہ تعمیر نہ ہوا۔

سنہ ۶۵۴ ہجری کی آتش زدگی[1] میں جب یہ چھت جل گئی تو اس کے بعد ملک منصور علی بن[2] معز و ملک الظاہر[3] رکن الدین سلاطین مصر و حجاز و شمس الدین یوسف بادشاہ یمن نے سنہ ۶۵۸ ہجری میں حجرہ شریف تعمیر کرایا۔ اور اس کی چھت بھی اسی وضع کی رکھی جیسی کہ عمر بن عبدالعزیز کی بنوائی ہوئی تھی یہ چھت بیس سال تک قائم رہی اس کے بعد سنہ ۶۷۸ ہجری میں ملک منصور قلاؤن[4] صالحی سلطان مصر و حجاز نے حجرہ شریف کی چھت پر ایک خوشنما قبہ تعمیر کرایا۔ یہ سب سے پہلا گنبد ہے جو مزار اقدس پر قائم کیا گیا۔ یہ گنبد نیچے سے مربع اور اوپر سے ہشت پہل تھا۔ اس پر لکڑی کے تختے کیلوں سے جمائے تھے۔ اور اُن کے اوپر سیسے کی چادریں منڈھی تھیں۔

سید جعفر برزنجی[5] اور اُن کے تتبع مولوی صبغۃ اللہ[6] صاحب ساکن مدراس مؤلف کتاب السکینہ باخبار

---

[1] کیفیت اس آگ کی یہ ہے کہ یکم رمضان سنہ ۶۵۴ ہجری کو سرشام ابوبکر بن اوحد نامی فراش قندیلیں روشن کرنے کیلئے مسجد کے ایک گوشہ میں گیا اس کے ہاتھ سے جلتی ہوئی بتی چھوٹ کر گر پڑی اُس سے کمبل اور بورئیے میں جو یہاں رکھا ہوا تھا آگ لگ گئی اور اتنی بھڑکی کہ اُس کے شعلے مسجد کی چھت تک پہنچ گئے وہ جل اُٹھی اب آگ ہر طرف پھیل گئی۔ اور منبر خزانہ قرآن۔ کتابیں غلاف حجرہ شریف غرض جو کچھ مسجد کی چھت کے نیچے تھا سب جل گیا کوئی لکڑی صحیح و سالم نہیں اُس وقت حجرہ شریف پر تہ برتہ کئی غلاف تھے وہ سب جل گئے اور مسجد میں سوائے ایک گنبد کے جو حرم سے فائدہ رکھنے کیلئے تھا کوئی حصہ محفوظ نہ رہا پتھر کے ستون جلکر کھجور کی ٹہنیوں کیطرح کھڑے رہ گئے۔ مسجد کی چھت جو حجرہ شریف کی چھت سے اونچی تھی جب وہ جلکر گر گئی تو اس سے حجرہ شریف کی چھت بھی ٹوٹ گئی اور دونوں چھتیں قبروں کے اوپر گر پڑیں اسکی اطلاع خلیفہ بغداد معتصم باللہ کو کیگئی اور سنہ ۶۵۵ھ کے اول میں تعمیر کی ابتدا ہوئی ہنوز تمام ہونے نہ پائی تھی کہ تاتاریوں نے خلافت بغداد کو دنیا سے مٹا دیا آخر ملک منصور نور الدین علی اور ملک الظاہر رکن الدین سلاطین مصر نے کاریگر و سامان مصر سے روانہ کیا اور شمس الدین یوسف نے بھی مدد کی یہاں تک سنہ ۶۵۸ھ میں مسجد نبوی اور حجرہ مزار اقدس بنکر تیار ہوا۔ [2] ملک منصور نور الدین علی بن معز کی سلطنت سنہ ۶۵۵ھ سے سنہ ۶۵۷ھ تک ہے۔ [3] ملک الظاہر رکن الدین سنہ ۶۵۸ھ سے سنہ ۶۷۶ھ تک بادشاہ مصر و حجاز رہا۔ [4] ملک منصور ابو المعالی قلاؤن صالحی خاندان قلاؤنیہ مصر کا پہلا بادشاہ تھا اسکا عہد حکومت سنہ ۶۷۸ھ سے سنہ ۶۸۹ھ تک ہے۔

[5] سید جعفر برزنجی مدنی کی تاریخ مدینہ نزہۃ الناظرین .... مدینہ منورہ کی آخری عربی تاریخ ہے جس میں سنہ ۱۲۹۶ھ تک کے حالات درج ہیں اسمیں زیادہ تر مسجد نبوی کی کیفیت بیان کی گئی ہے دوسرے واقعات بہت ہی مجمل و مختصر ہیں سن تالیف اسکا (۱۲۸۶) ہجری ہے مگر اور دس برس کے واقعات بھی اسمیں اضافہ کر دئیے گئے ہیں مطبع ...... مصر میں طبع ہوئی ہے برزنجی کا میلاد شریف بھی بہت مشہور ہے [6] مولوی صبغۃ اللہ صاحب مترجم عدالت حفیفہ مدراس نے سنہ ۱۲۵۳ھ میں السکینہ باخبار المدینہ تالیف کی ہے جو سنہ ۱۲۶۳ھ میں مقام مدراس طبع ہوئی

مدینہ لکھتے ہیں کہ "قلاؤن صالحی کا بنوایا ہوا قبہ پہلی آتشزدگی میں جل گیا" یہ صحیح نہیں ہے۔ پہلی آتشزدگی ۶۵۴ھ ہجری میں ہوئی تھی جیسا کہ اوپر تحریر کیا جا چکا ہے۔ اس وقت قبہ تھا ہی نہیں۔ اس آگ کے چوبیس[۲۴] برس بعد سب سے پہلا قبہ ۶۷۸ھ ہجری میں سلطان قلاؤن نے تعمیر کرایا۔ جس کو دونوں مؤرخین مذکورہ بالا تسلیم کرتے ہیں (ملاحظہ ہو نزہتہ الناظرین عربی مطبوعہ مصر صفحہ ۷۶۔ و السکینہ یا خبار مدینہ مطبوعہ مدراس صفحہ ۱۱۶)

چند سال بعد بارش کی وجہ سے جب اس قبے کی سیسے کی چادروں میں نقص پیدا ہو گیا تو سلطان قلاؤن کے لڑکے سلطان ناصر حسن نے جس کا زمانہ سلطنت ۶۹۳ھ ہجری سے ۶۹۸ھ ہجری تک ہے اس کی مرمت کرائی۔ اس کے بعد سلطان اشرف شعبان نے جس کا عہد حکومت ۷۶۵ھ ہجری سے ۷۷۸ھ ہجری تک ہے ۷۶۵ھ میں اسکو اور مستحکم کرایا۔ اسی طرح زمانۂ سلطان الظاہر جقمق میں جو ۸۴۲ھ ہجری سے ۸۵۷ھ تک ہے مسجد کی تعمیر کے وقت اس قبے کی بھی درستی کی گئی۔

۸۸۱ھ ہجری میں جب حجرہ مزار اقدس کی دیواروں میں دراڑیں پیدا ہو گئیں تو ملک اشرف سلطان قائد بے[۱] نے دیواروں کی مرمت کے ساتھ چھت کو بھی بدلوا دیا۔ اور بجائے معمولی چھت کے لداؤ کی چھت کر کر اس کو قبہ نما بنوا دیا۔ یہ چھت تاریخ سمہودی[۲] میں قبۂ صغیرہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس پر پیتل کا ایک ہلال بھی نصب ہے۔ حجرے کی سطح سے اس ہلال تک (۲۷) فٹ (۴) انچ بلندی ہے چونکہ اس چھوٹے قبے پر غلاف پڑا رہتا ہے اس وجہ سے یہ نظر نہیں آتا۔ البتہ حجرے کی چھت بیچ میں سے ڈبے کی طرح کچھ اٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ عام زائرین اس قبہ کی زیارت سے محروم ہیں۔ شعبان ۱۲۹۶ھ ہجری میں جب کہ سخت

---

[۱] عربی مؤرخ اس کا نام قائیتبای یا قایتبائی لکھتے ہیں جو قاید بے کا معرب ہے۔ یہ بادشاہ سلاطین ملوکہ چرکسیہ مصر میں بڑا نیک و مخیر گزرا ہے۔ اس کو مسجد نبوی کی تعمیر و درستی کا دو مرتبہ شرف حاصل ہوا تھا۔ ایک مرتبہ ۸۸۱ھ ہجری میں دوسری مرتبہ ۸۸۶ھ ہجری میں دوسری آتشزدگی کے بعد۔ قاید بے ۸۷۲ھ ہجری سے ۹۰۲ھ ہجری تک سلطان مصر و حجاز رہا۔ [۲] سمہودی کا پورا نام سید نورالدین علی بن عبداللہ ہے۔ یہ قصبہ سمہود واقع مصر کے رہنے والے تھے اور مدینہ منورہ میں اقامت گزین تھے انکی تاریخ مدینہ وفاء الوفاء با خبار دار المصطفیٰ تالیف ۸۸۶ھ ہے اور اس کا خلاصہ تالیف ۸۹۳ھ جو خلاصۃ الوفاء باخبار دار المصطفیٰ کے نام سے مشہور ہے۔ مدینۂ منورہ کی مستند ترین تاریخ ہے۔ جذب القلوب و نزہتہ الناظرین وغیرہ جسقدر کتابیں مدینۂ منورہ کے حالات میں لکھی گئی ہیں سب کا ماخذ یہی کتابیں ہیں۔ وفاء الوفاء ضخیم دو جلدوں میں ہے۔ اور مصر میں طبع ہوئی ہے۔ خلاصۃ الوفاء ایک جلد میں ہے اور مکہ معظمہ میں طبع ہوئی ہے۔ سید سمہودی کی وفات ۹۱۱ھ ہجری میں بمقام مدینۂ منورہ ہوئی۔

آندھی کی وجہ سے حجرۂ شریف کی ایک طرف کی جالی گر پڑی تھی تو سید جعفر برزنجی کو چھت پر چڑھنے اور اُس کی زیارت کرنیکا موقع ملا تھا وہ فرماتے ہیں:۔

"میں نے ادب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ حجرہ مربع ہے اس پر غلاف پڑا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ قبہ نظر نہیں آتا۔ جس کا ذکر سمہودی نے کیا ہے۔ لیکن وسط میں غلاف کسیقدر اٹھا ہوا تھا۔ جیسے خیمہ ہوتا ہے۔ اُس سے ظاہر ہوا کہ قبہ کے سبب سے غلاف کے بیچ میں بلندی ہے"

(نزہتہ النّاظرین عربی مطبوعہ مصر۔ صفحہ ۶۹)

سُلطان قایدبے نے حجرۂ مزار اقدس پر چھت کی بجائے قبۂ صغیرہ تعمیر کرا کے اس کے اوپر سلطان قلاؤن صالحی کا بنوایا ہوا بڑا قبہ جو اس وقت صحیح و سالم موجود تھا۔ بدستور قایم رہنے دیا اور اس وقت سے ابتک حجرۂ شریف پر یہ دو قبّے ہیں ایک اندرونی قبہ یا چھت دوسرا بڑا قبہ جو قبۂ خضرا کہلاتا ہے۔ ۸۸۶ھ ہجری کی آتشزدگی میں جب قلاؤن صالحی کا بنوایا ہوا بڑا قبہ جل گیا تو سُلطان

مزار[1] اقدس کے گرد سب سے پہلے جمال الدین اصفہانی وزیر سلطان نورالدین زنگی شہید اتابک موصل نے ۵۵۷ھ میں صندل کی جالی نصب کی تھی۔ ۶۵۴ھ ہجری کی آتشزدگی میں جب یہ جالی جل گئی تو ۶۶۸ھ ہجری میں ملک الظاہر رکن الدین بیبرس والی مصر نے لکڑی کی ایک جالی بنوائی جس کی بلندی دو قد آدم تھی۔ پھر ۶۹۴ھ ہجری میں ملک العادل زین الدین سلطان مصر نے لکڑی کی ایک جالی استاد کرائی۔ جب ۸۸۶ھ کی آتشزدگی میں یہ جل گئی تو سلطان مصر قایدبے نے ۸۸۸ھ ہجری میں تانبے کی ڈھلی ہوئی جالی تین طرف اور جانب قبلہ پیتل اور چاندی کی جالی نصب کی۔ جو اس وقت موجود ہے۔ جالی کی مفصل تاریخ میں نے اپنی کتاب "مزارات حرمین" میں تحریر کی ہے جو زیر طبع ہے۔

تیرہ[2] رمضان ۸۸۶ھ ہجری کو پچھلے پہر منارۂ اذان پر بجلی گرنے سے آگ لگ گئی تھی۔ جس سے مسجد کی چھت میں آگ لگ گئی۔ تمام شہر نے بجھانے کی کوشش کی مگر قابو نہ چلا۔ اور تقریباً نصف مسجد اور بہت سا سامان جل گیا۔ البتہ صرف حجرۂ شریف محفوظ رہا تھا۔ اور قبۂ صغیرہ بچگیا تھا۔ مگر بڑا قبہ نہ بچ سکا۔ اور حجرۂ شریف کے متصل جو ستون تھے وہ جل گئے۔ اور جالی اور اس کے اندر کا سامان بھی جل گیا۔ اس کی اطلاع سُلطان قایدبے کو کی گئی۔ اُس نے بہت سے کاریگر و سامان مصر سے بھجوایا آخر رمضان ۸۸۸ھ ہجری میں تعمیر ختم ہوئی۔

قایتبے نے دوبارہ قبہ عظمیٰ تعمیر کرایا۔ اس آگ میں قبہ صغیرہ یعنی مزار اقدس کی چھت بالکل محفوظ رہی تھی۔ اس وقت اس میں کچھ ردوبدل نہیں کیا گیا۔

چند سال بعد جب اس قبہ میں دراڑیں پڑ گئیں اور مرمت کا کام چلتا نظر آیا تو اس کے بالائی حصے کو تھوڑا سا توڑ کر قبے کو کسی قدر چھوٹا کر دیا اور محرابوں میں تختے بچھا کر کام شروع کیا تاکہ اوپر سے اگر کچھ گرے تو مزار اقدس پر نہ گرے۔ اس قبہ کی تعمیر میں بڑے ادب سے کام لیا گیا۔ معماروں نجاروں کے چڑھنے اترنے اور سامان لانے لے جانیکے لئے مسجد نبوی کی شرقی جانب سیڑھیاں لگائی گئیں اور ایسا خاموشی سے کام ہوا کہ نمازیوں کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی کہ یہاں تعمیر ہو رہی ہے۔ ۸۹۲ھ ہجری میں قبہ بنکر تیار ہوا۔

(خلاصۃ الوفا باخبار دار المصطفےٰ عربی مطبوعہ مکہ معظمہ صفحہ ۱۴۸)۔

۱۲۹۶ھ ہجری میں سید جعفر برزنجی نے اس قبہ کو اندر سے دیکھا تھا وہ فرماتے ہیں:۔

”قبے کے اندر مختلف قسم کے نقش و نگار ہیں اور نیچے اس کے اطراف میں جلی قلم سے کچھ لکھا ہوا ہے۔ مغربی جانب سے حسب ذیل عبارت لکھی ہوئی دیکھی۔ دوسری جانب میری نظر نہ پہونچ سکی

انشاء ھذہ القبۃ الشریفۃ العالیۃ المعترف بالتقصیر الراجی عفو ربہ القدیر القایتبا:۔“

یعنی اس عالیشان گنبد کا بنوانے والا اپنے گناہوں کا معترف اور خدا کی رحمت کا امیدوار قایتبے ہے۔

(نزہۃ الناظرین مطبوعہ مصر صفحہ ۶۹)

۱۲۳۳ھ ہجری میں سلطان محمود خان[ف] سلطان ٹرکی کے زمانہ میں اس قبے میں پھر دراڑیں پڑ گئیں تو اوپر کے حصے کو منہدم کر کے پھر بنوایا۔ اور اس امر کا لحاظ رکھا کہ انہدام کے وقت کوئی چیز قبہ صغیرہ پر یا حجرے میں یا مسجد میں گرنے نہ پائے۔ اس کام میں حصول برکت کے خیال سے اکثر مدینہ والے اور ان کے بال بچے شریک ہوئے۔ تعمیر ختم ہونیکے بعد باب عالی سے شہر والوں کے لئے جو اس کام میں شریک تھے نذر کے واسطے رقمیں آئیں اور فی کس ڈھائی ڈھائی سو قرش یعنی کوئی پندرہ پندرہ روپیہ دئیے گئے۔

(نزہۃ الناظرین عربی مطبوعہ مصر صفحہ ۷۷)

[ف] سلطان محمود خان کا عہد سلطنت ۱۲۲۳ھ سے ۱۲۵۵ھ ہجری تک ہے۔ اس کے زمانے کا سب سے بڑا واقعہ جنگ وہابیہ ہے۔

مشہور و معروف فرنگی سیاح حجاز برکھارٹ ؎ ۱۲۳۲ ہجری میں مدینے گیا تھا۔ اس نے اس قبہ کے بارے میں وہابیوں ؎ کے طرز عمل کے متعلق ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ملک حجاز وہابیوں کے قبضے سے نکل کر ترکوں کے ہاتھ میں آچکا تھا۔ وہ کہتا ہے:۔

"وہابیوں نے اس قبے کے کلس سے چونک کر اور مزارات کے گنبدوں کی ڈھا دینے والی عادت پر عمل کر کے۔ اس قبے کو بھی منہدم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور کلس و ہلال کو توڑ ڈالا تھا۔ لیکن اس گنبد کی مضبوط ساخت اور سیسے کے پتروں نے جو اس پر چڑھے ہوئے تھے اس کام کو مشکل بنا دیا۔ گنبد کی چکنی سطح سے بھی دو کاریگر نیچے گرے۔ اس وجہ سے انہدام کا کام موقوف ہو گیا۔ یہ واقعہ ایک معجزے کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ جو آنحضرت نے اپنی یادگار قائم رکھنے کے لئے ظاہر فرمایا۔

(انگریزی سفرنامہ برکھارٹ جلد دوم)

مذکورہ بالا واقعہ محض ایک کہانی ہے جو برکھارٹ نے مدینے میں سُنی ورنہ اگر یہ سچا واقعہ ہوتا تو سید جعفر برزنجی

؎ برکھارٹ باشندہ سوئٹزرلینڈ ابراہیم ابن عبداللہ نام رکھ کر حجاز گیا تھا۔ یہ عربی سیاحوں کا بادشاہ کہلاتا ہے۔ اس کی تصانیف میں سفرنامہ عرب سفرنامہ شام و سفرنامہ نوبہ اور بدویوں اور وہابیوں کے حالات بہت مشہور ہیں۔ اسکے سفرنامہ حجاز کا ترجمہ انگریزی سے میں نے اردو میں کیا ہے۔ جس کی پہلی جلد تاج پریس حیدرآباد میں طبع ہو چکی ہے۔

؎ محمد بن عبدالوہاب نجدی طریقۂ حنبلی کے ایک بڑے عالم تھے۔ وہ تعظیم قبور کو قبر پرستی خیال کرتے تھے۔ اور پختہ قبریں بنانا اور قبے تعمیر کرنا بھی ناجائز سمجھتے تھے۔ ان کے پیرو وہابی کہلاتے ہیں۔ امرائے نجد ان کے معتقد ہو گئے تھے اور جب عام مسلمانوں نے انکی تکفیر کا فتوے دیا۔ اور مکۂ معظمہ میں وہابیوں کا داخلہ بند کر دیا۔ اور حج کرنے کی ان کو اجازت نہ رہی تو انہوں نے تلوار سنبھالی اور سعود ابن عبدالعزیز امیر نجد نے حجاز پر حملہ کر کے ۱۲۱۸ھ ہجری میں مکہ اور ۱۲۱۹ھ ہجری میں مدینہ فتح کر لیا۔ بارہ تیرہ برس حجاز وہابیوں کے قبضہ میں رہا۔ اس کے بعد محمد علی پاشاہ والئ مصر نے سلطان ترکی محمود خان سے اجازت حاصل کر کے وہابیوں کے استیصال کیلئے حجاز پر چڑھائی کی اور اسکے لڑکے طوسون پادشاہ و ابراہیم پادشاہ کی کوشش اور خود اسکی قیامی فوج سے ملک حجاز دوبارہ ترکوں کے قبضے میں آگیا۔ اہل نجد نے مکہ و مدینہ پر قبضہ کرنے کے بعد قبروں کے گنبدوں کو توڑ ڈالا تھا مگر گنبد خضرا کیساتھ کسی قسم کی بے ادبی نہیں کی تھی محمد علی پاشاہ نے ۱۲۳۳ھ ہجری میں جنت المعلےٰ و جنت البقیع کے گنبدوں کو دوبارہ تعمیر کرا دیا۔ ایک سو برس کے بعد اہل نجد نے بسر کردگی سلطان عبدالعزیز ثانی ابن عبدالرحمن آل سعود جو سعود اول کی مناسبت سے ابن سعود کہلاتے ہیں دوبارہ ۱۳۴۳ھ میں شریف حسین پادشاہ کو حجاز سے نکالکر یہاں قبضہ کر لیا۔ اور اس وقت ملک حجاز ان ہی کے زیر نگین ہے۔ اور انہوں نے بھی قبروں کے گنبد منہدم کر دئے ہیں۔

جو وہابیوں کے دشمن ہیں[۵] اس کا ضرور ذکر کرتے۔ مگر اس موقعہ پر وہ صرف اس قدر لکھ کر خاموش ہو گئے ہیں

"وہابیوں نے گنبد خضرا کے انہدام کرنے۔ اور اس کے کلس کو سونے کا سمجھ کر لے لینے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔ اور وہ اس پر قابو نہ پا سکے۔"

(نزہتہ الناظرین صفحہ ۶۲)

موجودہ بڑا قبہ یا گنبد خضرا سلطان قایدبے کا بنوایا ہوا اسوقت تک قایم ہے اہل نجد کے حالیہ قبضۂ حجاز کے بعد ہندوستان کی بعض مسلمانوں کو یہ گمان ہوا تھا کہ وہابی شاید گنبد خضرا کے ساتھ بھی اسی طرح کا عمل کریگی جو انہوں نے دوسرے مزارات کے قبوں کیساتھ کیا ہے۔ اسی بناء پر میں نے ۱۳۴۵ ہجری میں بعض سر برآوردہ اہل علم نجدیوں سے دریافت کیا تھا کہ ہندوستان میں یہ مشہور ہوا ہے کہ آپ لوگ گنبد خضرا پر بھی اسیطرح دست درازی کرنیوالے ہیں جیسی کہ آپ کے مورث اعلی امیر سعود بن عبد العزیز نے کی تھی۔ انہوں نے جواب دیا کہ نہ ایسا سعود نے کیا تھا اور نہ معاذ اللہ ہمارا ارادہ ہے۔ میں نے کہا ایک فرنگی سیاح برکہارٹ نے ایسا ہی لکھا ہے اور بہت سے مسلمانوں کا بھی ایسا ہی خیال ہے۔ انہوں نے کہا کہ عام مسلمان اور عیسائی دونوں ہمارے دشمن ہیں۔

اب میں اپنا سلسلۂ بیان پھر شروع کرتا ہوں۔

اس بڑے قبہ میں جانب جنوب ایک کھڑکی ہے۔ جس کے پٹ جالی کے ہیں اس میں سے پانی اندر نہیں جا سکتا لیکن روشنی وہوا پہنچ سکتی ہے۔ یہ کھڑکی کوئی پون گز لمبی اور آدھ گز سے زاید چوڑی ہے ضرورت کے وقت اس میں سے ایک آدمی اندر داخل ہو سکتا ہے اس کھڑکی کے محاذی قبۂ صغیرہ میں بھی ایک دریچہ ہے۔ اس میں بھی جالی کا ایک دروازہ ہے۔ یہ کھڑکی حجرۂ مزار اقدس کی چھت یا گنبد میں ہمیشہ سے چلی آرہی ہے سمہودی کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے زمانہ میں ایک سال بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط پڑ رہا تھا۔ اہل مدینہ اکھٹے ہو کر ام المؤمنین کے پاس گئے۔ اور عرض کیا کہ حجرۂ شریف کا دروازہ کھولدیجئے تاکہ ہم بواسطہ حضرت رحمتہ للعلمین اللہ تعالیٰ سے دعائے باران رحمت کریں۔ حضرت عائشہؓ نے حجرہ کا دروازہ کھولا۔ اور تشنہ کاموں نے دعا کی۔ خدا کی قدرت ہے ایسی بارش ہوئی کہ جل تھل ہو گئے اور اس کثرت سے زراعت ہوئی کہ مویشی اناپ شناپ موٹی ہو گئی اس کے بعد سے مدینہ والوں کا یہ طریقہ ہو گیا کہ جب کبھی قحط کے آثار نمودار ہوتے یا کوئی اور سخت مشکل پیش آتی تو وہ حجرے کی چھت کی کھڑکیاں کھول کر دعا کیا کرتے تھے۔ بہت دنوں تک یہ طریقہ جاری رہا مگر نویں صدی ہجری

---

[۵] سید جعفر برزنجی وہابیوں کا ذکر ایک خاص لہجے میں کرتے ہیں سنہ ۱۲۱۹ ہجری میں جب وہابیوں نے مدینہ لیا تھا تو سید صاحب کے والد نے وہابیوں کے ڈر سے بھاگ کر عراق میں پناہ لی تھی۔ اس واقعہ سے بھی سید صاحب کو رنج تھا

یعنی سمہودی کے زمانہ میں موقوف ہوگیا۔ ان دنوں میں بجائے قبہ کی کھڑکی کے حجرۂ شریف کی جالی کا ایک دروازہ جو جانب قبلہ (جنوب) اور جسے باب التوبہ کہتے ہیں دعائے استسقاء کیا کرتے تھے۔ یہ طریقہ بھی چودہویں صدی تک جاری رہا۔ موجودہ عہد میں ایسی کوئی مصیبت نہیں آئی کہ باب التوبہ وا ہوتا اور خدا ایسا موقع بھی نہ لائے۔

قبۂ خضرا جس کا یہ نام ہمارے زمانہ میں اس کے سبز رنگ کی وجہ سے رکھا گیا ہے ہمیشہ سے سبز نہیں ہے پہلا گنبد جو ۶۷۸ ہجری میں تعمیر ہوا تھا اس کا رنگ سفید تھا اس وقت اس کو قبۂ بیضا کہا کرتے تھے ۸۸۶ ہجری کی آگ میں جب وہ جل گیا تو دوسرا تعمیر ہوا اسکا رنگ نیلا تھا اور اسکو قبۂ زرقا کہتے تھے۔ ۱۰۰۱ ہجری میں جب شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جذب القلوب تالیف کی تو اس وقت اس کا رنگ سبز تھا۔ پھر نیلا کیا گیا جو غالباً تیرہویں صدی کے وسط تک رہا چنانچہ جعفر برزنجی کہتے ہیں کہ سلطان محمود خاں کے زمانہ میں ۱۲۵۳ ہجری میں اسکو ہرا رنگا گیا اور جبکے بعد سے اب تک مسلسل اس کا رنگ سبز چلا آرہا ہے۔ ۱۲۸۹ ہجری میں جب دھم پڑ گیا تو سلطان عبدالعزیز خاں[۵۲] کے حکم سے پھر سبز رنگ پھیر اگیا۔ مدینہ والوں سے مجھے معلوم ہوا کہ موجودہ رنگ اب سے پچیس سال قبل ۱۳۳۱ ہجری میں ہوا تھا میں نے ۱۳۵۴ء میں دیکھا کہ رنگ بالکل دھیما پڑ گیا ہے اس میں کسی قسم کی تازگی اور شگفتگی باقی نہیں رہی ہے توتے (طوطے) کے سے پر کا رنگ ہے جس میں چمک نہیں اور بجائے روغنی رنگ کے محض آبی رنگ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا سنہری کلس بھی اس قابل ہوگیا ہے کہ اس پر بھی جلا کر دیجائے یہ صرف اس لئے عرض کرتا ہوں کہ دنیا داروں و ظاہر بین اصحاب کی آنکھوں میں بھلا معلوم ہو۔ ورنہ یہ ہلال و یہ کلس اس قسم کی چمک جھلک و ملمع کاری سے مبرا ہے اس کی چمک پیتل جیسی کی سی چمک نہیں ہے یہ ان تجلیات کا مطلع ہے جن سے زمین و آسمان منور ہو رہے ہیں۔ میں نے سچ کہا ہے اور خوب کہا ہے ؎

ندّی چڑھاؤ پہ ہے شراب طہور کی ‏ مئے نوش لا رہے ہیں خبر دُور دُور کی
کیا دیکھئے کوئی روشنی اب شمع طور کی ‏ جھڑیاں لگی ہوئی ہیں مدینہ کے نور کی

چھٹکی ہلالِ گنبدِ خضرا کی چاندنی
پھیکی پڑے نہ کیوں ید بیضا کی چاندنی[۵۳]

---

[۵۱] یہ دروازہ تخمیناً ۱۱ فٹ اونچا ڈھائی فٹ چوڑا ہے جو جالی کے وسط میں نصب ہے اسکے کواڑ بھی کٹی ہوئی برنجی جالی کے ہیں جنکے ایک پٹ پر چاندی کے ڈھلے ہوئے حروف میں بخط طغرے لا إله إلا الله الملك الحق المبين اور دوسرے پٹ پر محمد الرسول الله الصادق الوعد اليقين لکھا ہوا ہے۔ اس دروازے کے قریب ہی شبکہ نبی یعنی مواجہہ شریفہ ہے جہاں زائرین کھڑے ہو کر سلام عرض کرتے ہیں

[۵۲] سلطان عبدالعزیز خاں کا عہد حکومت ۱۲۷۷ سے ۱۲۹۳ تک ہے۔ [۵۳] یہ اس فقیر کی نظم مدینے کی چاندنی کا پہلا بند ہے۔

سید سمہودی نے اس قبے کی بلندی تحریر نہیں کی اور جعفر برزنجی بھی ساکت ہیں۔ میں نے جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ حجرہ شریف کی چھت یعنی قبۂ صغیرہ سے کوئی دو گز اونچی مسجد نبوی کی چھت ہے اس سے کوئی بارہ گز اونچا یہ قبہ ہے۔ قبۂ صغیرہ کی بلندی سید سمہودی نے کوئی نو گز تحریر کی ہے۔ اس پیمایش اور میرے حساب سے گنبد خضرا کی بلندی زمین سے تیئیس ۲۳ چوبیس ۲۴ گز ہے۔ اس پر جست یا سیسے کے پترے منڈھے ہوئے ہیں جن کی شکنیں اور جوڑ ہر طرف سے بخوبی نظر آتے ہیں۔

گنبد خضرا مدینے کے مختلف محلوں سے اور بعض مقامات پر کئی کئی کوس سے دکھائی دیتا ہے۔ جب حاجیوں کا قافلہ منزل بیر علی[1] پہنچتا ہے جو مدینہ سے دو ڈھائی کوس ہے تو یہ سبز گنبد مشتاقان جمال محمدی کے زخم فرقت ہرے کر دیتا ہے۔ اس کو دیکھ کر شیفتگان دیدار محمدی کی آتش شوق بھڑک اٹھتی ہے یہی وہ موقع ہے جس کی تصویر اس گنہگار نے ان اشعار میں کھینچی ہے۔

قافلے والو! اٹھو وقت سحر ہونے لگا ؎ اب ہوائے باغ یثرب کا اثر ہونے لگا
اب یہ وقت آیا کہ اونٹوں پر سوار رہنا حرام
حاجیو! اترو کہ روضہ جلوہ گر ہونے لگا

---

[1] بیر کنوئیں کو کہتے ہیں۔ یہاں علی نامی کسی شخص کے کنوئیں ہیں۔ جن سے زراعت ہوتی ہے۔ ذیحجہ ۱۳۲۸ھ ہجری میں جب کہ گرمی کا سخت موسم تھا۔ بیر علی کے آس پاس خربوزے تربوزوں کے کھیت میں نے دیکھے تھے۔ حاجی یہاں پڑاؤ کرتے ہیں۔ پانی لیتے ہیں اور یہاں کے پہاڑوں پر چڑھ کر گنبد خضرا کی زیارت سے اپنی آنکھوں کی پیاس بجھاتے ہیں۔

عشق

از جناب شیخ عبد القادر صاحب وفا

ہے گرمی دل ہنگامہ سر اک جوشش جنوں اک درد جگر
آنکھوں کی ہوس اور لب کی تمنا یوم جنوں کی شام و سحر
جس کو نہ لگی ہو باس تیری وہ کونسا ہے دنیا میں بشر
تو جس میں نہیں ہے کون وہ سر تو جس میں نہیں ہے کون وہ گھر

"ہنگامۂ چشمک"

(تاتار کا ایک واقعہ)

(از جناب شبیر حسن صاحب قیس رضوی متعلم چادر گھاٹ ہائی اسکول)

عزیزہ کے مافوق التعریف سحر پاش حسن کے متعلق جو نان بائی کے متعدد بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان سب کو یقین و اثوق کر کے نظر تعمق ڈالے تو ہر کوئی اس انصرام پر پہنچ جائیگا کہ ٹرائے کی ہیلن کا شہرۂ آفاق حسن اس کے سامنے دھندلا ہے لہٰذا ان تمام بیانات کو پس پردہ ڈالیں کیونکہ ان کو لکھے کئی صدیاں گزر گئیں۔ اور موجودہ نوجوان شاعر منصور الحفیظ کے خط کو جو انہنے ہمعصر شاعر کو عزیزہ کے جادو بھرے حسن کے متعلق تحریر کیا ہے غور سے دیکھیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"اللہ کی تمام ہفت کشور مخلوق میں اتنی مہ جبیں دوشیزہ پیدا نہیں ہوئی جو اس کے قدموں کی خاک کا بھی مقابلہ کر سکتی"۔

"بلحاظ پوشش وہ سنہری روپہلی پوشاک سے مزین تھی"۔ "اسکا غنچۂ دہن بہار کی طرح کھلکھلاتا"۔ "وہ مجسم شیراز کی چنبیلی تھی"۔ اور گلنے میں بلبل شیراز" "مخلوط شدہ صندل اور مشک کی طرح اس کا پیکر نازنیں معطر تھا"۔

گو آج اس پر اثر خط کو لکھے ہوئے عرصہ ہوا۔ لیکن اب بھی صفحۂ قرطاس کی زینت بنتا ہے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ نقاب پوش عزیزہ موسم گرما میں ایک دوپہر کو سمرقند کی پیچیدہ تاریک گلیوں میں پھر رہی تھی۔ نقاب کے مہین تاروں میں سے اسکا سفید رنگ اس کے انار کے سے یاقوت خام کا ضیا پاش حسن چھن چھن کر نکل رہا تھا۔ نوجوان جوش جوانی میں مست محو خرام تھے۔ انہوں نے اس پر ترچھی نظر ڈالی۔ جھلک حسن سے بجلی کوند گئی۔ انہوں نے صافہ کو درست کیا۔ مونچھوں کو خوبصورتی سے تاؤ دیا۔ اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔ سن رسیدہ لوگوں نے جوانوں پر نگاہ رشک ڈالتے ہوئے ایک آہ سرد بھری کیونکہ ان کی جوانی کی امنگیں اور ولولے دب چکے تھے۔

"چھن! چھنن! چھن" کی آواز جو راہ گیروں کو چونکا دیتی تھی۔ عزیزہ کے چاندی کے پازیبوں میں سے نکل رہی تھی۔ جو اس کے عریاں احمری پیروں میں تھے۔ اس کی مستانہ چال

کے ہر قدم پر اس کی ایڑی نیلی سلیپروں پر سے اُٹھتی ۔ اور سلیپر ایک پرند کی آغاز پرواز کے مانند پھٹ پھٹاتے ۔

"چھن ! چھنن ! چھن ۔" وہ بازار کے جنگلوں کے نیچے سے گزری جنہیں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر تانبے کے ظرف، مٹی کے برتنوں، دمشق کے اسلاح، زیورات، عطر کی بوتلوں، ریشم اور کمبل پر پڑ رہی تھیں ۔

لیکن عزیزہ ان سب سے قطعاً مستغنی تھی وہ ان کو دیکھنے نہیں آئی تھی ۔ بلکہ خود کو دکھلانے وہ ایک بُت تھی قابلِ پرستش ۔ کیونکہ وہ سولہ سالہ لعبتِ حسن تھی سراپا ناز ۔ اس کے ماں باپ مرچکے تھے ۔ گذشتہ شب وہ اپنی دادی کے پاس بیٹھی تھی کہ اس نے مکان کے بالائی حصہ پر سے ایک خوش آیند مسحور کن زمزمۂ محبت سُنا ـــــــ جو پُر سکوت فضا کو توڑتا ہوا ارتفاع کی جانب بڑھا ۔ یہاں تک کہ انجم بوس ہو گیا ۔ یہ گیت تھا درد اور تمنا سے مملو ـــــــ کیا یہ گیت اس کے لئے گایا گیا تھا ؟ اگر نہیں تو پھر کس کے لئے ؟ اور مغنی کون ؟ وہ کہاں ؟ اور اس سے کس قدر فاصلہ تفاوت ؟ ـ

وہ متبسم ہوئی ۔ جس پر اُس کی دادی نے غصہ سے سر ہلاتے ہوئے ڈانٹا اور کہا "اے مجسم بیحیائی کی پُتلی ۔ میری عزت کی قسم یہ نرالا ڈھنگ ہے کہ .... پر ہنسے ۔

"میں چاند کو دیکھ کر ہنسی" ۔ عزیزہ نے جواب دیا ۔

"ہاں ایک چاند مصطفٰے یا احمد ۔ ایک چاند جس کی بے ڈھنگی الجھی ہوئی ڈاڑھی ہے ۔ ہاں ایک چاند جو سراسر کمینہ ہے محبت کا گیت گاتا ہے ۔ واہ خوب !" اور بوڑھی نے ایک زور سے طمانچہ مارا ۔

(۲)

اُس دوپہر کو جب کہ اُس کی دادی باہر کچھ خریداری میں مشغول تھی ۔ عزیزہ چپکے سے باہر نکلی تاکہ سیر کرے ۔

وہ ریشم والوں کی دوکان تک پہونچ گئی ۔ دو طرفہ درختوں کی قطار کا اختتام ایک سخت پتھر اور سنگِ مرمر کی چٹان کی طرح معلوم ہوتا تھا جہاں تاتار کے خانِ اعظم کا محل تھا ۔ خان اعظم یعنی ناصر الدین، نادر خان، قلی خان، منگولیا کا بادشاہ، روس کا شہنشاہِ اعظم، خدا کا دائمی فاتح شیر، اور مذہب کا جان نثار،

ہمیں یہ تبلا دینا چاہئے کہ نو ماہ قبل یہ درخشاں ستارہ مشرقی ممالک پر ایک سیل بے پناہ کی طرح اُمنڈ رہا تھا ۔ تاتاری شمشیر کو کوندا تا ۔ لڑائی کا نقارہ گرجواتا ۔ شاہِ چین کے حصنِ حصین پر بجلی

کی طرح گرا۔ اور اُس ولوالعزم فاتح نے اس کو حلقہ بگوش کر لیا۔

دندانہ دار فصیل کے نیچے دو طرفہ سڑک ہے۔ اس لئے عزیزہ حیران تھی کہ کونسا راستہ اختیار کرے کہ بائیں جانب سے ایک نازک اندام خوش رو جوان گزرا جس کے سر پر تیل کا مٹکا تھا۔ اور دائیں جانب سے ایک نوجوان جس کے سر پر میوے کی ٹوکری تھی۔

وہ آپس میں تپاک سے ملے۔

"تجھ پر خدا کا سایہ قایم رہے" تیل والے نے کہا۔

"تجھ پر بھی خدا کی رحمت ہو"۔ میوہ فروش نے کہا۔

وہ اپنی اپنی راہ لینے ہی والے تھے کہ ——— ہوا کے جھونکے سے یا اُس کی نازک گوری انگلی سے نقاب سرکی ——— کیا یہ ہوا کے ذروں کی غلطی تھی۔ یا خود اسی کے خیال کی۔ اس کی پلکیں تتیری کی طرح پتھرائیں ——— ایک مدہوش کن جھپک سے۔"

خدا معلوم اس کی آنکھ دائیں جانب پڑی یا بائیں جانب جھکی۔ اگر وہ خود جانتی ہوتی جو کہ قابل بحث امر ہے لیکن عزیزہ کو کوئی موقع نہ ملا کہ تصفیہ کرتی کیونکہ ———

"اے میری غزالہ میں تیرے قدموں پر ہوں"۔ تیل والے نے کہا۔

"اے مسرت کے چاند میری جبیں ناصیہ فرسائی کی مشتاق ہے"۔ میوہ فروش نے کہا۔

یکے بعد دیگرے آرزو ظاہر کرتا۔ وہ بناز و ادب بلا تعین اپنے سر کا بوجھ سنبھالے یکے بعد دیگرے جھکتے ہوئے قریب سے قریب تر ہو گئے۔ وہ غافل تھے کیونکہ جادو حسن ان پر مستول تھا اور وہ شراب محبت کے متوالے بنے ہوئے تھے۔ وہ ملحق بھی ہو گئے۔ انہیں تن من کا ہوش نہ تھا ——— وہ ٹکرائے ——— بھڑ" سے تیل کا مٹکا گرا اور تیل بہہ گیا۔ "پھٹ" سے میوہ کی ٹوکری گری اور انگور وسنترے خاک آلود ہو گئے۔؟

"تم نے یہ کیا کیا۔ دیکھو تم کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑیگا"۔

"نہیں تم ہی کو سرجہ دینا پڑیگا۔ تمہیں کیا حق تھا کہ اس کے سامنے جھکو"۔

گالی گلوچ تجاوز کر گئے۔

"دور ہو دوشیزہ کا اشارہ میری طرف تھا"۔ تیل والے نے کہا۔

"ہشت کیا گلاب کی نوشگفتہ کلی ایک بندر کے حوالے کیجائے۔ اس نے مجھ سے فقط مجھ سے

آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔ صرف مجھ سے آنکھ ملی۔ میٹھی میٹھے پن سے اس نے نگاہ محبت مجھ پر ڈالی"۔

"اے جھوٹے کتے۔ کتے کا دل رکھنے والے!"

"اے جھوٹوں کے باپ۔ ڈاڑھی کی آڑ میں شکار کھیلتا ہے"۔ اس طرح گفتگو میں آگ بھڑک اٹھی۔

پھر خنجروں سی بات ہوئی۔ عزیزہ خوف زدہ ہو کر بھاگی۔ اُس نے آخری وقت ایک کے جسم سے خون کا دریا اُبلتے دیکھا ــــ ایک پُر درد آواز سُنی ــــ ایک غصہ کی چیخ اُس کے کان تک آئی یہاں تک کہ ایک جم غفیر جمع ہو گیا۔ تیل والوں کا گروہ ایک طرف۔ اور میوہ والوں کا دوسری جانب علٰحدہ ہوا۔ اور آتشِ مخالفت بھڑک اٹھی۔ دوکانیں منہدم کر دی گئیں۔ ریشم اور کمبل بیچنے والوں نے بھی اس خانہ جنگی میں حصّہ لیا۔ کیونکہ تجاراتِ تلب کے نکالنے اور کہنہ رنجشوں و عداوت کے مکافات کا غنیمت موقع تھا۔

ایک کمبل والے کی جھونپڑی لیمپ کے گرنے سے جل گئی۔ اور شعلے چاروں طرف دوڑنے لگے۔ یہاں تک کہ محافظانِ آگ پہونچ گئے۔ دونوں گروہ بازار کے سامنے آئے۔ اور چلّانے لگے "مدد کرو! مدد کرو۔ بادشاہ کا مال برباد ہو رہا ہے"۔ کمبل فروشوں نے نہایت تضرع سے محافظانِ آگ سے التجا کی۔

اِس احاطہ کے جُنوب میں کیزل تاتار کے شہزادہ کا محل تھا۔ اور اس کے شمال میں اس کے بھتیجے اور عدو جانی کیگیز کے شہزادہ کا قصر واقع تھا۔ اس زمانہ میں جبکہ خانِ اعظم یورشین اور فتوحات کرتا پھرتا یا نظام حکومت کے درستی کے لئے دَورہ کرتا تو ہر ایک شیرازی شراب سے مست ہو کر خوابِ غفلت میں ڈوب جاتا۔ اور اُمورِ سلطنت بالائے طاق کر کے محفل عشرت منعقد کی جاتی"۔

سمرقند میں جب یہ باہمی فساد برپا تھا۔ وہ حکومت گیری کے لئے یُورشین کر رہا تھا۔ دونوں شہزادے نئی آزادی میں مخمور اس فتنہ سے بالکل بے خبر تھے۔

"ہمیں مدد دو ــــ فوراً مدد کرو"۔ ریشم والوں نے خضوع و خشوع سے افسرانِ آگ سے التجا کی۔ "ہم ساڑھے پانچسو طومان دینے کے لئے تیار ہیں"۔ کمبل اور ریشم والے نے کہا۔ محافظانِ آگ کے شرقی دستے نے بعد پس و پیش کے بعد منظور کیا۔ لیکن مغربی دستے کے افسر نے اس سے کہا۔ "نہیں یہ رقم بہت کم ہے"۔

"کیا تم ہمیں برباد کرو گے اسے واغدار ماں کے لڑکے ۔"

"چپ رہ اے قصائی" دوسرے نے کہا ۔ یہاں تک کہ محافظانِ آگ آپس میں لڑنے لگے ۔ تمام مکانات آگ سے جل کر خاکستر ہو گئے ۔ ایک مسجد جل گئی ۔ تمام آسمان دھواں دھار بنا ہوا تھا ۔ اور قیر کا غازہ تھا ۔ شعلے آتشیں موت کے فرشتے بنکر آغوش پھیلائے بلند سے بلند ہوتے گئے ۔ اور جو چیز سامنے آتی فنا کرتے جاتے ۔ اب شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے ۔ کیونکہ کوئی انکو فرو کرنیوالا نہ تھا ۔ اور ہر ایک کو نفسا نفسی کی پڑی تھی ۔

عزیزہ ۔ گلی کے ایک تنگ و تاریک گوشہ میں چھپی ہوئی تمام ماجرا دیکھ رہی تھی جو صرف ایک "حسن کی جھلک" سے وقوع پذیر ہوا تھا ۔ وہ خوف زدہ اور لرزہ براندام تھی ۔

وہ بہت زیادہ حیران اس لئے تھی کہ اس کے گھر کا راستہ مسدود تھا ۔ اور اسے خوف تھا کہ اس کی دادی کیا کہیگی ۔ وہ ذرا پیچھے ہٹی ۔ "سن" سے ایک پتھر اس کے کان پر سے نکلگیا ۔ اور اس کے پیر تلے زمین نکل گئی ۔ اس اثناء میں سنگ باری سے لڑائی ہو رہی تھی ۔

ایک پتھر نہایت زور سے اُڑکر کیزل کے شہزادہ کو لگا جو اپنی نوجوان بیوی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور اس کا جبڑا پھٹ گیا ۔ اس نے غصہ سے اسلاح لئے اور اپنی فوج کو جمع کرکے لڑائی کے لئے تیار ہو گیا ۔ اسے یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ فساد کیگز کے شہزادے کا برپا کیا ہوا ہے ۔ وہ سب گلی میں آئے اور کئی کو جانوروں کی طرح قتل کرتے ہوئے شہزادہ کے محل کی جانب چلے لیکن چوکیدار نے پہلے ہی اطلاع دیدی تھی ۔ اسطرح دونوں شہزادے آپس میں لڑنے لگے ۔

(۳)

اِس اثناء میں سورج اپنے جلوے دکھاتا ہوا آغوش مغرب میں نہاں ہو چکا تھا ۔ اور شام ہو چلی تھی ۔ عزیزہ ایک تاریک حصہ میں سہمی ہوئی بیٹھی تھی ۔ گو اسکا خوف کم ہو چکا تھا تاہم وہ بھوک سے خستہ حال تھی ۔ اور اپنی عیب جو دادی کے دیدار کی مشتاق ۔

یہ عجیب بات تھی کہ باوجود اس جنگ و فساد برپا ہونیکے وہ بالکل بے اعتنا تھی جو ایک عورت کی خصلت ہے کہ آنکھ لڑائی ۔ ایک کو اپنے دام میں کھینچا ۔ اور دوسرے رقیب سے لڑائی چھڑوائی ۔ اسے صرف یہی خیال تھا کہ کسطرح گھر پہنچ جائے ۔ لیکن راستہ کی طرف سے مجبور تھی ۔ وہ اطمینان سے بیٹھی رہی ۔ کیونکہ اس کا حسن پاسبانی کر رہا تھا ۔ بےگناہی دل کو ڈھارس دے رہی تھی ۔ اور جوانی سو رہی تھی ۔

تمام کوچہ میں تاریکی مسلط تھی۔ کیونکہ نوشگفتہ فساد نے کسی کو اتنا بھی موقع نہ دیا کہ کوچہ کی قندیلین روشن کرتا۔ صرف شعلے بعض وقت بلند ہو ہو کر تاریکی کو دُور کرتے۔

شعلے اور پھیلنے لگے۔ ایک مسجد جل گئی۔

"اے خدا جانوں کو بچانے والے مولا! مجھے بچا" عزیزہ نے گلوگیر آواز سے گڑگڑا کر دُعا کی وہ اب زیادہ ہراساں تھی۔ اس لئے کہ فلک بوس شعلے اُسے محصور کر رہے تھے۔ وہ دو زانو بیٹھی تھی اور اشک جاری تھے

(۴)

خانِ اعظم، ایک شاندار فاتح کی طرح، فتح و ظفر کا ڈنکہ بجوا تا شہر کے ماحول میں پہنچ چکا تھا۔ اور وہیں خیمہ زن ہوا۔ لیکن وہ اس بدامنی سے مطلق بے خبر تھا۔ کیونکہ مسرت میں چُور جوانی کی اُمنگوں میں انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اس کی فوج مالا مال تھی۔ گذشتہ جنگ میں بیش بہا جواہرات۔ سونا۔ چاندی بے حد ہاتھ آیا تھا۔

اس نے دل میں منصوبہ کیا کہ سمرقند پہنچ کر ایک یادگار قایم کرے۔ تاکہ تمام دنیا میں اس زبردست شاندار فتح کی یادگار باقی رہے۔ جس سے اس کا نام صفحہ ہستی پر روشن رہے۔

لیکن جب اُس نے اپنے شہر کو دُھویں دار شعلوں کی آغوش میں دیکھا اور شور و غوغا سنا تو اس کے قلب کو ایک ٹھیس لگی۔ ایک قلبی صدمہ ہوا۔ اس نے فوراً سردار کو طلب کیا۔ اور پوچھا "یہ کیا ہنگامہ بپا ہے۔ کہیں افغان پھر آ تو نہیں گئے۔"

"نہیں ایلچی کے آنے پر معلوم ہو گا۔ اسمیں شک ہے۔ ضرور شک ہے"۔ مگر وہ ہنسا لیکن یہ ضرب المثل کہیں صادق نہ ہو"۔

"کونسی" اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "بھنو اے ... بلی باہر گئی۔ چوہے آزاد ہوئے۔" خان نے گھوڑے کو ایڑ ماری اور فوج کو شہر کے اندر لانے کا حکم دیکر گھوڑا اُڑایا اور قلب بلدہ میں پہنچ گیا۔ فوج کی وجہ سے تمام سمرقند میں امن ہوا۔ آگ بجھائی گئی اور فسادی گرفتار کر لئے گئے جس میں عزیزہ اس کی دادی اور وہ دو نوجوان بھی تھے جن کی وجہ سے اس قدر خون ریزی ہوئی تھی

(۵)

بارہ گھنٹے کے بعد دربار منعقد ہوا۔ خانِ اعظم زرنگار تخت پر جلوہ آرا ہوا۔ اس نے طائرانہ فسادیوں کے مجمع پر نظر ڈالی۔ جسمیں عزیزہ بھی تھی۔ اس کے دونوں طرف سپاہی تھے بائیں پہلو والے نے کہا "خدا کی قسم تیری وجہ سے اتنے خون ہوئے تیرے گلے پر خنجر کی دھار

ہو گی۔"

دائیں بازو اس کی داوی تھی۔ اس نے کہا "نا فرمانبردار بچوں کا مکافات عمل ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔" اس کے آنسو آ گئے۔ اور پھر کہنے لگی "آہ! آہ میں کیسے اپنی زندگی بسر کروں گی جب تو آغوشِ لحد کے تاریک ترین گڑھے میں دائمی نیند لیتی ہو گی۔

لیکن عزیزہ نے ان کی باتوں پہ توجہ ملتفت نہ کی وہ گنہگار نہ تھی بلکہ قطعاً معصوم۔ وہ بے قصور تھی۔ اس لئے وہ ساکت اور مستحکم تھی اور موت سے بے خوف۔

نقاب کے سنجاف میں سے اس نے اپنے بادشاہ کو غور سے دیکھا۔ اور اسنے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ خوش رُو جوان ہے۔

خاقان فیصلہ سنانے کے لئے تیار ہوا۔

اُس نے ڈاکوؤں کو (جو اس فتنہ میں آملے تھے) قتل کا حکم دیا۔ مگر اس کے ذہن میں ایک خیال راسخ ہوا۔ اُس نے سوچا۔

"مرا ہوا چور کس کام کا۔ لیکن ایک زندہ چور............؟ وہ ہنسا تم سمرقند کے مشہور ڈاکو ہو۔ میں تم لوگوں کو محصول وصول کرنے کیلئے مُعیّن کرتا ہوں۔ سوداگر تمہیں وقت بے وقت روپیہ کی مدد دیا کریں گے اس طرح سلطنت محفوظ رہیگی۔

اس نے سوداگروں کو ہلکے دُرّوں کی سزا دی جو بالکل معمولی تھی۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ اور پھر حمال و مزدور پیشہ وروں سے کہا "تم نے اپنی بہادری کا ثبوت دیا۔ میں آئندہ سال ہندوستان پر حملہ کرنیوالا ہوں۔ میں تمہیں اے جنگجو رعایا جنگ کی صفِ اوّلین میں رکھونگا اگر مر گئے تو شہید کہلاؤ گے اور زندہ رہے تو غازی۔ دیکھو تمہارے لئے بہشت کے دروازے کھلے ہیں۔" اس نے اسیطرح محافظان آگ کو فوج میں داخل کر لیا۔ اور سوداگروں کو حکم دیا کہ وہ خود فوری آگ بجھانیکا نظام قایم کریں۔"

پھر وہ شہزادوں کی طرف رجوع ہوا۔ "میں نے تمہیں وظیفہ دیا تھا تاکہ چین سے زندگی بسر کرو۔ لیکن یہ ایک معجزہ ہے کہ تمہاری جوانی عود کر آئی۔ اور تم اسیطرح بشاش ہو۔"

اس نے کیپٹل باشی کے شہزادہ سے کہا "مغربی سرحد کی حفاظت تمہارے سپرد کیجاتی ہے۔ تاکہ ترکمانوں کے حملہ کا سدباب کر سکو۔"

اس نے کیگر کے شہزادہ سے مخاطب ہو کر کہا "شرقی سرحد تمہارے سپرد ہے، تاکہ منگول کا تدارک کر سکو۔"

امداد باہمی

از جناب صفی اورنگ آبادی

انجمن امداد باہمی محکمۂ نظم جمعیت صرف خاص مبارک کے سالانہ جلسہ بابتہ ۱۳۴۰ف کے لئے یہ نظم لکھی گئی تھی، حسن اتفاق سے مجلۂ مکتبہ بھی انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ کا آرگن ہے اور یہ نظم اس کے حسب حال (مجلۂ مکتبہ)

جیتے جی بھی ہوتے ہیں انسان پر لاکھوں عذاب — کیا بتاؤں اُن کی گنتی کیا کروں اُن کا حساب
ایک اُن میں قرض وہ بھی قرضِ سودی کی بلا — جس کو یہ لپٹی ہوا پھر اُس کا گھر کا گھر خراب
پہلے تو یہ ہے کہ قرض آسان بھی ملتا نہیں — بے توسط کون ساہوجی کی ہاں ہو باریاب
باریابی بھی ہوئی تو چاپلوسی چاہیئے — ہو مہاراجہ زباں پر اور کبھی عالی جناب
اک غرض مند، ایک بے پروا خدا کی شان ہے — ہے کبھی آدھی تسلّی اور کبھی پورا جواب
یہ خوشامد، عاجزی جو ہو کسی معشوق کی — عاشقِ ناکام ہو مقصد میں اپنے کامیاب
بیچ والے کا بھی حقِ سعی ہے ٹھیرا ہوا — یوں کما لیتا ہے حسبِ مقدرت وہ بھی ثواب

جیبز پہ، تنخواہ پر، جاداد پر قرضہ ملا — وہ بھی جس کی تین ہیں گنتی نہ تیرہ میں حساب
سو میں ستّر ہاتھ آئے تو بڑی دولت ملی — کم ہو گیا اب سر کا سودا اور دل کا پیچ و تاب
ایسے پیاسے کی طرح مقروض کی حالت ہوئی — دوڑے جو پانی سمجھ کر اور وہ نکلے سراب
مطمئن ہونے لیا تھا قرض، وہ اک خواب تھا — فکر ادائی کی گلے ڈالی۔ یہ ہے تعبیرِ خواب

جس کے ہیں مقروض اُس کے آگے منھ کھلتا نہیں — گھر میں رہ جاتی ہے ساری شان و شوکت رعب داب
ہائے کن کن کو کیا ادبار نے خوار و ذلیل — لاکھ کے گھر خاک ہیں افلاس کا خانہ خراب
"نام دفتر میں بھٹا ہے پانو میں" یہ رنگ ہے — "ہاتھ خالی اور فتح خاں" جیب خالی اور نواب
مفلسی میں ہے تمنّا عیش کی آرام کی — دیکھتے ہیں جھونپڑوں میں رہ کے ہم محلوں کا خواب

یہ ہماری زندگی کی نیم رُخ تصویر ہے

یہ ہماری داستاں کا ایک ہی چھوٹا سا باب

اِس مصیبت میں ہماری رحم دل سرکار نے
کر دیا ہے ایک ایسے محکمے کا فتح باب
باہمی امداد جس کا خاص نصب العین ہے
فائدہ جس سے اٹھا سکتا ہے ہر اک شیخ و شاب
اِس کی سالانہ رپورٹیں بھی ہوا کرتی ہیں طبع
اِس کے اغراض و مقاصد کی بھی ملتی ہے کتاب
اِس میں لکھے ہیں قواعد بھی بڑی تفصیل سے
اِس میں تقریریں بھی ہیں حکام کی با آب و تاب

صدر دفتر وہ ہے لیکن پھر ہر اک دفتر میں بھی
اِس کی ایک اک شاخ کھولی ہے زروئے انتخاب
چوں کہ اس دفتر میں بھی یہ کام جاری ہو چکا
ہو چکے ہیں جس سے اکثر قرض لے کر فیض یاب
پہلا سالانہ یہ جلسہ اُس کا ہے سنیئے رپورٹ
ہو گا روشن آپ پر کیا ہے خطا کیا ہے صواب
اب یہ دفتر کا ہے دستور انجمن کی انجمن
یعنے "ہم خرما" (سمجھئے آپ اِس کو) "ہم ثواب"
میر مجلس اور نائب میر مجلس معتمد
سب یہاں ہیں بے نظیر و بے عدیل و لاجواب
پھر اراکین و محاسب بھی ہیں اِس کے سب امین
جوڑتے ہیں پیسے پیسے پائی پائی کا حساب
صرف ہمدردی سے اک صاحب ہیں قانونی مشیر
ہوں صلے میں ایسی خدمت کے وہ ماجور و مثاب
میں بتاؤں نام کس کا، میں سناؤں کس کا وصف
میں کروں کس کو مخاطب میں کروں کس سے خطاب
نام سے کیا۔ کام سے مطلب ہے دیکھو کام کو
قطرے کو دریا نہ ذرّے کو بناؤ آفتاب
بعض ناموں کی تو گنجائش نہیں اُس بحر میں
اس لئے یہ شجرہ لکھنے سے کیا ہے اجتناب
گر کروں مدح و ثنا تو۔ جتنے انسان اُتنے منہ
جتنے منہ ہیں اُتنی باتیں۔ کیا ہے اِسکا سدِ باب
کیوں دلیلیں پیش کر کے میں ہوں ناحق ذلیل
کیوں جواب اِن کے ادا کر کے بنوں میں لاجواب
پر کا یہ کوّا بنائیں حرف کی یہ داستاں
اور کیا کیا کچھ کہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

سب سے بہتر اور افضل تو مری دانست میں
وہ دعا مانگوں کہ جو ہو جائے فوراً مستجاب
یا الٰہی! جس کے سائے میں ہمیں ہے روز و شب
ذوقِ بیداری میسر اور حاصل لطفِ خواب
کون ہے وہ؟ آصفِ سابع رئیس المسلمین
عدل پرور، علم گستر، رحم دل، گردوں جناب
دوست، اولاد، آل اُس کے شاد اور خرم رہیں
ہر جگہ ہوں کامبخش و کامگار و کامیاب
رکھے زمیں پر اُس کو یوں سب میں بڑا مالک مرے
سارے ستاروں میں جیسا آسماں پر آفتاب

جذباتِ حبیب

از جناب حبیب رامپوری رکن انجمن ذوق ادب

نہ مرتا میں حسینوں پر نہ رسوا کو بکو ہوتا
کسی سے دشمنی ہوتی نہ پھر کوئی عدو ہوتا

بہت اپنی دراندازی سے شرمندہ عدو ہوتا
ہمارا اور اُن کا فیصلہ گر رو برو ہوتا

نہ ہوتی بیقراری دل کو گر تو روبرو ہوتا
نہ اُٹھتا درد پہلو میں اگر ہمدرد تو ہوتا

مرے چاکِ جگر کو دیکھتا اے بخیہ گر تو بھی
اگر تارِ نگاہِ یار سے اس میں رفو ہوتا

حسینانِ جہاں گل چینیاں کرتے تو کیا کرتے
اگر پھولا پھلا اپنا نہالِ آرزو ہوتا

ہمارے وقت میں ہوتا جو ہوتیں ہم سے دو باتیں
تو پھر مجنوں کی وحشت کا نہ شہرہ چارسو ہوتا

اگر مجھ دل جلے کو قتل کر کے دیکھتا قاتل
سیاہی سے توے کی بھی سوا کالا لہو ہوتا

تمنائے شہادت مجھکو اب جینے نہیں دیتی
تری تلوار ہوتی اور قاتل یہ گلو ہوتا

گرا کر مجھکو نظروں سے اُٹھایا اعتبار اپنا
جو میری آبرو کرتا تو تو باآبرو ہوتا

تلاش ناقہ نہ تھی مجنوں کی وحشت تھی
اُسے وہ ڈھونڈھ لیتا گر خیالِ جستجو ہوتا

عدو بے آگ کے دن رات کیا کیا رشک سے جلتے
حبیب اپنے اگر قابو میں وہ خورشید رُو ہوتا

عید کی تمنا

از جناب ثنامن علی صاحب نیساں

پھر نوید وصال یار آئے
دل بیتاب کو قرار آئے

پھر کھلے اپنا غنچۂ خاطر
باغ ارماں میں پھر بہار آئے

پھر گلے اُن سے ہم ملیں نیساں
عید ایسی ہزار بار آئے

تنقید

کلیاتِ وطن | قیمت (عمر) مکتبۂ ابراہیمیہ (۹۴) صفحے تقطیع (۲۰×۳۰/۱۶) لکھائی چھپائی عمدہ۔

حضرت سید افتخار علی شاہ وطن رحمۃ اللہ علیہ حیدرآباد دکن میں اپنے وقت کے ایک بسا بزرگ سمجھے جاتے تھے، ان کی تصانیف کے منجملہ علم تصوف کی ایک کتاب (سفر و وطن) بڑی مشہور ہے۔ "بستانِ تصوف" کے نام سے دیوانِ وطن کئی مرتبہ چھپ چکا ہے، اب مولوی غلام معین الدین صاحب یوسفی نے بڑی خوش سلیقگی سے مختلف ایڈیشنوں کو سامنے رکھ کر "کلیاتِ وطن" کو مصنف رح کی تصویر اور مختصر حالات کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کلیاتِ وطن کے شائع ہونے سے پہلے معلوم ہوا تھا کہ مصنف رح کے باقیات الصالحات ان کی تصانیف کو یکے بعد دیگرے "مجلس سجادگی و جانشینی" کے سلسلے میں شائع کریں گے، لیکن ان حضرات کو اپنی "سجادگی و جانشینی" کے مخمصوں سے فرصت کہاں؟

"مردے از غیب بروں آید و کارے بکند"

عقیدت مندان خاندان افتخاریہ کو مولوی غلام معین الدین صاحب یوسفی کا ممنون ہونا چاہیے کہ موصوف نے موجودہ مذاق مطالعہ کو مدنظر رکھ کر اسے شائع کیا ہے۔ جن نسخوں کو سامنے رکھ کر کلیات مرتب کیا گیا ہے۔ اگر ان کی فہرست بقید سنہ و مطبع دیدی جاتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔ دیباچے میں مصنف رح کے مختصر حالات وغیرہ ہیں، ان میں ہماری معلومات کی حد تک یہ باتیں قابل اضافہ معلوم ہوتی ہیں:۔

مصنف رح کا غالباً فارسی میں حسینی تخلص تھا جس کی تائید ان اشعار سے ہوتی ہے ؎

مدتے شد حسینی خستہ جگر | در ہوائے وصل تو مستانہ تر
از طفیل شافع جن و بشر | کن بریں حسینی ز رحمت یک نظر

(سفر و وطن صفحہ ۳ مطبع خیبر اورنگ آباد ۱۳۰۶ھ) ان کے ایک مرید سید محمود علی عرف سید عبداللہ لقا تھے، جن کا دیوان گلزار مومنین (مائۂ لقا) کے نام سے گلزار ابراہیم پریس حیدرآباد میں چھپ چکا ہے مصنف رح کو فارسی میں مولوی احمد علی صاحب عصر سے اور اردو میں جعفر علی صاحب نیک سے تلمذ تھا جناب نیک کی وفات کے بعد شاید حضرت فیض علیہ الرحمہ سے مصنف رح نے فیض پایا (تذکرہ نقش قلمی)

حضرت فیض کے فیضان سخن کا تو کیا پوچھنا جناب عصر و جناب نیک بھی حضرت فیض کے مشہور شاگردوں میں سے تھے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان حضرات کی نظر فیض اثر سے یہ کلام نہیں گزرا۔ اور اگر گزرا ہے تو بہت کم، فن شاعری کی پابندیوں اور زبان و بیاں کی ترکیبوں کی جستہ جستہ

مثالیں ملتی ہیں، دراصل ان بزرگ واروں کو شاعری کی رسوم و قیود سے بہت کم تعلق ہوتا ہے وہ اپنے واردات قلبیہ کو مرتب شکل میں تحریری طور پر نہایت صداقت کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں اور لفظی الٹ پلٹ میں پڑنا نہیں جانتے، دکن کے ایک اور صوفی بزرگ حضرت آغا محمد داؤد صاحب الوا کا دیوان (دفتر رحمت) جب شائع کیا گیا تو حضرت کے نہایت عقیدت مند مرید مولوی عبدالقیوم صاحب وکیل (مرحوم) اپنی تقریظ میں لکھتے ہیں:-

شعر گوئی کی حالت یہ تھی کہ کبھی ارادتاً شعر نہیں کہا، بلکہ کیفیت غالب ہوئی اور اسی غلبہ میں کچھ کلام موزوں فارسی ہو یا اردو، بے اختیار نکل آیا۔ حاضرین میں سے کسی نے اس کو لکھ لیا۔ باعتبار فن شاعری کوئی تعلق نہ تھا، اکثر ایسا ہوا کہ اس کیفیت میں اشعار ناموزوں بھی نکلتے تھے۔

لیکن جو محض فن شاعری کے اعتبار سے اس دیوان کو مطالعہ فرمائیں گے، اُن کی سمجھ میں بعض اشعار قطعاً نہ آئیں گے.......... صفحہ ۱۶۷ دیوان صحو.......... کلیات وطن کے یہ اشعار

کی فرشتوں سے میں باتیں کیا ہی کیفیت کے ساتھ — گو میں بھی مست رکھی یاد اک شے مخمور کی
نہ تو کعبہ نہ بت خانہ خوش آیا مجھکو — تو نظر آیا جو میں خود نظر آیا مجھکو
شرارت مجھ سے پروانوں نے سیکھی — دیئے کو داغ بھی میں نے دیا ہوں

گلستان شاعری میں خار کی طرح کھٹکیں گے!

حضرت خواجہ میر دردؒ، مرزا مظہرؒ، شاہ گلشنؒ، شاہ نیازؒ، شاہ ترابؒ وغیرہ کی بدولت اردو شاعری میں صوفیانہ اسرار و معارف کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ اس کے سوا بھی اور شعرا کے کلام میں کبھی کبھار تصوف کی چاشنی ملتی ہے لیکن یہ اُن کا قال ہوتا ہے حال نہیں!

کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ مرزا سودا کا یہ شعر ؎

پردہ کو تعین کے در دل سے اٹھا دے — کھلتا ہے ابھی دم میں طلسمات جہاں کا

کسی نے حضرت خواجہ میر درد کے سامنے پڑھا، آپ پر رقت طاری ہو گئی، پوچھا کس کا شعر ہے؟ متقدین مرزا سودا کی مرزا منشی کے باعث سودا کا نام لیتے ہوئے پہلے تو گھبرائے بعد کو بتانے پر مجبور ہو گئے حضرت خواجہ میر دردؒ اپنے حلقہ کے ساتھ مرزا سودا کے مکان پر گئے، سودا کو معلوم ہوتے ہی دوڑ کے باہر خواجہ صاحب کو لینے آئے، خواجہ صاحب نے فرمایا ہاں مرزا صاحب!

پردہ کو تعین کے در دل سے اٹھا دے — کھلتا ہے ابھی دم میں طلسمات جہاں کا

تعین کے پردہ کو در دل سے کس طرح اٹھایا جائے؟ مرزا سودا کی سٹی گم ہو گئی، خواجہ صاحب کے قدموں پر

گر پڑے اور کہنے لگے کہ پہلے کے لوگ اس طرح کہتے آئے ہیں میں نے بھی تقلیداً یہ خیال شعر میں ادا کر دیا ہے میں کیا جانوں کہ تعین کے پردہ کو دردل سے کیسے اُٹھا دیں!

خواجہ صاحب نے سودا کو نصیحت کی کہ بغیر سوچے سمجھے ایسی باتیں شعروں میں نہ لکھا کرو۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ع تصوف برائے سخن گفتن خوب است۔

کلیات وطن میں "گل و بلبل" "حسن رہ گزر" "عشق سر راہے" کے خلاف حقایق و معارف کے نکات بیان ہوئے جیسے

کلام سراپا الہام

میں وہ طلسم غیب شہادت ہوں اے وطن
سنتا ہوں نام پر نہیں ملتا نشاں مرا

آپ کو پاتا ہوں جب آپ میں رہتا نہیں
عالم ہستی تماشا ہے عدم آباد کا

سبھی اگر بہت تو "ہمہ اوست" کہتی ہے
خلقت کے ذہن میں ہی عالم خدا ہے کیا؟

تم شخص ہو، میں عکس ہوں، ہیں ایک یا ہیں دو
منہ دیکھو آئینے میں کہ ماوشما ہے کیا؟

آپ سے ہر دم گزر کر آپ کو پاتا ہوں میں
رات دن مجھ کو وطن میں بھی سفر ہے دور کا

معنوی ایک نہیں، علاقہ لفظی ہیں بہت
قال کرتے ہیں مگر حال نہیں دم بھر کا

آپ سے جب میں گذرتا ہوں تجھے پاتا ہوں
دیکھتا ہوں تیری آنکھوں سے تماشا تیرا

کہیں ہوں سورج، کہیں ہوں ذرہ، کہیں ہوں دریا، کہیں ہوں قطرہ
وفور کثرت سے اپنے مجھکو ہوا ہے ملنا محال میرا

پائیں گے ساکنان دو عالم کہاں مجھے
ماوشما نہیں ہیں جہاں ہے وطن مرا

یہ ہے علم تصوف کا خلاصہ
محمدؐ نام ہے شان خدا کا

نمود اشیاء مرے قدم سے ظہور اسما ہے میرے دم سے
ہوں بزم عالم میں جلوہ آرا میں شان اپنی اپنی بنا بنا کر

لفظ "انا" کو کہتے ہیں ارباب معرفت
معلوم ہو جو غور کریں ذرا کی طرف

ذکر دنیا ہے نہ فکر آخرت ہے اے وطن
اور ہی عالم کی باتیں کر رہے ہیں یاد ہم

حق شناسو! حق مری گوئی سے آگاہ ہے
حق، ہے گویا حق ہے شنوا حق ہی بینا ہیں نہیں

قالب میں جان، جان ہے جان جہاں میں
میں ہوں مکاں میں، ہے یہ مکاں لامکاں میں

آپ میں مجھ میں جو نسبت ہے نظر آتی ہے
آئینہ لے کے ذرا آپ منہ اپنا دیکھو

مقام وصل میں سوچو تو اللہ ہے نہ بندہ ہے
فقط ایک نام کی ہے قید قطرہ ہے نہ دریا ہے

مرے جی میں ہے پوچھوں رکھ کے قرآں شیخ کے آگے
زباں مطلق نہیں حق کو تو پھر یہ کون گویا ہے؟

امید ہے کہ کلیات وطن کی ارادت مندان اقتداریہ کے حلقہ میں پوری قدر کی جائے گی۔ (ع، ی)

جدید و تازہ کتب اور رسالے

وہ کتابیں جو حال ہی میں ہندوستان میں شائع ہوئی یا مکتبہ میں آئی ہوئی ہیں

تجارت عرب۔ ناشر پیسہ اخبار لاہور۔ قیمت ۱۰ر
خوبصورتی اور تندرستی ″ ″ عہ ۱۲ر
درازی عمر کے اسرار۔ ″ ″ عہ ۱۲ر
آہنی ارادہ ″ ″ ۵ر
عمدہ حافظہ کا راز ″ ″ ۶ر
مطالعہ نفس ″ ″ ۶ر
مطالعہ باطن ″ ″ ۵ر
امریکہ کے کامیاب لوگ ″ ″ عہ ۲ر
آئینۂ اسلام ″ ″ عہ ۲ر
محبوب الاخلاق ″ ″ ۱۰ر
معلم السیاست۔ مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ″ عہ ۱۲ر
تاریخ ہند۔ از لاجپت رائے انجہانی ″ عہ ۸ر
پولیٹیکل اکانومی۔ از امرناتھ ایم اے۔ ″ عہ ۱۲ر

عورت کا دل۔ از اختر قیمت عہ ۲ر
خواب و خیال۔ از پریم چند ″ عہ ۹ر
تفسیر آیۂ کریمہ مصنفہ امام ابن تیمیہ (الاو) ″ ۱۵ر
سیر المصنفین جلد دوم۔ از تنہا بی اے۔ ″ للعہ ۶ر
خیالات اورنگ۔ مترجمہ ″ ″ ۱۰ر
مخزن ظرافت شائع کردہ مرغوب ایجنسی لاہور ″ ۶ر
مضامین حکمت۔ شائع کردہ انڈین پریس الہ آباد ″ روپے ۱۲ر
نہرو رپورٹ اردو۔ مرتبہ نہرو کمیٹی ″ عہ ۱۲ر
تتمہ ″ ″ ″ ۱۰ر
پردہ۔ مولفہ عبد الحلیم شرر ″ عہ ۲ر
خاک پروانہ۔ پریم چند ″ عہ ۲ر
عروج کابل۔ از سید ظہور احمد شاہجہانپوری ″ ۱۰ر
فن شاعری۔ ″ ″ ″ ۶ر

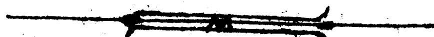
بیوی کے فرائض۔ از سید ظہور احمد شاہجہانپوری۔ قیمت ۱۰ر
آداب مجلس۔ ″ ″ ″ عہ ۲ر
شب نامچہ عروس از غلام احمد ″ عہ ۲ر
ابن سعود از عظمت علی ″ عہ ۹ر
بہترین انشا پرداز از مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ ″ عہ ۱۲ر

مشہور رسالوں کے تازہ سالنامے اور خاص نمبر

سالنامہ نیرنگ خیال لاہور قیمت عہ ۱۲ر
″ ہمایون ″ عہ ۲ر
خاص نمبر عالمگیر ″ عہ ۲ر
سالگرہ نمبر نمائش حیدر آباد ″ ۱۲ر
رسالہ نگار سنہ ۱۹۲۲ء کے جلد کا انتخاب عہ ۲ر
خاص نمبر رسالہ زبان منگرول بابتہ ۱۹۲۷ء عہ ۲ر

حسب ذیل ماہانہ و ہفتہ وار رسالے و اخبار مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتے ہیں

نیرنگ خیال ۵ر کلدار معادل ۵ر۱۰ر عثمانیہ۔ نگار ۸ر کلدار ۹ر۴ عثمانیہ۔ مخزن ۶ر کلدار ۷ر عثمانیہ۔ نظام گزٹ ہفتہ وار ۲ر عہ
عالمگیر ۵ر کلدار معادل ۵ر۱۰ر عثمانیہ۔ معارف ۸ر کلدار ۹ر۴ عثمانیہ۔ مجلہ مکتبہ ۶ر عثمانیہ۔ سروت ہفتہ وار ۲ر عصمت
۵ر کلدار ۵ر۱۰ر عثمانیہ۔ ہمایون ۸ر کلدار ۹ر۴ عثمانیہ۔ تجلی سہ ماہی ۱۲ر عثمانیہ۔ سفینہ سہ ماہی (مدراس) عہ ۲ر
زمانہ ۸ر کلدار ۹ر۴ عثمانیہ۔ مجلہ عثمانیہ سہ ماہی عہ ۸ر۔ عصمت کا جوبلی نمبر عالی کلدار عہ عثمانیہ تازیانہ ۱ر کلدار ۱ر۳ عثمانیہ
طاقت ۲ر کلدار ۲ر۶ عثمانیہ



افتخار الحکما نواب حاذق جنگ مرحوم سابق افسر الاطبا فرماتے ہیں

میں نہایت مسرت اور بڑی خوشی کے ساتھ محض بیماروں کی شفا کی غرض سے چند سطور سپرد قلم کرتا ہوں۔ برص (سفید داغ) یعنی کوڑھ اور سفید داغ کا علاج نہایت مشکل ہے۔ یہ مرض عموماً بڑا صاہی جاتا ہے۔ حکیم مولوی محمد عبد القادر صاحب مدد گار صدر مخزن الادویہ یونانی سرکار عالی و رکن دار التشخیص و انجمن اطبا یونانی حیدر آباد دکن خصوصاً علاج برص میں ید طولیٰ رکھتے ہیں صاحب موصوف نے اکثر مرضا برص کا علاج بہت ہی کم مدت میں نہایت قابلیت سے کیا اور یہ فضلہ کامیاب ہوئے ہیں نے بچشم خود مرضا برص کا معائنہ کیا ہے۔ بعد علاج جسم بالکل اصلی حالت پر ہو جاتا ہے۔ حکیم صاحب موصوف کی بہترین قابلیت اور مجرب دوا کا اثر ہے میں حکیم صاحب موصوف کو ایسے کٹھن مرض کی دوائے مجرب کی ایجاد پر مبارکباد دیتا ہوں اور پبلک سے زور کے ساتھ سفارش کرتا ہوں کہ وہ برص کے مریضوں کو حکیم صاحب موصوف کے پاس رجوع ہونے کی ہدایت کریں اور مریضان برص کو چاہئے کہ وہ اس موقع کو غنیمت سمجھکر حکیم صاحب موصوف سے علاج کرائیں اور اس مرض منحوس سے غافل نہ رہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

شرح دستخط (افتخار الحکما حاذق جنگ)

ویجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پُر تاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے۔ جو اقسام کے اعصابی و اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہاسال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پُر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے کوئی گھر او خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس وجع مفاصل دمہ۔ درد سر درد بیول بچھو کے زہر کھنچنے زخم ملنے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال تھوڑی دوا لیکر دن میں تین چار دفعہ مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھانپ دیں اور صاف کریں۔ جو اصحاب بغرض امتحان دوا طلب فرمائیں بخوبی تعمیل کی جائیگی۔

خوشخبری ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ دواؤں کا ذخیرہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔

المشتہر جمیس اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمۂ مالگذاری حیدرآباد دکن

اُردو زبان کا قدیم و مستند ماہوار رسالہ صرف

"زمانہ"

ہے جو ملک کے مشہور ادیب منشی دیا نرائن نگم صاحب بی اے کی ادارت میں پچیس سال سے متواتر اردو زبان کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ علمی و ادبی مقالات تحقیقی تنقیدی مضامین، دلکش و سبق آموز افسانے، بہترین نظمیں اور غزلیں، علمی خبریں اور نوٹس، غرض ہر قسم کے بہترین مضامین آپ کو صرف "زمانہ" میں مل سکتے ہیں۔ مشاہیر ملک و اہل قلم کے علاوہ آرٹ کی اعلیٰ تصاویر بھی ہمراہ بالالتزام "زمانہ" میں شائع ہوتی ہیں۔ فروری ۱۹۲۸ء میں "زمانہ" کی پچیس سالہ جوبلی کے موقع پر ایک خاص نمبر "جوبلی نمبر" کے نام سے شائع ہو کر قبولیت عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔ اگر آپ نے ابھی تک "زمانہ" ملاحظہ نہیں کیا ہے تو آج ہی اس کے خریدار ہو جائیے۔ قیمت سالانہ صرف پانچ روپیہ ششماہی (دو روپیہ بارہ آنے) روپیہ۔ فی پرچہ ۸ر مقرر ہے۔

منیجر رسالہ "زمانہ" کانپور

قابل قدر و لائق مطالعہ کتابیں

پریم بتیسی۔ اُردو کے مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند بی اے کے دلکش قصوں کا مجموعہ ہے۔ زبان کی سلاست و لطافت قابل دید ہے۔ قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم ۱۲ر

خاک پروانہ۔ یہ بھی پریم چند صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے اس میں چودہ منتخب جدید افسانے ہیں ہر افسانہ واقعات کی ہو بہو تصویر اور نفسیات انسانی کی بے مثل تمثیل ہے۔ قیمت عہ روپیہ

خیالات عزیز۔ مولوی عزیز مرزا صاحب بی اے کے دلکش و سبق آموز مضامین کا مجموعہ جو باقاعدہ رجسٹری شدہ ہے۔ اور ہمارے علاوہ کسی دوسری جگہ سے نہیں مل سکتا۔ قیمت عہ روپیہ

سیر المصنفین (حصہ اول) اُردو نثر نگاروں کا تذکرہ۔ از مولوی محمد یحییٰ صاحب بی۔ اے۔ قیمت عہ روپیہ۔

سنسکرت علم ادب۔ سنسکرت کے علم ادب کے متعلق بہترین معلومات کا ذخیرہ۔ قیمت ۱ہر

گلکدۂ لسان الہند۔ حضرت عزیز لکھنوی کا منتخب دیوان ہر شعر ندرت تخیل و جذبۂ دل کا صحیح نمونہ ہے قیمت عہ روپیہ

اختر ستان۔ خان صاحب مرزا جعفر علی خاں اثر بی۔ اے۔ لکھنوی کے اُردو کلام کا مجموعہ قابل دید ہے۔ قیمت عہ روپیہ۔

سرمایۂ تسکین۔ حضرت تسکین سورنوی کی منظومات و غزلیات کا مجموعہ۔ قیمت عہ روپیہ

کاس الکرام۔ یعنی شرح رباعیات عمر خیام از میر ولی اللہ صاحب قیمت عہر روپیہ

لسان الغیب۔ اُردو میں دیوان حافظ کی بہترین شرح از میر ولی اللہ صاحب قیمت ہر دو حصے (للعہ) روپیہ

منیجر زمانہ بک ایجنسی۔ کانپور

مطبوعاتِ مکتبہ

دکن میں اردو - مؤلفہ مولوی محمد نصیرالدین ہاشمی صاحب منشی فاضل۔ جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی، عادل شاہی و آصف جاہی دوران میں اردو نظم و نثر کی حالت اور شعرائے اردو کا تذکرہ مع نمونۂ کلام ضخامت ۴۸۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن $\frac{20\times30}{16}$ کاغذ چکنا بار دوم قیمت ہے

خیابانِ اردو - مرتبہ جناب محمد عارف صاحب حیدرآبادی ہندوستان کے ممتاز اہل انشا پردازوں اور نامی گرامی شعرا کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۲۵۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن $\frac{20\times30}{16}$ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ عہ

روحِ تنقید - مصنفہ مولوی ابوالحسنات سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے۔ فن تنقید کے متعلق اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں ماضی و حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر تنقید نمونۃً کیا گیا ہے ضخامت ۲۵۰ سائز پاکٹ ایڈیشن $\frac{20\times30}{16}$ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ بار دوم قیمت عہ

تنقیدی مقالات - مصنفہ زور صاحب یہ روح تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روح تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی، فارسی اور اردو زبانوں کے مشہور اہل قلم کی قلمکاریوں پر تنقید کرکے اصولوں کا استعمال دکھلایا ہے اور نیز بعض مشہور اردو انشا پردازوں کے طرز تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کیے گئے ہیں ضخامت ۲۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن $\frac{20\times30}{16}$ کاغذ چکنا لکھائی وغیرہ عمدہ مجلد سادہ ہے

اردو کے اسالیبِ بیان - مصنفہ زور صاحب۔ نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت ابتدا سے لیکر آج تک کے نثر نگاروں کے طرز تحریر و انداز بیان کا تذکرہ۔ خاص طرز تحریر کے اردو انشا پردازوں کے اسالیب بیان پر تبصرہ ضخامت ۴۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سادہ عہ

سلطان محمود غزنوی کی بزمِ ادب - مصنفہ زور صاحب۔ سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی، ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۲۰ صفحے۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲ر

دنیائے افسانہ - مصنفہ مولوی محمد عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی۔ افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نویسی کے اصول و مبادیات اردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۲۱۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت ہے

مبادیٔ فلسفہ - مؤلفہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی، ڈاکٹر اے ایس راپورٹ پی۔ ایچ۔ ڈی کی پرائمر آف فلاسفی کا مکمل بامحاورہ اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۴ر

اربابِ نثرِ اردو - مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے فورٹ ولیم کالج کے اردو اہل قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر نگاری کی تاریخ ضخامت ۲۴۳ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عللہ

آثار الکرام - جلد اول مصنفہ شمس المورخین جناب حکیم سید شمس اللہ قادری ایم آر اے ایس ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی محققانہ تاریخ ضخامت ۱۴۴ صفحے۔ سائز $\frac{20\times27}{16}$ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی خاصی قیمت ۱۲ر

جواہرِ کلیاتِ نظیر - منتخبہ جناب مولانا ذہین و سید محمد احمد نظیر اکبرآبادی کے کلیات سے اخلاقی، ادبی، نصیحت آموز، ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۸۰ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی خاصی قیمت عہ

عقائدِ امام - مترجمہ مولوی محمد عبدالغفور عابدی صاحب فقہ اکبر کا عام فہم اور بامحاورہ اردو ترجمہ۔ قیمت ۴ر

اسوۂ حسنہ - مصنفہ مولوی احمد عبداللہ مسدوسی بی اے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۸ر

دکنی لغت - مؤلفہ مولوی سید شعار احمد شعار ہاشمی۔ اردوئے قدیم یعنی دکھنیات کا لغت جس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۸ر

شاہ رفیع الدین قندھاری - مرتبہ مولوی محمد عبدالغفور صاحب عابدی۔ دکن کے ایک مشہور صاحبدل صوفی عالم کے دلچسپ حالات ضخامت ۴۸ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن۔ کاغذ چکنا۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۵ر

خزینۂ اخلاق - مصنفہ مولوی سید عبدالعزیز صاحب عزیز اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ۔ ضخامت ۶۴ صفحے۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۲ر

سیرتِ خیر البشر - سیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں آنحضرت صلعم کے مکارم اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت ار

نیک بی بی - مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے۔ نیک خو بی بی کس طرح اپنے بدخو شوہر کو ٹھیک کر سکتی ہے۔ قیمت ۲ر

چھوٹا شیطان - مصنفہ مولانا ذہین۔ منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ار

مطبوعہ مطبع مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام رام کشن لیتھوگرافر منیجر مطبع

مجلہ

مکتبہ

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر
محمد عبدالقادر سروری
ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

مجلۂ مکتبہ

۱۔ یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲۔ یہ علمی وادبی رسالہ ہے جسمیں علم وادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳۔ بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴۔ قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عاہر) فی پرچہ ۶

۵۔ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (ے) اور چوتھائی کے لئے عہر ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے انکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلاقیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلۂ مکتبہ بلاقیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلۂ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کر دیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر، مضامین اور جملہ خط وکتابت بتوسط "منتظم مجلۂ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیے۔

رجسٹرڈ نشان مہر سرکار آصفیہ
(۶۵)

مجلّہ مکتبہ

رجسٹرڈ نشان مہر سرکار انگلشیہ
(۰۰۰۰۰۰)

جلد (۲) بابتہ ماہ فروردی ۱۳۳۸ف م فروری ۱۹۲۹ء شمارہ (۵)

تصویر: مولانا مفتی سید اعظم علی مرحوم شائق حیدرآبادی

فہرست

مجلۂ مکتبہ

۱- یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے
۲- یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے
حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔
۳- بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو
ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالۂ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔
۴- قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عاہر) فی پرچہ ۶
۵- اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (سے) اور چوتھائی
کے لئے عہر ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲ ۱/۲ سے
۲۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے انکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلا قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ بلا قیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی۔ جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسیدیں "منتظم مجلہ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کر دیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ترسیل زر، مضامین اور جملہ خط و کتابت بتوسط "منتظم مجلہ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیئے۔

شذرات

ہندی پرچار سبھا نے جنوبی ہند خصوصاً مدراس میں ہندی زبان کے پھیلانے کے جو منظم پروپگنڈے پچھلے دس سال کے اندر کئے ہیں ان پر ایک نظر بازگشت ڈالنے سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ کوشش خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو اور اتحاد عمل کیسے نتائج پیدا کرسکتے ہیں۔ ایک مہاتما گاندھی کے اشاروں پر جن کی صدارت میں اس سبھا کا آٹھواں سالانہ جلسہ اندور میں ہوا تھا۔ مدراس کے ہر بڑے چھوٹے گاؤں اور شہر میں سبھا کی کوئی نہ کوئی شاخ قائم ہوئی۔ اس کی نشر و اشاعت کی وسعت کا اندازہ اس امر سے کسی قدر ہوسکتا ہے کہ فی الحال ۵۰ مرکز صرف امتحانات کے مقرر ہیں۔ اس سبھا نے اپنا ذاتی مطبع قائم کرلیا ہے۔ اور چالیس کے قریب کتابیں بھی شائع کیں۔ ہزاروں آدمیوں کو زبان سے روشناس کردیا۔ ہندی زبان کو جامعہ مدراس کے امتحانات میں داخل کروادیا غرض وہ کچھ کیا جو ایک زبان کی اشاعت کا ضامن ہوسکتا ہے۔ اور یہ تمام صرف اس کے بہی خواہوں کے صحیح ذوق خدمت اور اچھی تنظیم کا نتیجہ ہے۔ کاش اردو کی اشاعت کیلئے اس کے آدھے جوش ہی سے کام کرنے والا کوئی ادارہ وجود پذیر ہوجاتا۔

آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس کا دسواں اجلاس اوائل ماہ میں اس دفعہ حیدرآباد میں لیڈی سر آسمان جاہ کی صدارت سے منعقد ہوا۔ کانفرنس نے اس اجلاس میں جن تحریکات پر غور کیا اور جن کو کامیاب بنانے کی وہ سعی کرے گی، گذشتہ کی نسبت زیادہ ضروری اور عملاً مفید ہیں۔ ان میں سے تحریکات نمبر (۱) نصاب تعلیم میں امور خانہ داری کا لحاظ (۳) زنانہ طبیہ کالج کا قیام (۴) موجودہ طرز معاشرت کی تبدیلی (۶) خواتین میں اشاعت علم کے مخصوص طریقے اختیار کرنے کے متعلق خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

گذشتہ اجلاس کی طرح اس سال بھی ایک اہم تحریک اور اس کی منظوری اس اجلاس کی روح رواں ہے۔ یہ تحریک مسز حکم (گلکنڈہ) کی طرف سے پیش ہوئی تھی کہ "اس کانفرنس کی رائے میں پردہ ہر مسلمان اور شریف خاتون کیلئے نہایت ضروری اور باعث عزت ہے"

اس رسالے کے ساتھ جو تصویر شائع ہورہی ہے، وہ اردو کے مشہور اور ہر دلعزیز شاعر شائق مرحوم (حیدرآبادی) کی ہے۔ یہ بلدہ کے ایک قابل احترام خاندان مشائخین کرام سے تھے۔ بچپن ہی سے شعر گوئی کا چسکا تھا اور نہایت پرگو شاعر تھے چنانچہ ان کا کلام ایک کلیات کی صورت میں شائع ہوچکا ہے۔ جو تمام اصناف شاعری پر مشتمل اور نہایت ضخیم ہے۔ ان کا کلام عاشقانہ اور صوفیانہ ہے۔ اور اس کا بیشتر حصہ نعتیہ ہے۔ غزلیں، ٹھمریاں، ترجیع بند غرض تمام نعت پر مشتمل ہیں۔

ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی ہر دلعزیزی ہے۔ یہ ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلا ہوا اور عورتوں اور مردوں دونوں کے ورد زباں ہے۔ اس کی بڑی وجہ ان کا "مولود خوانوں" کا موضوع بننا ہے۔ اس کو ربیع کے یا متبرک موقع پر چند لوگوں کی ایک جماعت خاص خاص لہجوں سے پڑھتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی کلیات کا ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں ملے گا جو کسی محفل مولود خوانی میں اور ایک سے زیادہ مرتبہ نہ پڑھا جاچکا ہو۔ ان کے حالات، باوجود کوشش کے فی الحال اس سے زیادہ دستیاب نہ ہوسکے۔ آئندہ جب کبھی فراہم ہوجائیں گے ان سے قارئین کرام کو روشناس کیا جائے گا۔

حدیقۃ العالم

از جناب محمد سراج الدین صاحب طالب

ہمارے مکرم دوست، مولوی محمد سراج الدین صاحب طالبؔ، نواب میر عالم مرحوم، دیوان دکن کی "سوانح عمری" لکھ رہے ہیں، تاریخ "حدیقۃ العالم" "میر عالم" کے نام سے عام طور پر مشہور و معروف ہے۔ چارلس ریو، ہرمن ایتھے نے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی ترتیب فہرست کے وقت، اس کی حقیقت پر کسی قدر توجہ کی تھی، اور اس توجہ کا استدلال مسٹر گرانٹ ڈف (مولف تاریخ مرہٹہ) کے مخطوطات پر مبنی تھا، جن لوگوں کی دسترس ان فہرستوں تک ہوتی وہ تو ایک حد تک اس سے واقف ہو جاتے ورنہ محض منقولات اور صفحات کے حوالے دینے والے حضرات عام غلط فہمی کے آج تک شکار نظر آتے ہیں، مولوی سراج الدین صاحب طالب کے پیش نظر، نواب سالار جنگ بہادر کے مشہور کتب خانے کا ایک خاص نسخہ بھی رہا ہے جس کی وجہ سے ریو، اور ایتھے کی تحقیقات پر بھی روشنی پڑتی ہے!

ایک اور کتاب "دہ مجلس" اردو منظوم بھی میر عالم کے نام سے موسوم ہے جو محکم کی تصنیف ہے۔

(مجلۂ مکتبہ)

یہ غفران مآب "نظام علی خان" آصف جاہ ثانی" کے عہد کی ایک تاریخ ہے اور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے یا مقالے میں اول دیباچہ کتاب ہے اور اس کے بعد ایک مقدمہ جس میں سلطان قلی قطب شاہ کا نسب بیان کیا گیا ہے اور پھر سات ابواب ہیں جن میں علی التسلسل سات قطب شاہی سلاطین کے احوال مندرج ہیں۔ دوسرے مقالے میں اول ایک مختصر دیباچہ ہے جس میں مقالہ کی تقسیم بتائی گئی ہے اور پھر ایک مقدمہ ہے جس میں اُن حکام و صوبہ داروں کا بیان ہے جو سلاطین قطب شاہیہ اور آصفیہ کے مابین منجانب سلطنت مغلیہ صوبۂ دکن پر مامور رہے ہیں۔ اس کے بعد کتاب میں چار باب چار سلاطین آصفیہ کے احوال پر مشتمل ہیں دیباچہ میں اس مقالے کے پانچ باب بتائے گئے ہیں لیکن کتاب میں چار ہی مذکور ہیں۔ پانچواں باب جو مغفرت منزل سکندر جاہ کے عہد پر مشتمل ہے اس میں نہیں ہے اس کتاب کی نسبت مشہور ہے کہ ریاست آصفیہ کے مشہور وزیر میر عالم کی تصنیف ہے اور یہی اس کے مطبوعہ نسخہ کے مقالۂ اول کے دیباچہ سے معلوم بھی ہوتا ہے

چنانچہ۔ بناءً علی ہذا درمرأت خاطر فاتر اضعف عباد اللہ القوی ابوالقاسم بن رضی الدین الموسوی الملقب بہ
میرعالم کہ از منعمان دولت آصفی نژاد و منتسبان این ریاست فیروزی بنیاد است جلوہ گر گردید کہ اگر از آ
اخبار رنگارنگ چمن دولت سلسلۂ علیہ عالیہ آصفیہ ادام اللہ ایام دولتہم را کہ در صحن بساتین کتب
متفرقہ گل گل شگفتہ است برشتہ تحریر گلدستہ بندی لآلی آبدار مکارم احوال و معالی آثار این خاندان عالی
شان شامخ الارکان را کہ در اصداف السنہ و افواہ منتشر افتادہ است ......"

اور شاید اسی بناء پر یہ کتاب سب سے پہلے سراج الملک کے عہد وزارت میں انہیں کے ایماء پر طبع وشائع ہوئی اور قریباً نصف صدی بعد حسب الحکم نواب فخر الملک بہادر مطبع سیدی میں مکرر طبع ہوئی اس کے بعد برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی جو فہرستیں مدون وشائع ہوئیں ان میں اس کے متعلق سب سے پہلے یہ تحقیق پبلک میں پیش کی گئی کہ حدیقۃ العالم میرعالم کی تصنیف نہیں ہے۔ چارلس ریو برٹش میوزیم کی فہرست مخطوطات میں لکھتے ہیں کہ حدیقۃ العالم کے قلمی نسخہ (مخزونہ برٹش میوزیم) کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد ابوتراب ابن سید احمد الرضوی اس کے مصنف ہیں جو اپنی کتاب کے دوسرے مقالے کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ پہلے مقالہ کو جسے میرعالم کے نام سے منسوب کیا گیا ہے ختم کرنے کے بعد میں دوسرے مقالے کو شروع کرتا ہوں۔ ریو نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مطبوعہ نسخہ میں میرعالم جہاں اپنا ذکر کرتے ہیں تو اپنے آپ کو اس قلمی نسخہ میں جہاں میرعالم کا ذکر آیا ہے وہاں ان کے نام کے لئے ضمائر واحد غائب استعمال ہوئے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ اس کا لکھنے والا کوئی اور ہے۔ انڈیا آفس کی فہرست کے مرتب ہرمن ایتھے کی تحقیق بھی یہی ہے اس کے علاوہ اس نے اس کتاب کے متعلق یہ نئی معلومات بھی فراہم کی ہے کہ میر ابوتراب بن سید احمد الرضوی اپنی اس کتاب میں لکھتے ہیں کہ میر اکبر علی خاں سکندر جاہ کے حکم پر وہ (میر ابوتراب بن سید احمد) شاہان قطب شاہی کی تاریخ لکھنے پر مامور ہوئے اور انہوں نے یہ کتاب لکھی اور اس کا نام قطب نمائے عالم رکھا۔" اس کا سن تصنیف ۱۲۲۱ھ ہے جو ۱۸۰۶ عیسوی کے مطابق ہوتا ہے یہ کتاب بھی ایک مقدمہ اور سات باب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے جو حدیقۃ العالم کے ابواب کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں چارلس اور ایتھے دونوں کا استدلال ان دو کتابوں پر ہے جو مسٹر گرانٹ ڈف (مؤلف تاریخ مرہٹہ) کے پاس تھیں اور یہی نسخے بعد میں ان کے پاس سے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں منتقل ہوئے اس لحاظ سے حدیقہ کے متعلق سب سے پہلے محقق گرانٹ ڈف ٹھیرتے ہیں تحقیق جس کسی نے پہلے پہل کی ہو بہرحال یہ ضرور ہے کہ حدیقۃ العالم خود میرعالم کی تصنیف نہیں ہے۔ اگرچہ کتاب کے تفصیلی مطالعہ سے بعض مقامات پر اس کے خلاف بھی کچھ شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کا تخلیہ ایسے مقامات

کے مطالعہ سے خود بخود ہو جاتا ہے جن کا خود میر عالم کے قلم سے لکھا جانا کسی طرح باور نہیں آتا۔ مثلاً جہاں میر الملک (علی زماں خاں) سے میر عالم کی لڑکی کی نسبت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کے طرز اظہار سے یہ یقین نہیں ہو سکتا کہ میر عالم نے خود اس طرح لکھا اس موقع پر اُس عبارت کو نقل کرنا بیجا نہ ہوگا:۔

"چوں خاتون جنت بنت رسول الثقلین ابو القاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحکم الٰہی بوساطت جبرئیل امین بحیدر صفدر منسوب شد برطبق آں نور چشمی ابو القاسم سوداوراق کہ از ذریات رسول اکرم است باں حیدر ابن صفدر بتقدیر سبحانی بموجب حکم بندگان عالی در حین حیات والد ماجدش نواب غیور جنگ (صفدر یار خاں) مرحوم نامزد گردید......"

اس سے صاف طور پر معلوم ہو سکتا ہے کہ ان تشبیہات کو میر عالم خود اپنے یا اپنی بیٹی اور داماد کے لئے استعمال نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اگرچہ یہ ذریات و اسباط سے ہونے کے باعث وہ مجاز تھے کہ ان کا استعمال کریں لیکن اس کا اظہار اپنے منھ آپ کرنا شخیت کی حد تک پہنچتا جس کو عقل سلیم تسلیم نہیں کرتی۔ اس کے قطع نظر ہم اس عبارت کو سید محمد میر ابو تراب کی بھی نہیں سمجھ سکتے اس واسطے کہ مصنف کے اصل نسخے میں اس کا کہیں ذکر بھی نہیں ایسے الحاقات پر علٰحدہ روشنی ڈالی جائے گی۔

حدیقۃ العالم کے پہلے مقالے کے دیباچہ میں جہاں مصنف کا نام بتایا گیا ہے وہاں ابنیت بتانے میں صحت نام کا بہت کم خیال رکھا گیا ہے چنانچہ میر عالم کے باپ کا نام جو رضی الدین لکھا گیا ہے کسی تذکرے یا تاریخ میں ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ صاحب تحفۃ العالم (سید عبد اللطیف شوستری) جو میر عالم کے حقیقی چچیرے بھائی تھے اور جنہوں نے اپنی کتاب میں اپنے خاندان کے متعلق تفصیلی معلومات جمع کئے ہیں اور اپنے دادا اور ان کے جملہ بیٹوں کے نام علی الترتیب بتائے ہیں کہیں میر عالم کے باپ کا نام رضی الدین نہیں بتاتے اور اُن کے متعلق تو یہ قیاس نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے چچا کا نام بتانے میں غلطی کی جس تذکرے یا جس تاریخ میں ان کے والد کا ذکر آیا ہے سید رضی کے نام سے آیا ہے۔ یہ فارسی زبان کے فاضل اور اچھے شاعر اور اپنے زمانے کے مجتہدین سے تھے اقدس تخلص کرتے تھے اور مشہور مصنف غلام علی آزاد بلگرامی کے ہمعصر تھے خود آزاد نے ان کو سید رضی نام اور اقدس تخلص سے یاد کیا ہے[۱]۔ اگر اس کتاب کو خود میر عالم تصنیف کرتے تو اُن سے اپنے والد کا نام بتانے میں ایسی فروگزاشت نہیں ہوتی۔ مصنف کے اصل نسخہ کے مقالۂ دوم کی ایک نقل نواب یوسف علی خاں سالار جنگ بہادر کے کتب خانۂ علوم مشرقی میں موجود ہے جو نواب نمامدوح کے الطاف وعنایات سے ہمارے دیکھنے میں آئی۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ سید محمد میر ابو تراب نے اس کا

[۱] مجلۂ مکتبہ بسرو آزاد صفحہ ۲۲۳۔

مقالۂ اول حسب الحکم میر عالم لکھا اور اس کو ان کے نام سے منسوب کر دیا چنانچہ اس کی عبارت یہ ہے۔

"مخفی نماند کہ اضعف عباد اللہ القوی سید محمد مدعو بہ میر ابو تراب ابن سید احمد الرضوی عاملہما اللہ بلطفہ الخفی والجلی حسب الحکم واجب الانقیاد عالیجناب سید مکرم معدن احسان و کرم وزیر اعظم حضرت خلیفہ دوران اسکندر زمان دام ظل رحمتہ علی رؤس العالم میر ابو القاسم المخاطب بنواب میر عالم اعلی اللہ مقامہ چون کتاب حدیقۃ العالم متضمن دو مقالہ مقالۂ اولی در ذکر آثار ملوک قطب شاہیہ نور اللہ مراقدہم و مقالۂ ثانیہ در بیان احوال خیر مآل سلسلۂ عالیہ آصفیہ خلد اللہ دولتہم وغیرہ کہ در فہرست این مقالہ مرقوم تالیف نمودہ بنام نامی آن وزارت انتساب منسوب گردانیدہ ...."

اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے میر عالم کی فرمائش پر یہ تاریخ لکھی اور اس کو ان کے نام سے موسوم کیا لیکن ایتھے کی یہ تحقیق کہ حدیقۃ العالم سکندر جاہ کی فرمائش پر لکھی گئی ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں تک صحیح ہے قلمی نسخۂ ما بہ البحث کے دیباچہ کی عبارت بالا کے علاوہ بعد کی اس عبارت سے بھی۔

"امر عالی آن مدار المہام صاحب اختیار ذو الاقتدار دام دور اقتدارہ و اختیارہ بذرۂ بیمقدار منسلک در سلک متوسلان دامن دولت خلوص منزلت مؤلف کتاب موسوم عز صدور یافت کہ مستعد و سرگرم اظہار ما فی الضمیر خورشید نظیر بودہ ...."

ظاہر ہے کہ کتاب اس نے میر عالم ہی کی فرمائش پر لکھی۔ اگرچہ کہ اس عبارت میں مدار المہام کا نام واضح نہیں ہے تاہم چونکہ مصنف نے اسی دیباچہ کے آغاز میں میر عالم کا نام صراحتاً بتا دیا ہے اور اس کے علاوہ بعد میں اسی تصنیف کا سن "یکہزار و دو صد و بست و سیوم از سنین ہجریہ" بتایا ہے اور اس زمانہ میں مدار المہام وہی تھے اس لحاظ سے اس امر کے یقین کرنے کے بغیر کوئی اور صورت نظر نہیں آتی کہ یہ کتاب ان ہی کے عہد وزارت میں تصنیف ہوئی یہ البتہ ممکن ہے کہ اسی کتاب کو مصنف نے سکندر جاہ کے ملاحظہ میں پیش کرنے کے لئے دیباچے میں ضروری تحریف کر لی ہو اگر اس تحریف کو ہم مان لیں تو اس سے مصنف پر تلون طبع کا الزام عائد ہوگا لیکن واقعہ اس کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ میر عالم بڑے مردم شناس تھے اور وہ آدمی سے اسی قسم کا کام لیتے تھے جس کا وہ اہل نظر آتا۔ سید محمد میر ابو تراب علمی قابلیت رکھنے کے علاوہ ان کو تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے نظر آئے اس لئے ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے ان سے فرمائش کی کہ ایسی ایک تاریخ مرتب کریں جب تاریخ مرتب ہو چکی تو اس کے مصنف نے یہ استدعا کی کہ اس کے صلے میں ان کے ساتھ کوئی معقول سلوک کیا جائے اسی بنا پر اور خود میر عالم کے ایما پر مصنف نے اس کتاب کو بادشاہ وقت سکندر جاہ کے نام سے منسوب کر دیا۔ تا کہ وہ اس کو ان کے ملاحظہ میں گزران کر اس کے صلے میں مصنف

کے نام منصب یا ماہوار کی اجرائی کے لئے معروضہ کرسکیں۔ کتاب کے مقالۂ دوم کے اس نسخہ میں مصنف نے سن تصنیف ۱۲۲۳ھ لکھا ہے اور ایتھے نے ۱۲۲۱ھ بتایا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقالۂ اول ۱۲۲۱ھ میں تکمیل پایا اور اس کو حسب ایماء میر عالم قطب نمائے عالم نام رکھکر سکندر جاہ کے ملاحظہ میں پیش کیا اور اس کا صلہ پانے کے بعد دوسرا مقالہ اپنے ہی نام سے لکھا اور اس کو مقالۂ اول کا تکملہ قرار دیا۔ اصول تصنیف کے اعتبار سے اگر نظر ڈالی جائے تو مقالۂ اول اور مقالۂ دوم دونوں الگ الگ تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مقالہ بجائے خود مکمل ہے اور ہر ایک ہر دوسرے سے بے تعلق بھی ہے۔ یہ ممکن تھا کہ مصنف مقالۂ دوم کو ایک الگ کتاب قرار دیتا لیکن ہم اس کی کوئی وجہ قرار نہیں دے سکتے کہ مصنف نے اس کو بھی اسی کتاب کا ایک الگ جز کیوں گردانا۔ اگر مقالۂ دوم کو وہ الگ کتاب قرار دیتا تو کوئی حجت ہی نہیں رہتی۔ اس واسطے کہ اس کے مقالۂ دوم ہی کی وجہ سے یہ کچھ دقت درپیش ہے ورنہ مقالۂ اول میں تو علانیہ کوئی بحث ہی نہیں اس صورت میں البتہ قطب نمائے عالم نامی نسخہ سے اس کا تصادم ہوجاتا جو مصنف کے علاوہ کتاب کا نام بھی الگ ہوجانے کی وجہ سے بہت کم قابل توجہ ہوتا۔

حدیقۃ العالم کے پہلے مقالے میں سوائے اس کے کہ اس کا ایک نسخہ ایسا بھی پایا جاتا ہے جس کے دیباچے میں یہ بتایا گیا ہے کہ سکندر جاہ کی فرمایش پر خطۂ تلنگانہ کے شاہانِ قطب شاہی کی تاریخ میں وہ کتاب لکھی گئی اور اس کا نام قطب نمائے عالم رکھا گیا۔ اور کوئی تبدیل و تحریف پائی نہیں جاتی۔ لیکن اس کے دوسرے مقالے میں البتہ بعض الحاقات نظر آتے ہیں مثلاً متن میں شیر جنگ اور درگاہ قلی خاں سالار جنگ کے احوال۔ ان کا متن کتاب میں شامل ہونا صنعت تالیف میں داخل ہے اگرچیکہ خود مصنف نے بھی ایسے بعض احوال کتاب میں داخل کئے ہیں مثلاً مرہٹوں کا بیان، حیدر علی خاں کا ذکر۔ لیکن ان کا متن کتاب میں داخل ہونا اس وجہ سے بے موقع نہیں معلوم ہوتا کہ تاوقتیکہ ان کے اصلی اور تفصیلی واقعات سے واقفیت نہ ہو تاریخی حالات کھل نہیں سکتے۔ برخلاف ان کے شیر جنگ یا سالار جنگ کے احوال اصل کتاب میں نہ آنے سے تاریخ میں کوئی نقص یا کمزوری واقع نہیں ہوسکتی تھی اور ان کے احوال کو کتاب میں داخل کرنے کی جو توجیہ مصنف کی زبان سے بیان کی گئی ہے یہ ہے:۔

"چون درین مقالہ اکثر جا ذکر نواب حیدر یار خاں بہادر شیر جنگ و نواب درگاہ قلی خاں بہادر سالار جنگ رحمۃ اللہ علیہما تقریباً در مطاوی کلام بزبان قلم آمد لازم شد کہ احوال این ہر دو امیر کبیر عالی شان کہ از اعیان دولت آصفیہ بودند بمعرض بیان آید۔"

یہ وجہ ان بزرگوں کے احوال کو اس موقع پر داخل کرنے کے لئے ذرا بھی موجہ نہیں ہوسکتی اور یہی

معلوم ہوتا ہے کہ یہ علت اور اس کے بعد کے احوال مصنف نے نہیں لکھے بلکہ ان کا الحاق منیر الملک یا سراج الملک کے عہد میں محض ان کی خوشنودیِ خاطر کے خیال سے ان کے متوسلین میں سے کسی نے کر دیا ہے۔

آخر میں ہم یہ ضرور کہیں گے کہ حدیقۃ العالم کا پہلا مقالہ بعض تبدیلیوں کے ساتھ تاریخ قطب شاہی کی نقل ہے اس واسطے کہ اس میں قطب شاہیوں کے متعلق اس سے کچھ بھی زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتے اور بعض جگہ عبارتیں توارد کی حد تک پہنچ گئی ہیں۔ دوسرے مقالے میں مصنف نے البتہ اپنے عصر کے ذکر میں کچھ اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے لیکن اس کی ترتیب کے وقت تزک آصفیہ[۱] کا نسخہ اس کے مصنف کے پیش نظر یقیناً رہا ہے جن واقعات کو صاحب تزک نے تفصیل سے بیان کیا ہے انہوں نے بھی تفصیلاً بیان کیا ہے اور جن واقعات کو انہوں نے اجمالاً بتایا ہے انہوں نے بھی مجمل طور پر کہا ہے البتہ حدیقہ کے آخر میں میسور کی چوتھی جنگ کے حال کو بالکل مختصر کر دیا گیا ہے جسے صاحب تزک نے کسی قدر زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بہرحال اس لحاظ سے کہ مصنف نے اپنے زمانے کے واقعات تاریخی لکھے ہیں اس کے عصر کی تاریخ کی حد تک یہ کتاب قابل وقعت متصور ہو سکتی ہے۔

جواب دیا

از جناب سید قادر حسین صاحب قادرؔ حیدرآبادی

دل دیا دل کو پیچ و تاب دیا — جان دی جان کو عذاب دیا
کب سنا اس نے حال دل میرا — کب مجھے اس نے کچھ جواب دیا
سرکشی کا فلک کو نالوں نے — دیکھو جا کر کہاں جواب دیا
دل کے دل ہی میں رہ گئے شکوے — اس نے ایسا مجھے جواب دیا
دے رکھا ہے جواب قسمت نے — آپ نے مجھ کو کیا جواب دیا
اب بھی آؤ کہ بات رہ جائے — زندگی نے مجھے جواب دیا
دردِ دل سن کے ہو رہے خاموش — تم نے مجھ کو نہ کچھ جواب دیا
نہ رکھی اس نے کچھ لگی لپٹی — صاف منہ پر مرے جواب دیا
غیر نے تو برا کہا مجھ کو — آپ نے سن کے کیا جواب دیا
نہ دیا کچھ جواب قادرؔ کو — گر دیا بھی تو لاجواب دیا

---

[۱] مجلۂ مکتبہ:۔ شاہ تجلی کی مشہور تاریخ ہے ۱۲۰۸ھ میں تالیف پائی، اس کے صلے میں نواب ارسطو جاہ مدار المہام وقت نے مولف کو پچاس ہزار روپے دلوائے ۱۳۱۰ھ میں مطبع آصفی حیدرآباد میں میر احمد علی خاں موسوی کے حواشی کے ساتھ طبع ہو چکی ہے۔

عبرانی خط

(ترجمہ مقالۂ اول کتاب "الفہرست" ابن الندیم)

(از جناب مولوی کامل مسٹر مظہر علی صاحب وکیل)

میں نے بعض قدیم تاریخوں میں دیکھا ہے کہ سب سے پہلے عابر بن شالخ نے عبرانی خط لکھا اور اس کو اپنی قوم میں رواج دیا تب کہیں تمام لوگ یہ خط لکھنے لگے تیادورس نے کہا ہے کہ عبرانی سریانی سے مشتق ہے جب ابراہیمؑ نے نمرود بن کوس بن کنعان سے بھاگ کر شام کے ارادے سے فرات کو عبور کیا تو اسی وقت سے اس کا نام عبرانی ہوا۔ یہود و نصاری کا بالاتفاق یہ خیال ہے کہ عبرانی خط پتھر کی دو تختیوں پر تھا جن کو اللہ جل شانہ نے موسیٰؑ کو عطا فرمایا تھا جب موسیٰؑ پہاڑ سے نیچے اترے تو معلوم ہوا کہ آپ کی قوم نے بت پرستی شروع کر دی ہے تو غصہ ہو کر آپ نے دونوں تختیاں توڑ دیں جب آپ اپنے اس فعل پر نادم ہوئے تو اللہ جل شانہ نے آپ کو دو تختیاں تیار کر کے ان پر پہلے کا خط لکھنے کا حکم دیا۔ فضلاء یہود میں سے ایک شخص نے بیان کیا کہ وہ عبرانی خط آج کل کے عبرانی خط سے بالکل علیحدہ تھا کیونکہ اس میں بہت کچھ تغیر و تبدل کیا گیا ہے۔ یہود کے بعض علماء کا بیان ہے کہ جب یوسف علیہ السلام عزیز مصر کے وزیر تھے تو آپ امور سلطنت اور حساب وغیرہ اسی خط میں لکھتے تھے

عبرانی حروف کے اشکال یہ ہیں

ا ب ج د ہ و ز ح ط ی ک ل م ن س ع ف

ف ص ص ق ر ش ت

ف

م ل ط م ر ح ز و ہ د ح ب ا

د ر س ع ف و س ا م و س ر س

رومی خط

میں نے بعض قدیم تاریخوں میں دیکھا ہے کہ یونانی پہلے زمانہ میں لکھنا نہیں جانتے تھے جب مصر سے دو آدمی آئے جن کے نام (ہیمس) اور (اغنور) تھے اور یہ سولہ حرف جانتے تھے تو یونانیوں نے ان سے

یہ حروف سیکھ کر لکھنا شروع کیا پھر انہی دو مصریوں میں سے ایک نے چار حروف کا اضافہ کیا جن کو یونانی بھی لکھنے لگے پھر ایک دوسرے شخص نے جس کا نام (سموندیس) تھا ان میں اور چار حرف اضافہ کئے جس سے جملہ حروف کی تعداد چوبیس ہو گئی۔ اسحٰق راہب نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ انہی دنوں میں (سقراطیس) نے ستارہ شناسی کی ابتدا کی۔ یعنے ایک رومی سے پوچھا جو اپنی زبان کا بڑا ماہر اور جس کی نسبت یہ مشہور تھا کہ یہ اُس درجہ پر پہنچا ہے جس کو (الیطومولوجیا) کہا جاتا ہے الیطومولوجی رومی زبان کے علم نحو کو کہتے ہیں اس نے کہا کہ مدنیۃ السلام میں عام طور سے رومیوں میں تین خط مستعمل ہیں ایک تولیطون اس کی نظیر عربی میں خط وراقین ہے جس سے قرآن لکھے جاتے ہیں۔

رومی اپنی مذہبی کتابوں کو لیطون ہی میں لکھتے ہیں۔ رومیوں کا مذہب (بیریا)[1] کے نام سے مشہور ہے جس کے معنی مقدس کے ہوتے ہیں اس خط کی مثال یہ ہے۔

(اصل کتاب میں مثال درج نہیں ہے۔)

افوسفیبادون اس خط کی نظیر عربی میں خط ثلث ہے جس میں خط محقق و مہل مشترک ہے اس خط کی مثال یہ ہے۔

(اصل کتاب میں مثال درج نہیں ہے۔)

سورلیطون ۔ یہ کتابوں کا مخفف خط ہے اس کی نظیر ہمارے پاس خط مراسلات و فتری ہے جس میں حروف باہم ملائے جاتے ہیں اس خط کی مثال یہ ہے۔

(اصل کتاب میں مثال درج نہیں ہے۔)

سامیا۔ اس خط کی ہمارے پاس کوئی نظیر نہیں کیونکہ اس خط کا ایک حرف بہت سے معانی کا حاوی اور متعدد کلمات کا جامع ہوتا ہے۔ جالینوس[2] نے اپنی کتاب فنیکس میں اس خط کا ذکر کیا ہے فنیکس میں

---

[1] ۔ بیریا یونانی مذہب اور شرع کو کہتے ہیں۔ گریک میں مجموعہ احکام کو بیریا کہا جاتا ہے۔

[2] ۔ جالینوس بقراط سے ۶۶۵ سال بعد ظاہر ہوا۔ رومنس رومی سے اس نے تعلیم حاصل کی اس کی زندگی اکثر سفر میں گذرتی تھی خصوصاً شہر رومیہ کو اکثر جایا آیا کرتا تھا کیونکہ وہاں کا بادشاہ مجذوم تھا اور غالباً اسی کے زیر علاج بھی تھا۔ اکثر بادشاہان اس کی توقیر کیا کرتے تھے اسکندر افرودیسی سے اس کی اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ جالینوس عوام الناس کے مصالح میں بہت حصہ لیتا تھا۔ یہ اپنے زمانہ میں فن طب میں یکتا تھا۔ اس نے ملوک طوائف کے عہد میں وفات پائی مسیح کا زمانہ جالینوس سے ۷۰ سال پہلے کا ہے۔ ۱۲

کے معنے (کتابوں کو ضبط تحریر میں لانا) اس نے کہا ہے کہ مینے ایک عام جلسہ میں تشریح پر نہایت تفصیل سے تقریر کی تھی چند روز کے بعد ایک دوست سے ملاقات ہوئی انھوں نے کہا کہ آپ نے جلسہ میں جو کچھ کہا تھا وہ سب ایک شخص کو لفظ بلفظ یاد ہے اور انہوں نے میرے الفاظ کا بعینہ اعادہ کردیا۔ مینے ان سے پوچھا کہ آپ کو کہاں سے معلوم ہوا انہوں نے کہا میں ایک کاتب سے ملا تھا جو خط سامیا کا ماہر ہے وہ آپ کا کلام ختم ہونے سے پہلے اس کو لکھ لیا کرتا تھا۔ اس خط کو بڑے بڑے کاتب اور بادشاہ سیکھتے ہیں اس کی وقعت کی وجہ سے عام لوگوں کو اس کے سیکھنے کی ممانعت ہے ۲۴۸ھ سنہ میں بعلبک سے ایک طبیب ہمارے پاس آئے تھے انہوں نے کہا کہ میں خط سامیا جانتا ہوں ہم نے اُن کی آزمایش کی واقعی وہ اس خط سے واقف تھے۔ ہم نے دس باتیں کہیں وہ سن کر سب کو ایک لفظ میں لکھ لیے جب ہم نے اعادہ کے لئے کہا تو اسی ایک لفظ سے ہمارے تمام الفاظ ادا کردئے جعفر بن مکتفی نے کہا ہے کہ رومی بائیں ہاتھ کی طرف سے لکھنا شروع کرتے ہیں اور سیدھے ہاتھ کی طرف ختم کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس امر کے معتقد ہیں کہ بیٹھنے والا ہر حالت میں مشرق کی طرف منہ کر کے بیٹھے جب اس کا منہ مشرق کی طرف ہو تو شمال اُس کی بائیں جانب ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ سیدھا بائیں سے افضل ہے تو گویا بایاں ہاتھ احتراماً ہر چیز سیدھے کو دیتا ہے پس معلوم ہوا کہ لکھنے والا بائیں طرف سے شروع کرے اور سیدھی طرف ختم کرے۔ جعفری کا قول ہے کہ رومیوں کے پاس خط کے قوانین اور رسوم ہیں۔ ان ہی میں سے منجملہ چوبیس حروف کے حروف متعاقبہ ہیں جو غما، ولطا، قبا، سغا، طاؤخی ہیں۔ رومیوں کے چند حروف ہیں جن کو مصوتا کہتے ہیں وہ یہ ہیں۔ الفا، اِی، ایطا، یوطا، ہو چھوٹا اؤ، بڑا اؤ۔ ان ہی حروف کو اوطومیغا کہتے ہیں۔ حروف مونث تین ہیں۔ الفا چھوٹا اؤ، بڑا اؤ۔ اور حروف مذکر۔ اِی، ایطا، یوطا، ہو ہیں۔ سوائے سات حروف مصوتات کے جو جھن کے نام سے مشہور ہیں کسی اور یونانی حرف پر اعراب نہیں آتا۔ یونانی زبان عربی زبان کے چھ حروف کے استعمال سے بالکل مستغنی ہے جیسے۔ حا، وال، ضاد، عین، ہا، لام الف۔

خط سنکبروہ ولساکسہ

یہ رومیوں اور فرنگیوں کے مابین ایک قوم ہے جن سے اندلس کا بادشاہ قرابت رکھتا ہے ان کے لکھنے کے حروف بائیس ہیں۔ ان کے خط کا نام افسطلیقی ہے یہ لوگ بھی بائیں طرف سے سیدھے طرف لکھتے ہیں لیکن اس کے متعلق اِن کا استدلال رومیوں کے استدلال سے علیحدہ ہے یہ کہتے ہیں کہ بائیں طرف سے اس لئے خط شروع کیا جاتا ہے کہ حرکت قلبی سے لکھنے میں مدد ملے اگر ہم خط کو قلب کی جانب ختم کریں تو اس کی حرکت سے

سے ۱ مسعودی نے انکوبردہ اور رشاکسہ لکھا ہے ۱۲

مدد نہیں مل سکتی۔ جو خط سیدھی جانب سے شروع کیا جاتا ہے وہ جگر کی طرف سے آغاز ہو کر قلب کی طرف ختم ہوتا ہے۔ اس خط کی مثال یہ ہے۔ (اصل کتاب میں مثال درج نہیں ہے)

چینی خط

چینی خط بالکل نقش کی طرح ہے اس خط کا ماہر کاتب بھی اس کے لکھنے سے تھک جاتا ہے جلد سے جلد لکھنے والا بھی تمام دن میں دو تین ورق سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ اس خط میں اپنے دینی و علمی کتابوں کو چینی لوگ لکھتے ہیں۔ میں نے بھی چند کتابیں دیکھی ہیں۔ یہ لوگ مشرک و دہریہ ہیں۔ ان کا حال کامل طور سے بعد میں لکھونگا چینیوں کا ایک خط ہے جس کو خط مجموع کہتے ہیں۔ اس خط میں ہر کلمہ کی جو تین یا تین سے زائد حرف سے لکھا جاتا ہے ایک ہی صورت ہوا کرتی ہے اور ہر طویل کلام کے لئے حروف کی ایک خاص شکل ہے جو بہت سے معنی پر حاوی ہوتی ہے۔ اگر چاہیں تو اس خط سے سو ورق کی کتابت کو ایک صفحہ میں لکھ سکتے ہیں۔ محمد بن ذکریا[1] نے کہا ہے کہ ایک شخص چین سے میرے پاس آیا اور قریب ایک سال کے یہاں رہا یہ پانچ مہینہ کے عرصہ میں عربی زبان اور خط سیکھ کر نہایت فصیح اور زود نویس ہو گیا جب اس نے اپنے وطن کو واپس جانا چاہا تو اپنی روانگی سے ایک مہینہ پیشتر مجھ سے کہا کہ اگر جالینوس[2] کی سولہ کتابیں مجھے لکھا دی جائیں تو بہتر ہوگا میں نے کہا کہ وقت بہت تنگ ہے تمہارے قیام کا زمانہ ان کتابوں کے تھوڑے سے حصہ کی نقل کیلئے کافی نہیں ہو سکتا۔ اس نے کہا کہ میرے زمانہ قیام تک آپ مجھ کو

---

[1] ان کی کنیت ابوبکر اور نام محمد ابن ذکریا رازی ہے یہ اہل ری سے ہیں علوم قدیمہ سے خوب واقف تھے اور خصوصاً فن طب میں ان کو خاص دستگاہ حاصل تھی۔ یہ اکثر سفر کیا کرتے تھے۔ بڑے سخی اور رحم دل تھے۔ فقیروں اور مریضوں سے خاص توجہ اور مہربانی کے ساتھ پیش آتے اور بیماروں کی بیمارداری کرتے باوجود ان مصروفیتوں کے پھر بھی وہ کسی نہ کسی کتاب کے مسودہ یا مبیضہ میں مصروف رہتے آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے ان کے بہت سے تصنیفات ہیں صاحب الفہرست نے ان کی تصنیفات کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ ۱۲

[2] طب کی مشہور سولہ کتابوں کے نام جن کو جالینوس نے تصنیف کیا ہے حسب ذیل ہیں۔
کتاب الفرق، کتاب الصناعۃ، کتاب ای طوثون فی النبض، کتاب ای اغلوقن فی المغاتی لشفاء الامراض، کتاب المقالات الخمس فی التشریح، کتاب الاسطقس، کتاب المزاج، کتاب القوے الطبیعۃ، کتاب العلل والاعراض، کتاب تعرف علل الاعضاء الباطنۃ، کتاب النبض الکبیر، کتاب الحمیات، کتاب البحران، کتاب ایام البحران، کتاب تدبیر الاصحاء، کتاب حیلۃ البرء۔ ۱۲

میرے اس کام کیلئے وقف کر دیجئے اور آپ سے جتنا جلد ہو سکے کہتے جائیے میں آپ کے کہنے سے بھی جلد لکھتا جاؤں گا۔ میں نے اس کام کے لئے اپنے بعض شاگردوں کو بھی آنے کے لئے کہا ہم جتنا جلد ہو سکے کہتے جاتے تھے تاہم وہ لکھنے میں ہم سے آگے رہتا تھا۔ ہم نے تو پہلے جھوٹ ہی سمجھا لیکن مقابلہ کے وقت جو لکھا تھا برابر اُس کا مقابلہ کرا دیا میں نے اُس سے اِس خط کے متعلق دریافت کیا اوس نے کہا کہ ہمارے پاس ایک خط ہے جس کو مجموع کہتے ہیں یہ وہی خط ہے جس کو تم نے دیکھا ہے اگر ہم بڑی سے بڑی عبارت کو تھوڑی سی مدت میں لکھنا چاہیں تو اسی خط سے لکھتے ہیں اور جب چاہتے ہیں پھر اس کو مروج و مبسوط خط میں نقل کر لیتے ہیں اور کہا کہ اس خط کو ذکی اور ہوشیار شخص بھی بیس سال سے کم مدت میں نہیں سیکھ سکتا۔ چینی لوگ بعض چیزیں کو جو چینی تیل کے مشابہ رہتے ہیں مرکب کرکے سیاہی تیار کرتے ہیں۔ میں نے اس سیاہی کو تختیوں کی صورت میں دیکھا ہے جس پر بادشاہ کی تصویر تھی۔ اس کا ایک ٹکڑا باوجود ہمیشہ لکھتے رہنے کے ایک عرصہ کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اس خط کی مثال یہ ہے۔

مانی خط

مانی خط کو مانی[1] نے نکالا ہے جس طرح مذہب مجوسیت اور نصرانیت سے مرکب ہے اُسی طرح یہ خط بھی فارسی اور سریانی سے مستخرج ہے اس خط کے حروف عربی حروف سے زیادہ ہیں اسی خط سے اپنی

---

[1] یہ مانی بن فتق بابک بن ابی برزام ہے یہ اہل حسکانیہ سے تھا اس کی ماں کا نام میسں تھا بعضوں نے اس کا نام اوتاخیم اور بعضوں نے مریم لکھا ہے۔ یہ اشغانیہ کی اولاد سے تھی۔ بعض کا قول ہے کہ مانی کے والد کا نسبی تعلق ہمدان سے ہے۔ اس کی ماں اس کے حمل کے زمانہ میں عجیب غریب خواب دیکھا کرتی تھی اکثر بیداری میں بھی یہ دیکھا کرتی تھی کہ کوئی شخص مانی کو جو سما میں لے گیا ہے بسا اوقات ایک ایک دو دو روز کے بعد مانی کو واپس لایا گیا۔ صغیر سنی ہی سے مانی بڑا ذکی و عقلمند تھا۔ بارہ سال کی عمر میں اس پر وحی کا نزول ہوا جو فرشتہ وحی لاتا تھا اوس کا نام نبطی زبان میں توم تھا جس کے معنی ساتھی کے ہیں۔ اسی توم نے مانی سے اپنا آبائی مذہب چھوڑنے اور شہوات کے ترک کرنے کی ہدایت کی۔ جب مانی کی عمر ۲۴ سال کی ہوئی تو پھر توم آیا اور اس کو اپنے مذہب کی اشاعت کا حکم دیا۔ بادشاہ غالوس رومی کے دوسرے سال مانی ظاہر ہوا اور بیان کیا کہ میں ہی وہ فارقلیط ہوں جس کی بشارت عیسیٰؑ نے دی تھی اس نے مجوسیت اور نصرانیت سے اپنے مذہب کو ترتیب دیا اور دینی کتابوں کی تحریر کیلئے سریانی اور فارسی خطوط کی ترکیب سے ایک خاص خط کی اختراع

انجیلوں اور مذہبی کتاب کو لکھتے ہیں۔ اہل سمرقند اور اہل ماوراالنہر بھی اپنی مذہبی کتابیں اسی خط میں لکھتے ہیں اسی وجہ سے اس کو خط دین کہتے ہیں۔ مرقیونیہ قوم کا ایک خاص خط ہے ایک معتبر شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے اس خط کو دیکھا ہے۔ گو یہ خط منانی کے مشابہ ہے لیکن پھر بھی اس سے علٰحدہ ہے حروف منانی کی مثال یہ ہے۔

ان کے خط کی ایک دوسری صورت ہے اس کے حروف پہلے خط کے حروف سے مختلف ہیں اس کو اس طرح لکھتے ہیں

صغدی خط

ایک معتبر شخص نے کہا ہے کہ میں شہر صغد کو گیا تھا یہ ماوراالنہر کے ایک گوشہ میں واقع ہے اور اس کو صغد ایران الاعلیٰ کہا جاتا ہے۔ اس زمانہ کے ترک اس پر قابض ہیں اس کے قصبہ کا نام فرنکت ہے اور بیان کیا کہ یہاں کے لوگ مشرک اور نصاریٰ ہیں ان کی زبان میں مشرکین کو احارکف کہتے ہیں ان کے خط کی مثال یہ ہے۔

سندی خط

اس قوم کے مختلف زبان اور مختلف مذاہب ہیں ان کے خطوط بھی بہت ہیں ایک شخص نے جس نے ان کے شہروں کی سیاحت کی ہے مجھ سے کہا کہ ان کے خطوط قریب ننو کے ہیں۔ میں نے بادشاہ کے گھر میں ایک پیتل کا بت دیکھا کہا جاتا ہے کہ یہی بد کی شکل ہے یعنے ایک شخص کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اپنے ایک ہاتھ سے تین کا عقد باندھا ہے اور کرسی پر کچھ تحریر لکھی ہوئی ہے۔ جس کی مثال یہ ہے۔

[illegible]

شخص مذکور نے بیان کیا کہ یہ لوگ اکثر نو حرف سے لکھتے ہیں جن کی مثال یہ ہے۔

[illegible]

ان حروف کی۔ ا ب ۔ ج ۔ د ۔ ہ ۔ و ۔ ز ۔ ح ۔ ط سے ابتدا ہوتی ہے جب۔ ط۔ تک پہنچتے ہیں تو پہلے کے حروف کا اعادہ کر کے ان کے نیچے ایک نقطہ بڑھا دیتے۔ اس طرح سے۔

[illegible]

اس ایک نقطہ کے اضافہ سے۔ ی ۔ ک ۔ ل ۔ م ۔ ن ۔ س ۔ ع ۔ ف ۔ ص ۔ ہو جاتے ہیں گویا دس دس کا اضافہ کیا جاتا ہے جب۔ ص۔ تک پہنچیں تو پھر انہیں حروف کو پلٹا کر ان کے نیچے دو دو نقطے دیتے ہیں۔ اس طرح سے۔

[illegible]

ان دو نقطوں کے اضافہ سے۔ ق ۔ ر ۔ ش ۔ ت ۔ ث ۔ خ ۔ ذ ۔ ظ ۔ ہو جاتے ہیں۔ جب ظ۔ تک پہنچیں تو پھر وہی پہلے کے حروف لکھ کر ان کے نیچے تین نقطے بڑھا دیتے ہیں اس طرح ( ) تمام حروف معجمہ بنا کر جو چاہتے ہیں لکھتے ہیں۔

سوڈانی خط

سوڈان کے اقوام جیسے نوبہ۔ بجہ[۱]۔ زغادہ۔ مرادہ[۲]۔ استان۔ بربر۔ اور سندھ کے سوا تمام

---

[۱] اس لفظ کو بجا۔ بجادہ۔ بجاۃ۔ بیجہ لکھا جاتا ہے لیکن ان سب سے مراد ایک ہی ہوتی ہے۔ بجہ سے قدیم زمانہ کے بلیمیز اور موجودہ زمانہ کے بیا بقصود ہیں ۱۲۔

[۲] بر عفیر ثرا برٹ ایک شہر کو مردۃ اور اسی کو انڈکس میں مرواۃ لکھتا ہے ۱۲۔

حبشی اقوام ہند سے قربت کی وجہ سے ہندی لکھتے ہیں ان کا کوئی خاص مشہور خط نہیں ہے۔ جاحظ[1] نے اپنی کتاب البیان میں جو یہ کہا ہے کہ حبشیوں کے پاس اُن کے مذہب کے موافق اُن ہی کی زبان میں علم خطابت اور بلاغت ہے اس کے متعلق ایک شخص نے اپنا چشم دید واقعہ مجھ سے بیان کیا کہ جب حبشیوں پر پریشانیاں اور مصائب آتے ہیں تو اُن کا خطیب ایک بلند مقام پر بیٹھتا ہے اور سر جھکا کر دندل یا نقاروں کی آواز (یعنے گنگناہٹ) میں گفتگو کرتا ہے تمام لوگ اس کو سمجھ جاتے ہیں اور بیان کیا کہ لوگ جس قسم کی رائے طلب کرتے ہیں اوسی کے متعلق یہ خطیب مشورہ دیتا ہے اور لوگ اس پر عمل کرتے ہیں واللہ اعلم۔

ایک سیّاح نے مجھ سے بیان کیا کہ قوم بجہ کا خاص خط ہے لیکن یہ خط ہم کو نہیں پہنچا۔ ایک اور سیّاح نے مجھ سے بیان کیا کہ قوم نوبہ اپنی مذہبی کتابیں سریانی، رومی، قبطی خط میں لکھتے ہیں حبشیوں کا ایک خط ہے جس کے حروف حمیری حروف کی طرح ملے ہوئے ہوتے ہیں یہ لوگ بائیں طرف سے لکھتے ہیں اور ہر دو اسموں کے مابین تین نقطے بشکل مثلث دیکر ایک دوسرے میں تفریق کرتے ہیں۔ اس خط کے حروف کی مثال یہ ہے میں نے اس کو مامون کے کتب خانہ سے نقل کیا ہے۔

اس خط میں۔ ت۔ ث۔ رز۔ ح خ۔ ع غ۔ طظ۔ ایک ہی ہیں۔

---

[1] ان کی کنیت ابو عثمان ہے یہ بہت مشہور ہیں فن تفسیر وغیرہ میں ان کی تصنیفات ہیں۔ یہ علم کے بڑے شائق تھے ان کی ہمیشہ کتب بینی میں گذرتی تھی۔ ابو ہفان ان کے متعلق کہتے ہیں کہ جو کتاب جاحظ کے ہاتھ میں آتی اُس کو ابتدا سے انتہا تک دیکھتے یہ کتابوں کی دکانیں کرایہ سے لیتے اور وہیں بیٹھ کر مطالعہ کیا کرتے

ماضی و حال

(از جناب عمر عبد الکریم صاحب گل)

آج ہر فردِ بشر مائلِ شر ہونے لگا کینہ و بغض و حسد دل میں گھر ہونے لگا
یہ نہیں معلوم کیا مدِ نظر ہونے لگا عیب گنتے تھے جسے اب کیوں ہنر ہونے لگا

بزمِ عالم کا مرقع ہو گیا بدرنگ آج
کچھ کر بگڑا ہوا نقشہ پریشاں ہے آج

چل رہی ہے اب کو نااتفاقی کی ہوا چھا رہی ہے ہر طرف افلاس کی کالی گھٹا
آ رہی ہے آندھیاں ادبار کی صبح و مسا ہو رہا ہے دشمنی کا جا بجا طوفاں بپا

آج دریائے غضب کیا کیا تلاطم خیز ہے
اور پھر بادِ مخالف اک ستم انگیز ہے

جل رہا ہے آج سینوں میں عداوت کا چراغ پک رہا ہے گرمیٔ نارِ خصومت سے دماغ
آتشِ رشک و حسد سے سینکڑوں ہیں آج داغ ہو چلا ویراں سمومِ جہل سے ایماں کا باغ

دل کا آئینہ مکدر ہے کدورت کے سبب
بغض کے اسباب پیدا ہو رہے ہیں بے سبب

روز افزوں ہے ترقی پر تنزل آج کل آ رہی ہے پھوٹ پر ہر اک طبیعت آج کل
اڑ رہا ہے دہر سے رنگِ محبت آج کل بڑھ رہی ہے دن بدن جہل و ضلالت آج کل

اٹھ گئی قومی حمیت مٹ گیا نامِ وفا
گھٹ گئی طرزِ مروت بڑھ گئی رسمِ جفا

سرد مہری سے زمانہ کی طبیعت ہے اداس دل پہ قابض ہو گئے ہیں حسرت و اندوہ و یاس
چھا گئی آشفتگی رخصت ہوئے ہوش و حواس ناامیدی کے علاوہ کیا رہا ہے اپنے پاس

بیکسی رہ رہ کے مایوسی کا دیتی ہے پیام
بے بسی بڑھ بڑھ کے اپنا کر رہی ہے انتظام

آج نازل ہو رہا ہے کس لیے ہم پر غضب کیوں [illegible] پھر رہے ہیں مارے مارے روز و شب

سہہ رہے ہیں کس لیے درد و غم و رنج و تعب ہو رہے ہیں ان دنوں کیوں ناتوان و جاں بلب

بات تو یہ ہے خطا اس میں نہیں کچھ اور کی
ایک خصوصیت ہوا کرتی ہے ہر اک دور کی

ایک دن وہ تھا کہ ہم میں تھا نہایت اتفاق ہم زبان و ہم نوا تھے ہم خیال و ہم مذاق
خانگی جھگڑے اٹھا رکھتے تھے ہم بالائے طاق سب کو ہی معلوم جو کچھ تھا ہمارا [illegible]

دل مجلا تھا عیاں چہرے سے تھا ایماں کا نور
ایسے نام آور کہ شہرت تھی ہماری دور دور

ایک دل آپس میں تھے ہم عہد کے پابند تھے پاک باطن پاک نیت سعادت مند تھے
شاد تھے آباد تھے مسرور تھے خرسند تھے لاکھ پہ بھاری تھے گو تعداد میں ہم چند تھے

آن بان اپنی رہی ہر حال میں آن بان کے ساتھ
بات کرتے تھے زبانِ تیغ سے دشمن کے ساتھ

خلق میں مشہور ہم جانباز تھے ممتاز تھے ایک کے اک مونس و غمخوار تھے دمساز تھے
متفق تھے اور باہم ہمدم و ہمراز تھے میل جول ایسا کہ ہم آہنگ و ہم آواز تھے

دل مخالف کا دہل جاتا تھا ہم کو دیکھ کر
ظالموں کا دم نکل جاتا تھا ہم کو دیکھ کر

ہوشیار اتنے کہ تھی چاروں طرف اپنی نظر باخبر ایسے کہ تھی ہر ایک کی ہم کو خبر
ہم سے دنیا میں نہیں چھپا کوئی علم و ہنر شرق سے تا غرب عالم پر ہمارا تھا اثر

بحر و بر زیرِ نگیں تھے ہر جگہ تھا انتظام
کیا عرب اور کیا عجم اور کیا عراق و روم و شام

ہم ہر اک بزم و جماعت میں شریکِ حال تھے عیش میں شادی میں [illegible] میں شریکِ حال تھے
آفت و رنج و مصیبت میں شریکِ حال تھے [illegible] ہر ایک حالت میں شریکِ حال تھے

اپنی ہوتی تھی ہر اک محفل میں قدر و منزلت
کیونکہ خود اپنی تھی اپنے دل میں قدر و منزلت

وہ ہمارا دبدبہ وہ وہ کرامت کیا ہوئی   وہ ہمارا رعب اور وہ شان و شوکت کیا ہوئی
وہ اولوالعزمی وہ ہمت اور جرات کیا ہوئی   وہ طبیعت وہ حمیت وہ شجاعت کیا ہوئی

وہ زمانہ اور وہ فضلِ الٰہی کیا ہوا
آج کیسی آگئی ہم پر تباہی کیا ہوا

ہیں وہی ہم اور ہزاروں طرح کی ہیں بلا و وبا   حملے ٹڈی کے کبھی ہیں اور کبھی ہیں آندھیاں
قہر اولوں کا کبھی ہے اور کبھی طغیانیاں   قحط دامن گیر ہے اور سینکڑوں بیماریاں

زلزلوں سے دل ہلا جاتا ہے جاں بے چین ہے
جان اک بے چین کیا سارا جہاں بے چین ہے

ہو گئے اپنے وطن میں بے وطن اہلِ وطن   کھا رہے ہیں ٹھوکریں ہم بھول کر اپنا چلن
ہو رہے ہیں مبتلائے آفتِ رنج و محن   چین سے رہنے بھی دیتا ہے کہیں گردشِ زمن

در بدر بھٹکا رہا ہے آج دورِ روزگار
گردشیں دیتی ہے کیا کیا گردشِ لیل و نہار

آج ہم کیا ہو رہے ہیں چھوڑ کر اپنا رواج   کھو کے اپنا ہو رہے ہیں اوروں کے محتاج آج
ایسے بے خود ہیں کہ قابو میں نہیں اپنا مزاج   اس مرض کی کیا دوا اپنے کیے کا کیا علاج

قوم کا چھوٹا بڑا ہر اک پریشاں حال ہے
سچ اگر پوچھو تو یہ سب شامتِ اعمال ہے

آ رہا ہے آج کیوں ہر کام میں ہم سے قصور   کیوں تمدن ہو رہا ہے آج ہم سے دور دور
آج کیوں قعرِ مذلت میں پڑے ہیں چور چور   کس کی غفلت ہے خطا کس کی ہے کس کا ہے قصور

شرم دامن گیر ہے کس سے کریں فریاد ہم
ہو رہے ہیں اپنے ہاتھوں آپ ہی برباد ہم

پڑ گئے لہو و لعب میں چھوڑ کر علم و ہنر   بے ٹھکانے ہو گئے ہیں پھر رہے ہیں در بدر
فکر کچھ دین کی ہم کو ہے نہ کچھ عقبیٰ کا ڈر   بے خبر ایسے ہیں ہم کو کسی کی کچھ خبر

نا بلد نا آشنا ہیں نام سے تدبیر کے
جی رہے ہیں ہم بھروسے پر فقط تقدیر کے

ہم خلف ایسے کہ چھوڑی ہیں سلف کی اپنی چال   منتقل اتنے کہ اپنی جا سے اٹھنا ہی محال
پست ہمت ہیں مگر اونچا ہمارا ہے خیال   ابتدا کی ہم کو پروا ہے نہ کچھ فکرِ مآل

کس قدر حالت ہماری آج عبرت ناک ہے
سر بہ جیب و دل پریشاں شکل ہیبت ناک ہے

سامنے اہلِ ہنر کے آج آ سکتے نہیں   سر نگوں ایسے ہیں سر اپنا اٹھا سکتے نہیں
آنکھ اربابِ ترقی سے ملا سکتے نہیں   ماجرا اپنی مصیبت کا سنا سکتے نہیں

آج گردن جھک گئی بارِ ندامت کے سبب
سامنے آنکھ اٹھ سکتی نہیں اپنی خجالت کے سبب

تا بہ کے یہ بے خودی یہ خوابِ غفلت تا بہ کے   تا بہ کے یہ کاہلی پستیٔ ہمت تا بہ کے
تا بہ کے اے گل یہ بربادیٔ دولت تا بہ کے   تا بہ کے یہ فاقہ مستی اور یہ نوبت تا بہ کے

خوابِ غفلت سے اٹھو اب تو ذرا لو اپنی خبر
کس خرابی میں پڑے ہو دیکھو یہ آنکھیں کھول کر

مستعد ہو جاؤ تم اب کاہلی کو چھوڑ دو   بڑھ کے میدانِ ترقی میں قدم اپنا رکھو
لے کے نام اللہ کا آگے بڑھو آگے بڑھو   ڈھونڈ لو کھوئی ہوئی دولت کو اپنی ڈھونڈ لو

مان لو کہنا ہمارا اب خدا کے واسطے
مصطفیٰ کے واسطے مشکل کشا کے واسطے

وقت اپنا مفت میں کھونے سے حاصل کچھ نہیں   بسترِ آرام پر سونے سے حاصل کچھ نہیں
بیٹھ کر تقدیر کو رونے سے حاصل کچھ نہیں   آنسوؤں سے اپنا منہ دھونے سے حاصل کچھ نہیں

کام لینا چاہیے ہمت سے اور تدبیر سے
بات بنتی آئے گی امید سے تقدیر سے

یا الٰہی اب ہدایت کی ہمیں توفیق دے   اور آپس میں محبت کی ہمیں توفیق دے
خلق کی مہر و مروت کی ہمیں توفیق دے   نیک کاموں کی سعادت کی ہمیں توفیق دے

بس دعا یہ آخری ہے خاتمہ بالخیر ہو
آرزو گل کی یہی ہے خاتمہ بالخیر ہو

کھیل کی نفسیات

مسلسل

از جناب محمد مظہر حسین صاحب بی اے عثمانیہ کالج

گزشتہ صفحات میں معترضین نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ کھیل میں "قابو" کا جو جز پایا جاتا ہے اس کی قدیم نظریات کھیل کے بموجب تشفی بخش توجیہ نہیں کی جا سکتی مثلاً جب کھیل میں ایک کتے کا پلا اپنے ساتھی کو دبوچتا ہے تو خود کو قابو میں رکھتا ہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو غصہ کا ظہور ہوتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ "قابو" کے وجود کو تسلیم کئے بغیر کھیل کے مختلف مظاہرات کی تشفی بخش توجیہ نہیں ہو سکتی۔ اسی دقت کو رفع کرنے کے لئے ہم نے ڈاکٹر شانڈ کے نظریہ کو پسندیدہ قرار دیا تھا جس کی بموجب مسرت کے ایک مخصوص گروہ کا نام کھیل ہے اور مسرت کا فطری میلان ایسے تغیرات و مظاہرات کو روکتا ہے جن کے وقوع ہونے کی صورت میں نصب العین کے متزلزل ہونے کا اندیشہ رہتا ہے لہٰذا اس بیان کے بموجب معترضین کے شک کو فرض کرنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

ڈاکٹر شانڈ کے نظریہ کا اسلوب ہی ایسا ہے کہ قدرتی طور پر حریف کے تمام اعتراضات کے جوابات زیادہ خوبی کے ساتھ دئے جا سکتے ہیں لیکن جب خود نفس نظریہ پر غور و تامل کیا جاتا ہے تو اس میں بھی چند غیر اہم پنہاں نقائص دکھائی دیتے ہیں جن کی بنا پر ہم کو مجبوراً چند مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے سب سے اہم نقص کی تفصیل یہ ہے کہ جس وقت کھیل کے تمام معروضات پر غور کیا جاتا ہے تو اس کی دو مرکب صورتیں دکھائی دیتی ہیں یعنی یہ کہ کھیل کا معروض یا تو جاندار ہوتا ہے یا بے جان اور اس کے علاوہ اس کے ساتھ یا تو ہم انفرادی طور پر کھیلتے ہیں یا اجتماعی طور پر ثانی الذکر میں سے اول الذکر کی صورت بالکل سادہ اور بدیہی ہے لیکن موخر الذکر صورت کسی قدر تشریح کی طالب ہے کیونکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی جاندار معروض کے ساتھ ہوتے ہیں تو وہ اجتماعی صورت دکھلائی جا سکتی ہے اور غیر جاندار کے ساتھ ہوتے ہیں تو انفرادی لیکن حقیقتہً ہماری مراد اس سے کچھ مختلف ہے کیونکہ انفرادی کا مطلب یہ ہے کہ کھیلنے والا چاہے جاندار سے کھیلے یا غیر جاندار سے کھیل کی عام مسرت کو خود کے لئے مخصوص کر لیتا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ بعض صورتوں میں معروض جاندار تو ہو لیکن کھیل کی مسرت صرف کھیلنے والے کی ذات تک محدود ہو جیسے ایک خوش طبع شخص جب کسی دوسرے کا مذاق اڑاتا ہے تو اس سے خود اس کی ذات کو بلاشبہ لطف آتا ہے لیکن اس کے معروض

کو اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اجتماعی یا عمرانی کھیلوں میں مسرت سے سب محظوظ ہوتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ شانڈ کے نظریہ سے انفرادی کھیلوں کی کس طرح توجیہ کی جائے گی جبکہ بعض حالتوں میں وہ فی نفسہ کھیل تو ضرور ہوتے ہیں لیکن بعض ایسے مخصوص کردار دو بدو کام کرتے رہتے ہیں کہ مسرت کی بقا معرض خطر میں پڑ جاتی ہے۔ شانڈ اس کا جواب اس طرح دیتا ہے کہ ایسی صورتوں میں کھیل موجب مسرت صرف اس وقت ہوتے ہیں جبکہ معروضات ضعیف اور کمزور ہوتے ہیں کیونکہ اگر وہ بھی طاقتور ہوں تو فعلیت کا فوری خاتمہ ہو جاتا ہے اور اگرچہ اس قسم کی فعلیت ابتدائی آفرینش میں مسرت افزا ہوتی ہے لیکن جوں ہی معروض تنگ آ جاتا ہے تو کھیل کے میلان کے باوجود اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ شانڈ کا طریقۂ بیان نہایت سلیس اور عمدہ ہے لیکن متامّل اور متجسّس ذہن کو اس کے خلاف بھی مثالیں ملتی ہیں مثلاً بچہ جب نادانستہ طور پر جلد توڑ کر کسی کتاب کے اوراق کو پریشان کر دیتا ہے تو اس حرکت سے اس کی کسی طاقت کا مظاہرہ نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ ہیجانی طور پر اپنے معروض کا خاتمہ کر دیتا ہے حالانکہ شانڈ کے مطابق ہونا یہ چاہئے تھا کہ وہ اپنے معروض کو بلا تغیر باقی رکھے کیونکہ بصورت دیگر ایسے افعال کھیل کی فہرست میں داخل نہیں کئے جا سکتے اس کے متعلق شانڈ کہتا ہے کہ ایسی صورت میں چونکہ معروض بے جان ہوتا ہے لہذا انتقام یا غصہ کا خوف مفقود ہوتا ہے اسی وجہ سے جب کھیلنے والا خلل کا اندیشہ نہیں پاتا ہے تو اپنی مرضی کے مطابق اس کو کام میں لیتا ہے۔ اس لئے اس لحاظ سے بھی اس کی فعلیت "کھیل" کی ہوتی ہے۔

بہ ایں ہمہ واقعہ یہ ہے کہ شانڈ نہایت خاموشی کے ساتھ اس کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ مستثنیات بھی ضرور ہوتے ہیں اور تقریباً تمام انفرادی افعال کو انہی مستثنیات میں داخل کر لیا جا سکتا ہے لیکن اس اعتراف کے یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ شانڈ کے نظریہ کی اہمیت کا انکار کیا جا سکے کیونکہ اگر اس نظریہ کو ترک کر دیا جائے تو پھر ہم بھول بھلیاں میں پھنس جاتے ہیں جس سے نکلنے کے لئے ہزار ہا دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بہر حال یہاں تک معترضین کے اہم مطالبات کے ممکنہ جوابات تھے اور اب دیکھنا یہ ہے کہ کھیل کی کوئی جبلت ہوتی ہے یا نہیں۔ اس پر غور کرنے سے پہلے معلوم کر لینا چاہئے کہ جبلت سے کیا مراد لی جاتی ہے تاکہ آئندہ اس تشریح کے مطابق کھیل کی جبلت کے متعلق فیصلہ کیا جا سکے۔

جبلت کی ماہیت

"نفسیات کی صبح آفرینش سے اس وقت تک جبلت کی ماہیت و اصلیت کے متعلق ماہرین کسی متفق علیہ نتیجہ پر نہیں پہنچے اور ہر زمانہ میں اس لفظ کا اطلاق مختلف فعلیتوں اور مختلف حرکات

پر کیا گیا ہے[1]۔ شروع شروع میں ماہرین حیاتیات نے اسی کو مرکب کردار فرض کر کے خاص طبقہ تک محدود کر دیا تھا اور جبلت اور اضطرار میں یہ فرق قایم کیا تھا کہ مقدم الذکر مرکب اور پیچیدہ ہوتا ہے اور موخر الذکر سادہ اور بسیط۔ علاوہ ازیں جبلت اضطرارات کے خلاف ایک خاص طبقہ میں مشترک ہوتی ہے جیسے مدافعت کے اظہار میں مختلف حیوانات مختلف ہتیار استعمال کرتے ہیں لیکن جب ایک نوع ایک ہی قسم کی ہتیار استعمال کرتی ہے تو وہ جبلی کردار قرار پاتے ہیں۔

اس کے بعد جب نفسیات میں ترقی ہوئی تو جبلت کی قدیم نوعیت کی صورت بھی کچھ بدل گئی اور اس کی تعریف اس طرح کی گئی کہ اگرچہ یہ عضویاتی فعلیت ہوتی ہے لیکن اس میں ذہن کا بھی عنصر شامل ہوتا ہے لہذا اسی خیال کے تحت انہوں نے جبلت کو جذبہ کا ہم معنی قرار دیا یعنی بہ الفاظ دیگر انہوں نے جذبہ کو اس قدر وسیع کر لیا کہ جبلت بھی اسی زمرہ میں داخل کر دی گئی۔

آغاز نفسیات میں یہی عجیب و غریب خیالات نظر آتے ہیں لیکن جب زمانہ نے ترقی کا نیا دور شروع کیا اور علوم کے تمام شعبوں اور جوانب میں اصلاح و تجدید کی نئی روح پھونک دی گئی تو قدیم خیالات میں حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو گا چنانچہ ہماری نفسیات بھی اس ہمہ گیر انقلاب کے زد سے نہ بچ سکی۔ نئے نئے علماء پیدا ہوئے جنہوں نے کوپرنیکس کی طرح قدیم رجحانات کی خود مختاری سے بیزاری ظاہر کر کے ان کی جگہ نئے خیالات کی جمہوریت کو قایم کیا اور ہر ایک جمہور پسند نے ہر ایک شاخ کے عنوان پر مستقل کتابیں لکھیں ان پر تنقیدیں ہوئیں اور پھر ان کا ایک معجون مرکب تیار کیا گیا جو آج ہمارے سامنے ہماری جستجو کی تشنگی کو بجھانے کے لئے موجود ہے اور اس پر ہمیں اس وقت تک اکتفا کرنا پڑیگا جب تک کہ کوئی نیا انسٹائن پیدا ہو کر اس قدیم نیوٹن کے معجون کو مہلک نہ ثابت کر دکھائے اور کوئی ایسی دوا نہ تیار کرے جو اس سے زیادہ موثر اور مفید ہو۔ اس ترقی نے جبلت میں نفسی عنصر کے اشتراک کو تو قایم رکھا لیکن کہا کہ یہ جذبہ کا ہم معنی نہیں کیونکہ یہ عادت یا اکتسابی رد اعمال کے خلاف خلقی کردار ہوتا ہے[2]۔ اس میں سوچ بچار یا اکتساب کا قطعی دخل نہیں ہوتا کیونکہ سوچ بچار ہر انسان یا حیوان علت و معلول اور تجربہ پر بنیاد رکھتا ہے لیکن جبلت فریضی تجربہ پر نہیں بلکہ فطری ساخت پر منحصر ہوتی ہے۔ اس کا تعلق زیادہ خارجی کردار سے ہوتا ہے نہ کہ جذبہ کی طرح ذہنی کیفیات سے اس لحاظ سے اگر جبلت کو جذبہ کا ہم معنی قرار دیا جائے تو اس کی ماہیت کا بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ حیوانی اختلاف کے ساتھ جبلتیں بھی مختلف ہو جاتی ہیں کیونکہ مختلف انواع کی فطری ساخت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے یہ اختلاف کچھ تو آلات حس اور آلات حرکی میں ہوتا ہے اور کچھ اعصاب اور

---

[1] نفسیات جبلت پر معارف گزشتہ کسی پرچہ میں پروفیسر قاضی عبد الرحمن صاحب ایم اے نے ایک مضمون لکھا تھا جس سے یہ عبارت منقول ہے۔ ملاحظہ ہو ڈرور کی نفسیات باب ششم صفحہ ۱۰۰۔

مراکزِ عصبی میں جو آلات جن کے ذریعہ خود تہییج آلاتِ حرکی میں حرکت کا باعث ہوتے ہیں مقدمین اضطراری فعل کو جبلی فعل سے کہیں سادہ بتلاتے ہیں لیکن اس بنیاد پر ان میں تفریق ناممکن ہے کیونکہ زیادہ سے زیادہ ڈگری کا فرق قایم کیا جا سکتا ہے نہ کہ قسم کا۔ اضطرارات میں سادہ ترین اضطراری فعل بھی مرکب ہوتا ہے جیسے کھانسی جو ایک مرکب اضطراری فعل ہے بہر حال خلاصہ یہ کہ جبلت ردِ عمل کے فطری میلان کا نام ہے نہ کہ فوری ردِ عمل کا۔ اگر کسی محرک کا فوری ردِ عمل ہو اور معاملہ وہیں ختم ہو جائے تو وہ اضطراری فعل ہے لیکن جب ایک مہیج کسی ردِ عمل کا میلان پیدا کر دے جو فوری نہ ختم ہو اور مقصد تک جلد نہ پہنچے بلکہ دیر تک استقلال کے ساتھ برسرِ کار رہے اور ردِ عمل کا باعث ہوتا جائے تو ہم اس کو جبلت کہیں گے مثلاً مرغی کا انڈے سینا یا چڑیا کا گھونسلا بنانا۔ یہ میلان نہ تو کسی مفید مقصد کے ردِ عمل میں آسانی پیدا کرتا ہے اور نہ مضر حرکات سے باز رکھتا ہے بلکہ احساسی ہیجانات سے مل کر ان کے پیدا کرنے میں ممد ہوتا ہے۔ اسی ضمن میں اس کا بھی خیال رہنا چاہئے کہ ہماری تمام جبلتیں بہ وقت واحد ظاہر نہیں ہوتیں بلکہ آہستہ آہستہ ظہور میں آتی ہیں بہر حال جبلت کی منظم تعریف میں مختلف ماہرین نے مختلف نقطۂ نگاہ سے بحث کی ہے چنانچہ اسپنسر اس کو مرکب فعل اضطراری کہتا ہے وہ طبقہ جو مطالعۂ باطن کو اہمیت دیتا ہے اس کو خاص ذہنی عمل کا نتیجہ سمجھتا ہے اور بعض لوگ اس کو اضطراری افعال کا سلسلہ بتلاتے ہیں۔

ان تمام خیالات کو مدِ نظر رکھ کر ڈاکٹر میکڈوگل نے ایک معقول منطقی صورت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ وہ اس کی تعریف کرتا ہے کہ "یہ متوارث فطری نفسی طبعی میلان ہوتا ہے جو صاحبِ میلان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ایک خاص قسم کی اشیاء دیکھے اور ان کی طرف توجہ کرے اور ان کو دیکھ کر ایک خاص جذبی کیفیت محسوس کرے اور ایک خاص طریقہ سے اس کے متعلق عمل کرے یا کم از کم وہ اس قسم کے عمل کی طرف مائل ہو۔"

اس کا خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ میکڈوگل کے نزدیک فطری نفسی طبعی میلان جبلت کا جوہر ہوتا ہے یعنی یہ کہ جبلت نفسی طبعی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے جس میں تین اجزا لاینفک ہوتے ہیں وقوفی، مرکزی اور حرکی۔ اور انہی کے مجموعہ کو جبلت اور ان کے مظاہرات کو جبلی کردار کہا جاتا ہے۔

ان تمام بیانات کو پیشِ نظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کھیل کی کوئی مخصوص جبلت قطعی نہیں ہوتی کیونکہ بصورتِ دیگر اس کا مطلب ہے کہ کھیل کی صورت میں بھی خاص خاص قسم کے حرکات ہوں اور خاص قسم کا معروض ہو لیکن یہ ہمارا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ کھیل میں مختلف قسم کے حرکات ہوتے ہیں اور دوسرے الفاظ میں حیات کی کائنات کی تمام اشیاء کھیل کی جا سکتی ہیں اسلئے اس لحاظ سے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ کھیل کی کوئی جبلت نہیں ہوتی

گذشتہ صفحات میں ہم نے کھیل کی ماہیت اور نوعیت پر مفصل بحث کی ہے اور ماہیت کے متعلق ڈاکٹر شانڈ کے نظریہ کو منتخب کیا ہے جس کی بموجب کھیل کی ایک جبلت فرض کی جا سکتی ہے لیکن نوعیت کے متعلق جب ڈاکٹر میکڈوگل کے بیان کو پڑھتے ہیں تو کھیل کی جبلت سے انکار کرنا پڑتا ہے جس کا خود شانڈ نے قطعی تصفیہ نہیں کیا تھا۔

بہرکیف اس کا آخری فیصلہ ہمارے اختیار سے پرے ہے کیونکہ کوئی ایسا نظریہ قایم کرنا جو تمام شکوک کے حلول کا باعث ہو اور مقابلہ کر سکے بعید از عقل ہے تاہم کسی وجہ یا انکشاف کی ماہیت اور نوعیت کے متعلق شانڈ اور میکڈوگل دونوں کے نظریات قابلِ قدر اور اعلیٰ ہیں جن کی نفسیاتِ جدید مشکور ہے

اشاراتِ اعجام پر ایک تفصیلی نظر

(از)

جناب ابوالمحاسن محمد محسن خاں صاحب متین

اُردو رسم خط کی اصلاح کے متعلق، ایک عرصہ سے رسالوں میں مضامین شائع ہوتے رہے اور اس میں رسالۂ فصیح الملک نے تو کتابت کی ایک حد تک پابندی بھی شروع کر دی تھی لیکن یہ پابندی عالمگیر نہ ہونے پائی، بالآخر انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) کی سعی سے حیدرآباد دکن میں ایک مجلس قایم ہوئی۔ اور اس کے ارکان نے اصلاح رسم خط، تبدیل املا پر خیال آرائیاں کرتے ہوئے بالاتفاق "اوقاف" کے لئے حسب ذیل اسماء و علامات مقرر کر دئیے:۔

۱۔ فل اسٹاپ (وقفہ)
۲۔ کولن (نیم وقفہ)
۳۔ سمی کولن (رابطہ)
۴۔ کاما (سکتہ)
۵۔ ان ورٹڈ کاماز (واوین)
۶۔ نوٹ آف ان ٹروگے شن (سوالیہ)
۷۔ نوٹ آف انٹرجیکشن (ندائیہ)
۸۔ بریکٹس (قوسین)

(رسالہ اُردو صفحہ ۵۸۲۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء)

اس "بالاتفاق" فیصلے کے باوجود خود مجلس کے قاید اعظم نے "نیم وقفہ" کو وقفہ اور "ندائیہ" کو تعجبیہ اور "وقفہ" کو ختمہ سے بدلنا شروع کر دیا، ذیل کے مضمون میں جناب متین صاحب نے نہایت توجہ کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس لئے بحث کا اصل مسئلہ قابل توجہ ہے۔

(مجلۂ مکتبہ)

(۱)

تمہید۔ شیخ سعدی کے اس حکیمانہ مقولے سے کہ "سہ چیز پایدار نماند: مال بے تجارت، و علم بے بحث، و ملک بے سیاست"، کون انکار کر سکتا ہے۔ بحث مباحثے، مناظرے، مشاعرے، موازنے، محاکمے، تبصرے اور انتقادی مقالے تذکار علمیہ کو فروغ دینے کا واحد ذریعہ ہیں: علمی مجلسیں اور ادبی محفلیں انہیں سے اُبھرتی اور سنورتی ہیں اور انہیں سے ترقی و عروج بھی پاتی ہیں۔

اُردو شعراء کے تذکرے، دراصل اُن کی عجیب و غریب ذہنیتوں کی یادگار ہیں جن کے ذریعہ

ان کی اپنی اجتماعی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہے، جب ہم اس زمانہ کا پچاس سال پہلے کی حالت سے مقابلہ کرتے ہیں تو بہت نمایاں تبدیلی پاتے ہیں، کیونکہ اس زمانہ کی حالت یہ تھی کہ تعصب[۵۱] اور ہٹ دھرمی کی گھٹاؤں نے علمی فضا کو تاریک بنا رکھا تھا: لفظی بحث پر ہاتھا پائی کی نوبت آجاتی تھی، فریقین کے دل میں معاندانہ جذبات برسوں تک قائم رہتے تھے: ایک دوسرے کے جابرانہ رُعب کی وجہ کسی کو کسی کے کلام پر نکتہ چینی کرتے ڈر لگتا تھا، علمی مجلسیں سرد پڑی ہوئی تھیں۔ علمی طبقہ کے لوگ، اس خیال کے مدنظر کہ[۵۲] مصنفین ہمیشہ نشانۂ ملامت بنتے رہتے ہیں، تصنیف و تالیف کے کاموں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے، حق گوئی موجب شر سمجھی جاتی تھی اور حق پوشی باعث ایذا طلبی؛ علماء معترضین کے جواب کو "جواب جاہلاں باشد خموشی" کے خیال کی تائید میں مُہر بہ لب تھے، یا تو معترضین اور ناقدین نظروں میں کھٹکتے تھے یا تو ان کی موشگافیوں پر کفر و الحاد کے فتوے دئے جاتے تھے؛ یا تو ان کی ذاتیات سے بحث کرکے اُن کی شخصیت پر بُرا اثر ڈالنے کی کوشش کیجاتی تھی غرضکہ اُن کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے کوئی تسمہ لگا نہ رکھا جاتا تھا۔

جب سے اُردو زبان کی مربوطی تاریخ شروع ہوتی ہے، دلّی اور لکھنو ہمیشہ لفظیات کی جنگ میں دست و گریباں رہے: سودا[۵۳]، فاخر مکین، انشاء، مصحفی، ناسخ اور آتش، دبیر و انیس میں محض تنازع لفظی، بناء پر خاش رہی، اور یہی پرخاش ہجووں، مُناقشوں اور مُشاجروں کی شکل میں رونما ہوئی۔ ایک شخص دوسرے کے اعتراض کو، خواہ وہ صداقت ہی پر مبنی کیوں نہ ہو اپنی شخصیت و نفوذ پر بُرا اثر پڑنے کے اندیشہ سے نہیں مانتا تھا، لیکن[۵۴] "خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ اب مصنفین اور اُن کے ہوا خواہ اپنی معنوی اولاد پر کسی کو تنقید کرتے ہوئے دیکھکر بے دھڑک چراغ پا ہونا چھوڑتے جا رہے ہیں" اور علمی فضاء، جہل و نادانی کی اُمس بھری ہواؤں سے، پاک و صاف ہوتی جا رہی ہے؛ جب سے "روح تنقید" کے فاضل مصنف نے اس گران قدر کتاب کو، ملک میں شائع کرکے اردو دنیا پر احسان عظیم کیا ہے، تنقید کا معیار بلند ہوتا جا رہا ہے؛ فاضل اہل قلم، تنقید اور اعتراض پر ناک بھوں چڑھانے

---

[۵۱] تفصیل کے لئے "روح تنقید" مصنفہ مولوی سید محی الدین قادری صاحب زورؔ دام ظلہ ایم۔ اے صفحہ (۲۹) ملاحظہ ہو۔
[۵۲] کسی عرب کا قول ہے: "مَنْ صَنَّفَ فَقَدِ اسْتُهْدِفَ" جس نے تصنیف کی، نشانہ ملامت بنا ۱۲۔
[۵۳] "آبحیات" صفحہ ۱۶۰ و ۳۱۷ و ۳۲۵ ملاحظہ ہو ۱۲۔
[۵۴] "روح تنقید" صفحہ (۲۹)

سے باز آرہے ہیں، اور اب پھر اپنی غلطیوں کا مان لینا دانشمندی میں داخل ہوگیا ہے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مقالہ نگار، اس وقت تک طبقۂ مصنفین میں جگہ پانے کے مستحق نہ ہوں گے جب تک کہ اُن کے چند مقالوں پر شدت کے ساتھ، غیر جانبدارانہ تنقیدیں نہ لکھی جائیں۔

وہی رائیں اور تبصرے آنکھوں میں جگہ دینے کے قابل ہیں جو معقولیت پر مبنی ہوں، ورنہ وہ ایک دعویٰ ہی دعویٰ ہے جس کا احتوا کسی بار ثبوت کا منت پذیر نہیں، اعتراض، مضامین یا مقالوں کو خامیوں سے پاک کرنے اور اُن کو صحت و معقولیت کا جامہ پہنانے کے لحاظ سے مفید سمجھے گئے ہیں، لیکن وہ اعتراض غیر سنجیدہ ہوتے ہیں جو بلا کسی غور و خوض کے کئے جاتے ہیں اور تحقیقی دائرے میں دلائل و براہین یا کسی معنوی حقیقت کے حامل نہیں ہوتے۔ دنیا میں ہمدرد، مخلص اور آزادنگار نقادوں کا فقدان ہے؛ اس عصرِ قحط الرجال میں بھی چند شخصیتیں ایسی موجود ہیں، جن کے نوک قلم کے تیز نشتر مرہم جراحت ثابت ہوئے ہیں۔

مجلۂ مکتبہ، جلد (۱)، شمارہ (۲)، بابتہ تیر ۱۳۳۷ فصلی میں، ہمارا ایک مضمون، جو اُردو ببلیوگریشن یعنے اشارات اعجام کے زیر عنوان، شائع ہوا ہے اس کی نسبت، روزنامہ "بمبئی کرانیکل"[1] اور "اخبار رعیت"[2] کے فاضل مدیرین نے اپنی، جن قیمتی رایوں کا اظہار فرمایا ہے اگرچہ وہ ہمارے متزلزل ارادوں کو استحکام بخشنے اور پہلے سے زیادہ اپنے علمی کاوشوں کے مستقبل کو شاندار بنانے کے لئے کافی ہیں۔

تاہم اس موقع پر ہمارا یہ بیان، موجب طوالت نہ سمجھا جائے گا کہ مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے معتمد "ترقی اردو"، جن کے علمی و ادبی کارنامے دنیائے اردو کے آسمان پر روشن ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں اور مولوی سید محی الدین قادری صاحب زورؔ ایم۔اے۔ جو اس وقت انگلستان میں آرین زبانوں کی تحقیقات میں مصروف ہیں باوجود اپنی بے انتہا مصروفیتوں کے ان بزرگواروں نے بھی اس کے متعلق دلچسپی لے کر اپنی رائیں روانہ کرنے کا بذریعہ خطوط وعدہ فرمایا ہے جن کا ہمیں سخت انتظار ہے۔

ایک اور بزرگ، مولوی سید زبید احمد صاحب یم۔اے۔ پروفیسر عربی جامعہ الہ آباد نے بھی، جو اس وقت انگلستان میں مشہور و معروف پروفیسر ڈاکٹر آرنلڈ کے، زیر نگرانی تحقیقات علمیہ میں مصروف ہیں اور جن سے غائبانہ تعارف و نیاز مولوی زور صاحب کی بدولت میسر ہوا، اپنی زرین رائے روانہ کر کے "مکتبہ" جلد (۱)، شمارہ (۵)، بابتہ مہر ۱۳۳۷ ف کے صفحات کو جو زینت دی ہے وہ جالب توجہ ہے:-

زورؔ ایم اے حقیقتہً ـــــ جیسا کہ پروفیسر صاحب نے لکھا ہے: "آپ اُن چند سعادت مند،

---

[1] "بمبئی کرانیکل" بابتہ ۱۰؍جون ۱۹۲۸ء ۔ ۱۲

[2] "اخبار رعیت" (حیدرآباد) جلد (۱)، شمارہ (۳۸)، بابتہ ۲۰ مہر شہریور ۱۳۳۷ ف ۱۲

صاحب فضل اور ہونہار نوجوانوں میں سے ہیں، جن کے ابتدائی زمانہ طالب علمی کے کارنامے، اُن کے مستقبل قریب میں اُردو کے مایۂ ناز جیّد عالم ہونے پر بداہتہً دلالت کر رہے ہیں ......" قابل وقعت ہستی ہیں۔ انھوں نے خط کے ذریعہ، ہم سے اپنی رائے روانہ کرنے کا وعدہ ہی نہ فرمایا، بلکہ پروفیسر صاحب کی توجہ ہمارے مضموں کی جانب منعطف کرائی اور اُن کے اس وعدہ کی — جو انھوں نے رائے لکھنے کا قصد ظاہر فرمایا تھا — خوشخبری بھی دی۔ ایسے زمانے میں، جبکہ سنجیدہ سے سنجیدہ طبیعتیں، علمی و تحقیقی مقالوں کو خشک اور افسانوی مضامین کو دلچسپیوں کا موجب سمجھتے ہوئے، اس جانب بہت کم توجہ کر رہی ہیں؛ پروفیسر صاحب کا باوجود اپنے انتہائے شغف و انہماک کے، ہمارے ناچیز خیالات کی جانب توجہ فرمانا اور اپنے مخلصانہ مشورہ سے ہم کو استفادہ کا موقع دینا، ہمارے لئے تشکر و امتنان کا ہی موجب نہیں، بلکہ ہم اس کی وجہ سے ایک ایسی شاہراہ پر آگئے ہیں جس سے بھٹکنا ناممکن ہے۔

اس قدر "احوالِ واقعی" کی گذارش کے بعد، ہم پروفیسر صاحب کی رائے کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں: پروفیسر صاحب نے خاص کر، اُردو پنکچویشن کے مصطلحات پر جہاں اپنی رائے میں روشنی ڈالی ہے، مناسب ہوتا، اگر اس کے ساتھ ساتھ، ہمیں یہ بھی بتلا دیتے کہ عہد حاضر کے جدید مصری ادیبوں نے، اپنی زبان میں، پنکچویشن کے مجموعی اور تفریدی اسماء و اعلام کا، کن الفاظ میں ترجمہ کیا ہے اور ان کے لئے دیگر سامی و اسلامی السنہ میں کیا اسماء و علامات مقرر ہیں؛ کہاں تک اُن میں اصلاح کی ضرورت ہے، لسانیاتی نقطۂ نظر سے اس کا کوئی جزو تبدیل و ترمیم کے قابل تو نہیں؟

—— (۲) ——

ذیل میں ہم، لسانی و انتقادی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے، پروفیسر صاحب کی اُن توجیہات کی نسبت (جن سے ہم کو جزئی اختلاف ہے) تفصیلی بحث کرنا چاہتے ہیں:۔

| اشارات اعجام کی معنوی ترکیب | ا۔ پروفیسر صاحب "اشارات اعجام" یعنے (PUNCTUATION)

پنکچویشن کے ترجمہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ "غیر مانوس ترکیب ہونے کے علاوہ معنے کے لحاظ سے بھی صحیح نہیں" یہ بات "فرہنگ اصطلاحات علمیہ"[۲] پر نظر غائر ڈالنے سے واضح ہو سکتی ہے کہ فنی اصطلاحیں بالعموم غیر مانوس ہوتی ہیں، لیکن جب اُن کا استعمال شروع کر دیا جائے گا تو رفتہ رفتہ، ان سے غرابت و اجنبیت دور ہو کر روزمرہ میں داخل ہوتی جائیں گی۔ واضعین لغت و ماہرین علم بیان، جب کسی خیال کی ادائی یا کسی لفظ کے ترجمہ کے لئے کوئی لفظ لیتے ہیں تو ان کے پیش نظر یہ بات رہتی ہے کہ لفظ سلیس ہو یا غریب، مگر

---

[۱] مرتبہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۲۔ [۲] ضمیمہ فلسفہ جذبات صفحہ ۲۳۶-۱۲

مگر اس میں جامعیت و جزالت کا ہونا ضروری خیال کرتے ہیں یعنی یہ دیکھتے ہیں کہ آیا اس لفظ میں، اس خیال کی ادائی کی قوت یا اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں کچھ علاقہ بھی ہے یا نہیں اور اگر اس میں کچھ معنوی تعلق ہے بھی تو اس میں اصطلاح بننے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے یا نہیں۔

اردو ادبیات کی تاریخ کا، گہری نظر سے مطالعہ کرنے پر، اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اب تک جتنے بھی الفاظ اردو زبان میں داخل ہوئے ہیں وہ اکثر فارسی زبان کی وساطت سے داخل ہوئے اور اب بھی اسی خیال کی تحت ہم کو فارسی سے مدد لینے کی ضرورت پڑی:۔

پنکچویشن کا ترجمہ اہلِ ایران[1] نے "اشاراتِ اعجام" کیا ہے اور اس لفظ کو خاص کر ان ایرانیوں[2] نے، جو اس وقت یورپ میں رہ کر مستشرقین کے دوش بدوش کام کر رہے ہیں، استعمال کیا ہے۔ اس لفظ کی ترکیب معنوی اعتبار سے غلط نہیں معلوم دیتی: "اشارات" کا لفظ رموز، علامات، کنایات کا مترادف ہے؛ یہ لفظ دراصل اسم جمع ہے، اس کا واحد "اشارہ" ہے اور آج کل ہماری تعلیمی اصطلاح میں اس کا استعمال ہنٹس (HINTS) اور نوٹس (NOTES) کے عوض بھی ہو رہا ہے۔ بجائے رموز کے اشارات کا لفظ اختیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ رموز کے معنی لغت میں طعنے تشنے کے آئے ہیں جو ایک مجازِ عرفی کی صورت ہونے کے اعتبار سے معنوی التباس پیدا کر رہا ہے، اور لفظِ علامات میں، ہر وہ شخص جو ذوقِ سلیم رکھتا ہے اس کنہ کو پا سکتا ہے کہ اصطلاحی لفظ بننے کی کس قدر صلاحیت ہے؟ .... عہدِ حاضر میں جب کہ علمی طبقہ کی ذہنیات پر غالبیت کا عنصر غالب ہوتا نظر آ رہا ہے اور جس طرح غالب کی تنوع پسند طبیعت نے قدیم تشبیہوں اور قدیم ترکیبوں کو ـــــ جن میں کثرتِ استعمال کی وجہ ابتذال پیدا ہو چلا تھا، ـــــ قطعاً ترک کر کے نئی نئی ترکیبیں ایجاد کیں، کیا وہ ایسے الفاظ کو پسند کر سکتی ہیں؟[3]

---

[1] رسالہ "اردو"، جلد سوم، حصہ دہم، بابتہ اپریل سنہ ۱۹۲۳ء صفحہ (۲۹۶)

[2] مجلّہ "ایرانشہر" شمارہ (۶)، سال (۳)، بابتہ اپریل سنہ ۱۹۲۵ء میں آقا سید حسین کاظم زادہ مدیرِ مجلّہ مذکور کا مضمون "اصلاحاتیکہ بودجہ لازم ندارد"، ملاحظہ ہو ۱۲

[3] مجلّہ مکتبہ:۔ ایک اصولی بحث میں اس فضا سے مرعوب ہونے کی ضرورت تو نہیں معلوم ہوتی، ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب پروفیسر ادبیات انگریزی نے جو مقالہ غالب پر لکھا ہے اگر وہ مضمون نگار کے مطالعہ میں آ جاتا تو شاید اس خیال کو دلیلی طور پر پیش نہ کیا جاتا کہ خود غالب نے عام ذہنیت پر غالب آنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ تنقید نگاروں کی ذہنیت غالب پر ایسی غالب آگئی کہ عام ذہنیت ان کے وقارِ ذہنیت میں آگئی!

لفظ اعجام کی لغوی حقیقت

لفظ اعجام نہایت وسیع المعنی ہے، جس کے معنی صرف نقطے لگانے کے لینا، تحقیقی نظر میں محتاج تصحیح ہے۔ نِکلسن (NICOLSON) کی تاریخ "ادبیاتِ عرب"[1] (LITERARY HISTORY OF THE ARABS) کے ملاحظہ سے یہ امر واضح ہو سکتا ہے کہ نقطوں کا وجود تقریباً ۸۰ ہجری تک بھی نہ تھا، اُن کا موجد دراصل خلیفہ عبدالملک کے عہد میں عراق کا عامل حجاج بن یوسف تھا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ حجاج ابتدا میں ایک معلم تھا، اس کو تعلیم دینے میں اوّلین دقت جو پیش آئی وہ نقطوں کا نہ ہونا تھا۔ اسی ضرورت کے احساس نے اُس کو شناخت کے لئے حروف پر نقطے لگانے کے متعلق مجبور کیا۔

اس تاسیسِ حقیقت پر اعجام کے معنوں کو حروف ہی کے لئے مخصوص کرنا محدود نظری کو کام میں لانا ہے۔ نظر تو ہمیشہ الفاظ کی معنوی وسعت پر رہنی چاہیئے۔ الفاظ خیالات کے محفوظ رکھنے کا بکس ہوتے ہیں جس لفظ میں جتنی وسعت دیکھتے ہیں اُس میں اتنی ہی پہنائی کی چیز رکھ چھوڑتے ہیں۔ اس لئے اگر اعجام کے اصطلاحی معنوں (مثلاً: نقطے لگانا) سے قطع نظر کر کے اس کی لغوی حقیقت پر غور کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس لفظ میں پنکچوئیشن کے مفہوم کو ادا کرنے کی جو قوت و جزالت موجود ہے وہ کسی دوسرے لفظ میں نہیں پائی جاتی۔

اعجام کے معنے لغت میں گونگے پن کو دور کرنے یا بالفاظ دیگر گویائی بخشنے کے ہیں چونکہ اعجامی علامتیں بے اعجام کی عبارت سے ابہام دور کر کے (اُس کو معنی خیز بنا دیتی ہیں۔ اس لئے یہ لفظ (اعجام بالکسر) یا اُس کے مترادف الفاظ تعجیم یا تنقیط اس معنی میں زیادہ موزوں نظر آتے او پنکچوئیشن کا صحیح ترجمہ ہو سکتے ہیں جس طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس قول[2] "اِنَّ الکَلَامَ بِلَا نَحْوٍ نُبَحُ الکِلَابِ وَالسَّنَانِیْرِ" میں غیر نحوی کلام کی تشبیہ سگ و گربہ کی چیخوں سے دی گئی ہے۔ اسی طرح اگر بے اعجام کی عبارت کو گونگوں کے الفاظ و اصوات سے تعبیر کی جائے اور اعجام والی عبارت (عبارت مُعجمہ یا مُعجّمہ یا مُنقّطہ) کو کسی گویا شخص کے الفاظ سے مراد لی جائے تو اعجام کی معنوی حقیقت آشکار ہو سکتی ہے۔

صاحبِ تاج العروس[3] نے "نہایہ" کے حوالے سے لکھا ہے کہ اَعْجَمْتُ الکِتَابَ اَیْ نَقَّطْتُہٗ وَفِی النِّھَایَہ: "اَزَلْتُ عُجْمَتَہٗ اَوِاسْتِعْجَامَہٗ"، یعنے میں نے کتاب پر نقطے لگائے اور "نہایہ" میں اس کی معنوی توضیح اس طور پر کی گئی ہے کہ میں نے کتاب کی عُجمیّت یا اس کے استعجام [گونگے پن] کو دور کیا ابْنِ سِیْدَہٗ کہتا ہے: اعجام میں ہمزہ، سَلبی ہے کیونکہ "اَفْعَلْتُ" اگرچہ اس کی اصل اثبات ہے مگر

---

[1] لٹریری ہسٹری آف دی عربس صفحہ (۲۰۱)

[2] (ترجمہ) اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ جس کلام میں نحوی ترکیبیں نادرست ہوتی ہیں اس کو کتے اور بلی کی آواز سمجھنی چاہیئے ۱۲

[3] تاج العروس فی شرح القاموس، صفحہ (۳۹۰) ملاحظہ ہو ۱۲۔

کبھی کبھی سلب کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ عرب کہتے ہیں: اَشْکَیْتُ زَیْداً میں نے زید سے شکایت دور کی اور اسی قبیل کی دوسری نظیریں بھی عرب کے کلام میں موجود ہیں۔

اعجام کے مترادف الفاظ تعجیم اور تنقیط بھی ہیں: تاج العروس، صفحہ ۱۹۳ پر لکھا ہے کہ "تَعْجِیْمُ الْحَرْفِ تَنْقِیْطُہٗ لِکَیْ تَسْتَبِیْنَ عُجْمَتُہٗ"، یعنی تعجیم کسی حرف کی دراصل اس کی تنقیط ہے تاکہ اس کا ابہام دور ہو جائے۔

لفظ "علامات وقف" کا جامع نہ ہونا۔ | پروفیسر صاحب نے پنکچوایشن کے ترجمہ میں 'علامات وقف' کا جو لفظ پیش کیا ہے اس کے قبول کرنے میں ہمیں اس وجہ سے تامّل ہے کہ وقف کے معنی لغت میں ٹھہرنے کے ہیں اور پنکچوایشن کے بعض تفریدی نام ایسے بھی ہیں جو اوقاف کی تعریف سے خارج ہو جاتے ہیں۔ مثلاً انورٹڈ کاماز (واوین)، ہائی فن (رابطہ)، ایکویشن (متساویہ) اور ڈاٹس آف اُمیشن (نقاطِ تقدیریہ)..... .... گویا وقف کا لفظ ان معنوں پر حاوی نہیں۔

اشاراتِ اعجام کے مترادف الفاظ | قرآنی اوقاف، جن کو تجویدی اصطلاح میں "رموزِ اوقاف" کہتے ہیں، سجاوندی کی تجویز کے بموجب کم و بیش ۱۹ ہیں، لیکن، ان علامات میں، کوئی بھی جزو ایسا نہیں، جو اوقاف کی تعریف سے خارج ہوتا ہو۔ جس نام میں اتنی صلاحیت و قوت نہیں کہ وہ منطقی رو سے اپنے اجزا کی تعریفوں اور مفاہیم پر حاوی ہو، پھر اس [قسم کے نام] کو تجویز کرنے کی کیوں ضرورت ہے؟ کیا "اشاراتِ اعجام"، "رموزِ اعجام"، "رموزِ تعجیم"، "اسرارِ تنقیط"، "مبادیٔ توقیف"، "رموزِ توقیف"، "اشارات الوقوف" و "رموزِ عبارت"، اوقاف و اعجام کے مجموعی نام ہونے کے لحاظ سے پنکچوایشن (PUNCTUATION) کے مفہوم کو نہیں ادا کر سکتے؟ جو ان کو چھوڑ کر "علامات وقف"، جس میں جزالت و جاذبیت بہت کم ہے، اختیار کیا جائے۔

"رموزِ اوقاف" یا "علاماتِ وقف" کی تراکیب میں اشتقاقی دقتیں | الفاظ کے ترجمہ کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب نے فرہنگِ اصطلاحاتِ علمیہ کے مقدمہ میں جن سات اصول کو قلمبند کیا ہے، اس میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "یہ بھی جتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض اصطلاحیں جو صحیح نہیں تھیں اور رائج ہو گئی تھیں یا جن سے اشتقاق و ترکیب کے رو سے آگے لفظ نہیں بن سکتے تھے انہیں ترک کر دیا ہے اور ان کی بجائے دوسرے الفاظ وضع کر لئے گئے ہیں"[۵۲]۔ جب کہ وقف کے معنے پنکچوایشن کے مفہوم کے ادا کرنے کی قوت نہیں رکھتے

---

[۵۱] تاریخ القرآن، مصنفہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری صفحہ (۳۷)۔

[۵۲] "فرہنگ اصطلاحاتِ علمیہ"، مرتبہ انجمن ترقی اردو، صفحہ (۴)۔

تو ہم بجائے اس کے مندرجۂ بالا اسماء میں سے کوئی ایک لفظ مثلاً "رموز تعجیم" ......وغیرہ کیوں منتخب نہ کریں؟ اس وجہ سے کہ پنکچوئیشن، عبارت میں اُن علامتوں کے لگانے کے عمل کا نام ہے جن کے ذریعہ ابہامات دور ہو کر فہم مطلب میں مدد ملتی ہے اور اعجام یا تعجیم بھی اسی مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔

لسانیاتی نقطۂ نظر سے اس قدر حقیقت کو منکشف کرنے کے بعد، ہم یہ عرض کریں گے کہ "علاماتِ وقف" یا "رموزِ اوقاف" کے الفاظ کو اگر کوئی پنکچوئیشن کے بجائے پیش کرنا چاہتے ہوں تو ہماری نظر میں کوئی سلیس سے سلیس نام پنکچوئیشن کے مفہوم کو ادا کرسکتا ہے تو وہ "رموزِ عبارت" یا "رموز العبارت" ہے یا اگر ایسا لفظ چاہیئے جس سے اشتقاق و ترکیب کے رو سے آگے لفظ بن سکتے ہوں تو وہ "رموز توقیف" یا "رموز الوقف" ہیں یا وہ الفاظ، جن کی تصریح ہم نے اوپر کر دی ہے زیادہ موزوں نظر آتے ہیں۔ اگر انہیں الفاظ کو فنی معنوں میں استعمال کرنا چاہیں تو باآسانی اعجامیات، تعجیمیات، تنقیطیات، توقیفیات، وقفیات، رمزیات، بن سکتے ہیں۔ لیکن ان میں آخر الذکر سے دیگر اشتقاقات کے بنانے کی توقع رکھنا نہالِ بے ثمر کو ثمردار بنانا ہے۔

پنکچوئیشن کے ترجمہ کی نسبت دیگر اداروں سے اختلاف

اعجام یا تعجیم کی موزونیت کو بہ دلائل ثابت کرنے کے بعد، ہم مولوی عبدالحق صاحب کی اس تجویز پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا چاہتے ہیں جس کو انہوں نے قواعدِ اردو کے جدید ایڈیشن، صفحہ ۲۶۶ پر، پنکچوئیشن کے اردو ترجمہ میں "رموزِ اوقاف" یا "وقفے" کے الفاظ کی صورت کو پیش کیا ہے۔ رموزِ اوقاف تو خیر، کسی توضیح کا محتاج نہیں لیکن، "وقفے" کا لفظ ذرا کھٹکتا ہے۔ "وقفے" شائد اسم جمع ہے "وقفہ" کا، اور "وقفہ" مولوی صاحب کی تجویز کے مطابق ترجمہ ہے "سمی کولن" کا کیا ہر "سیمی کولن"، پنکچوئیشن کے تمام اجزاء کے مفہوم کو ادا کرسکتا ہے؟ ...... اگر ہم نے تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیا کہ "وقفے"، جمع ہے "وقف"، کی اور "وقف" نام ہے پنکچوئیشن کے ہر جزو کا، تو کیا ہم جرأت کے ساتھ قواعدِ اردو کے فاضل مرتب سے یہ امر دریافت کرسکتے ہیں کہ "وقفے"، "وقف کی جمع خلاف قاعدہ کس طرح آسکتی ہے؟ ....

ہم سے، ایک عربیت پرست بزرگ فرماتے ہیں کہ "رموزِ اوقاف" ہی پنکچوئیشن کا مترادف سمجھا جائے، مگر ہم اُن کی خدمت میں یہ عرض کریں گے کہ "رموزِ اوقاف" نام ہے اُس مجموعۂ اجزائے اوقاف کا، جو عبارتِ قرآن میں (جن کو رموز القرآن بھی کہتے ہیں) مروّج ہیں اگر اردو زبان میں، اُن کو من و عن، نقل کر لیا جاتا ہے تو اس صورت میں، ہم "رموز الاوقاف" کو پنکچوئیشن کا مترادف یا قائم مقام سمجھتے، لیکن جب یہاں سرے سے ہی اوقافِ قرآنیہ کو نہیں لیا گیا ہے تو پھر اس کے مجموعی نام کو کیوں اختیار کیا جائے۔

(۳)

قاطعہ کی جامعیت اور اس کے ترک وقبول کی نسبت تجویزیں

۲۔ پروفیسر صاحب کا "قاطعہ" کے ترک کی نسبت، اس توجیہہ کے ساتھ مشورہ دینا کہ "فل سٹاپ کے لئے وقفہ بہتر ہے۔ قاطعہ سے قطع نظر کیجئے" محض شاعرانہ تخیل ہے۔ حالانکہ تجویدی اصطلاح میں[1] "وقفہ" دراصل "سکتہ طویلہ" کا نام ہے جہاں وقف کی حالت میں بغیر سانس توڑنے کے تھوڑے سے ٹھہراؤ کا عمل ہوتا ہے یعنی جتنی دیر سانس لینے میں ہوتی ہے یہاں اس سے بھی کم ٹھہرتے ہیں "فل سٹاپ" مکمل جملہ کے خاتمہ پر ٹھہرنے کی علامت ہے جس پر "وقف تام" یا "وقفہ کاملہ" کا معناً اطلاق ہوتا ہے جب جملہ تمام ہوتا ہے اور اس کو جملہ مابعد سے لفظاً یا معناً کوئی تعلق نہیں ہوتا تو اس صورت میں ٹھہر کر سانس لینا ضروری ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کہ فل سٹاپ کا محل استعمال یہ ہے کہ جب کسی جملہ یا فقرے میں، جو کسی عبارت کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے اور جس میں ایک پوری بات یا ایک پورا خیال ادا ہوتا ہے وہاں یہ علامت لگائی جاتی ہے، جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ یہ ٹکڑا یا یہ خیال ہی عبارت یا پیراگراف سے قطع کرلیا گیا۔ اس اعتبار سے قاطعہ کا لفظ زیادہ موزوں نظر آتا ہے نہ کہ وقفہ کا، مگر چونکہ اہل پنجاب کتب نصاب کے آخر میں حسب عادتِ مستمرہ، اعجام کی چند علامات کی فہرست جس میں "فل سٹاپ" کا ترجمہ "پورا وقفہ" کیا گیا ہے، دیا کرتے ہیں اور ایک عرصہ سے مستعمل بھی ہے۔ چونکہ مجازِ مرسل کی ۲۴ صورتوں میں[2] ایک صورت[3] "تسمیۃ الکل باسم جزو" بھی ہے یعنی جزو کہکر اس سے کل مراد لی جاتی ہے اس لحاظ سے مجازاً اس کے معنی وقفہ کے لئے جاسکتے ہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب نے "فل سٹاپ" کا ترجمہ "ختمہ" کیا ہے، جس کی ترکیب غیر مانوس اور معنوی اعتبار سے درست نہیں معلوم ہوتی اور نہ اس لفظ کو عَلَمِیّت سے کچھ مناسبت ہے۔ اس سے تو "وقفہ" کا لفظ ہی بہتر اور پہلے سے موجودہ رائج ہے اور "ترقی اردو" کے اصول موضوعہ[4] کے مطابق درست بھی ہے۔ صرف اسی وجہ سے "قاطعہ" مستحسن الترک ہوسکتا ہے، ورنہ وہ دو نو کیفیتیں، جو قطع و وقف سے پیدا ہوتی ہیں اُن کا حامل "وقفہ" ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اور پھر مذاقِ سلیم کی آنکھ "قاطعہ" سے قطع نظر نہیں کرسکتی۔

---

[1] خلاصۃ التجوید صفحہ (۳۱)، سراج التنزیل صفحہ (۵۵)

[2] احسن القواعد، مولفہ مولوی نجف علی خاں مرادآبادی صفحہ (۳۳)

[3] حدائق البلاغۃ مصنفہ مولانا شمس الدین فقیر رح صفحہ (۷۴)

[4] مقدمہ فرہنگ اصطلاحات علمیہ صفحہ (۴) ملاحظہ ہو ۱۲

لفظ مُفرزہ کا ترک اور متوسط کی تجویز | ۳۔ مفرزہ ـ سی می کولن کے لفظ کا ترک کرنا اُس وقت زیادہ مناسب ہوگا جب کہ اُردو والے اس کی بجائے "نیم وقفہ" کے لفظ کو قبول کرلیں۔ ورنہ مُفرِزہ یا [اُس کا ہم وزن و مترادف] مُفرِقہ سہل التلفظ ہیں اور حروف میں بھی نیم وقفہ سے کم۔ مُفَرِّزہ، اسم فاعل ہے تفریز کا، جس کے لغوی معنے جدا کرنے والی علامت کے ہیں۔ چونکہ سیمی کولن کی علامت اُن بڑے بڑے جملوں کو، جو بغیر حروف رابطہ کے آپس میں مربوط ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے جدا کردیتی ہے۔ تجویدی اصطلاح میں "وقفِ مطلق"[1] یا "وقفِ کافی" اسی مفہوم کو ادا کرتے ہیں کہ "بات تو پوری ہوگئی مگر، ابھی مطلب تمام نہیں ہوا یعنی قائل کو ابھی کچھ اور کہنا ہے"، لیکن "وقفِ تام" اور "وقفِ کافی" میں یہ فرق ہے کہ اُس کو مابعد کے جملہ سے معناً یا لفظاً کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اِس سے لفظاً تو نہیں مگر، معناً ضرور تعلق ہوتا ہے۔ پنجاب والوں نے اس لفظ کا ترجمہ "تھوڑا وقفہ"[2] کیا ہے، شائد اسی کو ــــ کیونکہ یہاں وقفہ سے کم اور سکتہ سے زیادہ ٹھہراؤ ہوتا ہے، ــــ نیم وقفہ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے مگر اس سے، ایک بزرگوار[3] نے مطلق "وقفہ" مراد لیا ہے جس کی وجہ یہاں لفظی تنازع پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ ایسی صورت میں نیم وقفہ کا لفظ ہی بلحاظ عام فہم ہونے کے بہتر ہوگا۔ لیکن، صرف عام فہم ہونا، واضعین کے لئے کافی نہیں۔ سیمی کولن کے ترجمہ کے لئے اگر مفرزہ موزوں نہیں تو اس کا قائم مقام متوسطہ ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ لفظ، ایسے وقفہ کے لئے تراشا جارہا ہے جو "سکتہ" سے زیادہ اور "قاطعہ" سے کم ہے۔ اس (درمیانی) گومگو حالت کو ادا کرنے کی معنوی قابلیت "مُتَوَسَّطہ" میں بدرجہ اعلیٰ موجود ہے۔

لفظ مُفسِّرہ کی ترجیح کی نسبت مشورہ | ۴۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ "کولن" کے لئے بجائے شارحہ کے مُفسِّرہ بہتر سمجھتا ہوں کہ لفظ شارحہ کے مقابلہ میں شگفتہ ہے۔ حائے حطی اور ہائے ہوز کا اجتماع ثقالت سے خالی نہیں" کولن کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے شارحہ، مُفَسِّرہ، تفصیلیہ درست ہوسکتے ہیں، لیکن اُن میں کا ہر ایک لفظ اپنے اپنے موقع پر کام دیتا ہے یعنی شرح کے موقع پر شارحہ کا لفظ شگفتہ نظر آتا ہے، تفسیر کے موقع پر مُفسِّرہ کا، اور تفصیل کے موقع پر تفصیلیہ کا، لیکن، چونکہ نحو اور فنِ املاء میں بہت قریبی تعلق ہے بلکہ فن املاء، نحو کا جزو لاینفک ہے اس لئے پروفیسر صاحب کی تحریر کے مطابق کہ "ایک ہی فن کی اصطلاحوں میں اشتباہ نہیں ہونا چاہئے" مُفسِّرہ کا لفظ شائبہ پیدا کریگا۔ شارحہ کے تلفظ میں "حائے حطی" اور "ہائے ہوز" کا اجتماع ہرگز ثقالت نہیں پیدا کرتا۔ اور نہ پروفیسر صاحب

---

[1] خلاصۃ التجوید، صفحہ (۳۰)

[2] مرقاۃ الادب، مؤلفہ ظفر اقبال صاحب ایم۔ اے، بی ٹی لکچرار سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور صفحہ (۷۰)

[3] قواعد اُردو، جدید ایڈیشن، مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے، صفحہ (۲۶۶)۔ ۱۲

نے ثقالت کی کوئی وجہ بیان کی ہے حائے حطی اور ہائے ہوز اُن چھ[1] حروفِ حلقی میں شامل ہیں، جن کے مخرج آخرِ حلق، وسطِ حلق، ابتدائے حلق سے نکلتے ہیں (جن کو تجویدی اصطلاح میں اقصائی، وسطی، ادنائی کہتے ہیں) جیسا کہ قرآن شریف کی اس آیت اَلَمۡ اَعۡهَدۡ اِلَيۡكُمۡ يٰبَنِيۡۤ اٰدَمَ اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوا الشَّيۡطٰنَ ۚ میں اَعۡهَدۡ کا لفظ واقع ہوا ہے جو باوجود حروفِ حلقی کے اجتماع کے ثقیل نہیں مانا جاتا۔ یوں تو بیسیوں لفظ ایسے بھی موجود ہیں جن میں حائے حطی اور ہائے ہوز کا اجتماع ہوا ہے مگر ثقیل نہیں مانے جاتے۔ کیا اس قسم کے الفاظ، لغات و مصطلحات سے، اس خیال کے مطابق خارج کر دینے چاہئیں؟..... مثلاً فاتحہ، سانحہ، لائحہ، اعمالِ صالحہ، کرۂ مُسَطَّحَہ یا عین وہاء کے اجتماع سے ـــــ جامعہ، قطعہ، اَشِعَّہ، شہبِ متفرقعۂ (نیازک متفرقعہ)، کرۂ مصطنعۂ[2] ...... وغیرہ۔ یہ اعتراض تو مُفَسِّرہ پر ہونا چاہیے کیونکہ اس میں حرفِ مُشَدَّد، جس کو فنی اصطلاح میں مُثَقَّل بھی کہتے ہیں، ثقالت پیدا کر رہا ہے۔ یہ خیال محتاجِ تصحیح ہے کہ ایک ہی لفظ میں دو قریب المخرج یا متحد المخرج حروف کا اجتماع، ثقالت پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ اگر پروفیسر صاحب کی ثقالت سے تنافر مراد ہے تو، اہلِ بلاغت کے زاویۂ نگاہ سے کسی جملہ میں، ایسے حروف کا اجتماع، جن کا متحد المخرج ہونا ثابت ہو، تنافر پیدا کرتا ہے[3]۔ نہ کہ صرف ایک لفظ میں؛ لیکن مُفَسِّرہ کا لفظ، "شارحہ" اور "تفصیلیہ" کی نسبت کرتے، بلحاظ جامع ہونے کے اختیار کرنے کے قابل ہے مگر اس اعتراض کی بنا پر نہیں جو شارحہ پر کیا گیا ہے۔

لفظ سکتہ کی مقبولیت - | ۵۔ "ٹاما" کے لئے سکتہ بہتر ہے" اس لفظ کے بہتر ہونے میں کس کو کلام ہے اور اس کے قبول کرنے میں کس کو تامل؟ اس لئے کہ اس لفظ کو ثقات نے بالاتفاق مان لیا ہے۔ اگرچہ "وقفۂ قصیرہ" یا "وقفۂ صغیرہ" بھی اسی مفہوم کو ادا کرتے ہیں لیکن ثقات ان کو کیوں مانیں گے؟

لفظ داوین کی شگفتگی - | ۶۔ "اِن وَرٹِڈ کاماز" کے لئے "داوین" کے لفظ کی تجویز [اگرچہ "ممیّزہ"، اقتباسیہ، ناقلہ بھی اپنے اپنے موقع پر شگفتہ ہیں، لیکن جامع نہیں] مناسب ہے؛ کیونکہ اس سے ایک حد تک مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔

استفہامیہ کی موزونیت | ۷۔ "کوئری" کے لئے استفہامیہ کا لفظ ہی مناسب ہے جو کسی توضیح مزید سے مستغنی اور ایک

سلہ خلاصۃ التجوید، مولفہ مولوی قاری محمد منیر علی صاحب عثمانی شیخ التجوید کلیۃ المعلمین حیدرآباد صفحہ (۱۰)

سلہ آخر الذکر اصطلاحیں علم ہیئت کی ہیں [فرہنگ اصطلاحات علمیہ صفحہ ۱۴۴، ۱۳۰]

سلہ تسہیل البلاغۃ، مولفہ مولوی مرزا سجاد بیگ صاحب مرحوم صفحہ (۱۷۲)، بحر الفصاحت صفحہ (۱۰۲۶)

عرصہ سے مستعمل ہے!

فارقہ کا ترک اور خطِ فاصل کا استعمال | ۸۔ڈیش کا لفظ، قبول کرنے میں تأمّل نہ تھا، مگر ہم کو اس کا مترادف لفظ "خط"[1] [جس کو سابق میں خطِ فاصل بھی کہتے تھے] مل گیا ہے۔ جو ڈیش سے بھی سہل التلفظ اور سہل الاملا ہے۔

فجائیہ کی جامعیت | ۹۔انٹرجکشن کے لئے جذبیہ کا لفظ اس صورت میں زیادہ مناسب ہوتا، جب کہ اردو میں اس سے کوئی جامع لفظ نہ ملتا۔ اگرچہ انجذابیہ کا لفظ[2]، قریب التلفظ ہونے کے اعتبار سے انٹرجکشن کا قائم مقام ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے؛ لیکن "فجائیہ" کا لفظ بلحاظ اپنی جاذبیّت وجامعیّت کے ان دونوں کے مقابل مستحسن الرّواج نظر آتا ہے؛ کیوں کہ جو تفاوت، فعل وانفعال کے معنوں میں ہے وہی جذب وانجذاب کے معنوں میں بھی یعنی جذب کے معنی اثر آفرینی کے ہیں اور انجذاب کے معنی اثر پذیری کے لیکن انٹرجکشن کے معنی حروف نا۔یہ۔۔۔ ندا، تعجب، حسرت، افسوس، مسرّت، التماس سے کے اظہار کی علامت کے ہیں؛ اور عہد حاضر کے محققین نے ان تمام الفاظ (حروف) کے مفہوم کے لئے فجا کا لفظ [جس سے مراد[4] صرفی اصطلاح میں وہ الفاظ ہیں جو بحالت جوش وجذبہ اچانک طور پر زبان سے نکل جاتے ہیں] تجویز کیا ہے۔ چونکہ انٹرجکشن کی علامت بھی، انہیں الفاظ کے لئے مختص ہے اس لئے، فجائیہ[3] کا لفظ تجویز کرنا خالی از حکمت نہیں اور نہ نقاد کو اس کے ماننے میں تامل ہوگا۔ ہماری نظر میں، اگر کوئی لفظ فجائیہ کے بعد، موزوں بھی ہوتا، تو ہم، فوق الذکر توجیہہ کی بناء پر انجذابیہ ہی کے لفظ کو پیش کرتے۔

رابطہ کی مناسبت | ۱۰۔ہائی فن کے لئے رابطہ کے لفظ کو قبول کرنے میں کس کو تامّل ہے؟ اگرچہ ایک رنگ[5] نے اس کا ترجمہ "زنجیرہ" بھی کیا ہے؛ لیکن چونکہ ہائی فن کے لغوی معنی مرکب الفاظ کے اجزا کو ملانے والی علامت کے ہیں؛ اس لئے اسی مناسبت سے اس لفظ کا ترجمہ ٹھیک طور پر رابطہ ہی ہوسکتا ہے نہ کہ زنجیرہ۔

متساویہ کا رواج | ۱۱۔ایکویشن کے لئے "متساویہ" کے لفظ کی تجویز نہ صرف مناسب بلکہ احسن ہے اس لئے کہ اردو میں کوئی اور لفظ اس کا مترادف نہیں۔

---

[1] مولوی عبدالحق صاحب نے بھی اس لفظ کا ترجمہ "خط" ہی کیا ہے (قواعد اردو، جدید اڈیشن صفحہ ۲۶۶)

[2] قواعد اردو، جدید اڈیشن، صفحہ (۱۴۳)

[3] ,, ,, ,, (۲۶۶) پر انٹرجکشن کا بھی ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲

[4] اس سے مراد مولوی عبدالحق صاحب ہیں [قواعد اردو، جدید اڈیشن صفحہ (۲۶۶) ملاحظہ ہو] ۱۲

[5] دی اسٹوڈنٹس پریکٹیکل ڈکشنری، صفحہ (۳۹۶)۔ ۱۲

لفظ قوسین کا جامع ہونا | ۱۲- بریکٹ اور پارنتھیسس کے لئے بجائے بیانیہ اور معترضہ کے اردو میں قوسین سے بہتر و جامع کوئی لفظ نہیں ملسکتا۔ کیونکہ اُن کے لئے جو علامتیں مقرر ہیں وہ تقریباً ایک ہی شکل کی ہیں۔ اہل ایران نے اُس کا ترجمہ "کمانہ" بھی کیا ہے لیکن کمانہ اُتنا جامع نہیں جتنا کہ قوسین ہے۔

نقاط تقدیریہ کے ترجمہ کی خوبی | ۱۳- "ڈاٹس آف اومیشن" کے لئے نقاط تقدیریہ یا صرف تقدیریہ ہی مناسب ہے اس لئے کہ اس کے ترجمہ میں یہ خوبی ہے کہ نام کے ساتھ ہی اس کے عمل کا پتہ بھی چل جاتا ہے۔

(۴)

اعجامی مصطلحات کی ایک مکمل فہرست | ذیل میں، اعجام کے اجزا و اعضاء کے ہر ہر اسم پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد، ہم ان مصطلحات کو [جو قابلِ رواج یا قابلِ ترک پائے جاتے ہیں] ایک مکمل مگر اجمالی فہرست کی صورت میں، جس میں اُن کے محاذی، مختصر اصطلاحی معنی بھی مندرج ہیں، پیش کئے دیتے ہیں:-[لہ]

نمبر	اردو نام: رواج دینے کے قابل	اردو کے مترادف نام: ترک کرنے کے قابل	مختصر اصطلاحی معنی	اردو علامات	انگریزی نام اور انکے مترادفات	انگریزی علامات
۱	قاطعہ (وقفہ کاملہ)	وقفہ، ختمہ	پورا ٹھہراؤ: عبارت سے کسی مکمل جملے یا فقرے کو قطع کرنے والی۔	ـ	فل سٹاپ (پیریڈ)	.
۲	متوسطہ (وقفہ متوسطہ)	نیم وقفہ، مُفرزہ	متوسط ٹھہراؤ: طولانی جملوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والی۔	؛	سمی کولن	;
۳	مُفسّرہ	تفصیلیہ، شارحہ	پھیلاؤ: اجمال کی تفصیل بتانے والی	:	کولن	:
۴	سکتہ (وقفہ صغیرہ)	قامہ، وقفہ قصیرہ	چھوٹا ٹھہراؤ: پڑھنے میں بے سانس لئے ذرا سا رکاؤ۔	،	کاما	,
۵	واوین	مُمیّزہ، اقتباسیہ، ناقلہ	دو واو: اقتباس یا نقل کی شناخت کرانے والے۔	" "	ان ورٹڈ کاماز (کوٹیشن)	" "
۶	استفہامیہ	استفساریہ، سوالیہ	پوچھ گچھ: اقرار، انکار، استخبار کی حالتوں کو ظاہر کرنے والی	؟	کوئری (نوٹ آف انٹراگیشن)	?
۷	خط (خطِ فاصل)	فارقہ	فاصل: اصلی اور معترضہ جملوں کا	ـــــ	ڈیش	ـــــ

لہ اس فہرست میں وہی مترادف نام پیش کئے گئے ہیں جو ترجمہ کے اعتبار سے کسی قدر معنوی قربت رکھتے ہیں۔

نمبر	اردو نام رواج دینے کے قابل	اردو کے مترادف نام ترک کرنے کے قابل	مختصر اصطلاحی معنی	[illegible]	انگریزی نام اور انکے مترادفات	[illegible]
			فرق بتانے والا			
۸	ندائیہ	انجذابیہ، جذبیہ	منشار: جذبہ و جوش کو ظاہر کرنے والی	!	انٹروجکشن (ایکسکلیمیشن)	!
۹	رابطہ	زنجیرہ	ملائی: مرکب الفاظ کے اجزاء کو ملانے والی۔	۷	ہائی فن	-
۱۰	مساویہ (خطوط متشابہ)	متوازیہ، تطبیقیہ	تساوی: مترادف الفاظ کے درمیان تطابق پیدا کرنے والے خطوط۔	=	ایکویشن (ایکویل ٹو)	=
۱۱	قوسین (کمانہ)	تفریقیہ، معترضہ	کمانین: بیانیہ یا معترضہ جملوں یا لفظی توضیحات کا فرق بتانے والیں	( ) یا [ ]	بریکٹ، پارنتھسس	( ) یا [ ]
۱۲	تقدیریہ (نقاط تقدیریہ)	نقاط انصرافیہ	نقطے: محذوفات یا مقدرات کو ظاہر کرنیوالے	......	ڈاٹس آف امیشن	......

تأثرات لطیف

(از جناب جوش حیدرآبادی)

وصل میں وہ تلطفات خاص — خاص لہجہ میں تذکرات خاص
آرزوئے حصول یکجائی — اشتیاق، تقربات خاص
عرق آلود، شرم سے وہ جبیں — وہ ادائے تحیرات خاص
عاشقانہ مباحثات لطیف — مخلصانہ تنازعات خاص
کردیا میری پختہ مغزی نے — انکو محو تخیلات خاص
عام لوگوں میں ایک ہیں نکلے!! — مورد لطف و التفات خاص
ہم بھی نادر ہیں عشق بازوں میں — خاص ہیں اپنے کیفیات خاص
خاص دن، خاص وقت، خاص گھڑی — خاص موقع مشاہدات خاص
دھودیا دل شراب الفت نے — ہو رہے ہیں مکاشفات خاص
نام پڑھتا ہوں انکی دھن کا — پھر فتح مقدمات خاص
رازداران عشق کی باتیں، — ہیں بہر کیف کیفیات خاص

دلربایانہ جلوہ فرمائی — خاص اوقات میں نمرات خاص
بے حجابانہ گفتگو میں بھی، — گاہے گاہے تکلفات خاص
ازبرائے ثبوت صدق و وفا — خاص دیتے ہیں مطالبات خاص
یاد ہے ہجر کی پریشانی، — خاص کر وہ تفکرات خاص
یاد ہے انتہائے مستی میں — وہ حصول تلذذات خاص
قرب کامل کا انتہائی ذوق — لذت افزا تعلقات خاص
اف اوہ بے باک حملۂ جذبات — وہ کسی کے، مدافعات خاص
زور قدرت نے ان حسینوں کو — کردیا مظہر صفات خاص
اب کہاں زور جذبۂ الفت — اب کہاں وہ تصرفات خاص
عام لوگوں میں جوش ٹھیک نہیں
خاص وقتوں کے واقعات خاص

کفارہ

از

فطرت نگار منشی پریم چند۔ بی۔ اے

مترجمہ جناب غلام رسول صاحب (سٹی کالج)

(۱)

دفتر میں ذرا دیر سے آنا افسری کی شان ہے۔ جتنا ہی بڑا حاکم ہوتا ہے اتنی ہی دیر میں آتا ہے۔ اور اتنی ہی جلدی جاتا ہے۔ چپراسی کی حاضری چوبیسوں گھنٹے کی۔ وہ چھٹی پر بھی نہیں جا سکتا۔ اپنا عوض دینا پڑتا ہے۔ خیر جب بریلی ضلع بورڈ کے ہیڈ کلرک بابو مداری لال گیارہ بجے دفتر آئے تب سمجھو دفتر نیند سے جاگ اٹھا۔ چپراسی نے دوڑ کر سیکل لی۔ اردلی نے دوڑ کر کمرے کی چک اٹھا دی اور جمعدار نے ڈاک کی کشتی میز پر لا کر رکھ دی۔ مداری لال نے پہلا ہی سرکاری لفافہ کھولا تھا کہ اُن کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ کئی منٹ تک سکتہ کی حالت میں کھڑے رہے۔ گویا حواس باختہ ہیں۔ وہ بڑے بڑے صدمے اٹھا چکے تھے۔ پر اتنے بد حواس وہ کبھی نہ ہوئے تھے۔ بات یہ تھی کہ بورڈ کے سکریٹری کی جو جگہ ایک مہینے سے خالی تھی سرکار نے سُبدہ چندر کو یہ جگہ دی تھی اور سبدھ چندر وہ شخص تھا جس کے نام ہی سے مداری لال کو چڑ تھی۔ وہ سبدھ چندر جو اُن کا ہم سبق تھا۔ جسے زک دینے کو انہوں نے کتنی ہی دفعہ جدوجہد کی اور کبھی کامیاب نہ ہوئے تھے۔ وہی سبدھ آج اُن کا افسر ہو کر آرہا تھا۔ سبدھ کی اِدھر کئی سالوں سے کوئی خبر نہ تھی۔ اتنا معلوم تھا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ مداری لال نے سمجھا تھا وہیں مر گیا ہوگا۔ پر آج وہ سچ مچ جی اٹھا اور سکریٹری ہو کر آرہا تھا۔ مداری لال کو اس کی ماتحتی میں کام کرنا پڑے گا۔ اس بے عزتی سے تو مر جانا کہیں اچھا تھا۔ سُبدھ کو اسکول اور کالج کی ساری باتیں یقیناً ہی یاد ہوں گی۔ مداری لال نے اُسے کالج سے نکلوا دینے کے لئے کئی بار منتر چلائے جھوٹی چالیں چلیں، بدنام کیا۔ کیا سبدھ سب کچھ بھول گیا ہوگا۔ نہیں کبھی نہیں۔ وہ آتے ہی آتے پرانی کسر نکالے گا اور مداری بابو کو اپنے تحفظ جان کی کوئی تدبیر نہ سوجھی تھی۔

مداری اور سُبدھ کے ستاروں ہی میں جھگڑا تھا۔ دونوں ایک ہی دن، ایک ہی مدرسے میں داخل ہوئے اور پہلے ہی دن سے دل میں بغض و عناد کی وہ چنگاری پڑ گئی جو آج بیس برس گزرنے پر بھی نہ بجھی تھی۔ سبدھ کا قصور یہی تھا کہ وہ مداری لال سے ایک بات میں بڑھا ہوا تھا۔ ڈیل ڈول، رنگ روپ، طور و طریق، علم و دانش یہ سارے میدان اُس کے ہاتھ تھے۔ مداری لال نے اس کا یہ قصور کبھی معاف نہیں کیا۔ سبدھ بیس برس تک لگاتار اُس کے دل کا کانٹا بنا رہا۔ جب سُبدھ ڈگری لے کر اپنے گھر چلا گیا اور مداری فیل ہو کر اس دفتر

میں نوکر ہو گیا۔ تب اس کا دل ٹھنڈا پڑا۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ سُبدھ بصرہ جا رہا ہے، تب تو مداری لال کا چہرہ کھل اٹھا۔ اُن کے دل سے وہ پرانی پھانس نکل گئی۔ پر ہائے حرماں نصیب! آج وہ پرانا ناسور ٹیس اور سوزش کے ساتھ کھل گیا۔ آج اُن کی قسمت سُبدھ کے ہاتھ میں تھی۔ خدا اتنا جبار ہے! حکم اتنا سخت!

جب ذرا دل ٹھنڈا پڑا، تب مداری نے دفتر کے اہلکاروں کو سرکاری حکم سناتے ہوئے کہا۔ اب آپ لوگ ذرا ہاتھ پاؤں سنبھال کر رہیئے گا۔ سُبدھ چندر وہ آدمی نہیں ہیں جو غلطیوں کو معاف کر دیں، ایک اہلکار نے پوچھا۔ کیا بہت سخت ہیں؟

مداری لال نے مسکرا کر کہا۔ وہ تو آپ لوگوں کو دو چار دن ہی میں معلوم ہو جائے گا میں اپنے منہ سے کسی کی کیوں شکایت کروں بس تنبیہ کر دیا کہ ذرا ہاتھ پاؤں سنبھال کر رہیئے گا۔ آدمی قابل ہے پر بڑا ہی غصیلا۔ بُرا فرہی مغصد تو اس کی ناک پر رہتا ہے۔ خود ہزاروں ہضم کر جائے اور ڈکار تک نہ لے پر کیا مجال کہ کوئی ماتحت ایک کوڑی بھی ہضم کرنے پائے۔ ایسے آدمی سے ایشور ہی بچائے۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ چھٹی لے کر گھر چلا جاؤں۔ دونوں وقت گھر پر حاضری بجانی ہو گی۔ آپ لوگ آج سے سرکار کے نوکر نہیں سکریٹری صاحب کے نوکر ہیں۔ کوئی اُن کے لڑکے کو پڑھائے گا۔ کوئی بازار سے سودا سلف لائے گا۔ اور کوئی انہیں اخبار سنائے گا۔ اور چپراسیوں کے تو شاید دفتر میں درشن ہی نہ ہوں۔ اس طرح سارے دفتر کو سُبدھ چندر کی طرف سے بھڑکا کر مداری لال نے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔

(۲)

اس کے ایک ہفتہ بعد سُبدھ چندر گاڑی سے اترے تب اسٹیشن پر دفتر کے سب کارکنوں کو حاضر پایا۔ سب اِن کا خیر مقدم کرنے آئے تھے مداری لال کو دیکھتے ہی سُبدھ لپک کر اُن کے گلے سے لپٹ گئے اور بولے۔ تم خوب ملے بھائی! یہاں کیسے آئے؟ اوہ! آج ایک زمانے کے بعد ملاقات ہوئی۔

مداری لال۔ یہاں ضلع بورڈ کے دفتر میں ہیڈ کلرک ہوں۔ آپ خیریت سے ہیں؟

سُبدھ۔ اجی میری نہ پوچھو۔ بصرہ، فرانس، مصر، اور نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا۔ تم دفتر میں ہو۔ یہ بہت ہی اچھا ہوا۔ میری تو سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ کیسے کام چلے گا۔ میں تو بالکل کورا ہوں۔ مگر جہاں جاتا ہوں میرا خوش نصیبا بھی میرے ساتھ جاتا ہے۔

بصرہ میں سبھی افسر خوش تھے۔ فرانس میں بھی خوب چین کئے۔ دو سال میں کوئی پچیس ہزار روپیے بنا لایا اور سب اُڑا دیا۔ وہاں سے آکر کچھ دنوں کو آپریشن کے دفتر میں سٹر گشت کرتا رہا۔ یہاں آیا تب تم مل گئے (کلرکوں کو دیکھ کر) یہ لوگ کون ہیں؟

مداری کے دل پر برچھیاں سی چل رہی تھیں۔ مردود پچیس ہزار روپئے بصرہ سے کما لایا۔ یہاں قلم گھستے

گھستے مرگئے اور پانچ سو بھی جمع نہ کرسکے۔ بولے۔ "یہ لوگ بورڈ کے اہل کار ہیں۔ سلام کرنے آئے ہیں"

سُبدھ نے اُن سب لوگوں سے باری باری سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ آپ لوگوں نے فضول یہ تکلیف کی بہت ممنون ہوں مجھے امید ہے کہ آپ اصحاب کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ مجھے اپنا افسر نہیں اپنا بھائی سمجھئے۔ آپ سب لوگ مل کر اس طرح کام کیجئے کہ بورڈ کی نیک نامی ہو اور میں بھی سرخرو رہوں۔ آپ کے ہیڈ کلرک صاحب تو میرے پرانے دوست اور لنگوٹیا یار ہیں"

ایک من چلے کلرک نے کہا۔ "ہم سب حضور کے تابعدار ہیں۔ حتی المقدور آپ کو ناخوش نہ کریں گے۔ لیکن آدمی ہی ہیں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو حضور اُسے معاف کریں گے۔

سُبدھ نے نرمی سے کہا "یہی میرا عمل ہے ہمیشہ یہی عمل رہا۔ جہاں رہا ماتحتوں سے دوستوں کا سا برتاؤ رہا۔ ہم اور آپ دونوں ہی کسی تیسرے کے غلام ہیں۔ پھر غصہ کیسا اور افسری کیسی۔ ہاں ہمیں نیک نیتی کے ساتھ اپنا فرض ادا کرنا چاہئے۔

جب سُبدھ سے رخصت ہو کر اہلکار لوگ چلے تب آپس میں باتیں ہونے لگیں "آدمی تو اچھا معلوم ہوتا ہے"

"ہیڈ کلرک کے کہنے سے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کو کچا ہی کھا جائے گا"

"پہلے سبھی ایسی ہی باتیں کرتے ہیں"

"یہ دکھانے کے دانت ہیں"

(۳)

سُبدھ کو آئے ایک مہینہ گزر گیا۔ بورڈ کے کلرک، اردلی، چپراسی سبھی اس کے برتاؤ سے خوش ہیں۔ وہ اتنا خوش مزاج ہے۔ اتنا خلیق ہے کہ جو اُس سے ایک بار ملتا ہے ہمیشہ کے لئے اُس کا دوست بن جاتا ہے۔ سخت لفظ تو اس کی زبان پر آتا ہی نہیں۔ انکار کو بھی وہ گوارا نہیں کرتا۔ لیکن دشمن کی نظر میں خوبیاں اور بھی غضبناک ہو جاتی ہیں۔ سُبدھ کے یہ سارے اوصاف حمیدہ مداری لال کی آنکھوں میں کھٹکتے رہتے ہیں۔ پہلے اہل کاروں کو بھڑکانا چاہا کامیاب نہیں ہوئے۔ بورڈ کے ممبروں کو بھڑکانا چاہا منہ کی کھائی۔ ٹھیکہ داروں کو ابھارنے کا بیڑا اٹھایا بے عزت ہونا پڑا۔ وہ چاہتے تھے کہ بھس میں آگ لگا کر آپ دور سے تماشہ دیکھیں۔ سُبدھ سے یوں ہنس کر ملتے، یوں چکنی چپڑی باتیں کرتے، گویا اس کے سچے دوست ہیں پر گھات میں لگے رہتے۔ سُبدھ میں اور سب گن تھے مردم شناسی نہ تھی۔ وہ مداری لال کو اب بھی اپنا دوست ہی سمجھتے ہیں۔

ایک دن مداری لال سکریٹری کے کمرے میں گئے، تب کرسی خالی دیکھی۔ وہ کسی کام سے باہر چلے

گئے تھے۔ ان کی میز پر پانچ ہزار کے نوٹ پلندوں میں بندھے ہوئے رکھے تھے۔ بورڈ کے مدارس کے لئے کچھ لکڑی کے سامان بنائے گئے تھے۔ اسی کے دام تھے۔ ٹھیکہ دار وصولی کے لئے بلایا گیا تھا آج ہی سکریٹری صاحب نے چیک بھیج کر خزانے سے روپے منگوائے تھے۔ مداری لال نے برآمدے میں جھانک کر دیکھا، شبدھ کا کہیں پتہ نہیں۔ اُن کی نیت بدل گئی۔ حسد میں لالچ شامل ہو گیا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پلندے اٹھائے۔ پتلون کی دونوں جیبوں میں بھر کر فوراً کمرے سے نکلے اور چپراسی کو پکار کر بولے۔ بابو جی اندر ہیں؟ چپراسی آج ٹھیکہ دار سے کچھ وصول کرنے کی خوشی میں پھولا ہوا تھا۔ سامنے والے تنبولی کی دوکان سے آکر بولا۔ "جی نہیں۔ کچہری میں کسی سے باتیں کر رہے ہیں۔ ابھی ابھی تو گئے ہیں"

مداری لال نے دفتر میں آکر ایک کلرک سے کہا۔ یہ مسل لے جاکر سکریٹری صاحب کو دکھاؤ۔ کلرک مسل لے کر چلا گیا اور ذرا دیر میں لوٹ کر بولا۔ سکریٹری صاحب کمرے میں نہ تھے مسل میز پر رکھ آیا ہوں۔

مداری لال نے منہ سکوڑ کر کہا۔ "کمرہ چھوڑ کر کہاں چلے جایا کرتے ہیں۔ کسی دن دھوکا اٹھائیں گے۔"

کلرک نے کہا۔ "ان کے کمرے میں دفتر والوں کے سوا اور جاتا ہی کون ہے۔"

مداری لال نے گرج دار آواز میں کہا۔ "تو کیا دفتر والے سب کے سب دیوتا ہیں۔ کب کس کی نیت بدل جائے کوئی نہیں کہہ سکتا۔ میں نے چھوٹی چھوٹی رقموں پر اچھوں اچھوں کی نیتیں بدلتی دیکھی ہیں۔ اس وقت ہم سبھی ایماندار ہیں لیکن موقع پر شاید ہی کوئی چوکے آدمی کی یہی فطرت ہے۔ آپ جاکر اُن کے کمرے کے دونوں دروازے بند کر دیجیے۔"

کلرک نے ٹال کر کہا۔ "چپراسی تو دروازے پر بیٹھا ہوا ہے"

مداری لال نے جھنجھلا کر کہا۔ "آپ سے میں جو کہتا ہوں وہ کیجیے۔ کہنے لگے چپراسی بیٹھا ہوا ہے۔ چپراسی کوئی رشی ہے۔ منی ہے۔ چپراسی ہی کچھ اڑا دے تو آپ اس کا کیا کر لیں گے۔ ضمانت بھی ہے تو تین سو کی۔ یہاں ایک ایک کاغذ لاکھوں کا ہے۔" یہ کہکر مداری لال خود اٹھے اور دفتر کے دروازے دونوں طرف سے بند کر دیئے۔ جب ذرا دل ٹھکانے ہوا تب نوٹوں کے پلندے جیب سے نکال کر ایک الماری میں کاغذوں کے نیچے چھپا کر رکھ دیئے پھر آکر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

شبدھ چندر کوئی گھنٹہ بھر میں لوٹے۔ تب اُن کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ دفتر میں آکر مسکراتے ہوئے بولے۔ "میرا کمرہ کس نے بند کر دیا ہے بھائی؟ کیا میری بے دخلی ہو گئی؟"

مداری لال نے نرمی سے کہا۔ "صاحب گستاخی معاف ہو۔ آپ جب کبھی باہر جائیں۔ چاہے ایک ہی منٹ کے لئے کیوں نہ ہو۔ تب دروازہ ضرور بند کر لیا کریں۔ آپ کی میز پر روپے پیسے اور سرکاری

کاغذ پتر بکھرے پڑے رہتے ہیں۔ نہ جانے کس وقت کس کی نیت بدل جائے۔ میں نے ابھی سنا کہ آپ کہیں باہر گئے ہیں تو دروازے بند کرا دئے۔

سُبدھ چندر دروازہ کھول کر کمرے میں گئے اور ایک سگار پینے لگے۔ میز پر نوٹ رکھے ہوئے ہیں اس کی خبر ہی نہ تھی یکایک ٹھیکہ دار نے آکر سلام کیا۔ سُبدھ کرسی سے اٹھ بیٹھے اور بولے۔ "تم نے بہت دیر کر دی، تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ دس ہی بجے روپے منگوا لئے تھے۔ رسیدی ٹکٹ لائے ہو نا؟

ٹھیکہ دار: "حضور۔ رسید لکھی لایا ہوں"

سُبدھ: "تو اپنے روپے لے جاؤ تمہارے کام سے میں بہت خوش نہیں ہوں۔ لکڑی تم نے اچھی نہیں لگائی اور کام میں صفائی بھی نہیں ہے اگر ایسا کام کیا کرو گے تو ٹھیکہ داروں کے رجسٹر سے تمہارا نام نکال دیا جائے گا۔

یہ کہہ کر سُبدھ نے میز پر نگاہ ڈالی تب نوٹوں کے پلندے نہ تھے۔ سوچا شائد کسی فائل کے نیچے دب گئے ہوں۔ کرسی کے پاس کے سب کاغذ الٹ پلٹ کر ڈالے۔ مگر نوٹوں کا کہیں پتہ نہیں۔

ایں! نوٹ کہاں گئے ابھی یہیں تو میں نے رکھ دئے تھے۔ جا کہاں سکتے ہیں۔ پھر فائلوں کو الٹنے پلٹنے لگے۔ دل میں ذرا ذرا دھڑکن اٹھنے لگی۔ ساری میز کے کاغذ چھان ڈالے۔ پلندوں کا پتہ نہیں۔ تب یہ کرسی پر بیٹھ کر آدھ گھنٹہ میں ہونے والے واقعات پر دل میں تنقید کرنے لگے۔ چپراسی نے نوٹوں کے پلندے لا کر مجھے دئے خوب یاد ہے۔ بھلا یہ بھی بھولنے کی بات ہے اور اتنی جلد! میں نے نوٹوں کو لے کر یہیں میز پر رکھ دیا۔ گنا تک نہیں۔ پھر وکیل صاحب آ گئے پرانے ملاقاتی ہیں ان سے باتیں کرتا ہوا ذرا اس درخت تک چلا گیا۔ انہوں نے پان منگوائے بس اتنی ہی دیر ہوئی۔ جب گیا ہوں تب پلندے رکھے ہوئے تھے۔ خوب اچھی طرح یاد ہے۔ تب یہ نوٹ کہاں غائب ہو گئے۔ میں نے کسی صندوق، دراز یا الماری میں نہیں رکھے۔ پھر گئے تو کہاں! شاید دفتر میں کسی نے حفاظت کے لئے اٹھا کر رکھ دئے ہوں۔ یہی بات ہے میں فضول ہی اتنا گھبرا گیا۔ چھی!

فوراً دفتر میں آکر مداری لال سے بولے۔ "آپ نے میری میز پر سے نوٹ تو اٹھا کر نہیں رکھ دئے؟"

مداری لال نے فوراً بھولے ہو کر کہا۔ "کیا آپ کی میز پر نوٹ رکھے ہوئے تھے؟ مجھے تو خبر نہیں۔ ابھی پنڈت سوہن لال ایک فائل لے کر گئے تھے۔ تب آپ کو کمرے میں نہ دیکھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کسی سے باتیں کرنے چلے گئے ہیں تب دروازے بند کرا دئے۔ کیا کچھ نوٹ نہیں مل رہے ہیں؟"

سُبدھ آنکھیں پھیلا کر بولے۔ "ارے صاحب پورے پانچ ہزار کے ہیں ابھی ابھی چیک بھنایا ہے۔

مداری لال نے سر پیٹ کر کہا۔ "پورے پانچ ہزار! یا بھگوان! آپ نے میز پر خوب دیکھ لیا؟

"ابھی پندرہ منٹ سے تلاش کر رہا ہوں۔"

"چپراسی سے پوچھ لیا کہ کون آیا تھا؟"

"آئیے ذرا آپ لوگ بھی تلاش کیجئے میرے تو ہوش اُڑے ہوئے ہیں"

سارا دفتر سکریٹری صاحب کے کمرے کی تلاشی لینے لگا۔ میز، الماریاں، صندوق سب دیکھے گئے، رجسٹروں کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھے گئے۔ مگر نوٹوں کا کہیں پتہ نہیں۔ کوئی اُڑا لے گیا اب اس میں کوئی شبہ نہ تھا۔ سُدھ نے ایک لمبی سانس لی اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ ذرا سا منہ نکل آیا۔ اس وقت کوئی انہیں دیکھتا تو سمجھتا مہینوں سے بیمار ہیں۔

مداری لال نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "غضب ہو گیا اور کیا آج تک کبھی ایسا اندھیر نہ ہوا تھا۔ مجھے یہاں کام کرتے دس سال ہو گئے کبھی دھیلے کی چیز بھی غائب نہ ہوئی میں نے آپ کو پہلے ہی دن خبردار کر دیا تھا کہ روپے پیسے کے بارے میں ہمیشہ ہوشیار رہئے گا۔ مگر شدنی تھی خیال نہ رہا۔ ضرور باہر سے کوئی آدمی آیا اور نوٹ اُٹھا کر غائب ہو گیا چپراسی کا بھی قصور ہے کہ اس نے کسی کو کمرے میں جانے ہی کیوں دیا۔ وہ لاکھ قسمیں کھائے کہ باہر سے کوئی نہیں آیا لیکن میں اسے مان نہیں سکتا یہیں سے تو صرف پنڈت سوہن لال ایک فائل لے کر گئے تھے۔ مگر ... ادھر ہی سے جھانک کر چلے آئے۔ سوہن لال نے صفائی دی۔ "میں نے تو اندر قدم ہی نہیں رکھا صاحب۔ اپنے جوان بیٹے کی قسم کھاتا ہوں جو اندر قدم بھی رکھا ہو۔"

مداری لال نے پیشانی سکوڑ کر کہا "آپ فضول قسمیں کیوں کھاتے ہیں۔ کوئی آپ سے کچھ کہتا ہے (سُدھ کے کان میں) بنک میں کچھ روپے ہوں تو نکال کر ٹھیکہ دار کو دے دیجئے ورنہ بڑی بدنامی ہو گی۔ نقصان تو ہو ہی گیا اب اس کے ساتھ بے عزتی کیوں ہو۔"

سُدھ نے دردناک آواز میں کہا بنک میں مشکل سے دو چار سو روپے ہوں گے۔ بھائی جان! روپے ہوتے تو کیا فکر تھی۔ سمجھ لیتا جیسے پچیس ہزار اُڑ گئے ویسے تیس ہزار اُڑ گئے یہاں تو کفن کو بھی کوڑی نہیں۔

اسی رات کو سُدھ چندر نے خودکشی کر لی اتنے روپیوں کا انتظام کرنا اُن کے لئے کٹھن تھا۔ موت کے پردے کے سوا انہیں اپنے رنج، اپنے وقار کو چھپانے کی کوئی آڑ نہ تھی۔

(۴)

دوسرے دن صبح سویرے چپراسی نے مداری لال کے گھر پہنچ کر آواز دی۔ مداری لال کو رات بھر نیند نہ آئی تھی۔ گھبرا کر باہر آئے۔ چپراسی انہیں دیکھتے ہی بولا۔ حضور! بڑا غضب ہو گیا۔ سکریٹری صاحب نے رات کو اپنی گردن پر چھری پھیر لی۔

مداری لال کی آنکھیں اوپر چڑھ گئیں، منہ پھیل گیا اور سارا بدن شل ہو گیا۔ گویا ان کا ہاتھ بجلی کے تار پر پڑ گیا

"چھری پھیر لی؟"

"جی ہاں، آج سویرے معلوم ہوا۔ پولیس والے جمع ہیں آپ کو بلایا ہے"

"لاش ابھی پڑی ہوئی ہے؟"

"جی ہاں، ابھی پوسٹ مارٹم ہونے والا ہے"

"بہت سے لوگ جمع ہیں؟"

"سب بڑے بڑے افسر جمع ہیں۔ حضور لاش کی طرف تاکتے نہیں بنتا۔ کیسا بھلا مانس ہیرا آدمی تھا سب لوگ رو رہے ہیں چھوٹے چھوٹے دو بچے ہیں، ایک سیانی لڑکی ہے بیاہنے لایک۔ بھوجی کو لوگ کتنا روک رہے ہیں پر بار بار دوڑ کر لاش کے پاس آجاتی ہیں۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو رومال سے آنکھیں نہ پونچھ رہا ہو۔ ابھی اتنے ہی دن آئے ہوئے، پر سب سے کتنا میل جول ہو گیا تھا۔ روپے کی تو کبھی پرواہ ہی نہیں تھی۔ دل دریا تھا"

مداری لال کے سر میں چکر آنے لگا۔ دروازے کی چوکھٹ پکڑ اپنے کو سنبھال نہ لیتے تو شاید گر پڑتے۔ پوچھا۔ "بھوجی بہت رو رہی تھیں؟"

"کچھ نہ پوچھئے حضور۔ پڑکی پتیاں جھڑی جاتی ہیں آنکھیں پھول کر گولر ہو گئی ہیں"

"کتنے لڑکے بتلائے تم نے؟"

"حضور دو لڑکے ہیں اور ایک لڑکی"

"ہاں ہاں لڑکوں کو تو دیکھ چکا ہوں، لڑکی سیانی ہو گی؟"

"جی ہاں بیاہنے لایک ہے۔ روتے روتے بچاری کی آنکھیں سوج آئی ہیں"

"نوٹوں کے بارے میں بھی بات چیت ہو رہی ہو گی؟"

"جی ہاں سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ دفتر کے کسی آدمی کا کام ہے۔ داروغہ جی تو سوہن لال کو گرفتار کرنا چاہتے تھے پر آپ سے صلاح لیکر کریں گے۔ سکریٹری صاحب تو لکھ گئے ہیں کہ میرا کسی پر شک نہیں ہے۔ نہیں تو اب تک تہلکہ مچ جاتا۔ سارا دفتر پھنس جاتا"

"کیا سکریٹری صاحب کوئی خط لکھ کر چھوڑ گئے ہیں؟"

"ہاں معلوم ہوتا ہے، چھری چلاتے وقت یاد آیا کہ صبح دفتر کے سب لوگ پکڑے جائیں گے بس کلکٹر صاحب کے نام چھٹی لکھ دی"

"چھٹی میں میرے بارے میں بھی کچھ لکھا ہے؟ تمہیں یہ کیا معلوم ہو گا؟"

"حضور اب میں کیا جانوں، مگر ا تناب لوگ کہتے تھے کہ آپ کی بڑی تعریف لکھی ہے"
مداری لال کی سانس اور تیز ہو گئی، آنکھوں سے آنسوؤں کی دو بڑی بڑی بوندیں گر پڑیں۔ آنکھیں پونچھتے ہوئے بولے۔ وہ اور میں ایک ساتھ کے پڑھے تھے نندو۔ آٹھ دس سال ساتھ رہا۔ ساتھ اٹھتے بیٹھتے، ساتھ کھاتے، ساتھ کھیلتے، بس اسی طرح رہتے تھے جیسے دو سگے بھائی رہتے ہوں۔ خط میں میری کیا تعریف لکھی ہے؟ مگر تمہیں یہ کیا معلوم ہوگا"

"آپ تو چل ہی رہے ہیں دیکھ لیجئے گا"

"کفن کا انتظام ہو گیا ہے؟"

"نہیں حضور۔ کہا نہ کہ ابھی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔ مگر اب جلدی چلئے۔ ایسا نہ ہو کوئی دوسرا آدمی بلانے آتا ہو"

"ہمارے دفتر کے سب لوگ آ گئے ہوں گے؟"

"جی ہاں اس محلے والے تو سبھی تھے"

"پولیس نے میرے بارے میں تو ان سے پوچھ پانچھ نہیں کی؟"

"جی نہیں کسی سے بھی نہیں"

مداری لال جب سُبدھ چندر کے گھر پہنچے۔ تب انہیں ایسا معلوم ہوا کہ سب لوگ اُن کی طرف شبہ کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ پولیس انسپکٹر نے فوراً انہیں بلا کر کہا۔ آپ بھی اپنا بیان لکھا دیں۔ اور سب کے بیان تو لکھ چکا ہوں۔ مداری لال نے ایسی ہوشیاری سے اپنا بیان لکھایا کہ پولیس کے افسر بھی دنگ رہ گئے۔ انہیں مداری لال پر کچھ شبہ ہوتا تھا۔ پر اس بیان نے اس کا شبہ بھی نکال ڈالا۔ اس وقت سُبدھ کے دو لڑکے روتے ہوئے مداری لال کے پاس آئے اور کہا چلئے آپ کو اماں بلاتی ہیں دونوں مداری لال سے آشنا تھے۔ مداری لال یہاں تو روز ہی آتے تھے۔ پر گھر میں کبھی نہ گئے تھے سُبدھ کی بیوی اُن سے پردہ کرتی تھی۔ یہ بلاوا سُن کر اُن کا دل دھڑک اُٹھا۔ کہیں اس کا مجھ پر شبہ نہ ہو۔ کہیں سبدھ نے میرے بارے میں کوئی شک ظاہر نہ کیا ہو۔ کچھ جھجکتے، کچھ ڈرتے، اندر گئے تب بیوہ کی دردانگیز آہ و بکا سُن کر کلیجہ کانپ اوٹھا۔ انہیں دیکھتے ہی اس عورت کے آنسوؤں کا کوئی دوسرا سوت کھل گیا۔ اور لڑکی تو دوڑ کر اُن کے پیروں سے لپٹ گئی۔ دونوں لڑکوں نے بھی گھیر لیا۔ مداری لال اُن تینوں کی آنکھوں میں اس درجے رنج و غم بھرا ہوا معلوم ہوا کہ وہ اُن کی طرف دیکھ نہ سکے۔ ان کی آتما انہیں لعنت ملامت کرنے لگی۔ جن بچاروں کو ان پر اتنا تشفی، اتنا اعتماد، اتنا اخلاص، اتنی محبت تھی۔ انہیں کی گردن پر انہوں نے چھری پھیری۔ انہیں کے ہاتھوں بھرا پُرا خاندان خاک میں مل گیا! ان یتیموں کا اب کیا حال ہوگا! لڑکی کا بیاہ کرنا ہے۔ کون کرے گا۔ بچوں کے ناز و پرداخت کا بار کون اٹھائے گا! مداری لال کو اس قدر جانکاہ گزرا کہ اُن کے منہ سے تسلی کا ایک لفظ بھی نہ نکلا

انہیں ایسا جان پڑا کہ میرے منہ میں کالک پتی ہوئی ہے۔ میرا قدم کچھ چھوٹا ہو گیا ہے۔ انہوں نے جس وقت نوٹ اڑائے تھے، انہیں گمان بھی نہ تھا کہ اس کا یہ نتیجہ ہوگا۔ وہ صرف بدھو کو زچ کرنا چاہتے تھے۔ ان کا منشا بالکلیہ تباہی نہ تھا۔

دکھیا بیوہ نے سسکتے ہوئے کہا۔ بھیا جی ہم لوگوں کو وہ منجھ دھار میں چھوڑ گئے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ دل میں یہ بات ٹھان چکے ہیں تو اپنے پاس جو کچھ تھا وہ سب اُن کے چرنوں پر رکھ دیتی۔ مجھ سے تو وہ یہی کہتے رہے کہ کوئی نہ کوئی تدبیر ہو جائے گی۔ آپ ہی کی معرفت وہ کوئی مہاجن ٹھیک کرنا چاہتے تھے۔ آپ کے اوپر انہیں اتنا بھروسہ تھا کہ کہہ نہیں سکتی۔

مداری لال کو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اُن کے دل پر نشتر چلا رہا ہے۔ انہیں اپنے حلق میں کوئی چیز پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

رامیشوری نے پھر کہا۔ رات ہوئے تب خوب ہنس رہے تھے۔ روز کی طرح دودھ پیا، بچوں کو پیار کیا۔ تھوڑی دیر ہارمونیم بجایا اور تب کلی کر کے لیٹے۔ کوئی ایسی صورت نہ تھی جس سے تھوڑا سا بھی شبہ ہوتا۔ مجھے متفکر دیکھ کر بولے تم فضول گھبراتی ہو۔ بابو مداری لال سے میری پرانی دوستی ہے۔ آخر وہ کس دن کام آئے گی۔ میرے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں۔ اس شہر میں اُن کی سب جان پہچان ہے۔ روپیوں کا انتظام آسانی سے ہو جائے گا۔ پھر نہ جانے کب دل میں یہ بات سمائی۔ میں نصیبوں جلی ایسی سوئی کہ رات میں کسی تک نہیں۔ کیا جانوں کہ وہ اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔

مداری لال کو ساری دنیا آنکھوں میں پھرتی ہوئی معلوم ہوئی۔ انہوں نے بہت ضبط کیا مگر آنسوؤں کے بہاؤ کو نہ روک سکے۔

رامیشوری نے آنکھیں پونچھ کر پھر کہا۔ بھیا جی جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا لیکن آپ اس مردود کا پتہ ضرور لگائیے جس نے ہماری ساری تباہی کر دی ہے۔ یہ دفتر ہی کے کسی آدمی کا کام ہے۔ وہ تو دیوتا تھے، مجھ سے یہی کہتے رہے کہ میرا کسی پر گمان نہیں ہے لیکن ہے یہ کسی دفتر والے ہی کا کام۔ آپ سے صرف اتنی التجا کرتی ہوں کہ اس پاپی کو بچ کر نہ جانے دیجئے گا۔ پولیس والے شاید کچھ رشوت لے کر اسے چھوڑ دیں۔ آپ کو دیکھ کر ان کا یہ حوصلہ نہ ہوگا۔ اب ہمارے سر پر آپ کے سوا اور کون ہے۔ کس سے اپنا دکھ کہیں۔ نعش کی یہ درگت ہونی لکھی تھی۔

مداری لال کے دل میں ایک بار ایسا جوش اٹھا کہ سب کچھ بھی کھول دیں۔ صاف کہہ دیں کہ میں ہی وہ مردود وہ کمینہ، وہ سفلہ ہوں۔ بیوہ کے قدموں پر گر پڑیں اور کہیں وہی چھری اس جان لیوا کی گردن پر پھیر دو۔ پر زبان نہ کھلی۔ اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے اُن کے سر میں ایسا چکر آیا کہ وہ زمین پر گر پڑے۔

(۵)

تیسرے پہر لاش کا امتحان ختم ہوا۔ ارتھی تالاب کی طرف چلی سارا دفتر، سارے حکام اور ہزاروں آدمی ساتھ تھے۔ داہ سنسکار (لاش پھونکنا) لڑکوں کو کرنا چاہیئے تھا۔ پر لڑکے نابالغ تھے۔ اس لئے بیوہ چلنے کو تیار ہو رہی تھی کہ مداری لال نے جاکر کہا۔ بھوجی یہ سنسکار مجھے کرنے دو۔ تم کریا پر بیٹھ جاؤگی تو بچوں کو کون سنبھالے گا۔ سبدھ میرے بھائی تھے۔ زندگی میں ان کے ساتھ کچھ سلوک نہ کرسکا اب زندگی کے بعد مجھے دوستی کا کچھ حق ادا کرنے دو۔ آخر میرا بھی تو ان پر کچھ حق تھا۔ رامیشوری نے رو کر کہا۔ آپ کو بھگوان نے بڑا فیاض دل دیا ہے بھیاجی ورنہ مرنے پر کون کس کو پوچھتا ہے۔ دفتر کے اور لوگ جو آدھی آدھی رات تک ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے جھوٹوں بات پوچھنے آئے کہ ذرا تسلی ہوتی۔

مداری لال نے داہ سنسکار کیا۔ تیرہ دن تک کریا پر بیٹھے رہے۔ تیرھویں دن پنڈ دان (دسواں) ہوا۔ برہمنوں نے بھوجن کیا، بھکاریوں کو اناج بانٹا گیا، دوست احباب کی دعوت ہوئی۔ اور یہ سب کچھ مداری لال نے اپنے خرچ سے کیا۔ رامیشوری نے بہت کہا کہ آپ نے جتنا کیا اتنا ہی بہت ہے اب میں آپ کو اور زیر بار کرنا نہیں چاہتی۔ دوستی کا حق اس سے زیادہ اور کوئی کیا ادا کرے گا، مگر مداری لال نے ایک نہ سنی۔ سارے شہر میں ان کے نیک کام کی شہرت ہوگئی۔ دوست ہو تو ایسا ہو، سولھویں دن بیوہ نے مداری لال سے کہا۔ بھیاجی آپ نے ہمارے ساتھ جو بھلائی اور احسان کئے ہیں۔ ان سے ہم مرتے دم عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔ آپ نے ہماری پیٹھ پر ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو نہ جانے ہماری کیا گت ہوتی۔ کہیں روکھی بھی چھاؤں تو نہیں تھی۔ اب ہمیں گھر جانے دیجئے۔ وہاں دیہات میں خرچ بھی کم ہوگا اور کچھ کھیتی باڑی کا سلسلہ بھی کروں گی۔ کسی نہ کسی طرح مصیبت کے دن کٹ ہی جائیں گے۔ اسی طرح ہمارے اوپر مہربانی رکھئے گا۔

مداری لال نے پوچھا۔ گھر پر کتنی جائداد ہے؟

رامیشوری۔ زیادہ کیا ہے ایک کچا مکان ہے اور دس بارہ بیگھے کی کاشتکاری ہے۔ پکا مکان بنوانا شروع کیا تھا مگر روپے پورے نہ پڑے۔ ابھی ادھورا پڑا ہوا ہے۔ دس بارہ ہزار خرچ ہوگئے اور ابھی چھت پڑنے کی نوبت نہیں آئی۔

مداری۔ کچھ روپے بنک میں جمع ہیں یا بس کھیتی ہی کا سہارا ہے؟

بیوہ۔ جمع تو ایک پائی بھی نہیں ہے بھیاجی۔ ان کے ہاتھ میں روپے رہنے ہی نہ پاتے تھے۔ بس وہی کھیتی کا سہارا ہے۔

مداری۔ تو ان کھیتوں میں اتنی پیداوار ہوجائے گی کہ لگان بھی ادا ہو جائے اور تم لوگوں کی گزر بسر بھی ہو۔

رامیشوری۔ اور کر ہی کیا سکتے ہیں بھیاجی۔ کسی نہ کسی طرح زندگی کاٹنا ہی ہے۔ بچے نہ ہوتے تو میں زہر کھا لیتی

مداری۔ اور ابھی بیٹی کا بیاہ بھی کرنا ہے؟

بیوہ۔ اس کے بیاہ کی اب کوئی فکر نہیں۔ کسانوں میں ایسے بہت سے مل جائیں گے جو بغیر کچھ لئے دیئے بیاہ کرلیں

مداری لال نے ایک لمحہ سوچ کر کہا۔ اگر میں کچھ صلاح دوں تو اسے مانیں گی آپ؟

رامیشوری۔ بھیا جی آپ کی صلاح نہ مانوں گی تو کس کی صلاح مانوں گی اور دوسرا ہے ہی کون؟

مداری۔ تو آپ اپنے گھر جانے کے بدلے میرے گھر چلئے۔ جیسے میرے بال بچے رہیں گے ویسے آپ کے بھی رہیں گے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ایشور نے چاہا تو کنیا کا بیاہ بھی کسی اچھے خاندان میں ہو جائے گا۔

بیوہ کی آنکھیں آب دیدہ ہو گئیں۔ بولی۔ مگر بھیا جی۔ سوچئے..... مداری لال نے بات کاٹ کر کہا میں کچھ نہ سوچوں گا اور نہ کوئی عذر سنوں گا۔ کیا دو بھائیوں کے خاندان ایک ساتھ نہیں رہتے۔ سیدھو کو میں اپنا بھائی سمجھتا تھا اور ہمیشہ سمجھوں گا۔

بیوہ کا کوئی عذر نہ سنا گیا۔ اسی دن مداری لال سب کو اپنے ساتھ لے گئے اور آج دس سال سے اُن کو پرورش کر رہے ہیں۔ دو نو بچے کالج میں پڑھتے ہیں اور کنواری لڑکی کا ایک معزز خاندان میں بیاہ ہو گیا ہے۔ مداری لال اور اُن کی بیوی دل وجان سے رامیشوری کی سیوا کرتے ہیں اور اس کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ مداری لال خدمت سے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔ (سرستی)

غزل

(از مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب عزیز مصنف "الانسان" وغیرہ)

جانِ ما قربانِ بطرزِ آفتِ جانِ شما
شورِ قتل کرد برپا چشمِ فتانِ شما

عاشقاں سوزند از گرمیِ حسنِ دلفریب
شعلہا می خیزد از روی درخشانِ شما

وہ چہ اعجازِ ملاحت بود ایمانِ ترا
زخمِ دل ست تازہ از شورِ نمکدانِ شما

بلبلِ بیدل باہ و نالہ از گرمیِ عشق
شورِ محشر کرد برپا در گلستانِ شما

رشک بر گلگونہ می آید گلِ صد برگ را
خوں نش بخشید چوں روئی درخشانِ شما

جعدِ سنبل میکند حسرت چو بیند کاکلت
کو پریشاں باشد از زلفِ پریشانِ شما

در رہِ وادیِ عشقت رنجہا باید کشید
تا نہد گامے بصد راحت بایوانِ شما

دل نوازی شیوۂ خوبان بود اے جانِ من
زاں سبب باشد عزیز خستہ قربانِ شما

قہرمانیت

(از جناب محمد حمید اللہ صاحب بی۔اے)

تعارف | اگلے صفحات میں رالف والڈو ایمرسن کے مضمون (ON HEROISM) کے ترجمے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایمرسن شہر باسٹن واقع میساچوسٹ (امریکہ) میں ۲۵ ویں مئی ۱۸۰۳ء کو پیدا ہوا۔ وہ ابتداءً موحدین کی جماعت میں شریک ہوا مگر جلد الگ بھی ہوگیا۔ پھر فلسفۂ ماورائیت (TRANSCENDENTALISM) کا جس میں المانی (جرمن) فلسفے اور مشرقی ادبیات سے متاثر تخیل ہوتا ہے، مرجع و مرکز بن گیا۔ اس کے مضامین میں سے جزا، روحانی قوانین، قہرمانیت (جس کا ترجمہ پیش ہے)، خود اعتمادی اور دوستی عام طور پر ادبیات عالیہ میں شریک کئے جاتے ہیں اور انہیں کے بوتے پر اسے ایک معلم سمجھا جاتا ہے۔ میاتھیو آرنلڈ اسے ایسے لوگوں کا "مددگار و معین" سمجھتا ہے جو "روحانیات میں زندگی بسر کرنی چاہتے ہیں"۔ لاول کا خیال ہے کہ "اس نے ہمیں بیدار کیا...... وسیع تر خیالات کے سرچشمے کا پتہ دیا، ہماری ذکاوت کو ایک تیز تر محاورے سے جلا اور صیقل دیا ہمیں ایک آئیڈیل اور سطح کے نظارے دکھائے اور ہماری روح کو برترین اور ابدی جودت سے واقف کیا" اس نے ۲۷ ویں اپریل ۱۸۸۲ء کو (۷۹) سال کی عمر میں وطن کے قریب وفات پائی۔

قدیم انگریزی ڈرامہ نگار خاص کر بومانٹ اور فلیچر ہمیشہ اخلاقِ حسنہ کی اہمیت کا اعتراف کرتے رہے ہیں۔ گویا ان کے زمانے میں شریفانہ برتاؤ کو وہی امتیاز حاصل تھا جو رنگ کو ہماری امریکی آبادی میں۔ جب کوئی راڈریگو، پیڈرو یا والیر یعنی گورے چمڑے کا آدمی داخل ہوتا تو وہ چاہے اجنبی ہی کیوں نہ ہو، ڈیوک یا گورنر بے ساختہ کہہ اٹھتا کہ یہ شریف آدمی ہے ــــ اور اسے لامتناہی عنایتوں سے ممنون کرتا ہے، لیکن باقی سب اس کے نزدیک فضلہ اور کچرا ہیں۔ ان کے ناٹکوں کے کردار اور مکالمے ایک ہیرونی اور قہرمانی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کا باعث ان خصوصی فوائد کی مسرت کی ہم آہنگی ہے جو کسی شخص کو حاصل ہوتے ہیں ــــ جیسے بندقہ، سفوکلیس، دی میاڈ لور، دی ڈبل میاڈیج میں محسوس ہو سکتا ہے۔ ان میں متکلم اتنا پرجوش اور با اخلاق ہو جاتا اور سیرت کی اتنی گہرائی میں پہنچ جاتا ہے کہ اس کا مکالمہ ناٹک کے پلاٹ میں خفیف ترین حادثے اور واقعے کے اضافہ

ہیروئزم کا ترکی مرادف قہرمان اور ہیروئزم کا قہرمانیت ہے ہم نے قہرمانیت پسند کیا ہے۔ بعض لوگ شہامت لیتے ہیں۔

پر خود بخود منظوم و موزون ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل پر غور کرو۔ رومی جرنیل مارشیس نے یونان کا پایۂ تخت ایتھنز فتح کر لیا ہے — سوائے ڈیوک آف ایتھنز، سفوکلیس اور اس کی بیوی ڈورجن کی ناقابلِ تسخیر روحوں کے سب اس کے حلقہ بگوش ہو جاتے ہیں۔ آخر الذکر کا حسن مارشیس کے دل میں محبت کی آگ بھڑکا دیتا ہے اور وہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے شوہر کی جان بچا دے۔ لیکن سفوکلیس اپنی جان کے لئے درخواست اور التجا کرنے آمادہ نہیں ہوتا اگرچہ اسے یقین دلایا گیا تھا کہ اس کا ایک لفظ بھی اس کی جان بچانے کے لئے کافی ہے۔ آخر دونوں کے قتل کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد:-

والے ری یس (جلّاد): اپنی بیوی کو الوداع کہہ لو۔

سفوکلیس : نہیں، میں اس سے رخصت کی اجازت نہیں چاہونگا، میری ڈوری جن!
وہاں اوپر، آسمان کے ستاروں سے،
میری روح تجھ پر منڈلاتی رہے گی۔ برائے خدا جلدی کر۔

ڈوری جن : ٹھہر سفوکلیس، — اس سے میری آنکھیں باندھ۔
دنیا اتنی منقلب نہ ہونی چاہئے،
اور نہ صنفِ لطیف سے مروت اتنی دور ہونی چاہئے
کہ میں اپنے مجازی خدا کا خون بہتے دیکھوں۔ یوں، بس ٹھیک ہے۔
سورج تلے کسی چیز کو بھی
میں اپنے سفوکلیس کے سامنے نہیں دیکھوں گی۔
خدا حافظ، رومیوں کو بتاؤ کہ یوں مرتے ہیں۔

مارشیس : تجھے معلوم ہے کہ مرنا کیسا ہوتا ہے؟

سفوکلیس : یہ تو، تو ہی نہیں جانتا، مارشیس!
جب ہی تو تو یہ نہیں جانتا کہ جینا کیا ہے؟
مرنا زندگی شروع کرنا ہے!
وہ ایک پرانے، خشک اور ناگوار کام کو ختم کرنا
اور ایک جدید تر و بہتر کام کو شروع کرنا ہے۔
وہ دھوکہ باز بد معاشوں کو چھوڑنا
اور دیوتاؤں اور نیکوں کی صحبت میں جانا ہے۔
تجھ کو بھی آخر کار
اپنے تمام محلوں، مسرتوں اور اعزازوں کو خیر باد کہنا۔
اور اپنی ہمت کو آزمانا ہوگا کہ وہ اس وقت کیا کرے گی۔

والے ری یس: مگر کیا اس طرح مرنے پر رنج و تکلیف نہیں؟

سفوکلیس : میں کیوں رنج و افسوس کروں جب مجھے وہیں بھیجا جا رہا ہے

---

۵۱ پھولوں کا ہار۔

جہاں جانے کا میں ہمیشہ سے مشتاق رہا ہوں ؟ میں اب گھٹنے جھکاتا ہوں
مگر پشت تیری طرف کر کے ، یہ وہ آخری عبادت ہے
جو یہ قالب دیوتاؤں کے لئے کر رہا ہے۔

مارشیس : (اے جلاد مجھے) مار مار، والے ری ایس۔
ورنہ مارشیس کا دل اس کے منہ سے نکل پڑے گا۔
یہ ہے اصلی مرد، اصلی عورت اپنے پیارے کو پیار کرلے
اور اپنی تمام عادتی آزادیوں کے ساتھ زندہ رہ۔
او محبت! تو مجھے دوہری تکلیف دے رہی ہے :
اپنی نیکی سے بھی اور اپنی خوبصورتی سے بھی۔ غدار دل
میرا ہاتھ تجھے اس سے قبل نعش میں پہنچا دے گا۔
کہ تو ان کے مقدس رشتۂ ازدواج کو کاٹ ڈالے

والے ری ایس : میرے بھائی کو کیا چیز ستا رہی ہے ؟

سفوکلیس : مارشیس! او مارشیس!
تو نے اب مجھے جیت لینے کا راستہ پالیا۔

ڈوری جن : او ستارۂ روم! شکرگذاری کونسے الفاظ ادا کرے
جو اس موقع پر برمحل ہوں ؟ ......

مارشیس : والے ری ایس! یہ قابل احترام ڈیوک
نصیبے اور موت کو ٹھکرا کر،
قیدی ہونے کے باوجود، مجھے قید کر چکا ہے۔
گو میرے ہی بازوؤں نے اسے یہاں پکڑ لایا
(مگر) میری روح اس کی باجگزار ہو چکی ہے
رومیولس (بانی روم) کی قسم مجھے یقین ہے کہ یہ مجسم روح ہے،
اس کے گوشت نہیں: اور روح قید نہیں کی جا سکتی۔
پھر (اس کو چھوڑ دیں) تو بھی ہم کچھ نہیں کھوئیں گے؛ وہ (تو) آزاد ہے۔
اور مارشیس اب قیدی بن گیا ہے۔

گزشتہ چند سال میں ہمارے مطبعوں نے جتنی بھی نظمیں، ناٹک، وعظ، ناول خطبے شائع کئے ہیں ان میں مجھے ایک بھی ایسا نہیں ملتا جو مذکورہ بالا ہیروئی واقعہ کی سر سے سر ملاتا ہو اور اسکی سی عظمت و فرحت رکھتا ہو ہمارے پاس بہت سی پالسریاں اور الفورٹ ہیں لیکن (مردانہ) فوجی باجے کی آواز بہت کم سننے میں آتی ہے۔ تاہم ورڈس ورتھ کی لاؤڈامیا اور ڈایون کے گیت اور چند سانٹ نظمیں البتہ کسی حد تک ایک شریفانہ نیوٹیل موسیقی پیش کرتی ہیں، اور اسکاٹ بھی بعض وقت اس قسم کی تصویر کھینچ دیتا ہے جیسی کہ بالفوآف لے کے تذکرے میں لارڈ ایوان ڈویل کی ہے۔ طامس کارلائل فطرۃً مردانہ اور بر جسارت اخلاق کا مذاق رکھتا تھا اسی وجہ سے اس نے اپنی سیرتی اور تاریخی تصویروں میں داخل کرنے اور اپنے منظور نظروں میں شامل کرنے سے کسی ہیروئی کردار کو نظرانداز نہیں

کیا۔ اس سے پہلے رابرٹ برنس نے ہمیں وہ ایک اچھی نظمیں دی ہیں۔ سر لائن میں کے نیز میں لسٹ ریزن کی لڑائی کا واقعہ پڑھنے کے قابل ہے۔ اور سائمن اوکلے کی ہسٹری آف سارا سینس (تاریخ عرب) انفرادی جسارتوں کے نادرات کا تحسین و تعریف کے ساتھ تذکرہ کرتی ہے۔ مگر تذکرہ نویس کے متعلق یہ بات بالکل واضح ہے کہ عیسائی اکسفورڈ سے تعلق رکھنے کے باعث وہ اپنا فرض یہ خیال کرتا ہے کہ (اسلام کی) مکروہیت کا موزوں طور پر اعتراف کرے۔ خیر۔ اگر ہم قہرمانی یا ہیروئی ادبیات کی تلاش کریں تو ہم بہت جلد پلوٹارک سے دوچار ہوتے ہیں جو اس شعبے کا حکیم اور مورخ ہے۔ یہ پلوٹارک ہی کا احسان ہے کہ ہم براسی ڈاس، ڈائون، اپی منونڈاس، اور قدیم شیلیو سے روشناس ہیں اور ہمیں یہ خیال کرنے پر مجبور ہوں کہ ہم قدیم مصنفوں میں سب سے زیادہ اسی کے قرضدار ہیں۔ اس کی لکھی ہوئی ہر سیرت یا سوانح عمر ہمارے مذہبی اور سیاسی نظریاتیوں کی چوزہ دلی اور کم ہمتی کی ایک تردید اور ایک تغلیط ہے۔ ایک وحشیانہ ہمت اور ایک بیراگ (جو فلسفی نہیں بلکہ عملی ہے) اس کے ہر ہر قصے میں چمکتے نظر آتے ہیں اور یہی وہ بات ہے جس نے اس کتاب کو اتنی بڑی شہرت دلا دی ہے۔

ہمیں سیاسیات و معاشیات کی کتابوں سے زیادہ ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جن کی خاصیت تیز اور دست آور ہو۔ زندگی صرف عقلمندوں کے لئے ایک تہوار ہے اور اگر احتیاط کے کونے اور حزم کے آتش دان سے جھانک کر دیکھیں تو وہ ایک خرقہ پوش، بھیانک اور خطرناک چہرہ نظر آتی ہے۔ اگر ہمارے اسلاف یا ہم عصر قوانینِ فطرت کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو اس کی سزا ہمیں بھی بھگتنی پڑتی ہے۔ ہمارے ماحول کی بیماری اور بدشکلی سے اس بات کا یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ فطری، ذہنی اور اخلاقی قوانین کو ضرور توڑا گیا ہے۔ اور اکثر خلاف ورزی بر خلاف ورزی ہو کر ہی ایسی مرکب تباہی پیدا ہوتی ہے۔ لکجا (LOCKJAW) کی بیماری جس سے انسان کا سر پیچھے جھک کر ایڑھیوں کو آ لگتا ہے، سگ گزیدگی جس سے مریض اپنے ہی بیوی بچوں پر بھونکتا ہے، دیوانگی جس سے انسان گھاس کھانے لگتا ہے، اور جنگ، طاعون، ہیضہ، قحط سب جو فطرت کے ایک جوش کا اظہار کرتے ہیں اور جن کی آمد انسانی برائیوں سے ہوتی ہے، انسانی سزایابی ہی سے دور ہو سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے ایسا کوئی آدمی نہیں پایا جاتا جو گناہ کا کچھ نہ کچھ حصہ دار نہ ہو گیا ہو اسی بنا پر سزا میں بھی اسے شریک ہونے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

پس ہماری تہذیب کو انسان کے تیغ مسلح کرنے سے باز نہیں آنا چاہئے۔ اسے یہ بر وقت سن رکھنا چاہئے کہ وہ جنگ کی حالت میں پیدا ہوا ہے اور نہ صرف دولتِ عامہ بلکہ خود اس کی اپنی بھلائی کا مطالبہ ہے کہ وہ امن کی جھاڑیوں میں رقصاں نہ رہے: (غیر فوجی نہ بنے) بلکہ آگاہ اور دل جمع رہے۔ اور گرج کو نہ تو حقیر سمجھے اور نہ اس سے ڈرے۔ اسے چاہئے کہ شہرت اور حیات دونوں اپنے ہاتھ میں لے کر اور

جان پر سے کھیل کر مکمل خوش اخلاقی سے اپنی انتہائی صداقت بیان اور متانت برتاؤ کے ساتھ پھانسی اور ہجوم کا مقابلہ کرے۔

قہرمانیت کی تعریف

اس تمام بیرونی برائی کے خلاف انسان اپنے سینے میں ایک جنگجویانہ انداز اختیار کر لیتا ہے اور فرض کر لیتا ہے کہ وہ تن تنہا دشمنوں کی غیر محدود فوج کا مقابلہ کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ روح کے اس فوجی انداز کا نام ہم قہرمانیت (Heroism) رکھتے ہیں۔ اس کی ایک نامکمل ترین صورت سہولت وسلامتی کو ٹھکرا دینا ہے جس کے باعث ایک طرح کی جنگجوئی اور جدال وقتال سے کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ قہرمانیت ایک خود اعتمادی ہے جس میں ممکنہ نقصانات کی تلافی و اصلاح کی غیر معمولی قوت وقابلیت ہوتی ہے اور اسی لئے وہ حزم واحتیاط کی بندشوں کو حقیر سمجھتی ہے۔ ہیرو ایک زبردست توازن کا مالک اور قلب ہوتا ہے۔ اس کے ارادوں کو کوئی ہرج ہلا نہیں سکتا بلکہ وہ اپنی ذاتی موسیقی کی ہم آہنگی کرتے ہوئے خوشی خوشی آگے بڑھتا ہے اس سے اسے کوئی ہولناک خوف یا فناء عالم کی نشہ آور خوشی کوئی روک نہیں سکتی۔ قہرمانیت کسی قدر غیر فلسفی چیز ہے، اس میں عدم تقدس بھی ہے، وہ اس بات سے ناواقفیت کا اظہار ہے کہ دوسری روحیں بھی اس کی ہم جنس ہیں۔ اس میں فخر ہوتا ہے اور وہ انفرادی طبیعت کی انتہا ہوتی ہے۔ مگر ان سب کے باوجود ہمیں اس کا پورا احترام کرنا چاہئے۔ کارہائے نمایاں میں کچھ بات ہی ایسی ہوتی ہے کہ ہم اس کے اسباب وعلل اور ذرائع حصول کے پیچھے نہیں پڑتے۔ قہرمانیت محسوس ہوتی وہ کسی سے تحقیق نہیں اور اسی وجہ سے ہمیشہ صحت پر ہوتی ہے۔ اور گو یہ صحیح ہے کہ اگر کسی شخص کی نشوونما جداگانہ طور پر ہو، اس کا مسلک ومذہب مختلف ہو اور اس میں ایک عظیم تر ذہنی عملیت ہو تو وہ کسی مخصوص کارنامے میں ترمیم بلکہ تبدیل کر سکتا ہے۔ لیکن ہیرو اپنے کئے ہوئے کارنامے ہی کو بلند ترین کارنامہ خیال کرتا ہے اور وہ کسی فلسفیانہ یا مذہبیانہ تنقید اور ملامت کی پروا نہیں کرتا۔ اور یقین کرتا ہے کہ اس میں ایک ایسی صفت اور قابلیت ہے جس کی وجہ سے خرچ صحت، زندگی، خوف، دشمنی، ملامت کسی چیز کی اسے پروا نہیں رہتی، اور وہ جانتا ہے کہ اس کا ارادہ اور عزم تمام حقیقی اور امکانی مخالفتوں سے برتر وبالا ہے۔

قہرمانیت رائے عامہ کے خلاف کام کرتی ہے اور کچھ عرصے تک بہ ظاہر بری اور اچھی رائے کے بھی خلاف رہتی ہے۔ قہرمانیت اس مخفی دباؤ کی اطاعت کا نام ہے جو کسی شخص پر اس کے کردار کی طرف سے پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے کسی قہرمانہ کارنامے کی خوبی سوائے اس شخص کے جو اس کو کرتا ہے کسی کو نظر نہیں آتی کیوں کہ ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنا راستہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ دور تک دیکھ سکتا ہے۔ بنا بریں نیک اور محتاط لوگ (ابتداءً) اس کے کام سے ناراض ہو جاتے ہیں لیکن تھوڑا عرصہ گزرنے کے بعد

وہی لوگ اس نازعیض کرنے والی شخصیت کے اور اپنے ذاتی طرزِ عمل میں کوئی اختلاف اور بیگانگی نہیں پاتے۔ بات یہ ہے کہ محتاط لوگ دیکھتے ہیں کہ وہ قہرمانہ طرزِ عمل ایک موجودہ محسوس خوش حالی کے خلاف ہے ـــــ اور ہر قہرمانہ کارنامہ کسی بیرونی خوبی کو ٹھکرانے ہی سے اپنا اندازہ کرتا ہے ـــ اور اسی وجہ سے وہ مخالفت بھی کرتے ہیں لیکن آخر کار جب اسے کامیابی حاصل ہوجاتی ہے تو اس وقت محتاط لوگ بھی اسے آسمان پر چڑھا لیتے ہیں۔

قہرمان کے صفات

خود اعتمادی قہرمانیت کی روح ہے اور یہ روح کی حالتِ جنگ کا نام ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ناروائی اور غلط کاری کو معدوم کردے اور اس بات کی قابلیت پیدا کرے کہ کارپردازانِ بدی جو کچھ تکلیف پہنچا سکیں اسے برداشت کرسکے۔ قہرمانیت سچ بات کہتی ہے، وہ منصف، فیاض، مہمان نواز اور اعتدال پسند ہوتی ہے اور ذلیل ذرائع سے آمدنی پیدا کرنے اور ٹھکرائے جانے کو ٹھکرانے والی ہوتی ہے۔ اس کا ارادہ پکا، جسارت بے دھڑک اور ہمت غیر مضمحل ہوتی ہے۔ اس کا مزاج معمولی زندگی کو حقیر سمجھتا ہے اور وہ اُن ناروا طور سے احتیاط کرنے والوں کا مضحکہ اُڑاتی ہے جو صحت و ثروت کے عاشق بنے رہتے ہیں۔ جب قہرمانیت اپنے ہی قالب اور جسم پر تقریباً شرمندہ ہوجاتی ہے تو خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ شکر کے لڈو، چڑیا کے جھولے، بناؤ سنگار، تعریف و تحسین، لڑائی جھگڑے، گنجفے کے پتے، فیرنی وغیرہ وغیرہ کے متعلق کیا خیال رکھتی ہوگی حالانکہ یہی چیزیں معاشرے (سوسائٹی) کی فطانت کو نڈھال کرتی رہتی ہیں! مہربان قدرت نے جس کے ہم پروردے ہیں ہمارے لئے کیا کیا مسرت کے سامان مہیا کردیے ہیں! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برتری اور کمینگی میں کوئی برزخ اور درمیانی چیز نہیں ہے۔ اگر روح دنیا پر مالک و آقا کی طرح حکومت نہ کرے تو دنیا اس کو فریب دے دیتی ہے۔ ایک کم ظرف آدمی دنیا کی اس عظیم فریب دہی کو سادگی سے قبول کرلیتا ہے، وہ سادہ لوحی اور اعتماد سے کام انجام دیتا رہتا ہے، وہ سرخ پیدا ہوتا ہے مگر زرد مرتا ہے، وہ اپنی سنگار میز کو سنوارتا اور آراستہ کرتا ہے، وہ اپنی صحت کا غیر معمولی بلکہ غیر ضروری طور سے لحاظ رکھتا ہے، وہ محض میٹھی غذا اور تلخ شراب کے حصول کی خاطر پھندے پھیلانے سے دریغ نہیں کرتا۔ اسے کوئی اچھا سا گھوڑا یا رائفل نظر آتا ہے تو بے اختیار دل کھو بیٹھتا ہے اور جتنی کہ مختصر سی گفتگو اور چھوٹی سی تعریف پر پھول جاتا ہے ـــــ لیکن کم ظرف کی ان سنجیدہ بیہودگیوں پر ایک عظیم روح اور بالا ہستی صرف ہنسنا ہی پسند کرسکتی ہے۔ حقیقت میں ایسی چیزوں کا کچھ لحاظ کرنا عظمت طلبی کے خلاف ہے۔ یہ نوٹ کرنا میرے لئے کتنی سبکی کی بات ہے کہ آپ کے پاس ریشمی پائتابوں کی کتنی جوڑیاں ہیں اور کس رنگ کی ہیں یا یہ کہ کتنی قمیصیں ہیں جن میں سے کچھ برتنے میں ہیں کچھ زاید از ضرورت۔

شہر میں رہنے والے محض خرچ کے خیال سے کسی اجنبی کی میزبانی کرنے اور اسکو اپنے آتش دان کے

پاس مدعو کرنے میں بے آرامی محسوس کرتے ہیں اسی طرح وہ تنگ دل لوگ یہ بہانہ کرتے ہیں کہ وقت اور غیر معمولی مظاہرات برباد اور تلف ہو جاتے ہیں۔ مگر جو شخصیت عمدہ اخلاق اور اعلیٰ صفات سے متصف ہوتی ہے وہ ایسی بیجا کفایت شعاری کو اپنے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتی اور یہ یقین کرتی ہے کہ "خدا خود میر ساماں ارباب توکل را"۔ ابن حنقل (غالباً ابن حوقل — مترجم) جو ایک عربی جغرافیہ نویس تھا شہر صغد واقع بخارا کی ایک انتہائی مہمان نوازی کا یوں تذکرہ کرتا ہے کہ "جب میں صغد میں تھا تو مجھے ایک بڑی محل نما عمارت نظر آئی۔ اس کے دروازے (پھاٹک چوپٹ کھلے ہوئے اور دیواروں میں کیلوں سے جوڑ دیئے گئے تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہا گیا کہ عمارت مذکورہ ایک سو برس سے رات اور دن کبھی بند نہیں کی گئی۔ اجنبی کسی وقت بھی کسی تعداد میں بھی آ سکتے ہیں، مالک مکان ان کی اور ان کے سواریوں کی مہمانی کرنے سے ہرگز نہیں گھبراتا اور اس کی اس سے بڑھ کر اور کوئی خوشی نہیں کہ مہمان کچھ عرصہ ٹھہریں۔ اس قسم کی اور کوئی چیز مجھے کسی ملک میں بھی نظر نہیں آئی"۔ کشادہ دل لوگ خوب جانتے ہیں کہ دکھاوے کی خاطر نہیں بلکہ محض محبت سے اگر کوئی شخص کسی اجنبی کو اپنا کچھ وقت یا رقم یا پناہ دے تو وہ خدا کو اپنا ممنون بناتا ہے —— اس سے بڑھ کر اور کیا جزا و بدلہ مل سکتا ہے۔ ان کا وقت جو بظاہر خرچ ہوتا نظر آتا ہے اس کا معاوضہ مل جاتا ہے اور جو تکلیفیں وہ سہتے ہیں ان کا صلہ حاصل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگ انسانی محبت کے شعلے کو تیز کرتے ہیں اور بنی نوع انسان میں اخلاق حسنہ کے معیار کو بلند کرتے ہیں۔ میزبانی خدمت کے لئے ہونی چاہئیے نہ کہ دکھاوے کے لئے۔ ورنہ وہ میزبان کو اس کے بلند مقام سے نیچے گھسیٹ لیتی ہے۔ بہادر اور حوصلہ مند روح اس بات سے بہت بالا ہوتی ہے کہ اپنا اندازہ اپنے دستر خوان اور فرش کی سج دھج سے کرے۔ وہ جو کچھ میسر ہوتا ہے پیش کرتی ہے اور اس میں کوئی کمی نہیں کرتی اور اس کی اس جلالت سے سادہ چپاتی اور صاف پانی میں بھی وہ حسن پیدا ہو جاتا ہے جو میر بلد کی شہری ضیافتوں کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔

ہیرو کی پرہیزگاری اور اعتدال صرف اس خواہش کی وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کی عزت کو بٹہ اور شہرت کو دھبہ نہ لگے۔ پرہیزگاری کو وہ اعتدال پسندی کے باعث چاہتا ہے نفس کشی کی غرض سے اختیار نہیں کرتا۔ وہ اس بات کو اپنے مرتبہ کے مطابق نہیں سمجھتا کہ سنجیدگی اختیار کرے۔ اور ایک تلخ لہجے میں گوشت خواری، شراب نوشی، تمباکو، افیون یا چائے کی عادت اور ریشم و سونے کے استعمال سے اپنی بیزاری ظاہر کرے۔ ایک بڑا آدمی شاید ہی یہ جاننے کی فکر کرتا ہو کہ وہ کیا کھاتا ہے، یا کیسا پہنتا ہے۔ تاہم عیب جوئی کو رفیشن پرستی کے بغیر بھی اس کی معیشت طبعی اور شاعرانہ ہوتی ہے۔ جان ایلیٹ نے جس نے

سب سے پہلے امر نڈیوں (امریکی ہندی یا امریکا کے اصلی باشندوں) میں عیسائیت کی تبلیغ کی ضرورت محسوس کی تھی، پانی پی کر شراب کے متعلق کہا کہ گو شراب ایک نبیل (NOBLE) اور فیاض شربت ہے اور ہمیں اس کے لئے عاجزانہ شکر ادا کرنا چاہئے لیکن میں جانتا ہوں کہ پانی اس سے پہلے پیدا کیا گیا"۔ اس سے کہیں بہتر شاہ داود (علیہ السلام) کا اعتدال ہے جنہوں نے خدا کی رضا کے لئے اس پانی کو زمین پر انڈیلوا دیا جسے ان کے تین سپاہیوں نے جان جوکھم میں ڈالکر آپ کے لئے حاصل کیا تھا۔ بروٹس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ فلپائی کی لڑائی کے بعد اپنی تلوار پر (خودکشی کے لئے) گرا تو اس نے ایوری پیڈس کی ایک سطر دہرائی کہ "اے نیکی! میں عمر بھر تیرے پیچھے لگا رہا لیکن آخر کار معلوم ہوا کہ تو فقط ایک سایہ ہے"۔ مجھے ذرا بھی شک نہیں کہ یہ اس نامور شخص کی محض اہانت ہے۔ ایک قہرمانہ روح اپنا انصاف اور اپنی نبالت (NOBILITY) کبھی فروخت نہیں کرتی۔ وہ کبھی عمدہ کھانے اور گرم اور بہ آرام سونے کے لئے مدعو نہیں کرتی۔ یہ یقین کر لینا ہی حقیقی عظمت ہے کہ نیکی خود وافی ہے اور اپنا آپ صلہ و بدلہ ہے۔ غربت اس کا زیور ہے وہ ثروت و عزت نہیں چاہتی اور بڑی آسانی سے اپنا نقصان برداشت کر سکتی ہے۔ لیکن قہرمانہ صنف کی جو چیز سب سے بڑھ کر مجھے بھاتی ہے۔ وہ اس کی خوش مذاقی اور بشاشت ہے۔ یہ صفات اس میں خوب نمایاں رہتے ہیں۔ عظمت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اپنا فرض منصبی ادا کرو اور مصائب کا سنجیدگی سے مقابلہ کرکے انہیں برداشت کرلو — یہ آسان نہیں ہے۔ لیکن بعض ایسی نادر روحیں بھی ہوتی ہیں جو راسے، کامیابی اور زندگی کی کوئی قیمت ہی مقرر نہیں کرتیں۔ وہ اپنے دشمنوں کو التجاؤں اور درخواستوں سے راضی کرنا یا اپنے افسوس اور معذرت کا اظہار کرنا بالکل نہیں جانتے بلکہ ہمیشہ اپنی عادتی عظمت و خودداری کا نقاب ڈالے رہتے ہیں۔ سپیو پر غبن کا الزام لگایا جاتا ہے مگر وہ اپنی برارت ثابت ہونے تک انتظار کرنا بھی ایک بہت بڑی ذلت سمجھتا ہے اور اگرچہ حسابات کی فرد اس کے ہاتھ میں تھی لیکن وہ اسے ارکان عدالت فوجداری کے سامنے پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ سقراط کا (تبدیلی سزا کی التجا کرنے کی بجائے) دارالبلد میں اپنے اعزاز میں ضیافت چاہنا اور سر طامس مور کا مقتل میں (جلاد سے) دل لگی کرنا اسی ارو سے تعلق رکھتا ہے۔ بومانٹ اور فلیچر کے "بحری سفر" میں جولیٹا، بہادر کپتان اور اس کے ساتھیوں سے کہتی ہے —

جولیٹا: کیوں غلامو! یہ ہمارے اختیار میں ہے کہ تمہیں پھانسی دیدیں۔

کپتان: بہت ممکن ہے۔

اور یہ ہمارے بھی اختیار میں ہے کہ پھانسی پر چڑھ کر تختے حقارت سے دیکھیں۔
یہ جوابات درست اور مکمل ہیں۔ ظرافت حقیقت میں مکمل صحت کا شباب اور تازگی ہے عظیم المرتبت انسانیت کبھی نہیں ہوتا کہ کسی چیز سے سنجیدگی سے مقابلہ کرے۔ وہ ہر چیز کو ایسا ہی بشاشت دیکھنا چاہتا ہے۔ جیسے سیاہ جھپانے والا گیری پرندہ۔ خواہ کام شہر بسانے کا ہو یا قدیم اور احمقانہ مذاہب و اعتقادات کا استیصال کرنا جو ہزاروں برس سے زمین کو پریشان کر رہے ہیں، وہ سادگی سے اس عالم کی تمام تاریخ اور رواجات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اور اپنی من مانی بات عمل میں لاتے ہوئے دنیا کے نیلے تو زمین کو (جن کا لحاظ نہ رکھنے پر سر اسقراط ہے) "معصومیت" سے ٹھکرا دیتے ہیں اور اگر ہم نسل انسانی کا مطالعہ کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے باہم مل کر کلول کر رہے ہیں۔ اگرچہ دنیا کی نظروں میں وہ عمل واثر کا ملوکانہ اور سنجیدہ جامہ پہنے نظر آتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جو شخصیت جتنی بڑی ہوگی اتنی ہی زیادہ ظریف، غیر سنجیدہ اور طفلانہ حرکتیں کرنے والی ہوگی۔
عمدہ قصوں سے ہمیں سبق ملتا ہے، ممنوع کتاب کو مدرسے میں بنچ کے نیچے چھپا رکھنے والے لڑکے پر رد مان کا اثر اور تسلط ہوتا ہے اور قہرمان یا ہیرو کے حالات پڑھنے سے ہمیں اس سے ایک دلچسپی اور دابستگی پیدا ہو جاتی ہے — سچ پوچھئے تو یہی ہمارے مقصد کی اصل حقیقت ہیں اور یہ بڑی اور قیمتی جائداد کے مانند ہوتی ہیں جن پر ہمارا قبضہ ہوتا ہے۔ اگر ہم یونانی بہادری اور رومی غرور کا مطالعہ کرتے وقت ایک قسم کی وسعت اختیار کر لیتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ ہم یونانی و رومی جذبات سے یگانگی محسوس کرنے لگتے ہیں اور اس رفیع المرتبت مہمان کو (جس کا ہم تذکرہ پڑھ رہے تھے) اپنے حقیر گھروں میں اتارتے ہیں اس کے بعد میزبان (قاری) کے لئے مناسب ترین امر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو زمان و مکان اور تعداد و تقطیع (سائز) کے وہمی تعلقات سے دھوکہ نہ دیں۔ کیوں آتھنائی، رومی، ایشیا اور انگلستان وغیرہ الفاظ کانوں میں گونجیں؟ حالانکہ جہاں دل ہوتا ہے وہیں دیویاں رہتی ہیں اور دیوتا آتے جاتے ہیں؛ اور یہ دیوتا اور دیویاں کسی اور ارض شہرت میں نہیں آتیں۔ میساشوسیٹ، دریائے کنک ٹیکٹ، خلیج باسٹن آپ (امریکی لوگ) معمولی مقامات سمجھتے ہیں اور کان اجنبی اور قدیم بلادیات (ٹوپوگرافی) کے نام پسند کرتے ہیں۔ مگر ہم یہاں ہیں اور ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ بہترین چیزیں بھی یہی ہیں۔ صرف یہ دیکھئے کہ آپ یہاں ہیں؛ — فن اور فطرت، امید اور قسمت، دوست، فرشتے، ذات اعلیٰ کوئی بھی اس کمرے سے جہاں آپ بیٹھے ہیں غائب نہیں۔ بہادر اور مہربان اپنی مسند اس کے متعلق کبھی یہ ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ دیوتاؤں کے کوہی مسکن

اولیمپس پر مرے نہ ہی ملک شام کی شاعرانہ دھوپ کی۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے اچھا ہے۔ واشنگٹن کے چلنے پھرنے کے لئے جرسیس کی زمین کافی معزز تھی اور اسی طرح لندن کی گلیاں ملٹن کے قدموں کے لئے کوئی شخص عظمت حاصل کرتا ہے تو ساتھ ہی اپنے وطن کو لوگوں کے تخیل میں دلپسند اور اس کی آب و ہوا کو ہر دلعزیز منوا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ نفاست پسند ذہن بھی اُسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اصل میں وہی ملک بہترین ہے جو نبیل ترین (NOBLEST) دماغوں کا مسکن ہو۔ پیریکلیس، ارتوفون، کولمبس، ہیار ڈ ماسدن کے کارنامے پڑھتے وقت جو تصویریں ذہن میں ابھر جاتی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری موجودہ زندگی کتنی ذلیل ہے۔ نیز یہ کہ ہمیں اپنی استطاعت کے مطابق اپنی زندگی کو ان چیزوں سے آراستہ و پیراستہ رکھنا اور ان اصول پر عمل پیرا رہنا چاہئے جو فطرت کو ہماری زندگی کے دوران میں بھلے معلوم ہوں۔ ایسی چیزیں شاہی یا قومی طمطراق اور شان و شوکت سے بڑھ کر عظمت رکھتی ہیں۔

ہم نے بہت سے ایسے غیر معمولی نوجوانوں کو دیکھا یا سنا ہے جو بن کھلے مرجھا گئے یا جن کی کارگزاری عملی زندگی میں غیر معمولی نہ تھی: جب ہم اُن کے جذبات و رجحانات دیکھتے ہیں اور انہیں سوسائٹی، کتب یا مذہب کے متعلق کچھ کہتا سنتے ہیں تو ہم ان کی برتری کو سراہنے لگتے ہیں، اور جب وہ ہمارے طریقۂ حکومت اور سماجی حالت کے پورے ڈھانچ سے حقارت اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں تو اُن کا لہجہ ایک شباب بھرے دیو کا سا ہوتا ہے جو انقلاب برپا کرنے بھیجا گیا ہے۔ لیکن جب عملی شعبے میں داخل ہونے کا وقت آتا ہے تو یہ تکمیل طلب عوج بن عوق (بجائے COLLOSSUS۔ مترجم) ایک معمولی قد کے انسان میں سکڑ آتے ہیں۔ ان کے اعمال میں جو سحر طرازی تھی وہ دراصل اُن کے تخیلی رجحانات تھے جو ہمیشہ امور واقعی کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ مگر عمل کی سخت زمین تخیل کے آفتابی گھوڑوں سے جوتی نہیں جا سکتی انہیں کوئی نمونہ یا ہم مشرب ساتھی نہ ملنے سے اُن کے دل ہمت ہار دیتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اُس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی ابتدائی تمنّاؤں کے وقت وہ دوسروں کو جو سبق دیتے تھے وہ اب بھی صحیح ہے اور اگر وہ ذرا جرأت اور صداقت سے کام لیں تو اس کی صحت پر انہیں خود بھی یقین حاصل ہو سکتا ہے ورنہ کیا ایک عورت اپنے آپ کو کسی تاریخی زنانہ شخصیت سے مشابہ سمجھے اور یہ خیال کرے کہ سافو ہیلو نگلیے، دسائل یا گرجے میں بند رہنے والی ذہین اور تربیت یافتہ راہبہ عورتیں چونکہ تخیل اور پُرجلال جدل کو مطمئن نہیں کر سکتیں اس لئے کوئی بھی مطمئن نہیں کر سکتا — کم از کم وہ نہیں کر سکتی نہیں کیوں؟ اب تک جتنی طبیعتیں وجود میں آئیں ممکن ہے وہ ان میں سرورترین ہو مگر پھر بھی چونکہ اُسے ایک نئی اور غیر آزمودہ گتھی سلجھانی ہوتی ہے اس لئے اس خاتون کو چاہئے کہ روح مستقیم کے ساتھ اپنی راہ پر پُرجلال طور سے گامزن رہے، ہر نئے تجربے

کے اشارے اور ارشاد کو قبول کرے، اور یکے بعد دیگرے ان تمام چیزوں کا جائزہ لے جو اس کی آنکھوں سے وکالت کرتی ہیں تاکہ اس طرح وہ اپنی نو مولود ہستی کی طاقت اور کشش کا اندازہ کر سکے یا اگر وہ ایسا کرے تو اس رفتار کی موقتی اور عارضی رکاوٹوں یا سکونوں میں تاریکی یاس کے بعد ایک نئی فجر امید کا طلوع ہوتا ہے۔ حسین عورت جو مداخلت بیجا کو ایک فیصلہ کن اور مغرور اختیار اثرات کے ذریعے سے رد کر دیتی ہے، جو اوروں کو خوش کرنے کا لحاظ نہیں رکھتی اور نہ پروا کرتی ہے اور جو خود پسند اور بلند ہمت ہوتی ہے، وہ دیکھنے والوں کو اپنی نبالت و شرافت سے متاثر کر دیتی ہے، اور اس کا خاموش دل اس کی ہمت بندھاتا ہے، عزیز من، کبھی ہتیار ڈال کر بادبان نہ اتارو اس بلندی سے بندرگاہ میں آجاؤ یا خدا کے ساتھ سمندروں میں فتحمندی کے پھریرے اڑاتے اپنے جہاز کے بادبان کھول دو، تمہاری زندگی عبث نہیں کیوں کہ ہر گزرنے والی آنکھ تمہارا معاینہ کر کے مسرور اور اصلاح پذیر ہوتی ہے۔

قہرمانیت کی خصوصیت یہ ہے کہ استقلال کے ساتھ جمے رہیں۔ ہر شخص میں فیاضی کی اتفاقیہ لہریں اٹھتی اور اس کے دورے ہوتے ہیں۔ مگر کمال تو یہ ہے کہ جب تم نے کسی پارٹ کو اختیار کر لیا تو اسی پر باقی رہو اور یہ کمزوری نہ دکھاؤ کہ دنیا کی رائے کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ ہیرو ئی، عامی نہیں ہو سکتا اور نہ عامی، ہیرو ئی۔ اس کے باوجود ہم میں یہ کمزوری ہے کہ لوگوں کی ہمدردی ایسے امور میں حاصل کرنے کے متمنی رہتے ہیں جن کی خصوصیت و خوبی ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمدردی کے پاس اپیل کرنے کی کوشش سے بالا اور سست رو انصاف کے نزدیک مرافعہ کرنے کی خواہش سے ارفع ہوتے ہیں۔ اگر تم اپنے بھائی کی خدمت اس واسطے کرتے ہو کہ اس کی خدمت تمہارا فریضہ ہے تو یہ دیکھ کر اپنی رائے نہ بدل دو کہ محتاط لوگ تمہاری تعریف نہیں کرتے۔ اپنے عمل سے وابستہ رہو اور اگر تم نے کوئی عجیب اور متجاوز الحد کام کیا ہے اور سلامت روی کی اجازت دینے والی یکسانیت کو توڑ دیا ہے تو اپنے آپ کو مبارکباد دو۔ وہ ایک بڑا مشورہ تھا جو ایک نوجوان کو دیا جا تا ہیں تے سالہ ——— "ہمیشہ وہی کام کرو جس کے کرنے سے تم گھبراتے ہو" اگر کسی میں سادہ مردانگی ہے تو اسے ہرگز معافی نہیں مانگنی چاہئے۔ بلکہ اپنے گزشتہ کام کو فوشیوں (PHOCION) کے سے سکون سے دیکھنا چاہئے جس نے مان لیا کہ لڑائی کا انجام اچھا رہا مگر اس بات پر کبھی نہیں پچھتایا کہ اس نے اس لڑائی سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔

ہماری کوئی کمزوری یا تضحیک ایسی نہیں پائی جاتی جسے اس خیال سے تسلی نہ ہو کہ "وہ میری ساخت اور بناوٹ کا، نیز میرے ہم خلقوں کے ساتھ میرے تعلقات اور فرائض کا جزء ہے"۔ کیا فطرت نے میرے ساتھ معاہدہ کیا ہے کہ میرا کبھی نقصان نہ ہو، اور نہ میں کبھی مضحکہ بنوں؟ عظمت

شروع سے آخر تک اوروں کی رائے اور عمدہ خیالات سے بے نیاز رہتی ہے۔ ہم اپنی خیراتوں کا تذکرہ اس لئے نہیں کرتے کہ اُن کی وجہ سے تعریف ہو یا وہ بڑا کارنامہ ہیں بلکہ ہمیں صرف اپنا صحت پر ہونا ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ مگر یہ خیال ایک سرمایہ حماقت سے بڑھ کر وقعت نہیں رکھتا، چنانچہ تمہیں خود اس کا انکشاف اس وقت ہو جاتا ہے جب کوئی اور اپنی خیرات کا تذکرہ کرتا نظر آتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ معمولی حسن خلق (والا) زہد نفس کشی اور غیر معمولی فیاضی کو ایک ایسی بنیا سمجھتا ہے جو انہیں لوگوں میں پائی جاتی ہے جو آرام اور وافر دولت سے بہرہ ور ہیں اور جن کے متعلق یہ بات بیّن طور سے معلوم ہے کہ انہیں مصیبت زدوں کی عظیم جمعیت سے برادرانہ ہمدردی ہے۔ اور نہ صرف ہمیں ترک مسرات، قرض، تنہائی اور غیر ہر دلعزیزی کی سزا کو برداشت کرکے (ہیروئیت کی) روح سے رو حدار بننا اور اسی کے مطابق کام کرنا چاہیئے بلکہ عقلمند کو تو یہ سزاوار ہے کہ وہ بہادری سے ان نادر الوجود خطرات کا مقابلہ کرے جو کبھی کبھی انسانوں کو پیش آتے ہیں اور اپنے آپ کو اکتا دینے والی بیماریوں اور مہلک آمیز حملوں سے مانوس بنائے۔ تیز بے قصور اچانک مار ڈالے جانے کے لئے آمادہ رہے۔

ہیروئی اوقات عموماً پُر خطر اوقات ہوتے ہیں مگر وہ دن کبھی روشن نہیں جس میں یہ عنصر کام نہ کرے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانی ماحول اور حالت آج کل اس ملک میں تاریخی طور پر گزشتہ تمام زمانوں سے کسی حد تک بہتر ہے اور تہذیب کے لئے زیادہ آزادی میسر و موجود ہے۔ اسی وجہ سے پہلے ہی قدم میں پامال سا سے کوئی سخت آویزش نہیں ہوتی تاہم جو ہیروئی ہوگا اُسے ہر وقت اپنی دھار کو آزمانے کا موقع ہاتھ آتا رہے گا۔ انسانی نیکی کے غازیوں اور شہیدوں کو ہمیشہ عناد اور تکلیف ہی سے سابقہ پڑتا ہے۔ یہ تو کل ہی کی بات ہے کہ بہادر لیفجے نے اپنا سینہ ایک مجمع کی گولیوں کے سامنے پیش کر دیا اور آزادیٔ بیان و خیال کی وکالت کرتے ہوئے جان دیدی اور اس وقت حیات کا رشتہ منقطع کیا جب زندہ نہ رہنا ہی بہتر (و شریف تر) تھا۔

میری نظر میں ایسی کوئی راہ نہیں جس پر طمانیت کامل کا دور دورہ ہو اور انسان اپنے دل کے مشورے کے بغیر گامزن رہ سکے۔ اسے میل جول کی کثرت نہ کرنی چاہیئے۔ اسے اپنے نفس سے تخلیہ زیادہ کرنا چاہیئے اور جن راہوں کو وہ پسند کرتا ہے ان پر مضبوطی سے جم جانا چاہیئے۔ اس کا لگاتار چھوٹے سے چھوٹے فرض میں سادے مگر بلند جذبات کا لحاظ رکھنا اس کے کردار کو اس حد تک مضبوط کردے گا کہ وہ ضرورت پڑے تو سخت ترین ابتری بلکہ پھانسی کے تختے پر بھی قابل تعریف ثبات دکھائے گا۔ لوگوں کو جو کچھ تعدیاں اور مظالم پیش آتے ہیں وہ آئندہ بھی آسکتے ہیں، خصوصاً ایک جمہوریت میں جہاں مذہب کا اثر کم ہو گیا ہے [illegible]

آگ، اُڈا، ابر، اور پر FEATHER (جو امریکائی مجمعوں کی سخت ترین سزا ہے) اور پھانسی کا خیال نوجوان ہیرو کو کتنا آسان اور کتنا دم خوش کن معلوم ہوتا ہے اور جب کبھی کوئی دوسرا اخبار یا ہمسایوں کی کافی تعداد اس کے رجحانات اور آراد کو انقلاب انگیز قرار دینا پسند کرتے ہیں" تو دیکھو وہ کس قدر جلد اپنے فرض کے مفہوم کو سمجھتا اور سزاؤں کو ٹھکراتا ہے۔

انتہائی اشتعال طبع "ول سے بھی مستقبل کے متعلق پریشانیاں یہ دیکھنے سے دور ہوجائیں گی کہ قدرت نے کس قدر جلد اس کے اور انتہائی بدخواہی کے درمیان ایک حد قائم کردی ہم (مرنے پر) ایک ایسے کنارہ پر پہنچ جاتے ہیں جہاں کوئی دشمن ہمارا پیچھا نہیں کرسکتا۔

انہیں بکنے دو:

تو اپنی قبر میں آرام سے ہے۔

تعلیق = بٹینی سن کی DIRGE نامی نظم میں اصل میں یوں ہے "اپنی قبر کو گھیرے ہوئے سبزے پر

(۲) انہیں بکنے دو، مترجم (ا)

آئندہ کے متعلق ہماری ناواقفیت کی جو تاریکی ہے اس میں اور ایسی گھڑی میں جب ہم بلند تر آوازوں سے کان بند ہوتے ہیں تو کون شخص ہے جو ان لوگوں پر رشک نہ کرے جنہوں نے اپنی مردانہ جد و جہد کا محفوظ انجام دیکھ لیا؟ کون ہے جو ہماری سیاسی کمینگی کو دیکھتا ہے اور دل ہی دل میں واشنگٹن کو مبارکباد دئے بغیر نہیں رہتا کہ وہ عرصے سے کفن میں لپیٹا جاچکا ہے اور ہمیشہ کے لئے محفوظ ہے! اور یہ کہ وہ قبر میں میٹھی نیند سوتا اور انسانیت کے متعلق ابھی نراس و مایوس نہیں ہوا؟ کون ہے جو بعض اوقات اچھے اور بڑے لوگوں پر رشک نہیں کرتا جو فطرتی دنیا کی ابتری کے مصائب برداشت کرنے اور عجیب سکون کے ساتھ فطرت محدودہ سے اپنے تعلق منقطع ہونے کا انتظار کرنے اب نہیں رہے؟ پھر بھی یہ امر اہمیت رکھتا ہے کہ محبت انسانی نے جو دغا بازی سے پہلے فنا ہوجاتی ہے موت کو ناممکن بنادیا ہے اور وہ اپنے آپ کو لافانی اور مجرد و غیر اطفا پذیر (INEXTINGUISHABLE) ذات کی گہرائیوں کا باشندہ بناتی ہے۔ فقط

(ترجمہ)

بادۂ دکن

(لچھمی نارائن صاحب تخلص اورنگ آبادی)

۵

عالیجاہ بہادر کے تصویر خانہ کے ساتھ، رباعیات و قطعات کا بھی ایک کافی حصّہ کلیات میں ہے، جس میں سے مناجات، نعت، منقبتِ صحابہ کرام، عقاید، بے ثباتی دنیا، قدر کمال، نیرنگ عشق، استغراقِ محبت، گریہ و زاری، رضائے دوست، یاد ایام، فہمائش معشوق، بے وفائی معشوق، یار و گلزار، جور و تغافل، صنعت تجنیس، تقدیر و تدبیر کے مضامین رباعیات و قطعات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ (عمر یافعی)

مناجات

یارب جو بھلائی ہو مری سو وہ دے
دل پر مرے جو زنگ ہے اس کو کھو دے
ظاہر تھا مرے ہاتھ سو میں نے کھویا
باطن ہے ترے ہاتھ تو اس کو دھو دے

نعت

نکلا احمد سے جب کہ میم احمد
وہ ذات مقدس تو ہوئی عین احد
چالیس برس بعد نبوت جو ہوئی
یہ رمز ہے یعنی کہ ہوئے محو عدد

منقبت صحابہ کرام

جیسے فرقان میں ہیں نقطے چار
یوں رسول خدا کے چار ہیں یار
چار ہیں گے کتاب ربانی
اور مقرب فرشتہ بھی ہیں چار

عقائد

کس کے نزدیک مال کی عزت
کس کے نزدیک حال کی عزت
میرے نزدیک اس کی ہی عزت
جس کے نزدیک آل کی عزت

سکین و ناتواں ہوں یا مصطفےٰ توجہ
دل خستہ نیم جاں ہوں یا مصطفےٰ توجہ
شاید کسی دنوں میں دیکھے سے ہو تغافل
بے کس ہوں نوجواں ہوں یا مصطفےٰ توجہ

گھسنے میں ترے در پہ جبین اہل نیاز
الطاف ترا ہر دو جہاں میں ممتاز
تیرا ہوں غلام تو ہے صاحب میرا
یا بندہ نواز ہے بندے کو نواز

بے ثباتی دنیا

گل! اب ہے ہم سے جنگ تجھ کو کب تک، گلشن میں ہے یہ رنگ و بو کب تک؟
تیری ہے غرض کہ ہم چمن جاویں
بالفرض کہ ہم یہاں سے گئے تو کب تک؟

اے شمع! بھلا یہ گرانی کب تک
پروانے کے ساتھ سرگرانی کب تک؟
وہ تو جل مر کے ترے سر خاک ہوا
بارے تیری یہ زندگانی کب تک؟

قدر کمال

کوئی مشتاق مال کے ہیں گے
کوئی عاشق جمال کے ہیں گے
میرے نزدیک وہ ہی ہیں کامل
جو کہ طالب کمال کے ہیں گے

نیرنگِ عشق

پیا کل رات میرے گھر کو آیا۔ میں سوتا تھا مجھے اس نے جگایا
کہا مجھ کو وہ کہاں تک سوئے گا تو؟ ارے اب جاگ جو جاگا سو پایا"

ہم تو وہ ہیں کہ مے پرستی نہ کریں
بت خانہ میں جاویں بت پرستی نہ کریں
زلفوں سے ترے گو کشش ہے پیارے ہر دم
لیکن یہ غلط دراز دستی نہ کریں

یہ جو آنکھیں ہیں یگانہ باطنی و ظاہری
مانع دیدار ہیں ان سے ہوا تو جنتری

چشمۂ حیواں ابلتا ہی تیرے سینہ کے بیچ   دُوسرے لباں کرے ہے آپ ہی لعل جلوہ گری

صبح عدم کو آیا تھا میں کیا فراغ سے   نے کام تھا ایاغ سے نے سیر باغ سے

خانہ خراب عشق نے آکر جگا دیا   میرا ہی گھر جلا دیا میرے چراغ سے

استغراقِ محبت

ہر شخص سے کیفیت کو تیرے پوچھا   جو کوئی آیا ادھر میں اُس سے پوچھا

جس نے کہ ذرہ حرف کہا تیرا مجھے   اک بار میں پوچھ پوچھ پھر دیکھ پوچھا

واعظ کیا تو پھیرے ہی بہشت کا بھٹکا   دیکھا نہیں اُس زلف کا لٹکا لٹکا

کیا حور بہشت کی کرے ہے تعریف   یہ دل ہے مرا جدھر کو اٹکا اٹکا

صاحب اُس من ہرن پیا بن میں گیا تھا کل   اک سرو کو دیکھ ہوش میں آیا نہ ہر خلل

میں اُس کے تئیں کو یار کے قامت کا کر خیال   دوڑا، گلے لگا میں گرا یا نو پر اُچھل

گریہ وزاری

میں یار کا خط ہاتھ میں لیکر رویا   ایسا رویا کہ خط گیا سب دھویا

جب مجھ سے پڑھا گیا نہیں وہ نامہ   پھر میں رویا کہ ہائے کیوں میں رویا

صاحب کا تو ان دنوں عجب ہے لیکھا   میں حال کو اُس کے تک جو جا کر دیکھا

اک خط جو لکھا اس نے ہے تجھ کو   آنسو سے بھگا کے آہ سے پھر سینکھا

مخمور میں کل صبح کو ہوتے ہوتے   سرخ آنکھیں اُٹھا نیند سے جو تھے سوتے

زاہد نے مجھے دیکھ کہا آنکھیں لال   "کیا ہے بھیس میں" ہم نے کہا "روتے روتے"

رضائے دوست

نہ تم کو ہی مطلوب تو لیجیے پیارے   سر تم کو ہے مطلوب تو لیجیے پیارے

اک جی تو بساط میں رہا ہی ہم پاس   گر تم کو ہے مطلوب تو لیجیے پیارے

جس گھڑی بسمل تڑپنے سے رہا   نزع کی حالت میں اتنا ہی کہا

تو نہ ہا قاتل سے مت مانگو مرا   یہ ہی بس جو دیہ اُس کے خون بہا ہے

یاد ایام

اے دل اجب کہ عشق تیرے تو آیا   میرے کہنے کو پھر نہ خاطر لایا

اس ہی گرفتار بلا یا میں تجھ کو   دیکھا آخر سزا کو اپنی پایا

سامعہ میں فتور ہے تھوڑا   باصرہ میں قصور ہے تھوڑا

لذتِ راگ و رنگ سے چھوٹے   بارے اس سے سرور ہے تھوڑا

فہمائش معشوق

اے یار ہمیں سخت کہیگا کب تک   ہم ہیں سہنے کو کوئی سہیگا کب تک؟

دو دن کی یہ زندگی خوشی سے کاٹیں   پیارے ہم سے خفا رہیگا کب تک؟

مے و معشوق

اُس شوخ سے شب میکدہ میں دھوم رہی تھی   آنکھوں میں سبھوں کی تو نشہ جھوم رہی تھی

شیشہ کے گلے پڑتی تھی خم سے نکل کر   پیالے کا صراحی بھی تو منھ چوم رہی تھی

یار و گلزار

گلشن میں دم صبح عجب دھوم رہی تھی   بلبل بھی رگ گل سے لٹک جھوم رہی تھی

میں گوشہ نشیں یار کو اپنے تو منایا   شمشاد کا قمری بھی قدم چوم رہی تھی

جور و تغافل

تغافل سے ترے ہم تو مرے رہے   کوئی کیا الفت اب تجھ سے کرے رے

پھپھولا ہو رہا ہی دل ہمارا   دُکھایا اس کے تئیں تو نے ارے رے

دل صاحب عبث اے دل آزار!   لب کو شکوہ سے وا نہیں کرتا

جب تلک پھوٹتا نہیں شیشہ   تب تلک تو صدا نہیں کرتا

صنعت تجنیس

اُس غنچہ دہن سا کہ چمن میں گل ہے   کیا سوجھے اُسے جس کی زمین میں گل ہے

پروانے کی پرفشانی کچھ گل نہ ہوئی   افسوس! چراغ انجمن میں گل ہے

مرض ہے مرا اے پیا- لا دوا   تری چشم کا ہے پیالا دوا

حکیم اب تری دیکھی تشخیص ہے   جو کچھ تو دیا میں پیا- لا دوا

پیا جا مت ستا میرے تئیں کو   پی آ جا مت ستا میرے تئیں کو

پیا پی کیوں مجھے دیتا ہی پیالے   پیا جا مت ستا میرے تئیں کو

تقدیر و تدبیر

اک ذرہ اختیار ترے ہاتھ میں نہیں   آیا یہ فہم راز تری ذات میں نہیں

مسیر کہیں تقدیر نقش ہے   گر میں ترے ساتھ دکھا سکتا نہیں

تنقیدین

شہنشاہ دو جہاں اس کتاب کو لال دین صاحب عابد ایم۔اے۔ نے تالیف کیا ہے اس میں پیغمبر اسلام کی پیدائش سے وفات تک کے حالات درج ہیں یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں عرب کا جغرافیائی حال اور خاندان ہاشم کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں پیغمبر اسلام علیہ التحیۃ والسلام کی پیدائش آپ کی پرورش۔ تجارت اور نکاح وغیرہ کے احوال ہیں۔ تیسرے باب میں رسول اللہ صلعم کی نبوت۔ اسلام کا آغاز مسلمانوں پر کفار قریش کے مظالم اور حبش کی ہجرت کا ذکر ہے۔ چوتھے باب میں آنحضرت صلعم کی مدینہ کی جانب ہجرت مسجد نبوی کی تعمیر اور اصحاب صفہ کا حال ہے۔ پانچواں باب آنحضرت صلعم کے غزوات پر مشتمل ہے۔ چھٹا باب عرب میں قیام امن۔ تمام عربوں کا مسلمان ہونا اور اسلامی سلطنت کی بنیاد کے متعلق ہے۔ ساتویں باب میں آنحضرت صلعم کے حج کا تذکرہ ہے آٹھویں باب میں آنحضرت صلعم کی وفات کا بیان ہے۔ نواں باب خانہ نبوت کے احوال پر مشتمل ہے۔ دسویں باب میں آپ کے شمائل درج ہیں۔ اس طرح اسلام اور پیغمبر اسلام کے تمام سوانح نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں لکھے گئے ہیں۔ گو (۲۰×۳۰/۸ سائز) کے (۳۰۴) صفحوں کی ضخامت میں ان تمام مضامین کا سمانا متعذر ہے لیکن مولف نے ایجاز و اختصار سے کام لے کر بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ صحیح اور ضروری واقعات نہایت دلچسپ پیرایہ میں درج کئے ہیں۔ لیکن جو خاص اور اہم واقعات ہیں بلحاظ ضرورت ان کی کسی قدر تفصیل بھی کر دی ہے غرضکہ اسلام اور پیغمبر اسلام جنکے ضروری واقعات وحالات سے ہر مسلمان کو کم از کم واقف رہنا چاہیئے وہ تمام باحسن الوجوہ اس کتاب میں موجود ہیں کتابت وطباعت بھی اچھی ہے۔ عابد صاحب کی یہ اسلامی خدمت قابل مبارکباد ہے۔ حقیقتاً اس زمانہ میں اس امر کی بیحد ضرورت ہے کہ عام مسلمانوں کے معلومات کے لئے اسی طرح چھوٹی چھوٹی کتابیں اسلام کے مختلف شعبوں پر عام فہم اردو میں تالیف کی جائیں۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ منشی طالب علی صاحب پابند قریشی مینجنگ پروپرائٹر اخبار تعلیم انارکلی لاہور۔

(۲) **رسالہ ارشاد** یہ ماہانہ رسالہ محرم ۱۳۴۷ھ سے پیرزادہ سید شاہ یوسف الدین صاحب قادری کے زیر ادارت حیدرآباد سے شائع ہو رہا ہے سائز رائل حجم (۴۸) صفحہ قیمت سالانہ معہ محصول ڈاک (عہ) ہے۔ یہ بالکل مذہبی و اصلاحی رسالہ ہے ہر رسالہ کے (۲۰) صفحات تفسیر حدیث فقہ کے لئے مخصوص کردیئے گئے ہیں بقیہ صفحات پر علمی، اصلاحی، تاریخی مضامین درج رہتے ہیں۔ چونکہ اکثر مسلمان قرآن کے معنی و مطلب سے واقف نہیں ہوتے اس لئے اس رسالہ نے اون سورتوں کی سلیس تفسیر شروع کی ہے جو عموماً نمازمیں پڑھے

جاتے ہیں اور جن کے معنی سے واقف رہنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ اسی سلسلہ میں مسلمانوں کو حدیث و فقہ کے معلومات بہم پہنچانے کا بھی انتظام کیا ہے جو زمانہ موجودہ میں مسلمانوں کے لئے بیحد ضروری ہے۔ جو مضامین ابتک اس میں شائع ہوئے ہیں وہ فاضل اور مشہور مضمون نگاروں کے قلمی ہیں اور حالات حاضرہ کے اعتبار سے مسلمانوں کے اضافہ معلومات کے لئے بیحد مفید ہیں حقیقت میں ملک کو ایک ایسے مذہبی رسالہ کی بڑی ضرورت تھی ہمیں قوی امید ہے کہ مسلمان ضرور اس مفید رسالہ کی قدر کریں گے اور اس ہونہار پودے کے بارآور کرنے میں ممکنہ سعی سے دریغ نہ کریں گے۔ (م - م)

رپورٹ | اجلاس نہم آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس منعقدہ ملکاپور (برار) فروری ۱۹۲۵ء۔ مرتبہ جناب نفیس دلہن صاحبہ آنریری سکریٹری صفحات ۱۱۲

۲۵ء کے ہی ماہ میں اس کانفرنس کا اجلاس ملکاپور کے چھوٹے سے شہر میں منعقد ہوا تھا لیکن یہ اجلاس حسن خوش اسلوبی کے ساتھ انجام کو پہنچا، وہ اس چھوٹے شہر کی سنجیدہ خیال والی بیبیوں کی مساعی کا ترجمان ہے۔

کانفرنس کے اس اجلاس میں کل (۱۱) تحریکات پیش اور منظور ہوئیں۔ ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ مسلم خواتین میں حصول علم کی خواہش پیدا ہو رہی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مذہبی احساس کی بھی ان میں کمی نہیں چنانچہ دوسری تحریک میں حکومت سے اس امر کی خواہش کی گئی ہے کہ جس طرح مدارس میں ہندی کو داخل نصاب کیا گیا ہے اسی طرح مسلم زنانہ مدرسوں میں دینیات زائد مضمون قرار دیا جائے۔ یہ احساس اپنی تمام وسعت نظر کے ساتھ ہماری آئندہ آزاد خواتین کا مشعل ہدایت بن سکتا ہے اور اس کا صحیح استعمال ہی میدان ترقی میں ان کو افراط و تفریط کے راستوں سے بچا بچا کر لے جا سکتا ہے۔

جب ہم اپنی زندگی کے اس تاریک پہلو پر دردمندانہ نگاہ ڈالتے ہیں جو ہماری زندگی کا بہترین نصف اور معیوب کی طرح سات پردوں کے اندر پوشیدہ ہے تو ہمارے دل کو ان کی عمومی پستی اپنے قنوطی اثر سے بھرنے لگتی ہے۔ سرسید احمد کی وسیع نظرانہ جدوجہد نے مسلمان مردوں کو تو آشنا بنا دیا۔ کیا اچھا ہوتا اگر سید مرحوم کی توجہ ہمارے گھر کے ان محفوظ خزانوں کی طرف بھی منعطف ہو گئی ہوتی! ہم ان کو اس روشن عہد میں یقیناً زیادہ مفید اور اپنے کاموں میں مددگار پاتے۔

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

تاہم ہم کسی نوق فطری ہستی کی پیدائش اور رہنمائی کے منتظر بھی نہیں رہ سکتے کیونکہ محفل تہذیب میں ہماری جگہ نشست سے بھی نیچے ہو جائیگی اس لئے آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس ہو یا کوئی اور اصلاحی انجمن خواتین ہم کو اس کی مدد کی طرف نہایت سنجیدگی سے متوجہ ہونا چاہئے۔

انجمن کے اس اجلاس کا سب سے بڑا شاندار کارنامہ غالباً وہ ہے جو خواتین ملکاپور کی اس مستعدی کو ظاہر کرتا ہے جس سے انہوں نے کولہاپور کی اسکول فائنل کامیاب لڑکی کی درخواست امداد پر فراخدلانہ اور عاقبت اندیشانہ نظر ڈالی جس سے یہ تشنہ علم اپنی پیاس بجھانے کے قابل ہو سکی۔ امید ہے کہ یہ مثال نمونہ بنکر ہر سال اپنے آپ کو دہراتی رہیگی کارکنان کانفرنس خصوصاً جناب سکریٹری صاحبہ اپنی ان قومی مساعی کے صلہ میں ہماری وقعت عملی ہمدردی اور ایک بڑی حد تک شکریہ کی مستحق ہیں ہر پڑھنے لکھنے والی لڑکی اور تمام مسلمانوں کو اپنی بہنوں کی ان ہی خواہشوں کا رو بار واقف ہونیکی خاطر کانفرنس سے متعلق رہنا، اور اسکے روشن پیام کو ہر تاریکی سے تاریک علم

جدید و تازہ کتب اور رسالے

وہ کتابیں جو حال ہی میں ہندوستان میں شائع یا مکتبہ میں آئی ہوئی ہیں

تجارت عرب سانتر پیسہ اخبار لاہور قیمت ۱۰ ر	عورت کا دل ۔ از اختر قیمت عہ	بیوی کے فرائض ۔ از سید ظہور احمد شاہجہانپوری قیمت ۱۰ ر
خوبصورتی اور تندرستی " " عہ	خواب و خیال ۔ از پریم چند " عہ	آداب مجلس ۔ " " " " عہ
درازی عمر کے اسرار " " " عہ	تفسیر آیۃ کریمہ مصنفہ امام ابن تیمیہ "۱۵ ر	شبنامچہ عروس از غلام احمد " عہ
آہنی ارادہ " " " ۵ ر	سیر المصنفین جلد دوم از تنہا بی ۔ اے " للعہ	ابن مسعود از عظمت علی " عہ
عمدہ حافظ کا راز " " " عہ	خیالات اور نگ ۔ مترجمہ " " ۱۰ ر	بہترین انشاپرداز ۔ مطبوعہ النظر پریس لکھنؤ " عہ
مطالعہ نفس " " " ۲ ر	مخزن ظرافت شائع کردہ مرغوب اجنسی لاہور "۶ر	**مشہور رسالوں کے تازہ سالنامے اور خاص نمبر**
مطالعہ باطن " " " ۵ ر	مضامین چکبست ۔ " انڈین پریس الہ آباد ہے	
امریکہ کے کامیاب لوگ " " " عہ	نہرو رپورٹ اردو ۔ مرتبہ نہرو کمیٹی " عہ	سالنامہ نیرنگ خیال لاہور قیمت عہ
آئینہ اسلام " " " عہ	تتمہ " " " " " ۱۰ ر	" ہمایون " عہ
محبوب الاخلاق " " " ۱۰ ر	پردہ ۔ مولفہ عبد الحلیم شرر " عہ	خاص نمبر عالمگیر " عہ
معلم السیاست مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ عہ	خاک پروانہ ۔ از پریم چند " عہ	سالگرہ نمبر نمائش حیدرآباد " ۱۲ ر
تاریخ ہند از لاجپت رائے آنجہانی " عہ	عروج کابل ۔ از سید ظہور احمد شاہجہانپوری " ۱۰ ر	رسالہ نگار ۱۹۲۲ء کے جلد کا انتخاب " عہ
پولٹیکل اکانومی از امرناتھ ایم ۔ اے " عہ	فن شاعری " " " عہ	خاص نمبر رسالہ زبان منگرول بابتہ ۱۹۲۷ء " عہ

حسب ذیل ماہانہ و ہفتہ وار رسالے اور اخبار مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتے ہیں

نیرنگ خیال ۵ ر کلدار معاول ۵ ر ۱۰ ار عثمانیہ نگار ۸ ر کلدار ۹ ر ۴ ر عثمانیہ ۔ مخزن ۶ ر کلدار ۷ ر عثمانیہ ۔ نظام گزٹ ہفتہ وار ۲ ر ۶ ر عالمگیر ۵ ر کلدار معاول ۵ ر ۱۰ ار عثمانیہ معارف ۸ ر کلدار ۹ ر ۴ ر عثمانیہ ۔ مجلہ مکتبہ ۶ ر عثمانیہ ۔ رعیت ہفتہ وار ۲ ر عصمت ۵ ر کلدار ۵ ر ۱۰ ار عثمانیہ الجمعیۃ ۱ ر کلدار ۱ ر ۴ ر عثمانیہ ۔ ہمایون ۸ ر کلدار ۹ ر ۴ ر عثمانیہ ۔ تجلی سہ ماہی ۱۲ ر عثمانیہ ۔ سفینہ سہ ماہی (مدراس) عہ عثمانیہ ۔ زمانہ ۸ ر کلدار ۹ ر ۴ ر عثمانیہ ۔ مجلہ عثمانیہ سہ ماہی عہ ۔ عصمت کا جوبلی نمبر عہ کلدار عہ عثمانیہ ۔ تازیانہ ۱ ر کلدار ۱ ر ۳ ر عثمانیہ ۔ طاقت ۲ ر کلدار ۲ ر ۶ ر عثمانیہ ۔

مطبوعات مکتبہ جامعہ ملیہ

ہمارے نبی بچوں کے لئے خدا کے پیارے نبی کی پاک زندگی کی کہانیاں از پروفیسر نواب علی صاحب ایم اے (طبع سوم) ۵ ر

ہمارے رسول خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی نے بچوں کے لئے سہل اور موثر ترین زبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک حالات تحریر فرمائے ہیں قیمت ۱ ر

سرکار کا دربار از احمد الیاس صاحب مجیبی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ذرا بڑے لڑکوں کے لئے بیحد مفید کتاب۔ ۴ عہ

دنیا کے بسنے والے دنیا کے عجیب غریب باشندوں کے حالات تقریباً ۵۰ تصاویر از سید بشیر حسن صاحب زیدی۔ ہیڈ ماسٹر مسلم یونیورسٹی اسکول علیگڑھ۔ قیمت ۲ ر ۶ ر

ترکوں کی کہانیاں ترک بچوں کی ہمت و جرأت کی سچی کہانیاں جن کے پڑھنے سے بچوں میں قومی جوش پیدا ہوتا ہے۔ قیمت ۵ ر

ازہار العرب ہمت و شجاعت و سخاوت و مروت اور علم و حکمت کے بہترین عربی اشعار کا گلدستہ۔ قیمت ۱۰ ر

انتخاب مضامین جوہر طلبا جامعہ کے قلمی رسالہ "جوہر" کے منتخب علمی و ادبی اور تاریخی مضامین۔ قیمت ۲ عہ

اورنگ زیب عالمگیر مولانا شبلی کی معرکتہ الآرا تصنیف، طباعت، کتابت نفیس۔ قیمت ۲ عہ

مقدمہ شعر و شاعری خواجہ حالی کے دیوان کا مقدمہ اردو شاعری کے اصناف پر لطیف تبصرہ معہ فوٹو خواجہ مرحوم۔ قیمت ۲ ر

صلاح کار عنفوان شباب کے جذبات کے نشیب و فراز پر گہری نظر۔ اور ازدواجی زندگی کے لیے دلسوز مشیر از چودھری محمد علی صاحب تعلقہ دار رودلی۔ قیمت ۲ عہ

جمال الدین افغانی اتحاد اسلام کے داعی اور مشرق کے مصلح اعظم سید جمال الدین افغانی کے حالات زندگی سید صاحب اور ان کے جانشین شیخ محمد عبدہٗ کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ قیمت ۱ ر

عرض جوہر مجموعہ کلام محمد علی صاحب۔ قیمت ۱ ر

انتخاب میر زبان اردو کے زندۂ جاوید شاعر میر تقی میر کے کلام کا ایک خاص نقطۂ نظر سے انتخاب معہ مقدمہ و حالات میر۔ مرتبہ مولوی نورالرحمن صاحب بی اے (علیگ) قیمت ۲ عہ

دیوان غالب طلبہ کی سہولت اور روزمرہ کے استعمال کے لئے مناسب۔ قیمت ۱۰ ر

مسدس حالی طلبہ کے استعمال کے لئے مجلد ہونے کے باوجود قیمت ۱ ر

مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ اس رسالہ میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے تعلیم کی غایت اور مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی ضروریات پر مجمد مفید بحث کی ہے۔ قیمت ۱۰ ر

خطبۂ صدارت شیخ الہند مرحوم کا تاریخی خطبہ صدارت جو بتقریب افتتاح جامعہ پڑھا گیا تھا۔ قیمت ۲ ر ۶ ر

خطبۂ صدارت مسیح الملک مرحوم کا عالمانہ خطبہ جو جلسہ اول تقسیم اسناد میں پڑھا گیا۔ قیمت ۵ ر

اسلامی تہذیب اور قومی تعلیم ڈاکٹر سرپی سی رائے کے خطبۂ صدارت کا اردو ترجمہ۔ مسلمانوں کی حیرت انگیز علمی ترقی کا خاکہ۔ قیمت ۵ ر

قومی و اسلامی تعلیم کا نظام رئیس الاحرار مولانا محمد علی کی تعلیمی اسکیم۔ قیمت ۵ ر

نامۂ مشیر شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی کا منظوم خط ایک دوست کے نام۔ قیمت ۱ ر

نالۂ مشیر دیوان کا پہلا حصہ۔ قیمت ۲ عہ

کلام مشیر دیوان کا دوسرا حصہ بیشتر نظمیں نینی تال، کشمیر اور یورپ کے پر فضا مقامات میں لکھی گئی ہیں۔ قیمت ۲ عہ

الورد والریحان صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیثوں کا انتخاب معہ ترجمہ نظم و نثر۔ قیمت ۲ ر ۱۲ ر

ملنے کا پتہ

مکتبہ ابراہیمیہ دیباہی (محدود) اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعاتِ مکتبہ

دکن میں اُردو ۔ مؤلفہ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب منشی فاضل۔ جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی عادل شاہی اور آصف جاہی دور ان میں اردو نظم و نثر کی حالت و شعرائے اردو کا تذکرہ معہ نمونہ کلام ضخامت ۴۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا بارِ دوم قیمت ...

خیابانِ اُردو ۔ مرتبہ جناب محمد عارف صاحب حیدرآبادی ہندوستان کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور نامی گرامی شعرائے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۴۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ...

روحِ تنقید ۔ مصنفہ مولوی ابوالحسنات سید محی الدین قادری زور پہلی فن تنقید کے متعلق اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں انتہائی حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصول کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ... سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ بارِ دوم قیمت ...

تنقیدی مقالات ۔ مصنفہ زور صاحب یہ روحِ تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روحِ تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی فارسی اور اردو زبانوں کے مشہور اہلِ قلم کی قلمکاریوں پر تنقید کرکے ان اصولوں کا استعمال دکھلایا ہے اور نیز بعض مشہور اردو انشا پردازوں کے طرزِ تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کیے گئے ہیں ضخامت ۵۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی و غیرہ مجلد ...

اُردو کے اسالیبِ بیان ۔ مصنفہ زور صاحب نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت ابتدا سے لیکر آج تک کے نثر نگاروں کے طرزِ تحریر و اندازِ بیان کا تذکرہ ۔ خاص طرزِ تحریر کے اردو انشا پردازوں کے اسالیبِ بیان تبصرہ ضخامت ... صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ...

سلطان محمود غزنوی کی بزمِ ادب ۔ مصنفہ زور صاحب سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی و ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں براؤن کی تاریخ ادبیاتِ ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۳۰ صفحے کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲ ...

دنیائے افسانہ ۔ مصنفہ مولوی محمد عبدالقادر سروری ایم اے ۔ ایل ایل بی ۔ افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ اور افسانہ نویسی کے اصول و مبادیات اردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۲۱۸ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت ...

مبادیِ فلسفہ ۔ مؤلفہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی ۔ ڈاکٹر اے سی راپورٹ پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی پرائمر آف فلاسفی کا ملخص بامحاورہ اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۲ ...

اربابِ نثرِ اُردو ۔ مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے ۔ فورٹ ولیم کالج کے اردو اہلِ قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر نگاری کی تاریخ ... صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ...

آثار الکرام جلد اول مصنفہ مؤرخ دکن نواب حکیم سید شمس اللہ قادری ... جس میں ہندوستان کے سلاطین اور حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی محققانہ تاریخ ضخامت ۲۴۰ صفحے ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی اچھی قیمت ...

جواہرِ کلیاتِ نظیر ۔ منتخبہ جناب مولانا ذہین و سید نثار احمد نظیر اکبرآبادی کے کلیات سے اخلاقی ادبی نصیحت آموز ظرافت آمیز اور دلچسپ نظموں کا مجموعہ ضخامت ۳۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت ...

عقائدِ امام ۔ مترجمہ مولوی محمد عبدالغفور عابدی صاحب فقہ اکبر کا عام فہم اور بامحاورہ اردو ترجمہ قیمت ...

اسوۂ حسنہ ۔ مصنفہ مولوی محمد عبداللہ سروری بی اے ۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ...

دکنی لغت ۔ مؤلفہ مولوی سید شاہ احمد شعار ہاشمی ۔ اردوئے قدیم یعنی دکنیات کا لغت جس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۱ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ...

شاہ رفیع الدین قندھاری ۔ مرتبہ مولوی محمد عبدالغفور صاحب عابدی ۔ دکن کے ایک مشہور صاحبِ دل صوفی عالم کے دلچسپ حالات ضخامت ۴۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا ۔ لکھائی چھپائی قیمت ...

خزینۂ اخلاق ۔ مصنفہ مولوی سید عبدالعزیز صاحب عزیز اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ ۔ ضخامت ۶۲ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ...

سیرت خیر البشر ۔ سیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں آنحضرت صلعم کے مکارمِ اخلاق بیان کیے گئے ہیں ۔ قیمت ...

نیک بی بی ۔ مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے ۔ نیک بی بی کس طرح اپنے شوہر کو خوش رکھ سکتی ہے ۔ قیمت ...

چھوٹا شیطان ۔ مصنفہ مولانا ذہین ۔ منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ...

ملنے کا پتہ ۔ انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ روبروئے محکمۂ مالگزاری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

افتخار الحکما نواب حاذق جنگ مرحوم سابق افسر الاطبا فرماتے ہیں

میں نہایت مسرت اور بڑی خوشی کے سات محض بیماروں کی شفا کی غرض سے چند سطور سپرد قلم کرتا ہوں برص (یعنی کوڑ اور سفید داغ) کا علاج نہایت مشکل ہے۔ یہ مرض عموماً بڑھتا ہی جاتا ہے۔ حکیم مولوی محمد عبد القادر صاحب مددگار صدر مخزن الادویہ یونانی سرکار عالی دکن و دار التشخیص و انجمن الاطبا یونانی حیدرآباد دکن خصوصاً علاج برص میں ید طولیٰ رکھتے ہیں صاحب موصوف نے اکثر مرضا برص کا علاج بہت ہی کم مدت میں نہایت قابلیت سے کیا اور بفضلہ کامیاب ہوئے میں نے بچشم خود مرضا برص کا معاینہ کیا ہے۔ بعد علاج جسم بالکل اصلی حالت پر ہو جاتا ہے۔ حکیم صاحب موصوف کی بہترین قابلیت اور مجرب دوا کا اثر ہے میں حکیم صاحب موصوف کو ایسے کٹھن مرض کی دوائے مجرب کی ایجاد پر مبارکباد دیتا ہوں اور پبلک سے زور کے ساتھ سفارش کرتا ہوں کہ وہ برص کے مریضوں کو حکیم صاحب موصوف کے پاس رجوع ہونے کی ہدایت کریں اور مریضان برص کو چاہئے کہ وہ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر حکیم صاحب موصوف سے علاج کرائیں اور اس مرض منحوس سے غافل نہ رہیں۔ وما علینا الا البلاغ

شرحد ستخط (افتخار الحکما حاذق جنگ)

ویپسال بام

بیرونی استعمال کی پرتاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے۔ ہر اقسام کے اعصابی و اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پُر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس وجع مفاصل دمہ۔ درد سر۔ درد سول۔ بچھو کے زہر کیلئے زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال۔ تھوڑی دوا لیکر دن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھانپ دیں اور صاف کریں جو اصحاب بغرض امتحان دوا طلب فرمادیں بخوشی تعمیل کی جائیگی۔

نوٹ۔ ہمارے دوا خانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت تیار رہتا ہے اور نسخہ جات نہایت احتیاط کیساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔

المشتہر۔ جمیس اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگزاری حیدرآباد دکن

مطبوعہ مطبع مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام رام کشن لیتھوگرافر منیجر مطبع

مجلہ

مکتبہ

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کا ماہوار علمی رسالہ

مدیر

محمد عبدالقادر سروری

ایم اے ال ال بی

مجلۂ مکتبہ

۱۔ یہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کا ماہوار رسالہ ہے۔

۲۔ یہ علمی و ادبی رسالہ ہے جسمیں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہوں گے حجم کم سے کم چار جزو ہوگا۔

۳۔ بنظر احتیاط پرچہ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ہر فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

۴۔ قیمت سالانہ (للعہ) مع محصول ڈاک پیشگی چھ ماہ کے لئے (عالہ) فی پرچہ ۶؍

۵۔ اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (صہ) نصف کے لئے (ستہ) اور چوتھائی کے لئے عہ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲½ سے ۲۵ فیصدی تک کمی ہوسکے گی۔

مجلۂ مکتبہ کی خریداری میں مزید سہولت

جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا ساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور درسی کتابیں یکمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے انکے نام رسالہ سال بھر کیلئے بلاقیمت جاری ہوسکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پینتیس روپے کی درسی و دیگر کتابیں بدفعات یا یکمشت نقد خریدیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلۂ مکتبہ بلاقیمت حاضر ہوگا۔ یکمشت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کردیا جائے گا جو حضرات بدفعات کتابیں خریدینگے ان کو ایک رسید دیجائے گی۔ جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبوں کو چاہیے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب صراحت بالا رقم معینہ کی تکمیل ہوجائے وہ رسیدیں "منتظم مجلۂ مکتبہ" کے پاس بھیجدیں رسالہ انکے نام جاری کردیا جائیگا یہ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہوسکتی ہیں اس طرح سے کئی اشخاص مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط وکتابت بتوسط "منتظم مجلۂ مکتبہ" مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن ہونی چاہیے۔

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار آصفیہ (۶۵)

رجسٹرڈ نشان ٹپہ سرکار انگلیشیہ (۰۰۰۰)

مجلّۂ مکتبہ

جلد (۲) شمارہ (۶)

بابتہ ماہ اردی بہشت سنہ ۱۳۳۸ف م مارچ سنہ ۱۹۲۹ء

تصاویر

(۱) مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر صدر اعظم و امیر جامعہ عثمانیہ (۲) راجہ مرلی دھر فتح نواز ونت بہادر بیکنٹھ باش

فہرست

شذرات

اس نمبر پر مجلۂ مکتبہ کی دوسری جلد ختم ہو رہی ہے۔ خدائے تعالیٰ کا صدق دل سے شکر گذار ہونا چاہئے کہ مجلۂ مکتبہ گوناگون رکاوٹون اور برس کے بارہ مہینون کی مخالف ہواؤن کے باوجود افتان و خیزان اپنی زندگی کا ایک سال پورا کرنے کو ہے۔ اس قلیل یا طویل جو کچھ کہئے عرصہ مدت میں اس نے علم و ادب کی کیا خدمت انجام دی اور کس قسم کا لٹریچر پیش کیا اس کا جواب ہمارے پاس کچھ زیادہ نہیں۔ مضامین جلد اول کی فہرست مطبوعہ جلد دوم نمبر (۱) اور مضامین جلد دوم کی فہرست پر جو اس نمبر کے آخر میں شریک ہے ایک سرسری نظر ڈالنے سے اس کی خدمت گذاری کا چھچھلتا ہوا اندازہ بہ آسانی کیا جا سکتا ہے حیدرآباد میں خالص علمی مساعی ادبیات کی بے لوث خدمت کی جو کس مپرسی ہے اور کتابت و طباعت کی جو رکاوٹین رونما ہیں اور جن کی اصلاح شاید کئی برس میں ہو ان کے پیش نظر کارپردازان مجلۂ مکتبہ کچھ بہت زیادہ اپنے ارادون میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تاہم ہم مایوس نہیں ہیں۔ ع رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور۔ یہی موانعات ہمارے ارادون کو مستقل بناتے، ہمارے جوش بڑھاتے، اور ہمت باندھتے نظر آتے ہیں۔ ہم نے جس طرح ابتدا میں بلند بانگ دعاوی پیش کرنے سے احتراز کیا تھا اب بھی خاموشی کے ساتھ مکمنہ خدمت گذاری کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جو لائحۂ عمل ہمارے سامنے ہے اور جن اصولون پر ہم مکتبہ کے ذریعہ اہل حیدرآباد کی علمی سرگرمیون اور کارنامون کو اجاگر کرنے اور مفید مضامین اور زبان و ادب پر محققانہ مقالات سے اردو لٹریچر میں اضافہ کرنے کے آرزومند ہیں ان کا دلفریب طریقہ پر اظہار اتنا اچھا نہیں جتنا کہ عملی ثبوت ہو سکتا ہے۔

۲۹ ماہ حال کو جامعہ عثمانیہ کا چوتھا سالانہ جلسہ عطائے اسناد منعقد ہوا اور ان طیلسائین کو ڈگریاں دی گئیں جو جامعہ میں تحصیل علمی سے فارغ ہو کر میدان عمل میں قدم رکھنے والے ہیں۔ اگرچہ تقریب ایک رسمی جلسہ ہو گئی ہے لیکن اپنے مقصد کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ اس دفعہ نواب سر امین جنگ بہادر ایم اے، ایل ایل، ڈی نے خطبہ دیا جو نہایت پر مغز اور مفید نصائح اور مشورون پر مشتمل تھا ہم اس خطبہ کو مجلۂ مکتبہ میں شایع کرتے لیکن ملک کے تقریباً تمام وقیع اخبار و جرائد میں یہ شایع ہو گیا ہے۔ فاضل خطیب نے

جو نصائح اس خطبہ میں کی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ نہ صرف نوجوان طیلسانین ہی بلکہ پرانے تعلیم یافتہ اور تمام ہندوستانی جامعات کے بوڑھے گراجویٹ بھی اس سے مستفید ہوں اور جو حقیقی مسلمی اسپرٹ پیدا کرنے کا مشورہ اس خطبہ میں دیا گیا ہے اس کو عملی جامہ پہنائیں۔

اس جلسہ کی ایک اہم خصوصیت نواب مسعود جنگ بہادر (سید راس مسعود) بی اے بیرسٹر ایٹ لا کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری کی عطا ہے۔ موصوف کے عہد نظامت تعلیمات میں حیدرآباد میں ادبی و علمی تعلیم میں جو ترقی ہوئی اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ جامعہ عثمانیہ کے تحت تین انٹرمیڈیٹ کالج خواتین کے لئے ایک درجہ اول کا زنانہ کالج اور کلیتہ المعلمین آپ کی تعلیمی خدمات کے نمایاں ثبوت ہیں اگرچہ آپ کی بیشتر توجہ علمی اور ادبی تعلیم کی طرف رہی اور صنعت و حرفت کے مدارس آپ کی توجہ سے محروم رہے لیکن یہ بڑی حد تک وقت کا اقتضا تھا ورنہ آپ صنعت و حرفت کی تعلیم کو بھی بڑا فروغ دیتے۔ جامعہ عثمانیہ کے اصول تعلیم کے نہ صرف آپ اول سے قائل اور ہمدرد تھے بلکہ اس کے زبردست مبلغ بھی۔ آپ کا وہ خطبہ جو جامعہ خواتین پونہ میں دیا گیا تھا اس کا بین ثبوت ہے آپ کو ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دیکر جامعہ عثمانیہ نے آپ کی واقعی علمی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔

اگرچہ آپ خرابی صحت کی وجہ سے نظامت تعلیمات کی خدمت سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے لیکن قومی خدمت کا شوق اور ملک و قوم کا درد آپ کو آرام لینے نہیں دے سکتا تھا۔ جب جامعہ اسلامیہ علیگڈھ کی نیابت امیر جامعہ کے لئے قوم نے آپ کا انتخاب کیا تو آپ بہ خوشی بہر خدمت قوم کے لئے کمر بستہ ہوگئے۔ اس عرصہ میں سرکار عالی نے بھی معتمدی سیاسیات کے لئے آپ ہی کا انتخاب کیا اور اول الذکر خدمت کے انتخاب سے قبل ہی آپ کو معتمد سیاسیات بننے پر راضی ہو جانا پڑا لیکن معلوم ہوا ہے کہ قوم کی خدمت گذاری کیلئے آپ نے تحصیل جاہ و ثروت کا ایثار کر کے معتمدی سیاسیات کی کرسی پر جلوہ گر ہونے کی بجائے جامعہ علیگڈھ کی عنان انتظام اپنے ہاتھ میں لینے اور قوم کی واحد درسگاہ کو سنبھالنے کی جد و جہد کو پسند کیا۔

نہایت افسوس ہے کہ اس ماہ کی ۲۳ ویں کو حیدرآباد کی ایک دیرینہ روزگار اور تجربہ کار و ہر دلعزیز بزرگ ہستی راجہ مرلیدہر فتح نواز ونت بہادر نے وفات پائی۔ بیکنٹھ باشی جامعہ کلکتہ سے امتحان ایف اے پاس کر کے سرکار عالی کی ملازمت میں داخل ہوئے اور سوم تعلقداری کے عہدہ سے ترقی کرتے ہوئے محض اپنی کارکردگی اور اعلیٰ قابلیت سے صدر المہام مالگذاری و صرفخاص مبارک کے

بلند تریں تک پہنچے اور انتقال کے وقت تک صدر المہامی صرف خاص مبارک پر فائز رہے۔
آپ نے سررشتۂ مالگذاری میں ملک و حکومت کی جو شاندار اور اعلیٰ خدمات انجام دی
ہیں اس پر ملک و حکومت کی طرف سے بار بار خراج تحسین حاصل کیا اور اپنے وسیع اخلاق، غربا پروری
رحمدلی اور قدر شناسی کے لئے تو سارے ملک ہی میں نہیں بلکہ بیرونی ممالک محروسہ سرکار عالی میں
بھی بڑی شہرت رکھتے تھے۔ بیگم صاحبہ بھوپال نے کئی مرتبہ آپ کو اپنی ریاست کا دیوان بنانا
چاہا مگر آپ نے اپنے آقائے قدیم سرکار عالی کی خدمت انجام دینے اور حق نمک ادا کرنے کو
بھوپال کی وزارت عظمیٰ پر ترجیح دی۔ مہاراجہ صاحب کو علم و ادب اور بالخصوص شاعری سے جو
خاص انس تھا وہ بہت کم لوگ جانتے ہیں آپ اپنے اوقات فرصت کا بہترین مصرف اردو فارسی
شاعری کا خاموش مطالعہ ہی سمجھتے تھے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کی
بعض علمی تصانیف بھی ہیں اور ابتدا میں آپ نے اپنے علمی کارناموں کو
شائع بھی کیا تھا انشاء اللہ آپ کے علمی و ادبی کارناموں پر آئندہ روشنی
ڈالی جائے گی۔

ہم معذرت خواہ ہیں کہ یہ نمبر غیر معمولی تعویق سے شایع ہو رہا ہے۔ اس کا سبب
اراکین مکتبہ ابراہیمیہ کا طاعونی پریشانیوں میں مبتلا ہو جانا ہے جس کی وجہ سے کارکنان
رسالہ کوئی تین ہفتہ اس قدر پریشانیوں اور مصیبتوں میں گھرے رہے کہ طباعت و اشاعت
کی طرف توجہ ہی نہ ہو سکی۔ اس کی تلافی کے لئے ہم نے آئندہ نمبر بہت ہی جلد شایع کرنے
کا اہتمام کیا ہے اور انشاء اللہ یہ نمبر متعدد تصاویر اور بہترین مضمونوں سے مزین ہو کر ایک ہفتہ
کے اندر ہی ناظرین کی خدمت میں حاضر ہو گا۔ "س۔م"

---

*

"شبلی اور جدید شاعری"

از جناب احمد عبد اللہ صاحب مسدوسی بی، اے،

رسکن (RUSKIN) اپنے ادبی دوست ہیارسن (HARRISON) کے متعلق ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"ادبیات کی دنیا کا آسمان جس پر مسٹر ہیارسن و مدار ستارے کی طرح خوب گردش کرتے کبھی ایک ستارے کے اطراف اور کبھی دوسرے کے گرد بغیر کسی ذاتی صاف اور سرخ تابانی کے چکر لگاتے ہیں بالکلیہ تصنیف و تالیف کی اس ملکوتی حالت سے جداگانہ ہے جس کی شعاعوں سے آج کل ہماری آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں اور ہماری رہنمائی ہوتی ہے۔"

یہ قول بعینہ شبلی پر صادق آتا ہے۔

شبلی نے اتنے مختلف النوع مضامین اور فنون پر قلم اٹھایا ہے اور اس عجیب طریقے سے اس سعی میں کامیابی حاصل کی ہے کہ بے اختیار ہماری زبان پر تعریفی کلمات جاری ہو جاتے ہیں ان کا اشہب قلم جس طرح تاریخ کی سنگلاخ وادیوں میں فقہ، و اصول فقہ، حدیث و تفسیر کے صحراؤں میں کلام و الہٰیات کے خشک اور چٹیل میدانوں میں فلسفہ کی بھول بھلیاں میں، ادبیات کے گلزاروں میں اور تنقید کے پل صراط پر سرپٹ دوڑتا ہے اسی طرح شعر و سخن کی مجالس میں بھی اپنی جولانی دکھلاتا ہے اور جس طرح ان کی نثر اپنے موضوع کی اہمیت، طرز بیان کی شگفتگی استدلال کی پختگی، نظر کی وسعت اور گہرائی کے لئے مشہور ہے اسی طرح ان کی نظم بھی ان تمام صفات کی کم و بیش حامل ہے جو کسی کامیاب کارنامہ کی جان کہی جا سکتی ہیں ان کی تمام تصانیف کا مطالعہ کیجئے، زور، روانی، فصاحت و بلاغت اور صنعت و موضوع بر

کامل قدرت اور اس کے انتخاب میں صحیح مذاقی قدم قدم پر آپ کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کریگی۔ آپ ان کی نثر پڑھتے ہیں اور الفاظ و محاورات کی برجستگی، خیالات کے اچھوتا پن الفاظ و معانی کی ہم آہنگی اور اتار چڑھاؤ میں گم ہو جاتے ہیں۔ آپ ان کی نظم سنتے ہیں اور اس کی روح سے متاثر ہوتے ہیں اور محسوس کرنے لگتے ہیں کہ شاعر ہم سے کوئی کام کی بات ایسے پیرایہ میں بیان کرنا چاہتا ہے جس کی تعریف نہ کرنا ظلم ہے اور جس کا اثر یقینی ہے۔ الغرض شبلی اپنے مضامین کے تنوع اور مذاق کی ہمہ گیری کا لحاظ کرتے اردو کے مکالے اور والٹیر ہیں وہ کمانڈر کی طرح جو میدان جنگ میں فوج کے متعدد دستوں کی رہنمائی کرتا ہے، تاریخ ادب، شاعری، تنقید، سیرت نگاری فلسفہ و کلام، تفسیر، حدیث اور فقہ و اصول فقہ کو اٹھاتے ہیں اور ان کے بے جان قالب میں مسیحا نفسی کے ذریعہ روح پھونکدیتے ہیں۔ ان کا ذوق ادب کان نمک ہے جس کے اندر جانے کے بعد ہر شئے "نمک شد" کے مصداق رنگین ہو جاتی ہے۔ ہر قسم کے علوم و فنون کو جیسی صاف اور رنگین زبان میں انھوں نے ادا کیا ہے اس سے جہاں ان کے کمال انشاپردازی کا ثبوت ملتا ہے وہاں اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ شعریت کا عنصر بھی ان کے اندر کس دریا دلی سے مبدء فیاض نے ودیعت کیا تھا ان کا ذوق ادب وہ جادو کی چھڑی ہے جس کے چھو لیتے ہی خشک سے خشک مضمون بھی اپنی لطافت و رنگینی کا دعویدار نظر آنے لگتا ہے اس سے اس امر کے پتہ چلانے میں بڑی آسانی ہوتی ہے کہ شبلی کا پایہ اردو شاعری میں کیا ہے۔ ؟

حقیقت یہ ہے کہ شبلی نے اپنی شاعری کو مہتم بالشان بنانیکی کوشش اس لئے نہیں کی کہ "انہوں نے بذات خود اس کو اپنا قابل فخر کارنامہ نہیں قرار دیا" یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کوئی نظم اس خیال سے نہیں لکھی گئی کہ ان کو پبلک کے سامنے کبھی بہ حیثیت شاعر کے پیش کیا جائیگا جس طرح اور مختلف علوم و فنون پر انھوں نے اپنی معلومات اور طباعی سے مجبور ہو کر کتابیں لکھی ہیں اسی طرح کبھی کبھی جذبات دلی، شاعرانہ قوت یا زمانہ کی ضروریات سے مجبور ہو کر نظمیں کہی ہیں جن کو آج ہم تنقید کی کسوٹی پر کسکر ان کے حسن و قبح کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا لٹریچر کے اندر کیا پایہ ہے ؟ ان کے موجودہ کلام کی نوعیت اس امر کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ اگر وہ ادبیات

کی جانب ہر طرف سے کٹکر ہمہ تن متوجہ ہو جاتے تو اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ اردو شاعری کو فائدہ پہنچا سکتے تھے، ان کے صحیح تنقیدی زاویہ نگاہ موازنہ اور شعرالعجم کا جو تھا صحیح ثبوت ہیں۔ مشرقی، عربی و فارسی شاعری کی تاریخ اس کے عہد بعہد کے تغیرات و خصوصیات کامل آگاہی اور موجودہ یورپی خیالات اور اصول سے فی الجملہ واقفیت اور اعلی فلسفیانہ نکتہ سنجی و نکتہ آفرینی یہ تمام صفات کسی پر عظمت شاعری کی عمارت کی تیاری میں بنیاد، اینٹ، پتھر اور چونے کا کام دیتی ہیں۔ وہ دبستان علم و فضیلت کے وہ ذہین اور طباع طالبعلم ہیں جو امتحان میں بحیثیت مجموعی اول ٹھہرنے کے علاوہ جداگانہ طور پر بھی ہر مضمون میں اول آتا ہے، ہر شعبہ کو اپنا آرزومند پانے کے بعد بالاخر کسی ایک شعبہ کو اپنے انتہائی امتحان کی تکمیل کے لئے اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن جب دوسرے فنون میں اپنے سے کم تر درجہ کے طلباء کو مہارت حاصل کرکے برتری اور کمال کا دعویدار پاتا ہے تو یہ کہتے ہوئے کہ ؎

کہاں فطری ترقی کی امنگیں ———— کہاں ٹھوسی ہوئی چیزوں کا آنا ہے

اپنی جولانی طبع کا ثبوت پیش کر دیتا ہے۔

شبلی کا مجموعی کلام اس امر کی کافی سند ہے کہ ان کو اردو شعراء کی صف میں ممتاز جگہ ملنی چاہیئے، جدید شاعری کی منزل کی تلاش میں شعراء کا جو قافلہ روانہ ہوا تھا وہ برسات کی اندھیری رات کی طرح اس آسیب زدہ جنگل اور میدان میں بھٹک گیا تھا جہاں شیطانی چراغ سائنیس آج کل جس کو فاسفورس کی کرشمہ سازیوں سے تعبیر کرتی ہے۔ رات بھر بھٹکاتے اور ہر ہر قدم پر پستی کا دھوکہ دیتے ہیں۔ لیکن اس قافلہ میں صرف شبلی ہی ایسے ہیں جو تھوڑی دور ساتھ چلنے کے بعد لاحول پڑھ کر اس آفت سے رہائی پاتے اور بے فائدہ رات بھر کی تگ ودو سے بچنے کی خاطر اپنی جگہ پر ٹھیر جاتے اور پھر صبح صادق کی روشنی میں اپنے سفر کو جاری رکھتے ہیں۔ اگرچہ مقام افسوس ہے کہ پیام مرگ بہت جلد ان کو منزل مقصود تک پہنچنے سے روکدیتا ہے شبلی اِبع کارے دنیا کسے تمام نہ کرد تاہم وہ قافلہ کے اور افراد کی طرح اپنی طاقت کو ضائع ہونے سے بچاتے ہیں۔

علیگڈھ کی زیادہ تر تعلیمی اور کم تر اصلاحی تحریک نے جہاں ہماری جدید شاعری کے اولین طبقہ کیلئے تیار تصویر کی پشت کا کام دیا اور ان کے تخیل کو تلاش و جستجو کی مشکل سے بچا کر عارضی اور موقتی

کامیابی سے خوش کر دیا ہے وہاں ان کی زندگی کے لئے چیلنج بھی ہے۔

موقتی تحریکیں اور مخصوص العہد خیالات و معتقدات جہاں بے انتہا نظر فریب اور بادی النظر میں کامیابی کے ضامن ہوتے ہیں وہاں اسی قدر وہ چھلاوہ اور دھوکہ ثابت ہو سکتے ہیں اس لئے شعراء کو زمانہ کے واقعات اور خیالات کی رنگ آمیزی میں بے انتہا محتاط رہنا چاہئے۔ عارضی اور ناپائدار رنگ و روغن سے جو تصویریں تیار کی جائیں گی ان کے متعلق مصور کو خوب یقین کر لینا چاہئے کہ ان کی بہار چند روزہ ہے چاہے ان کے اندر کیسا ہی سہانا سماں اور جذبہ ظاہر کیا گیا ہو۔ ملک الشعراء لارڈ ٹینی سن (TENNYSON) سے زیادہ دلکش اور دلفریب اور کس کی تصویریں ہو سکتی ہیں؟ مگر نقادان کے برباد جانے کی پیشین گوئی کرتے ہیں اور زوال کی علامتوں کو ان کے اندر نمایاں دیکھتے ہیں۔ دنیا کے تمام کامیاب شعراء نے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اپنی شاعری میں اس اصول کو مرعی رکھا اور "دور زمانہ" کو اس پر حاوی کرنے کے بجائے اپنی شاعری کو اس پر حکمران کیا ہے۔

(۲)

شبلی کی شاعری کے دو دور ہیں پہلا دور حالی کی طرح علیگڈھ کی اصلاحی اور علمی تحریکات سے متعلق ہے اس لئے ان کی نوعیت پر زیادہ بحث کرنا فضول ہے البتہ اس کو پیش نظر رکھکر انکی شاعرانہ قابلیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے یہ دور قدیم شاعری کے خلاف بغاوت ہے اور دوسرا دور جس کا آگے ذکر آئیگا جدید شاعری کی مخالفت یا اصلاح کا پہلا قدم ہے۔

ابتداً وہ علیگڈھ سے متعلق اور سر سید کے مشن کے بڑے سرگرم موید تھے اس کے لئے ان کی ان نظموں میں خلوص، درد، جوش اور اثر معلوم ہوتا ہے۔ حالی کی طرح ان کے الفاظ دھیمے، نرم اور ملائم نہیں ہوتے بلکہ ان میں ایک قسم کی کھلی ہوئی تڑپ اور بے چینی پائی جاتی ہے لیکن اس بے چینی اور تڑپ میں کبھی کبھی ان کی سنجیدہ مذاقی اور حکیمانہ طبیعت ہویدا ہو کر ایسے جواہر پاروں کی تخلیق کا باعث بن جاتی ہیں جو ذوق سلیم کا سامان ہیں۔ حالی کی طرح ان کی تصویریں بھڑکدار اور چمکیلی نہ سہی صاف اور گل بوٹوں سے عاری سہی لیکن ان میں زندگی اور پائداری کے آثار پائے جاتے ہیں مثلاً ان کی نظم "دعوت عمل" کے ان اشعار کو پڑھیئے۔

دو اہر بار جب اپنا اشاالثاہی کھلائے   تو بس سمجھو کہ اب بیمار کوئی دم کا مہمان ہے

جو سچ پوچھو تو ہے اسلامیوں کی بس یہی حالت مرض دونا بڑھا دیتی ہے خود وہ نسخے جو درماں ہے
سلف کا تذکرہ جو ہمت و غیرت کا ہے افسون ہمارے حق میں وہ سرمایۂ خواب پریشاں ہے
یہ افسانے بڑھاتے ہیں ہماری نیند کی شدت یہ افسون اپنے حق میں اور بیہوشی کا ساماں ہے
ہمیں احساس تک ہوتا نہیں اپنی تباہی کا کہ سب پیش نظر اسلام کی وہ شوکت و شاں ہے
ہماری کلفتیں سب دور ہو جاتی ہیں یہ سنکر کہ دنیا آج تک اسلام کی ممنون احساں ہے
مزے لیتے ہیں پہروں تک کسی سے جب یہ سنتے ہیں کہ یورپ دولت عباس کا ابتک ثناخواں ہے
نہیں رہنے کو یاں گھر تک مگر چرچے یہ رہتے ہیں کہ اب تک قصر حمرا، قبلہ گاہ رہ نوردواں ہے
ہیں خود ان پڑھ مگر اس زعم میں اتراتے پھرتے ہیں کہ دنیا میں ہمیں سے زندہ ابتک نام یوناں ہے
نظر آتے ہیں ہم کو عیب اپنے خوبیاں بنکر ہم اپنے جہل کو بھی سمجھتے ہیں کہ عرفاں ہے
بسر ہوتی ہے گر اوقات فیاضی پہ غیروں کی تو سمجھے ہیں کہ بس زہد اور توکل کی یہی شاں ہے
حمیت اور خودداری نہیں ہے گر طبیعت میں تو اچھا ہے کہ مسکینی تو اول شرط ایماں ہے

تو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر شگفتگی اور کیف بھی موجود ہے ان کی شاعری کا عام رنگ بھی ہے مسلسل نظموں میں ایک نہایت ضروری شرط ہمواری ہے۔ غزل میں اگر دو تین شعر لطیف ہوں تو بھرتی کے کئی شعر بھی کھپ سکتے ہیں لیکن نظم میں ایسا نہیں ہو سکتا اگر ایک شعر بھی پایہ اعتبار سے گرا ہوا اور ادنیٰ پایا جائے تو نہ صرف اس کی دل کشی کو برباد کردیگا بلکہ شاعر کی کامیابی میں طرح ہوگا۔ غزل کو اس پہاڑی نالے سے تشبیہ دے سکتے ہیں، جو کبھی بلندیوں سے اچھلتا، کودتا اور شور کرتا ہوا بہتا ہے اور کبھی پستیوں میں خاموش اور گم ہو جاتا ہے اور نظم کو اس دریا سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو میدانوں میں چمکتا، بل کھاتا اور نیچے سروں میں گاتا ہوا یکساں ہمیشہ نظروں کے سامنے اپنی منزل مقصود کی طرف بہتا چلا جاتا ہے۔

اس لحاظ سے شبلی کی نظموں میں یکسانیت کا پایا جانا ان کے کلام کے لئے نیک فال ہے اور اسی بناء پر ہم ان کی مثنوی "صبح امید" کو حالی کی مسدس کا ہم پلہ ٹھرانے پر مجبور ہیں حالی سرسید کے توجہ دلانے سے یاس و قنوط کے خیالات کی اشاعت کو روکنے کی خاطر جن کے پیدا ہونے کا ان کی "مسدس" سے ایک قوی شبہ پیدا ہو گیا تھا مسدس میں امید کا ضمیمہ زیادہ کرتے ہیں عنوان کا لحاظ کرتے حالی کا یہ ضمیمہ صبح امید کا مقابل ٹھرتا ہے لیکن حقیقت میں یہ مثنوی مکمل مسدس کے مقابل کی

شئی ہے کیونکہ اس میں بھی فطری طور پر ترقی کی امید کے آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے تنزل کی سیاہی اور یاس انگیز شام کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اس مثنوی اور مسدس کا بالمقابل مطالعہ کر کے ان دونوں عظیم الشان ادبی ہستیوں کی قابلیتوں اور شاعرانہ استعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس خاص زاویہ نگاہ سے مسدس پر جو قوی اور پہلا اعتراض وار دہوتا ہے یہ ہے کہ اس کے دونوں حصے دوسرا اور تیسرا متناسب نہیں ہیں۔ تنزل و پستی کی ایسی طویل اور مفصل داستان کا علاج یہ ضمیمہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ بیماری جس درجہ مزمن و مہلک ہو اسی درجہ کی دوا ہونی چاہیے تریاق کو زہر کے اثر سے مناسبت ہونی چاہیے جس مایوسی اور حسرت کو محسوس کرنے سے وہ بھی نہ محفوظ رہے اس کو اتنی آسانی سے دفع کرنیکی کوشش بے سود ہے۔ چولھا جب بجھ جاتا ہے تو اسکو روشن کرنے کے لئے دونی آگ اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن شبلی کی مثنوی میں یہ خامی نہیں ان کی نگاہوں کے سامنے سے کبھی اصل مقصد اوجھل ہونے نہیں پاتا اس لئے وہ اسلام اور مسلمانوں کی پستی کا اتنا ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جتنا الاشیاء تعرف باضدادھا کے مدنظر ضروری ہے وہ چولھے کو روشن کرنے کے لئے اس کو بجھا نہیں دیتے بلکہ ہوشیار مالک کی طرح ٹھنڈا ہونے کا خوف دلا کر ملازم کو کوئلے جھونکنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ دوسرے حالی کی طرح جگہ جگہ پر پھر دوبارہ یاس انگیز خیالات کے اظہار سے جن کے لئے ان کا "قنوطی" زاویہ نگاہ ذمہ دار ہے اصل غرض کو کمزور نہیں کرتے ضمیمہ امید پر لکھا گیا تھا لیکن اس کا نصف سے زیادہ نہیں تو نصف کے قریب حصہ ایسا ہے جس میں امید کی جھلک کی بجائے یاس و ناامیدی کا ڈراؤنا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔

اگر کہا جائے کہ اس سے مسدس پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ وہ ایک غمناک اور ٹریجک نظم ہے اور اسی لحاظ سے جس کو عیب کہتے ہو وہی حسن ہے ضمیمہ کے اندر "رجائی" پہلو کا نمودار ہونا کم ور دکی بات ہے جس کا رد کھا پھیکا ہونا ہی شاعر کے کمال پر دلالت کرتا ہے تو بے شک یہ ایسی تاویل ہوگی جو اصل مسدس کے بچاؤ میں کی جا سکتی ہے لیکن جہاں تک ضمیمہ کا تعلق ہے کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا اور ماننا پڑتا ہے کہ وہ ناکامیاب سعی ہے لیکن مثنوی صبح امید کا حال اس سے بالکل مختلف ہے اس میں بھی مسلمانوں کی پستی اور مذلت کے مرقع پیش کئے گئے ہیں اور ایسی خوبصورتی اور کمال سے پیش کئے گئے ہیں کہ داد دینی پڑتی ہے مثلاً ؎

سمجھے نہ ذرا کہ وقت کیا ہے؟
کس سمت زمانہ چل رہا ہے ؟

نیرنگیوں پہ نہ کچھ نظر کی
یعنے کہ ہوا ہے اب کدھر کی

کیا پیش ہے کیسی صورتیں ہیں
کیا وقت ہے کیا ضرورتیں ہیں

رنگ و روش سپہر کیا ہے ؟
اب طرز خرام دہر کیا ہے

ہیں چرخ کی اب نئی ادائیں
چلنے لگیں اب نئی ہوائیں

چھیڑے جو گئے نئے فسانے
نغمہ وہ رہا نہ وہ ترانے

پھونکا ہے فلک نے اور افسون
اب رنگ زمانہ ہے دگرگوں

سیّارے ہیں اب نئی چمک کے
وہ ٹھاٹھ بدل گئے فلک کے

اب صورت ملک و دین نئی ہے
افلاک نئے زمین نئی ہے

سب بھول گئے ہیں ماسبق کو
گردوں نے الٹ دیا ورق کو

تیور جو بدل گئے قضا کے
ڈھنگ اور ہیں چرخ فتنہ زا کے

میخانہ اولین ہمارا
وہ جام وہ ساغر نگین ہمارا

وہ لطف کے تذکرے وہ فرصت
وہ گرمیٔ انجمن وہ صحبت

وہ سحر و فسون گری زباں کی
وہ طرز وہ شوخیاں بیاں کی

وہ درج درِ سخن ہمارا
گنجینۂ علم و فن ہمارا

جو زینت و تاج تھے ہمارے
جو مایۂ ناز تھے ہمارے

جس باغ کے برگ و ساز تھے ہم
یعنے کہ چمن طراز تھے ہم

جو دشت تھا سبزہ زار ہم سے
جس باغ پہ تھی بہار ہم سے

جس بزم کے میگسار تھے ہم
جس ملک کے تاجدار تھے ہم

جھونکے جو چلے نئی ہوا کے
آغوش میں آ گئے فنا کے

وہ بزم رہی نہ جام و ساغر
اک بار الٹ گیا وہ دفتر

از بسکہ ذلیل و خوار ہیں ہم
افسانۂ روزگار ہیں ہم

ہے اوج پہ بخت بد ہمارا
دیکھے کوئی جزر و مد ہمارا

اب عیب ہیں سب ہنر ہمارے
ہیں پوتھ سے کم گہر ہمارے

کیا کوئی سنے فغان ہماری
دلدوز ہے داستان ہماری
ہم مایۂ عبرت جہاں ہیں
ہم ننگ زمین و آسماں ہیں
ناچار ہیں خستہ حال ہیں ہم
عبرت کدۂ زوال ہیں ہم
مٹنے پہ ہے اب نشان ہمارا
گم گشتہ ہے کاروان ہمارا

کس قدر دلدوز داستان ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بلبل باغ کے اجڑ جانے پر فریاد کر رہی ہے ایک کامیاب وکیل اور فطرت شناس مقرر کی طرح شبلی پہلے مخالفت کے تمام پہلوؤں پر جامعیت اور جوش سے اظہار خیال کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد اپنے مقصود کو ثابت کرنے کا فطری طریقہ اختیار کرتے ہیں ان کی یہ فغان اس بلبل کی آہ و بکا ہے جو بہار کی آمد آمد پر خوش ہو کر بے اختیار ایک مرتبہ جذبات کے غلبہ کے عالم میں گل سے چمن میں فراق کے زمانہ کے مصائب کا ذکر شروع کر دیتی ہے۔ قوم کی تباہ حالی کا دکھڑا بیان کرنے کے بعد ان کے کان میں آواز آتی ہے ؎

ماتم ہی تھا لب پہ آئی ناگاہ
اک سمت سے اک صدائے جانکاہ
اس شان سے تھی وہ آئی دلگیر
پہلو میں اثر، بغل میں تاثیر
دل ہاتھ سے لینے میں تھی بلا تھی
جادو تھی؟ فسون؟ جانے کیا تھی؟
ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں
نشتر سی اتر گئی جگر میں

تو اس سمت بڑھتے ہیں جہاں وہ ایک پیر دیرین باجاہ و تمکیں کے جلو میں دانش طلبان نکتہ دان اور عیسیٰ نفسان خوش بیاں" کا ایک گروہ نظر آتا ہے جو وہ یادگار ایام" مدرسۃ العلوم اسلام" قائم کرتا ہے جو صبح امید کی پہلی کرن ہے۔

قائم ہو باتفاق باہم
اک مدرسۃ العلوم اعظم
جو قوم کا امن و مقر ہو
درماں ہو طبیب چارہ گر ہو
وہ کعبۂ آرزو ہمارا
ہر غم میں ہو چارہ جو ہمارا
آئین و اصول فن بتائے
آداب معاشرت سکھائے
وہ درس گہ خجستہ انجام
ہو پشت و پناہ قوم اسلام
ہر عقدہ آرزو کرے وا
مرکز ہو ہماری حاجتوں کا

درماں ہو مریض خستہ جاں کا	مرہم ہو جراحت نہاں کا
نادار تھا یا کہ اہل زر تھا	ہر اک کا یہ مطمح نظر تھا
روشن ہو یہ شمع راہ حاجت	تعمیر ہو قبلہ گاہ حاجت
آخر بہزار جاہ و اجلال	طالع ہوا آفتاب اقبال
روشن ہوئی بزم گاہ امید	نکلا افق شرف سے خورشید
قائم ہوا یادگار ایام	وہ مدرستہ العلوم اسلام
یہ ماحصل نالہائے شبگیر	یہ قوم کی آرزو کی تصویر
یہ ادج وہ خیال امید	یہ قوم کا نونہال امید
صد شکر کہ آج بارآور ہے	جو شاخ ہے اس کی پرثمر ہے
لایا ہے وہ برگ و بار کیسا	اعدا کو ہے خار خار کیسا
بخت اس کا جو آج اوج پر ہے	ہر لحظہ بر رونق دگر ہے
یہ اس کی ترقیوں کا ہے طور	کل اور تھا آج ہو گیا اور
پہلے سے یہ آب و تاب ہے آج	کل شمع تھا آفتاب ہے آج
اس چشمۂ فیض سے ہے سیراب	بنگال سے تا حدود پنجاب
دانش طلبان قوم اکثر	ہیں جمع ہر اک جگہ سے آکر
کس نخل کے یاں ثمر نہیں ہیں	کس کان کے یاں گہر نہیں ہیں
اس باغ میں کوئی آکے دیکھے	اسلام کے ہونہار پودے

یہ نظم فی الحقیقت علیگڈھ کی تحریک کی تائید اور سرسید کی تعریف میں لکھی گئی ہے اور جہاں تک اس مقصد کا تعلق ہے وہ بے مثل ہے علیگڈھ کی تحریک اور سرسید کی کوششوں کا جو زبردست نقش اس مختصر سی مثنوی کو پڑھکر دل پر ثبت ہو جاتا ہے وہ ایسا ہے کہ ہمیشہ اس نظم کی کامیابی کا ذمہ دار بنا رہیگا۔ سرسید کے کیریکٹر کو اس نظم میں اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر ان کی عظمت اور زبردست شخصیت کا لافانی اور لامٹ اثر بیٹھ جاتا ہے، مشتاق حسین، مہدی علی، اور سید اشرف علی وغیرہ کا ذکر کرنا اور سرسید کے نام کو ختم مثنوی پر سرسری طور پر ظاہر کرنا وہ انتہائی .

بلاغت اور موقع شناسی ہے جو اس نظم کی خوبیوں میں سے ہے وہ قوم کی تباہ حالی کے ذکر کے بعد ہیرو یعنی کا ذکر کرتے ہیں اور عوام کی مخالفت اور ناراضی کے مدنظر اس کا نام نہیں بتاتے ایک شعر کے بعد دوسرا شعر مطالعہ کرنے والے کے دل میں عظمت و احترام کی اینٹ بنکر عمارت تیار کرتا جاتا ہے تا آنکہ نظم ختم ہو جاتی اور وہ سرسید کے متعلق قائم کردہ رائے کی تبدیلی پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کردار نگاری ہماری شاعری میں مفقود ہے مراثی کے کیریکٹر کو مستثنےٰ کر دیجئے جن میں ترقی و اصلاح کی بڑی گنجائش ہے۔ تو اس کا خانہ خالی نظر آئیگا اردو زبان کو مستقبل میں خاص اس ضمن میں ترقی کی ضرورت ہے ایسی حالت میں ہم کو خلاف توقع اس بے مثل کردار نگاری کو شبلی کے کلام میں پاکر جو بے اندازہ خوشی حاصل ہوتی ہے وہ ہمارے سر کو فخر سے اونچا کر دیتی ہے۔ جتنی نظمیں سرسید اور علیگڈھ سے متعلق لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے کسی میں بھی وہ کیف اور عجیب و غریب سحر موجود نہیں ہے جو اس مثنوی میں پایا جاتا ہے شکسپیر کا سب سے بڑا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنے کیریکٹر کا غیر محسوس طور پر موقع بہ موقع اس طرح کردار نمایاں کر دیتا ہے کہ پڑھنے والے کو کبھی اس کی اس کوشش کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ جولیس سیزر میں بروٹس، کیاسیس اور انٹونی کے کردار کو اس طرح مختلف واقعات، حالات اور اعمال کے ضمن میں نمایاں کیا گیا ہے کہ شکسپیر کی اس سعی کی طرف کبھی پڑھنے والے کا دھیان نہیں جاتا لیکن باوجود اس کے غیر محسوس اور غیر ارادی طور پر دماغ کے خانہ میں ترتیب وار نام بنام یہ واقعات منسلک ہوکر اس کے کردار کو بناتے اور روشن کرتے ہیں اسی طرح اس مثنوی میں سرسید کے کردار کا حال ہے کہ کہیں پڑھنے والے کے دل میں خیال بھی نہیں گذرتا اور نہ شاعر کوشش کرتا ہے کہ اپنے ہیرو کی عظمت و شخصیت کا سکہ بٹھائے بلکہ اپنے اصلی مقصود کو پیش نظر رکھکر چند خیالات کو جو زنجیر کی طرح ایک مقصد اعلیٰ کے تحت جکڑے ہوئے ہیں اور کتاب کے پراگندہ اوراق کی طرح ایک شیرازہ میں بندھے ہوئے ہیں۔ کہتا ہے۔ قوم کی بے جان مشین کے اندر اپنے چشم و ابرو کے ادنیٰ اشارے سے حرکت پیدا کرنا سرسید کے کیریکٹر کو اس طرح مکمل بنانا ہے جسطرح شکسپیر نے اپنے مشہور عالم ڈرامہ داستان کیاسیس کے کیریکٹر کو واضح اور مکمل کیا ہے ذیل کے اشعار جو

مکمل نہیں ہیں شاید اس تصویر میں رنگ بھر سکیں۔

دیکھا تو وہاں بجاہ و تمکین　　آیا نظر ایک پیر دیرین
صورت سے عیاں جلال شاہی　　چہرہ پہ فروغ صبح گاہی
وہ ملک پہ جان دینے والا　　وہ قوم کی ناؤ کھینے والا
اٹھتے ہوئے جوش سے برقت　　ہے مرثیہ خوان قوم و ملت
اب وقت اخیر ہے خبر لو　　جو کچھ کرنا ہے اب بھی کر لو
تا دیر وہ قوم کا فدائی　　وہ خضر طریق رہنمائی
اٹھتے ہوئے جوش دل سے پیہم　　عبرت کا دکھا رہا تھا عالم
افسانۂ غم سنا کے چھوڑا　　سوتوں کو جگا جگا کے چھوڑا
جادو کی بھری ہوئی وہ تقریر　　ہونٹوں سے ٹپک رہی تھی تاثیر
ترغیب کے ساتھ ساتھ تہدید　　کچھ یاس تو کچھ نوید امید
کچھ لطف بھی تھا عتاب کے ساتھ　　تھا زہر بہ قند نبات کے ساتھ
باتوں میں اثر تھا کس بلا کا　　اک بار جو رخ پھرا ہوا کا
امید کی بڑھ گئی تگ و تاز　　اونچی ہوئی حوصلوں کی آواز
خواہش کے بدل گئے ارادے　　ہمت نے قدم بڑھائے آگے
جو تھا وہ عجیب جوش میں تھا　　مخمور بھی اب تو ہوش میں تھا
وہ کشتۂ قوم وہ فدائی　　اٹھا لئے کاسۂ گدائی
ایک ایک سے عرض حال کرتا　　در در وہ پھرا سوال کرتا
ہر بزم میں ہر انجمن میں پہونچا　　ہر باغ میں ہر چمن میں پہونچا
کاوش سے غرض تھی کچھ نہ کد سے　　ملتا تھا ہر ایک نیک و بد سے
مردان خدا پرست سے بھی　　رندان سیاہ مست سے بھی
پستی سے ملا فلک کی صورت　　ذروں میں رہا چمک کی صورت
دانش طلبان نکتہ آموز　　کم حوصلگان حیلہ آموز
مطلب کا ہر اک سے تھا طلبگار　　ہر خوان سے تھا وہ ذلہ بردار

گزرا وہ ہر ایک رہگزر پہ — دی اس نے صدا ہر ایک در پہ
کس بزم میں یہ فغاں نہ پہونچی — آہ اس کی کہاں کہاں نہ پہونچی
ہر ایک کو یہ ماجرا سنایا — ہر بزم میں اپنا راگ گایا
نالے کیے داغ دل دکھا کر — رویا کبھی حال غم سنا کر
کیا کیا نہ مصیبتیں اٹھائیں — ہر طرح کی ذلتیں اٹھائیں
ناکام رہا صدائیں دے کر — دشنام سنی دعائیں دے کر
گویا اک طلسم کا ہدف تھا — وہ شیفتہ پھر بھی سر بکف تھا
یہ ہمتیں گو تھیں ساتھ اس کے — بے زور تھے پر جو ہاتھ اس کے
آگے وہ بڑھا ہٹا کے سب کو — طے کر کے رہا رہ طلب کو
آئے تھے جو سنگ راہ بنکر — سب اڑ گئے برگ کاہ بنکر
کی خس نے اگرچہ لاکھ تدبیر — صرصر کا نہ ہو سکا عنان گیر
آتش پہ ٹھہر سکا نہ سیماب — خاشاک سے رک سکا نہ سیلاب
باطل کو جو حق نے کر دیا پست — اب نیست نے پائی صورت ہست
آہوں نے دکھائی اس کی تاثیر — کام آئے وہ نالہائے شبگیر

علیگڈھ کی پیداوار میں یہ مثنوی ایک ایسا کارنامہ ہے جو مسدس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور اس کی ہمسری کا دعوی دار نظر آتا ہے ناول اور مختصر قصوں میں جو تعلق ہوتا ہے وہی نسبت مسدس کو مثنوی کے ساتھ ہے جس طرح ناول میں پھیلنے اور سمٹنے کا خداداد موقع رہتا ہے اور جس کی عدم نگہداشت اکثر اوقات ناول نویس کی ناکامی کا سبب بن جاتی ہے اسی طرح مسدس کے ناصیۂ جمال کے لیے پھیلنے اور سمٹنے کی خداداد قابلیت کی کمی اور نظر اندازی بدنما داغ ہیں اور جس طرح مختصر افسانوں میں بالغ نظری اختصار اور اصل قصہ کا ارتقاء فن کار کی مہارت کا غماز ہوا کرتا ہے "صبح امید" اسی طرح شاعر کی ذہانت اور فن دانی کی نشانی ہے مسدس ایسے لاتعداد خوبصورت حلقوں سے مرکب ہے جو غیر متناسب اور بے جوڑ ہیں برخلاف اس کے مثنوی کے اندر چند محدود حلقے ہیں جو باہم دگر متناسب طور پر جڑے ہوئے ہیں اس لیے دیکھنے میں بہ حیثیت مجموعی خوبصورت نظر آتے ہیں۔

یہی حال اُن کی "تماشائے عبرت" کا بھی ہے یہ مسدس نہایت مختصر ہے لیکن باوجود اس کے اس کے اندر ڈرامائی خوبیاں اور عناصر موجود ہیں سر سید کی سرکردگی میں ایک ڈرامہ کا اعلان کیا جاتا ہے۔ پبلک قومی رہنماؤں اور شریفوں کی ایکٹینگ (ACTING) دیکھنے کے لئے جوق جوق آتی ہے عین وقت پہ اسٹیج کا پردہ گرتا ہے اور قوم کے لیڈر مسلمانوں کے انجام اور قسمت کا ڈرامہ پیش کرتے ہیں غور تو کیجئے وہ کس قدر عبرت انگیز اور روح فرسا منظر ہوگا جب کہ ملت اسلامیہ کے چند چشم و چراغ ایکٹروں کے لباس میں اسٹیج پر جلوہ افروز ہوگئے اور قوم کا مایہ ناز شبلی دردناک انداز اور حسرت بھری آواز میں ایکٹ کے بجائے سنا رہا ہوگا۔

کوئی کہتا ہے کہ تھیٹر تو نہیں ہے لیکن ساز و نغمہ بھی نہ ہو ساتھ نہیں ہے لیکن
سامعین کاٹی ہیں اسی شوق میں تارے گن گن دیکھیں کیا سیر دکھائیں یہ بزرگان مسن
کچھ نہ کچھ تازہ کرامات تو ہوگی آخر
بوڑھے عمروں میں کوئی بات تو ہوگی آخر

دوستو کیا تمہیں سچ مچ تھا تھیٹر کا یقین کیا یہ سمجھے تھے کہ ڈرا کوئی ہوگا رنگین
نظر آئیگی جو سوتی ہوئی ایک زہرہ جبین آئے گا پھول کے لینے کو ارم کا گلچین
قوم کی بزم کو یوں کھیل تماشہ سمجھے
ہائے گر آپ یہ سمجھے بھی تو بیجا سمجھے

نوحۂ غم ہے یہاں نغمۂ عشرت کیسا یہ ہے عبرت کا سماں جوشِ مسرت کیسا
ہے جنون خیز یہ ہنگامۂ عبرت کیسا قوم کا حال ہے غفلت کی بدولت کیسا
ہے عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے
دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشہ دیکھے

ہائے کیا سین ہے یہ بھی کہ گروہ شرفا صاحب افسر و اورنگ تھے جن کے آبا
قوم کے عقدۂ مشکل کے جو ہیں عقدہ کشا ایکٹر بن کے وہ اسٹیج پہ ہیں جلوہ نما
قوم کے خواب پریشاں کی یہ تعبیریں ہیں
ایکٹر یہ نہیں عبرت کی یہ تصویریں ہیں

۳

شبلی کی شاعری کا دوسرا دور علیگڈھ کی تحریک سے علیحدگی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ابتدا میں وہ سرسید اور ان کے ہم مشربوں کے موافق ہو کر اس امر کی خوب تبلیغ کرتے ہیں تعلیم جدید ہی میں مسلمانوں کے مرض کا حقیقی علاج ہے اور ایک جوشیلے کارکن اور پیرو کی طرح اس تحریک کی کامیابی میں سرگرم حصہ لیتے ہیں تا آنکہ اس ہنگامۂ تعلیم کو ایک ربع صدی سے زیادہ زمانہ گزر جاتا ہے اور مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ تعلیم جدید کے زیور سے آراستہ ہو جاتا اور قوم کے خوابوں کی تعبیریں کر سامنے آتا ہے نوجوان طبقہ کی اخلاقی مذہبی معاشرتی حالت اس خواب کی ایسی مایوس کن اور ہمت شکن تعبیر ہوتی ہے کہ وہ اس علاج کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں ان کے نزدیک تعلیم جدید کے تخیل کے اندر یورپ کی ہر جائز و ناجائز بات کی اندھی تقلید نہیں بلکہ "خذ ما صفا ودع ما کدر" پر عمل داخل تھا جس کا نتیجہ اپنی قومی روایات مذہبی احکامات اور علوم دینیہ کی حفاظت کی صورت میں جلوہ گر ہو کر اسلام کے استحکام اور قوم کی فلاح و بہبود کا ذریعہ ہوتا لیکن تعلیم جدید کی شراب لالہ گوں کے اس خمار کو دیکھکر کہ نوجوان اپنے مذہب، اپنی روایات و خصوصیات اپنی تہذیب و تمدن سے دست بردار ہوتے جا رہے ہیں ان کے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے اور وہ خالص تعلیم جدید کی طرف سے بیزار ہو جاتے ہیں لیکن ان کی یہ بیزاری وہ بیزاری نہیں جو نادان ملاؤں کی جاہلانہ اور متعصبانہ بیزاری تھی بلکہ وہ بیزاری ہے جو ایک روشن خیال زمانہ شناس رہبر کی ہو سکتی ہے ورڈسوتھ کی طرح جو انقلاب فرانس کی مساوات آزادی اور حریت کے خوش آئند اصول سے مسحور ہو گیا تھا وہ بھی تعلیم جدید کے برکات و فوائد کے سبز باغ میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور جس طرح انقلاب فرانس کے بانیوں کی بے اعتدالی اور ظلم و سفاکی ورڈسورتھ جیسے سرگرم و مخلص موئد کو بالآخر اپنی طرف سے بیزار کر دیتی ہے ٹھیک اسی طرح تعلیم جدید کے فرزندوں کی بے راہروی اور بے مہار آزاد خیالی بالآخر شبلی جیسے علیگڈھ کی تحریک کے مستعد کارکن کو اپنی آغوش سے علیحدہ کر دیتی ہے اس کے بعد شبلی کی زندگی لگاتار اپنے جدید خیالات کی اشاعت اور اس کو روبکار لانے کی عملی جد و جہد کی جولانگاہ ہے۔ ندوۃ العلماء کا قیام فی الحقیقت اس خیال کا عملی مظہر ہے۔

وہ لوگ غلطی پر ہیں جو سمجھتے ہیں کہ شبلی علیگڈھ کی تحریک کے مخالف ہیں اور تعلیم کا وہ طریقہ جو ندوۃ العلماء کے اندر جاری ہے سرسید کے خلاف اعلان جنگ تھا برخلاف اس کے وہ آخردم تک علیگڈھ کالج کی کامیابی اور بھلائی کے درپے رہے مسلم یونیورسٹی فونڈیشن کمیٹی کے سلسلہ میں انہوں نے جو زبردست اور انقلاب آفریں نظمیں لکھیں ہیں وہ اس پر شاہد عادل ہیں۔ ان کے ہر لفظ سے بے پایاں محبت اور گہری خلوص مندی کی بو آتی ہے وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ علیگڈھ کو حقیقی معنوں میں مسلمانوں کا کالج بنایا جائے جس کا لازمی جز و مذہبی تعلیم اور مشرقی روایات کا رکھ رکھاؤ اور پابندی ہو کیونکہ ان کے خیال میں بغیر اس کے مسلمان ترقی کے زینہ پر قدم نہیں دھر سکتے چنانچہ ایک نظم میں بعض کوتاہ فہموں کے خیال اور دلائل کا ذکر کرنے کے بعد ثابت کرتے ہیں کہ ہماری پستی کا سبب اسلام نہیں ترک اسلام ہے ؎

لوگ کہتے ہیں کہ یہ بات ہے امر صریح — کہ زمانہ میں کہیں عزت اسلام نہیں
پس اگر غور سے دیکھو تو بجز مذہب و دین — ہم مسلمانوں میں کوئی صفت عام نہیں
ان اصولوں کی بنا پر یہ نتیجہ ہے صریح — سبب پستی اسلام جز اسلام نہیں
ان مسائل میں ہے کچھ ژرف نگاہی درکار — یہ حقائق ہیں تماشائے لب بام نہیں
غور کرنے کے لئے فکر و تعمق ہے ضرور — منزل خاص ہے یہ رہ گزر عام نہیں
بحث ما فیہ میں پہلی غلطی یہ ہے کہ آپ — جس کو اسلام سمجھتے ہیں وہ اسلام نہیں
آپ کھانے کو بنا دیتے ہیں پہلے مسموم — پھر یہ کہتے ہیں کہ غذا موجب اسقام نہیں
اعتبارات میں ہے سب سے مقدم توحید — یہ آپ ان کو صف کو ڈھونڈیں تو کہیں نام نہیں
کون ہے شائبہ کفر سے خالی اس وقت — کون ہے جس پہ فریب ہوس خام نہیں
آستانوں کی زیارت کے لئے شد رحال — اس میں کیا شان پرستاری اصنام نہیں
کیجئے مسئلہ شرک نبوت پہ جو غور — کفر میں بھی یہ جہاں گیری اوہام نہیں
اب عمل پر جو نظر کیجے آئیگا نظر — کہ کسی ملک میں پابندی احکام نہیں
اغنیاء کی ہے یہ حالت کہ نہیں ہے وہ رئیس — جس کے چہرہ پہ فروغ مئے گلفام نہیں
قرآن سے مسلمان ہیں بھائی بھائی — اس اخوت میں خصوصیت اعمام نہیں

یاں یہ حالت ہے کہ بھائی کا ہے بھائی دشمن کون سا گھر ہے جہاں یہ روش عام نہیں
نہ کہیں صدق و دیانت ہے نہ پابندی عہد دل ہیں ناصاف زبانوں پہ جو دشنام نہیں
آیت فاعتبروا پڑھتے ہیں ہر روز مگر علماء کو خبر گردش ایام نہیں

الغرض عام ہے جو چیز وہ بے دینی ہے صاف یہ بات ہے دھوکہ نہیں ابہام نہیں
ان حقائق کی بنا پر سبب پستیٔ قوم ترک پابندی اسلام ہے اسلام نہیں

دوسرے دور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر ان کے سیاسی اور تعلیمی خیالات کے تقریباً ساتھ ساتھ کلام میں پختگی، تناسب، سنجیدگی اور تجربہ کاری آگئی ہے ان کی مسلسل دماغی اور ذہنی محنت اور معلومات اور خیالات کی وسعت اس وقت اس نقطہ پر پہونچ گئی ہے جس پر آج تک اردو کا کوئی ادیب اور انشاپرداز نہ پہونچ سکا لگاتار علمی مشاغل اور مختلف مجلسوں کمیٹیوں اور تحریکوں کو چلانے اور دیکھنے کا موقع ہاتھ آیا ہے اس لیے اس دور کے کلام میں ایک پختہ کار کا تجربہ اور دور اندیشی ابل پڑتے ہیں الغرض ان کے خیالات میں تبدیلی کا پیدا ہونا تھا کہ شاعری کا دریا بھی اپنا رخ بدل لیتا ہے، تاریخی اور سیاسی مسائل جو ان کی آخری زندگی کی سرگرمیوں کے اصلی میدان قرار پاگئے تھے، شاعری پر قبضہ کر لیتے ہیں اور ان کی نکتہ رس طبیعت اور عظیم الشان شخصیت سے ایسی نظمیں لکھواتے ہیں جو بے نظیر ہیں مثلاً رواداری پر ایک نظم سنئے ؎

ہمارا طرز حکومت

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی ان ممالک پر مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پہ تھا
قرابت راجگان ہند سے اکبر نے جب چاہی کہ یہ رشتہ عروس کشور آرائی کا زیور تھا
تو خود فرماں دہ جے پور نے نسبت کی خواہش کی اگرچہ آپ بھی وہ صاحب دیہیم و افسر تھا
ولیعہد حکومت اور خود شاہنشاہ اکبر گئے امبیر تک جو تختگاہ ملک و کشور تھا
ادھر راجہ کی نور دیدہ گھر میں حجلہ آرا تھی ادھر شہزادۂ پر چتر مدوسی پہ گستر تھا
دلہن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے کہ کوسوں تک زمیں پر فرش دیبائے مشجر تھا
دلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پہ جو لائے تھے وہ شاہنشاہ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر تھا

یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطر محبت کی — کہ جن سے بوستان ہند برسوں تک معطر تھا
تمہیں لے دیکے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا — کہ عالمگیر ہندو کش تھا ظالم تھا ستم گر تھا

سنہ ۱۹۱۴ء میں مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں حکومت پرستوں اور احرار کے درمیان جو جنگ زرگری برپا تھی اس کا حال سنئے۔

جزر و مد

دیکھ کر حریت فکر کا یہ دور جدید — سوچتا ہوں کہ یہ آئین خرد ہے کہ نہیں ؟
رہنماؤں کی یہ تحقیر یہ انداز کلام — اس میں کچھ شائبہ رشک و حسد ہے کہ نہیں ؟
اعتراضات کا انبار جو آتا ہے نظر — اس میں کچھ قابل تسلیم و سند ہے کہ نہیں ؟
نکتہ چینی کا یہ انداز یہ آئین سخن — بزم تہذیب میں مستوجب رد ہے کہ نہیں ؟
جس نئی راہ میں ہیں بادیہ پیما یہ لوگ — کوئی اس جادۂ مشکل کا بلد ہے کہ نہیں ؟
شاعروں نے جو نئی آج بچھائی ہے بساط — آئین ان پر بھی کہیں سے کوئی زد ہے کہ نہیں ؟
پہلے گر شان غلامی تھی تو اب خیرہ سری — اس دوراہے میں کوئی بیچ کی حد ہے کہ نہیں ؟
فیصلہ کرنے سے پہلے ذرا دیکھ تو یوں — جزر جیسا تھا اسی زور کا مد ہے کہ نہیں ؟

یہ نظمیں اپنی نوعیت میں مستقل حیثیت رکھتی ہیں سیاست اور تاریخ کے خشک اور بے جان مسائل کو سامری کی طرح گویا کر دینا شبلی کا وہ امتیازی وصف ہے جس میں وہ ایک مطلق العنان حکمران کی شان رکھتے ہیں۔ اقبال کی سحر بیانی بھی "صدیق اکبر" "جنگ یرموک کا ایک واقعہ" ہیں جو یقیناً شبلی کی تقلید میں لکھی گئی ہیں ان پر آگے بڑھنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

سرسید کے معصرین میں صرف شبلی ہی ایسے تھے جو اپنی معلومات قوت ارادی اور زبردست شخصیت کی بنا پر "درمع الدہر کیف ما دار" کی بنا پر مختلف تعلیمی سیاسی اور مذہبی مسائل میں اختلاف کی جرأت کر سکتے تھے چنانچہ تعلیمی اور مذہبی مسائل میں اختلاف کا روشن مظہر ندوۃ العلما کا قیام اور ان کی تصانیف ہیں آخر زمانہ میں وہ سرسید کے سیاسی مسلک سے بھی بشرطیکہ اس راز دار اور گھر کے بھیدی کے بیان پر یقین نہ کیا جائے کہ ۵

کوئی پوچھے تو میں کہہ دونگا ہزاروں میں یہ بات روش سید مرحوم خوشامد تو نہ تھی
ہاں مگر یہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف ان کی جو بات تھی آورد تھی آمد تو نہ تھی

اعتراف کرگئے ہندؤں سے ملکر ملک کی آزادی اور نجات کے لیئے دوش بدوش سعی وکوشش کے حامی تھے اس تبدیلی نے ان کی شاعری کے دوسرے دور پر زبردست اثر ڈالا ہے ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ مسلمانان ہند کی تاریخ میں وہ عہد آفرین زمانہ اور عبوری دور ہے جب کہ ممالک اسلامیہ کی پیہم بربادی اور حکومت انگلستان کے دفتر خارجہ کی مسلم آزار پالیسی، طرابلس و بلقان کے ہنگامے، مسجد کانپور کا خونین واقعہ، اور مسلم یونیورسٹی کے معاملات اور اختیارات میں خداوندان حکومت کی دخل دہی اور رخنہ اندازی سمند ناز پہ اک اور تازیانہ ہو کر مسلمانوں کو خواب غفلت سے چونکاتی ہے یہی وہ عبوری دور ہے جب کہ جذبات کے تلاطم اور ہیجان کے باعث ہماری زبان کے اندر نثر اور نظم میں وہ کارنامے پیش ہوتے ہیں جو ۵۷ء کے غدر میں بھی حریت فکر، آزاد خیالی اور احساس کے فقدان کے سبب عالم وجود میں نہ آسکے تھے۔ اقبال و اکبر کی بعض بہترین نظموں کی طرح ان کی اکثر کامیاب نظمیں بھی اسی ہنگامہ و شورش کی پیداوار ہیں۔ ان نظموں نے اس طوفانی زمانہ میں مسلمانوں کی قومی کشتی کے لئے جو حوادث دہر کے منجدھار میں پھنس گئی تھی جس طرح ناخدا کا کام دیا ہے اس کا بیان ہمارے موضوع سے باہر ہے لیکن مختصراً اتنا اظہار کافی ہے کہ مسجد کانپور، جنگ بلقان کے حوادث، مسلم یونیورسٹی فونڈیشن اور مسلم لیگ کے معاملات کے اندر آزادی پسند فرقہ کی پالیسی کے لیے شبلی کی ان نظموں نے دستور العمل کا کام دیا ہے جس انتہائی خوبصورتی اور استادانہ مہارت کے ساتھ یہ پیغام اور لائحہ عمل قوم کے طبقۂ احرار کے گوش گزار کیا گیا ہے اور ان کو معاملات کی اونچ نیچ سے آگاہ کیا گیا ہے وہ بے مثل ہے ان مہتم بالشان مسائل پر ان کا کوئی قطعہ بیس پچیس اشعار سے زیادہ کا نہیں ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی نظموں میں سیاسی مسائل کو سلجھانا کہ حکومت اور حکومت پرستوں کی تضحیک و تمسخر کا سررشتہ بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے وہ قابل تعریف کارنامہ ہے جو اپنے طرز بیان کے سبب جدید شاعری میں منفرد ثابت ہوتا ہے۔

قطعہ لکھنے میں شبلی کو جیسا کہ ڈاکٹر لطیف[1] نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے خاص

---

[1] ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ مصنف غالب

کمال حاصل ہے چنانچہ ذیل کی نظم سے اس کا اندازہ ہو سکیگا۔

خطاب بہ احرار

یہ جو لیڈر شکنی آپ نے کی خوب کیا
قوم اب طوقِ غلامی سے ہے بالکل آزاد
لوگ اب حلقۂ تقلید میں ہونگے نہ اسیر
ٹوٹ جائیگا طلسم اثر استبداد
ہاں مگر ایک گذارش بھی ہے قابلِ غور
یہ تو فرمائیے اس باب میں ہے کیا ارشاد
بت کدے آپنے ڈھائے بہت اچھا لیکن
شرط یہ ہے کہ حرم کی بھی رکھیئے بنیاد
آبلہ قابلِ نشتر تھا یہ مانا لیکن
دیکھئے یہ کہ کہیں زخم میں آئے نہ فساد
آپ کہتے ہیں کہ وہ مجمع ناجائز تھا
خیر جو کچھ تھا مگر جمع تو تھے کچھ آزاد
اب کوئی مرکز قومی ہے نہ توحید خیال
نہ کوئی جادۂ مقصد ہے نہ کچھ توشہ زاد
خوف یہ ہے کہ بکھر جائے نہ شیرازۂ قوم
خوف یہ ہے کہ یہ ویرانہ نہ ہو پھر آباد
ذرے جسطرح سے ہو جاتے ہیں اڑ اڑ کے فنا
یونہی ہو جائیگی پھر قوم بھی آخر برباد
نکتہ چینی سے فقط کام نہیں چل سکتا
یہ بھی لازم ہے کہ کچھ کام بھی ہو پیش نہاد
بھاپ پر زور ہے لیکن کوئی انجن بھی تو ہو
کام کیا آئیگا نشتر جو نہ ہوگا فصاد

آپ نے ملاحظہ کیا کہ تعلیم و تہذیب جدید اور مغربی خیالات و جذبات کی طرف سے بیزاری یعنی مغرب پرستی کا ردعمل جو آگے چلکر اکبر و اقبال کے ہاں زیادہ نمایاں اور گہرا ہو گیا ہے سب سے پہلے شبلی کے ہاں نظر آتا ہے جس طرح انگریزی ادبیات میں احیا رومانی کا (ROMIANTICREVIVAL) جو بعد میں ورڈس ورتھ کالرج، کیٹس، شلی بائرن اور ٹنی سن وغیرہ کے ہاں زیادہ قوی اور جاندار ہو گیا ہے بانی برنس (سمجھا جاتا ہے اسی طرح قومیت اور مذہبیت کے اولین بانی اور یورپین تہذب کے ردعمل کا منونہ شبلی ہیں شبلی کی شاعری کا دوسرا دور وہ زرین عہد ہے جس نے جدید شاعری کے اندر مناسب تغیر پیدا کیا۔

نتیجۂ آزادی

از جناب سید علی شبیر صاحب شبیر سررشتہ دار انتظامی عثمانیہ عدالت العالیہ

زمین سے اُڑ کے کوئی سو پچاس گز اونچی / پتنگ شیخی میں جامے سے ہو گئی باہر
ہوا یہ سر میں سمائی کہ میں بھی ہوں اک چیز / نہاں ہیں ذات میں میری بڑے بڑے جوہر
"نہ ہوتا ساتھ اگر ڈور کا یہ پُن جھلا / دکھاتی اپنے کمالات چرخ پر چڑھ کر"
"لگاتی جا کے ابھی آسمان میں تھگلی / فلک کے چاند ستاروں کو مارتی ٹھوکر"
"مگر غضب ہے کہ کم بخت ڈور نے ناحق / کیا ہے مجھکو جکڑ بند۔ باندھکر شہپر"
تھا اس کے سر پہ جو اک بھوت حریت کا سوار / اسی خیال میں بڑھ رہی تھی تن تن کر
کی جد جہد و کشاکش کہ پائے آزادی / گھٹی۔ بڑھی۔ کبھی نیچی ہوئی۔ کبھی اوپر
اکھڑ کے ٹھونٹھ سے آخر وہ ہو گئی آزاد / مگر وہ اگلی سی قوت رہی۔ نہ شور۔ نہ شر
کیا تھا نشۂ آزادی نے جو مست اُسے / قدم قدم پہ لگی کھانے ہر طرف ٹھوکر
بجائے اس کے کہ کرتی وہ عرش پیمائی / زمیں پہ اوندھے منہ آئی بہ حالتِ ابتر
رہی کانپ۔ نہ ٹھڈے۔ نہ پرزے کاغذ کے / کہ تاک میں تھا لٹیروں کا اک بڑا لشکر

غلام قوم کی حالت بھی تم یہی سمجھو / ترقی کرتی ہے وہ بھی اور سب کے بل پہ
اگر نہ دیتے رہیں اس کو ٹھمکیاں حکام / تو اپنی جھوک پہ قائم نہ رہ سکے دم بھر
کبھی علائقِ دنیا سے دور مت بھاگو
اسی میں دینی ترقی کا راز ہے مضمر

اور شبلی کے یہان ٹھیرا ہوا تھا، ہیارس محنتی، جفاکش اور فرمانبردار غلام تھا، دوران قیام میں ایلینرا سے اس کو محبت ہوگئی اور ایلینرا بھی اس کو چاہنے لگی۔ طبعیتون کا میلان دیکھکر شبلی نے ان دونون کی شادی کردی، شادی بالکل سیدی تھی نہ تو کچھ دھوم دھام ہی تھی اور نہ کسی قسم کا کوئی تکلف کیا گیا تھا۔ دولہا، دولہن اپنے روزمرہ کے لباس میں پادری کے سامنے آئے اور اس نے نکاح پڑھا دیا، کاش وہ کسی آزاد ملک میں پیدا ہوئی ہوتی تاکہ اس کے دل کی حسرت نکلتی مگر خیر وہ اس حال میں بھی خوش تھی اس نے آزاد دنیا کا خواب ہی نہیں دیکھا تھا اس لئے وہ بہت ہی شاد و بشاش تھی، گاؤں کے بچے، بوڑھے اور نوجوان سب ہی خوش تھے، اس کی شادی اُن سب کی شادی تھی، ان کی خوشیون میں حقیقی مسرت اور بے لوث محبت کے جلوہ نظر آرہے تھے جو متمدن ممالک کے آزاد گھرانون میں مفقود نظر آتے ہیں۔

رات کے بارہ بجے تھے اور قمری مہینہ کی پندرہ تاریخ، چاندنی چھٹک کر پڑی تھی اور گاؤن کا بچہ بچہ غلامی کی زنجیرون میں بھی قدرت کے دلچسپ نظارہ کا لطف اٹھا رہا تھا، ایلینرا کی شادی نے آج ان کے لطف کو اور بھی دوبالا کر دیا تھا، اور تمام غلام میدانون اور جنگلون میں خوشیان مناتے اور شادی کے راگ گاتے پھر رہے تھے۔ دلہا دلہن بھی چاندنی کا لطف اٹھانے جنگل کی طرف چلے اور دولہن جاکر ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھ گئے جہان ایک درخت تھا جس کے پتوں سے چاندنی چھن چھن کر ایلینرا کے حسین چہرہ پر پڑتی اور منظر کی دلاویزی میں ایک گونہ اضافہ کررہی تھی ایلینرا اپنے مرکز محبت کے آغوش میں بانسری بجا رہی تھی، آج معمول سے زیادہ اچھے سُر نکل رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا دل کی حسرتیں اور تمنائیں موسیقی کے دلچسپ ترانون میں ظاہر ہو رہی ہیں، ہیارس اپنی خوش قسمتی پر ناز کر رہا ہے اور ایلینرا کی گردن میں ہاتھ ڈالے عشق و محبت کے پیچیدہ راگنیون میں گم تھا حسن کی تجلیات نے اس کی آنکھیں بند کردیں اور وہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر تھا۔ اگرچہ ان کے جسم اب بھی غلامی کی زنجیرون میں جکڑے ہوئے تھے لیکن ان کی روحین آزادی کے ساتھ عیش منا رہی تھی۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ خوشیان بالکل عارضی ہوا کرتی ہیں۔ انہیں یہان آئے ہوئے کامل آدھا گھنٹہ گذر گیا مگر انہیں اس کا احساس بھی نہ ہو، وہ ایک عالم بے خودی میں تھی کہ یکایک ایلینرا کو کسی کی آہٹ سنائی دی، وہ چونک کر کہنے لگی،

"ہیارس دیکھو کوئی آتا ہے" ہیارس اپنے پرکیف خواب سے چونکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا مگر جب کچھ نظر نہ آیا تو ہنستے ہوئے الینیرا کے رخسار کا ایک بوسہ لیا اور کہنے لگا "یہاں کون آتا ہے" لیکن وہ ابھی ہنس ہی رہا تھا کہ پھر کسی کی آہٹ قریب سنائی دی اب کی دفعہ تو وہ گھبرایا اور چوطرف دیکھنے لگا کہ ناگہان اس کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی کہ اس کے ہوش اڑ گئے اور سارا لطف کرکرا ہو گیا یہ شخص اس کا آقا گریگوری تھا جو اتفاق سے اسی رات شبلی سے اپنا قرضہ وصول کرنے آیا ہوا تھا' ہیارس کی شادی کا حال سنکر وہ آگ بگولہ ہو گیا اور اب اس کو سزا دینے آیا تھا قریب آکر کہنے لگا "نیچے اتر حرامزادے! وہاں کیا کر رہا ہے؟"

ہیارس نیچے اترا اور ڈرتے ڈرتے گریگوری کے قریب گیا۔ "مردود تو نے بغیر میری اجازت کے کیسے شادی کی" یہ کہکر اس نے دو کوڑے رسید کئے۔ ہیارس تلملا کر رہ گیا مگر الینیرا کا ہاتھ تھامے تھا

"چھوڑ اس لونڈی کو اور میرے ساتھ چل"۔

"آقا مجھے ایک دن کی اجازت دیجئے" ہیارس نہایت عاجزی سے استدعا کرنے لگا "اجازت' مردود کے بچے چلتا ہے یا مارے جوتوں کے سر توڑ دوں"۔

"آقا! ...."

وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ گریگوری اس کو مارتا اور گھسیٹتا ہوا لیکر چلا گیا' اگرچہ شبلی نے بہت کچھ سفارش کی مگر اس کی کون سنتا' شبلی زیادہ اصرار بھی نہ کر سکا اس لئے کہ مقروض آدمی کی زبان قرض خواہ کے سامنے نہیں کھلتی' الینیرا بھی ہزار روئی چلائی مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ نظروں سے غائب ہو گیا' شبلی الینیرا کو سمجھا منا کر گھر لایا اور گریگوری تھوڑی بہت رقم وصول کر کے چلتا ہوا۔

۲

اس واقعہ کو گذرے ہوئے کوئی دو سال کا عرصہ ہوتا ہے' اس اثنا میں زمانہ نے کئی کروٹ بدلے لیکن نہ بدلنے والی تھی تو وہ الینیرا کی قسمت' شوہر کی یاد میں وہ دن بدن گھلتے جا رہی تھی یوں کہئے کہ وہ زندگی کے دن پورے کر رہی تھی' اسے کیا امید تھی کہ اس کا

متاعِ زندگی شادی کے پہلے ہی دن لٹ جائیگا۔ مگر خدا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے اس کی دلبستگی کا سامان فراہم کر دیا تھا' اس کو ایک لڑکی پیدا ہوئی جو اس کی زندگی کا سہارا تھی۔

ایک روز شام کے وقت وہ اپنے آقا کے کمرے سے ملحقہ کمرہ میں اپنی بچی کو گود میں لئے اپنی بدقسمتی پر آہستہ آہستہ آنسو بہا رہی تھی کہ اس کے کان میں آواز آئی۔

"اچھا میں نے دو ہزار کو بیچ ڈالا"

"بیچ ڈالا" کے الفاظ نے اس کے دل پر وہی اثر کیا جو بے گناہ مجرم کو حاکم کی زبان سے سزائے موت کا اعلان سنکر ہوتا ہے' وہ دیوانہ وار اٹھی اور دروازہ کی سائیں سے جھانک کر دیکھنے لگی آہ یہاں وہی منظر تھا جس کو وہ دیکھنا پسند نہ کرتی تھی اور وہ یہ کہ گریگوری اور شلبی بیٹھے ہوئے بیع و شرح کر رہے تھے شلبی نے اپنے قرض کی ادائی میں ایلینیرا کی لڑکی اور چچا ٹام کو بیچ ڈالا تھا۔

اپنے کو اس نازک ماحول میں پاکر ایلینیرا کے ہوش پران ہوگئے اور وہ اپنی بچی کو لیکر مکان کے دوسرے دروازہ سے فرار ہوگئی۔

رات کا وقت تھا اور فضا کہر آلود' چوطرف برف باری ہو رہی تھی' اِدھر قطرے جسم پر پڑے اور برف بن گئے۔ راستوں پر برف جم گئی ادھر ہوا بھی خوب زوروں پر چل رہی تھی' ایسی حالت میں ایک عورت کا اپنے معصوم بچے کو کلیجے سے لگائے اندھیری رات میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے جانا حقیقت میں قابلِ رحم ہے! وہ پناہ کی تلاش میں جا رہی تھی' کوئی گھنٹہ بھر کی کوشش کے بعد وہ ایک جھونپڑی کے قریب پہونچی جس کے اندر دو حبشی غلام رات کا کھانا کھا رہے تھے' آواز دینے پر دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوئی' سردی کے باعث اس کا جسم سن ہوگیا تھا' چچا ٹام اس کو اس حالت میں دیکھکر ششدر رہ گیا اور دریافت کرنے لگا۔

"بیٹی ایلینیرا تو ہے ایسے وقت میں تو یہاں کیسے آئی"؟

"چچا' کیا کہوں' اول تو میرا متاعِ زندگی مجھ سے چھین لیا گیا" یہ کہکر وہ رونے اور سسکیاں بھرنے لگی' اور اب میری زندگی کا سہارا یہ بچی تھی اس کو بھی شلبی نے اپنے قرض کی

دالی میں گریگوری کے ہاتھ بیچ ڈالا' اب میں کیا کروں کس کو دیکھکر زندہ رہوں" یہ کہکر ایلینرا نے بچی کو ٹام کی گود میں دیدیا۔

ٹام بھی شلبی کا غلام تھا اور اپنی بے لوث محبت اور فرمانبرداری کے باعث وہ تمام غلاموں میں ممتاز حیثیت رکھتا' اگرچہ وہ غلام تھا مگر فطرت نے اس میں وہ لطیف جذبات ودیعت کئے تھے کہ اس کو دنیا کے بہترین انسانوں میں شمار کیا جا سکتا تھا چنانچہ شلبی اکثر دفعہ اسے آزاد علاقوں میں بھیجتا تھا مگر کبھی اس نے اپنے مالک کو دھوکا نہ دیا' اس کی محبت اور ہمدردی کے باعث سارا گاؤں اس کو چچا چچا کہکر پکارتا وہ گویا جگ چچا تھا۔ ایلینرا کی اس قدر افسوسناک حالت دیکھکر اس کا دل بھر آیا اور اس نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا' بیٹی اللہ مالک ہے' وہ کسی نہ کسی طرح سے دلبستگی کے سامان فراہم کردیگا میں تیری ہر طرح سے مدد کرونگا اللہ پر بھروسہ کر"

ایلینرا کے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور وہ چلا کر کہنے لگی

آہ چچا ٹام! اس نے تم کو بھی بیچ ڈالا"

"مجھکو!" ٹام نے حیرت سے پوچھا

"ہاں' ہاں' تم کو"

یہ سنکر ٹام ایک سناٹے میں آگیا اس کو پہلی دفعہ یہ معلوم ہوا کہ غلام خواہ کتنا ہی سنجیدہ اور وفادار ہو آخر غلام ہی ہے اس کی زندگی دوسرے کے ہاتھ ہے۔

باوجود خود پریشان ہونے کے ٹام نے ایلینرا کو دلاسا دیا چچا ٹام کو اس مایوسانہ حال میں دیکھکر ایلینرا نے اسے خدا حافظ کہا اور جھونپڑی سے باہر نکل گئی یہاں سے لوٹ کر پھر مکان جانا گویا موت کے منہ میں جانا تھا جس کو کبھی وہ گوارا نہ کرتی تھی اس نے یہ ٹھان لیا کہ "چاہئے جان جائے یا جان رہے مگر میں کبھی اپنی معصوم بچی کو اس ظالم کے حوالے نہ کرونگی وہ میری زندگی کا نہیں بلکہ میری راحت' میرے آرام کا دشمن ہے"

باہر برفانی رات کا بھیانک منظر اس کا استقبال کر رہا تھا اس نے خوشی سے اس کا خیر مقدم کیا اور آگے کی طرف چلنے لگی۔

بیع وشرع کے بعد جب شلبی لڑکی کو لینے اندر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ کمرہ خالی پڑا ہے

گریگوری نے کہا "میں سمجھ گیا، ہیاریس بھی میرے یہاں سے بھاگ گیا ہے، شاید اسی نے اس کو فرار کیا ہو، اچھا جاتا ہوں میں اس بدمعاش کو خود گرفتار کرونگا" یہ کہا اور اپنے ساتھ دو تین غلاموں اور چھ شکاری کتوں کو لیکر اس کے تعاقب میں روانہ ہوا، ایلیزا نے دور سے ہی ان لوگوں کو آتے دیکھا راستہ برف سے اٹ گئے تھے، کتے اور گھوڑے بڑی مشکل سے قدم اٹھارہے تھے، ایلیزا اب ہمت کر کے بھاگنے لگی مگر ہر ہر قدم پر ٹھوکر لگ رہی تھی، آگے آگے ایلیزا اور پیچھے پیچھے کتے تھے اسی طرح افتاں وخیزاں کوئی دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے ایک مکان نظر آیا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا وہ بے تحاشا مکان کے اندر داخل ہو گئی اور اس کے بعد ہی بے ہوش ہو گئی، کوئی گھنٹہ بھر کے بعد ہوش آیا تو اس نے اپنے کو ایک گدے دار بستر پر پایا سامنے خادمہ چار لیئے کھڑی تھی اور بچی بازو تھی اس کو ایک گونہ اطمینان ہو گیا اور وہ خیال کرنے لگی کہ ع "رسید بود بلائے ولے بخیر گذشت"۔ وہ اب اپنی بچی کو گود میں لیئے پیار رہی تھی کہ یکایک کسی کے کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی، ایلیزا کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی اور وہ آنے والی مصیبت کا انتظار کرنے لگی، مالک مکان باہر گیا، اس کے بعد ہی گریگوری کی کرخت آواز سنائی دی، کیا تم نے کسی عورت کو اپنے مکان میں پناہ دی ہے؟"

"نہیں میں تو وکیل ہوں"

میں یہ نہیں دریافت کرتا کہ آپ وکیل ہے یا زمیندار مگر یہ بتلاؤ کہ کوئی عورت جس کے ساتھ ایک چھوٹی بچی ہے آپ کے مکان پناہ گزین ہے"۔

"ٹھیک ہے، میں تو وکیل ہوں"۔

گریگوری اس کا منشا سمجھ گیا اور کہنے لگا اگر تم اس عورت کو میرے حوالے کردوگے تو میں تمہیں چار سو ڈالر دونگا، وکیل صاحب کے منہ میں پانی چھوٹ گیا اور اس نے رضامندی ظاہر کی۔

یہ سنتے ہی ایلیزا گھبرائی اور اپنے نونہال کو گود میں لیکر کھڑکی سے فرار ہو گئی اور ابھی ایک فرلانگ بھی نہیں گئی تھی کہ اس کے راستہ میں ایک ندی حائل آئی جس میں برف کے بڑے بڑے تودے بہہ رہے تھے، اب ایلیزا کی عجیب حالت تھی "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن"

گھوڑے اور کتے اس کا پیچھا کر رہے تھے، اب اس کو آنے والی مصیبت کا کامل یقین ہو گیا اور وہ بچی کو دونوں ہاتھوں میں لیکر دعا کرنے لگی " اے اللہ تو اس بے کس مظلوم پر رحم کر، یہ تیری امانت ہے" یہ التجا کر رہی تھی کہ کتے اس کے قریب پہونچ گئے اور وہ فوراً اللہ کا نام لیکر ندی میں گود پڑی اتفاق سے اس کا پیر برف کے تودے پر پڑا اور وہ اس پر کھڑی ہو گئی، کتے پانی کو دیکھکر جھجک گئے لیکن گریگوری کے دو چار کوڑوں نے انہیں سیدھا کر دیا اور وہ بھی برف کے تودوں پر قدم رکھتے ہوئے ایلینرا کا تعاقب کرنے لگے ایلینرا اب کافی فاصلہ طے کر چکی تھی، یہاں تک کہ وہ ایک آبشار کے قریب پہونچی اور اب قریب تھا کہ وہ گر گئی ہوتی لیکن گاؤں کے پٹیل نے جو اس طرف کسی کام کو آ نکلا تھا اسکی یہ حالت دیکھکر رسی پھینکی اور ایلینرا اس کے سہارے کنارے پہ پہونچ گئی۔ ایلینرا خشکی پر آ گئی اور کتے ڈوب مرے، گریگوری نا امید ہو کر واپس چلا گیا لیکن وکیل صاحب کے دل میں لالچ چٹکیاں لے رہی تھی، پٹیل ان کو اپنے گھر لے گیا اور خوب آگ جلا کر ماں اور بچی کو رات تمام گرم رکھا، تھک جانے کے باعث بستر پر پڑتے ہی ایلینرا کی آنکھ لگ گئی۔

۳

صبح کا وقت ہے، آسمان پر بادل بکھر گئے ہیں اور کچھ دھوپ بھی نکلی ہے۔ سورج کی شعاعیں کھڑکی میں سے گذر کر جیسے ہی ایلینرا پر پڑیں اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ محسوس کرنے لگی گویا اس نے کوئی وحشت ناک خواب دیکھا ہے، پہلے وہ تو اپنے کو اس اجنبی ماحول میں پا کر گھبرائی اور جو پلٹی تو بچی اس کی گود میں تھی اسے ایک گونہ اطمینان ہو گیا، وہ اٹھ بیٹھی اس کا محسن اس کے قریب ہی کھڑا تھا اس نے شکریہ ادا کیا " جناب میں آپکی مشکور ہوں کہ آپ نے میری زندگی کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دیا، یوں تو ہر حال میں اللہ مالک ہے لیکن آپ نے بُرے وقت میں میری امانت کی......... کاش میں ڈوب گئی ہوتی" اس نے کچھ سوچکر آہ سرد بھرتے ہوئے کہا اور گذشتہ رات کے واقعہ پہ غور کرنے لگی۔

مالک مکان نے جو ایک تاجر تھا اس کو تسلی دی اور کہا " مادام خدا کا فضل تھا

بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم اب کسی بات کی فکر مت کرو۔ مگر یہ تو بتلاؤ کہ تم کون ہو اور تمہارا اس اندھیری طوفانی رات میں دریا میں بہہ نکلنے کا سبب کیا ہے؟"

"میں ایک بد نصیب ہوں اور میرا........... وہ یہیں تک کہنے پائی تھی کہ سامنے والی کھڑکی میں وکیل صاحب کی بزرگ صورت دکھائی دی، اس کا دل سہم گیا اور وہ سمجھ گئی کہ روپیہ کی لالچ اسے یہاں کھینچ لائی ہے۔ وکیل اندر داخل ہوا اور ادھر ادھر کی باتیں بنا کر بیٹی سے ایلینرا کو چھین لیا ایلینرا ہزار انکار کرتی رہی مگر اس نے ایک نہ سنی اور اس کو لے جا کر گریگوری کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

دوسرے دن صبح کو جب کہ دریائے اُن میں برف پوری طور پر پگھل چکی تھی اور جہاز آسانی کے ساتھ نقل و حرکت کر رہے تھے، گریگوری مع اپنے غلاموں کے جن میں ایلینرا اور اس کی بچی اور چچا ٹام شامل تھے جہاز میں بیٹھکر اپنے گاؤں کو روانہ ہوا۔ وکیل اور اس کا ایک دوست اس کے ہمراہ ہو گئے۔ ایلینرا اب طور پر قید تھی، مگر اب بھی بچی اس کے ساتھ تھی، اس کے دل کو کسی قدر اطمینان تھا مگر ایک رات جب کہ وہ گہری نیند میں سو رہی تھی وکیل اور اس کا ساتھی بچی کو مٹھائی کی لالچ دیکر چرا لے گئے، جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے نونہال کو اپنی گود سے غائب پایا اس کے دل میں تیر لگی اس تیر کا زخم اب گہرا تھا کہ اس کا کوئی علاج ممکن نہ تھا، وہ دیوانہ وار جہاز کے اندر ادھر ادھر تلاش کرنے لگی جب کہیں پتہ نہ چلا تو بے آس ہو کر وہ جہاز کے سامنے والے حصہ پر آئی یہاں کیا دیکھتی ہے کہ بچی "اماں اماں" کہکر بلبلا رہی ہے مگر وکیل اس کو گود میں لیکر گاڑی پر سوار ہو رہا ہے، وہ چیل کی طرح لپکی اور چاہتی تھی کہ گاڑی کو پکڑ لے مگر وکیل نے ایک کوڑا اس زور سے مارا کہ ایلینرا گر پڑی گاڑی آگے کی طرف نکل گئی ایلینرا بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی وکیل کے ساتھی نے اس کو جہاز پر سوار کرا دیا، کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا غم واندوہ کی حالت میں بے ہوشی انسان کے لئے حد درجہ مفید ہے۔ یہی حال ایلینرا کا تھا جب اسے ہوش آیا تو اسے تمام دنیا تاریک نظر آئی اس کے دل کا چراغ بجھ چکا تھا جس کے روشن ہونے کی کم از کم اس کے گھر میں تو امید نہ تھی "خیر اللہ کی شاید یہی مرضی ہوگی" کہکر خاموش رہ گئی۔

روپیہ کے لالچی وکیل نے اس کی بچی کو کسی دوسرے گاؤں میں دو ہزار ڈالر کو بیچ ڈالا۔

دو روز بعد جہاز گرگوری کے گاؤں کو پہونچا اور تمام غلام جن کو گرگوری نے خرید کئے تھے گھر پہونچائے گئے دو روز تک ان کی کسی نے کچھ خبر نہ لی، چچا ٹام اور ایلیزا اور دیگر غلام قید کی سرد مہریاں برداشت کر رہے تھے، ایک دوسرے کی حالت دیکھکر سہم جاتے تھے، مگر کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ منہ سے ایک لفظ بھی نکالے، دو دن تو اس طرح کس مپرسی کے عالم میں گذر گئے، تیسرے دن گرگوری اپنے کمرہ میں شراب پیتا ہوا بیٹھا تھا اس نے اپنے ایک غلام کو آواز دی، اس کے آنے میں ایک آدھ منٹ کی دیر ہو گئی بس کیا تھا، گرگوری کا خون جوش کھانے لگا اور اس نے غلام کو اتنے کوڑے رسید کئے کہ غریب نے کچھ دیر بعد دم توڑ دیا، پھر دوسرے غلام کو آواز دی، وہ آیا حکم دیا کہ "جا، ایلیزا کو یہاں لے آ" وہ بھاگتا ہوا ایلیزا کے پاس گیا، اور اس سے چلنے کو کہا ایلیزا خوف و دہشت سے کانپ گئی اور ڈرتے ڈرتے گرگوری کے سامنے گئی، گرگوری جس کی آنکھیں غصہ کے مارے سرخ ہو گئیں تھی ایلیزا سے کہنے لگا "بیٹھ جا" اس مہربانی اور عنایت نے ایلیزا کے دل میں شک پیدا کر دیا اور بجائے بیٹھنے کے وہ خاموش کھڑی رہی گرگوری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بازو والی کرسی پر بٹھلا دیا اور گلے میں ہاتھ ڈالکر شراب پینے لگا، ایلیزا کا خون خشک ہو گیا، اب تک تو صرف جان پہ بنتی آئی، مگر اب عصمت پر بھی دست اندازی کی نوبت آ گئی، ایک مخفی جذبہ جو اکثر شریف عورتوں میں عصمت کی حفاظت کے لئے موجود ہوتا ہے بھڑک اٹھا اور وہ پھرتی کے ساتھ کرسی سے اچھلکر بازو کھڑی ہو گئی اور نفرت اور حقارت آمیز نگاہوں سے گرگوری کی طرف دیکھنے لگی، مگر اس ظالم اور بے حیا پر ان کا کیا اثر ہوتا، وہ اٹھا اور ایلیزا پہ جبر و تشدد کرنے لگا کہ وہ کسی طرح اس کے ساتھ محبت کا اظہار کرے۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور گرگوری کی ایک قدیم لونڈی جو اس کی معشوقہ بھی تھی کمرہ کے اندر داخل ہوئی گرگوری کو ایک دوسری عورت کے ساتھ محوِ اختلاط دیکھکر اس کے بدن میں آگ لگ گئی، وہ جھلا کر کہنے لگی۔

"گرگوری یہ کیا ہے؟"

"تو یہاں کیسے آئی" گریگوری نے ڈانٹ کر کہا
میں، مجھے حق حاصل ہے، تم اس عورت سے کیا باتیں کر رہے ہو؟
"تجھے اس سے کیا کام؟ تو چلی جا"

اس کی معشوقہ نے آگے بڑھکر گریگوری کا ہاتھ پکڑ لیا، گریگوری نے اس کو جھڑک دیا اور پیٹتے ہوئے کمرہ سے باہر نکال دیا اور حکم دیا کہ اس کو خوب کوڑے لگائے جائیں چچا ٹام نے سفارش کی مگر الٹے چچا ٹام کو اتنے کوڑے پڑے کہ غریب ہمیشہ کے لئے دنیا سے رخصت ہو گیا، اس کی معشوقہ وہاں سے بھاگ گئی اور چچا ٹام کے ساتھی سے اس کا ذکر کیا، اس کے آنکھ سے آنسو رواں ہو گئے اور اس نے پھر ایلینیرا کا قصہ کہا جس سے وہ پہچان لی کہ ایلینیرا اس کی لڑکی ہے، یہ معلوم کرنے کے بعد اس کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی وہ دوڑتے ہوئے کمرہ کے اندر داخل ہوئی اور ایلینیرا سے بیٹی کہکر لپٹ گئی، اور اب گریگوری چاہتا تھا کہ اپنے کوڑے سے کام لے، ماں اور بیٹی بھاگ کر بالاخانہ پر چلا گئے اور اندر سے کواڑ بند کر لی۔ گریگوری آدھ گھنٹہ کی کوشش کے بعد دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوا، ماں بیٹی ادھر ادھر چھپتے رہے لیکن بالآخر گریگوری نے انہیں مارنے کے لئے پستول اٹھایا۔

۴

گریگوری کے پاس سے بھاگ نکلنے کے بعد ہیارس چھپتے چھپاتے آزاد علاقوں میں پہونچا اور وہاں کے بعض لوگوں سے ملکر اس نے اپنے غم کی پوری داستان سنائی، ان لوگوں کے دلوں میں نوع انسانی کی ہمدردی کا جذبہ بھڑک اٹھا اور انہوں نے اپنے ملک سے رسم غلامی کو مٹانے کا مصمم ارادہ کر لیا، ابراہام لنکن نے اس معاملہ میں حد درجہ دلچسپی لی، ملک کے اکثر لوگوں نے اس کی ہم نوائی کی اور ابراہام لنکن سے اس کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کا وعدہ کر لیا، آزاد علاقوں میں یہ خیال بہت جلد پھیل گیا، اس کام کے لئے فوجیں جمع کی جانے لگیں، دو سال کے عرصہ کے بعد جب کافی فوج جمع ہو گئی تو ابراہام لنکن اور دیگر بہی خواہان نسل انسانی نے ان علاقوں کا رخ کیا جہاں غلام ظلم و ستم کی کڑی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، یہ فوج یکے بعد دیگرے ہر علاقہ میں پہونچتی اور وہاں کے

غلاموں کو آزاد کراتی جارہی تھی، اصل فوج کے ساتھ غلاموں کی بھی کافی فوج جمع ہوگئی ہیارس بھی اسی فوج کے ہمراہ تھا، اگرچہ ایلینیرا کی مفارقت سے وہ مغموم تھا مگر آج اس کا دل ضرورت سے زیادہ خوش معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ ظالم آقاؤں سے اپنا بدلہ لے رہا تھا فوج ایک گاؤں میں پہونچی، سڑکوں، گلی کوچوں میں غلام دیوانہ وار پھر رہے تھے ہیارس کی نظر ایک چھوٹی لڑکی پر پڑی، اس نے فوراً پہچان لیا کہ یہ اسی کی لڑکی ہے کیونکہ ہیارس ایک دفعہ خفیہ طور پر ایلینیرا اور اپنی بچی سے مل چکا تھا، دوڑ کر بچی کو گود میں اٹھایا اور فرط مسرت سے اس کا منہ چومنے لگا، مختلف گاؤں طے کرنے کے بعد وہ گریگوری کے گاؤں میں پہونچے، ہیارس بے انتہا خوش تھا فوج کے آگے آگے وہ اپنی بچی کو کندھے پر بٹھائے چل رہا تھا۔ فوج گاؤں کے اندر داخل ہوگئی۔

۵

ادھر اس نے پستول اٹھایا اور ادھر فوجی باجوں کی آواز اس کے کان میں گونجنے لگی گریگوری فوجی باجوں کی آواز سنکر گھبرا گیا، پستول اس کے ہاتھ سے گر پڑا، وہ دیوانے کتے کی طرح مکان کے اندر ادھر ادھر نیچے اوپر بھاگنے لگا، ایلینیرا جو اس وقت کھڑکی سے لگ کر کھڑی تھی جھک کر باہر کی طرف دیکھنے لگی، فوجی نشان ہوا میں لہرا رہا تھا، کچھ غلام بھی اس فوج کے ہمراہ تھے۔ ایلینیرا کا دل خوشی سے پھول گیا کیونکہ وہ سمجھ گئی یہ وہی فوج ہے جس کے متعلق ہیارس نے اسے کہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد فوج نے مکان کا محاصرہ کر لیا اور کچھ فوجی اندر داخل ہوئے گریگوری کے ہوش اڑ گئے مگر غرور اور بدمزاجی اس کی فطرت ثانی بن گئی تھی وہ اسی لہجہ میں فوجیوں سے گفتگو کرنا چاہا مگر اب اس کی کون سنتا؟ اس کو گرفتار کر کے اتنا پیٹا گیا کہ اس کا جینا محال ہوگیا۔

ایلینیرا نے ہیارس کو دیکھا اور ہیارس نے ایلینیرا کو دونوں کی آنکھیں ملی اور دونو فرط خوشی سے رونے لگے، بچی امی! امی کہکر پکار؟ ایلینیرا نے اس کو گلے سے لگالیا۔

مائدۃ الاسلام

از جناب ابوالسخا محمد سعید صاحب ہاشمی سالار

کی ودیعت مرے اللہ نے شرافت مجھ میں ۔۔۔ بھر دی اس شان سے کچھ شان مروت مجھ میں
موج در موج ہے وہ بحر محبت مجھ میں ۔۔۔ ٹھیر سکتی نہیں کشتیٔ عداوت مجھ میں
سم روانی ہے مری نفس شرارت کے لئے
ایک طوفان ہوں خاشاک حماقت کے لئے

چشمۂ فیض خدا شان ہدایت میں ہوں ۔۔۔ جس کو اللہ نے چاہا وہ شریعت میں ہوں
تم ہو عزت سے زمانہ میں وہ عظمت میں ہوں ۔۔۔ جو ملاتی ہے خدا سے وہ محبت میں ہوں
شان حق مجھ میں ہے اور جان صداقت مجھ میں
للہ الحمد ہے توحید کی قوت مجھ میں

وہ کلام آج سناؤں میں تمہیں غیرت تاب ۔۔۔ یاد آجائے تمہارا وہ سبق پھر نایاب
پھر بڑھیں تم میں وہی حوصلہ آموز آداب ۔۔۔ پھر اٹھے تم سے ہی نیرنگ زمانہ کا حجاب
پھر کرے بحر کمالات کو پایاب خدا
پھر ہوں بہبودیٔ اسلام کے اسباب خدا

تم اگر دوست ہو میرے تو حکومت کیا شے ۔۔۔ تاج شاہان زمانہ کی حقیقت کچھ ہے
میں وہ ساقی ہوں پلا کر تمہیں توحید کی مے ۔۔۔ شان ضرارؓ کی خالدؓ کی دکھادوں پھر سے
میری خاطر جو بخالت نہ کریں جانوں کی
اب ضرورت ہے مجھے ایسے مسلمانوں کی

تم جو مسلم ہو تو ہے تم میں محبت میری ۔۔۔ ہر مسلمان پہ ہے فرض شریعت میری
کس پہ روشن نہیں دنیا میں حقیقت میری ۔۔۔ تاب کیا لائے کوئی ہے وہ جماعت میری

برق توحید بھری ہے مرے سرشاروں میں
بحر میں چھوڑیں کسی کو نہ یہ ملیتاروں میں

فرض ہے تم پہ مری جان موحدّ ہونا
بس یہی ہے میرا ارمان موحدّ ہونا

تم کو ہونا ہے جو انسان موحدّ ہونا
آدمیت کی ہے یہ شان موحدّ ہونا

متفق ہو کے ذرا دیکھو تماشہ اپنا
ساری دنیا پہ نظر آئیگا قبضہ اپنا

راضی اللہ کو کرنا ہے اطاعت سے کرو
رونق بزم عمل شمع شریعت سے کرو

اپنے ہر کام کو قرآن کی حجت سے کرو
جو عمل جا ہو وہ پیمانۂ حکمت سے کرو

تم اگر حسن اماں جا ہو روا داری ہے
گہن ترقی کا تعصب کی یہ بیماری ہے

باغ عالم میں بنی نوع کے ہمدرد بنو
ہو نسیم سحری تو نہ دم سرد بنو

آئینہ ہو کے کدورت کی نہ تم گرد بنو
بھائی کے بھائی بنو اور جواں مرد بنو

بنو انصار و مہاجر قوی بازو ہو جاؤ
بات انصاف کی یہ ہے کہ ترازو ہو جاؤ

دور اللہ کرے تم سے یہ آپس کا ملال
ایک معبود تمھارا ہے رہے ایک خیال

تم میں سالار جو قائم ہے صحابہ کی مثال
تا ابد تم کو نظر آئے نہ خورشید زوال

پھر تو اسلام ملے نام ملے کام ملے
تم کو جنت ملے راحت ملے آرام ملے

رباعی

از جناب ابو الاعظم **امجل** حیدرآبادی

یاں سے جو چلے گئے نئی دنیا میں
آفاق سے پہنچے الغنی دنیا میں

"مرنا" کہتے ہیں، جس کو دنیا والے
پیدا ہونا ہے، دوسری دنیا میں

ایثارِ حیات

از جناب نبی الحسن صاحب شمیم

شمیم صاحب کلیہ جامعہ عثمانیہ میں تاریخ کے متعلم ہیں۔ آپ نے ایثار حیات کے عنوان سے ایک کتاب لکھنے کا قصد کیا ہے جو ان بزرگ ہستیوں کے حالات پر مشتمل ہوگی جنہوں نے قوم ملک یا صداقت کی خاطر اپنی جانیں قربان کی ہیں۔ یہ اس کی پہلی قسط ہے۔ باقی حصے بھی "مکتبہ" ہی میں دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

"مکتبہ"

مادر گیتی کا وہ پہلا فرزند تھا جس نے انسانی کیفیات کا مطالعہ کیا حق و ناحق کو استدلال کے ترازو میں تولا ان کا ایک معیار قائم کیا۔ اس کی زبان امر حق کے کہنے سے کسی حال میں بھی نہ رکی، مذہب، اخلاق، تمدن، معاشرت، سیاست غرض ہر شعبہ زندگی کے متعلق اس کے ذاتی خیالات تھے، مخصوص دلائل تھے، نیا طرز بیان تھا، جو دنیا کو نرالا معلوم ہوا۔

وہ چاہتا تھا کہ لوگوں کے پاس ہر فعل کی وجہ ہونی چاہئے۔ ضمیر کے خلاف کام کرنا گناہ ہے۔

زبان حق کا جوش برابر بڑھتا ہی گیا لوگ اس کی گفتگو سے اکتانے لگے لیکن پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی، راستہ چلتے اس نے تقریریں شروع کیں خود لوگوں کی زبان سے ان کے اصولوں کو غلط ثابت کرایا۔ قدامت پرستوں کو یہ باتیں کیسے بھاتیں یہ پہلی آواز تھی جو انھوں نے اپنے اصولوں کے خلاف سنی تھی خاموش کیسے رہتے۔ ایک طرف

تحقیق ومطالعہ کا یہ عالم کہ انسان کے ہر فعل پر نقص نظر آتا ہے اس کے دلائل موجود ہیں، نکات سمجھائے جا رہے ہیں الفاظ کا ایک طوفان ہے جو امنڈا امنڈ کر آ رہا ہے، دوسری طرف تغافل کا یہ حال کہ اگرچہ جوابات سے زبان قاصر ہے پھر بھی دل یہی کہتا ہے کہ یہ دروغ گو ہے کاذب ہے اسلاف کے طریقوں سے ہٹ گیا ہے۔ ایسی حالت میں تباہ ہو تو کیسے لوگوں نے کان بند کر لیے تاکہ آواز حق ان تک نہ پہونچے راستہ میں اس کو دیکھ کر چپکے سے چل دیتے کہ کہیں یہ بلا پیچھے نہ لگ جائے آخر حکومت کو بھی اس کی طرف توجہ کرنی پڑی اس کے تمام خیالات مہیا کیئے گئے۔ پانچ ہزار آدمیوں کی جیوری کے روبرو مقدمہ کی سماعت ہوئی، حق گوئی اور اظہار خیال کو جرم قرار دیا گیا۔ سزا بھی ایسی دی گئی جو دنیا میں سب سے پہلا امتحان صداقت قرار پائی۔ زہر کا ایک پیالہ اس کے ہاتھ میں دیا گیا اور کہا گیا کہ اسے پی لو یا عہد کرو کہ جو کچھ تم کہتے ہو پھر کبھی نہ کہو گے" صداقت کے دیوتا نے خوشی خوشی زہر کا جام پی لیا۔ یہ پہلا امتحان تھا جو علم کی اشاعت میں کیا گیا یہ پہلا واقعہ تھا جس نے خودداری اور استحکام سیرت کی مثال قائم کی۔ دنیا میں ایمان پر مرنے والے بہت ہوئے لیکن بات پر مرنے والا یہ پہلا شخص سقراط تھا جسے ہم شہید اول کہہ سکتے ہیں۔

تیغ خوں آشام کے جوہر دکھانے والو اپنی آنکھیں بند کر لو نہیں تو ایسا خونیں منظر دیکھو گے کہ بے اختیار ہو جاؤ گے۔

آفتاب اسلام طلوع ہوئے ابھی ایسا زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ دنیا کے ہر گوشہ سے تاریکیاں بڑھنے لگیں، فسق و فجور پھیلنے لگا احکام شریعہ کو بالائے طاق رکھ دیا گیا، آخر ایک جماعت اس حالت کو روکنے پر آمادہ ہوئی اور امام وقت سے التجا کی کہ وہ ان کا ساتھ دیں، غیرت کے تقاضے سے خاموش نہ بیٹھا گیا حق کی جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ بیوفائی غداری جو چاہے کہو ساتھیوں نے ساتھ نہ دیا ایک بیابان میں تنہا چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ عرب کا ریگستان تھا گرمیوں کا زمانہ، لوؤں کا چلنا اس پر پانی کا ایک قطرہ نہ ملنا۔ تمام عزیز و اقارب دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں کے آگے دشمنوں نے خاک و خون میں ملا دئے۔ اس بے بسی کی حالت میں شرط صلح یہ پیش کی گئی کہ دشمن کی بیعت کی جائے۔ ہائے کیا برا وقت تھا ایک

طرف اپنی جان کا خیال، دوسری طرف آن کا اندیشہ آخر خدا کی راہ میں سر جنگ کیا دشمن نے وہ دکھایا جو دنیا کی آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ امام حسینؑ جو دوش نبی صلعم پہ بیٹھتے تھے آج خاک و خون میں غلطان تھے جواہر کا ٹکڑا ریت میں پڑا تھا پھر بھی آب و تاب وہی تھی۔ تسلیم و رضا کا اب کوئی باب دنیا کی تاریخ میں نہ لکھا جائیگا اسی کو پڑھو اور سبق سیکھو۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔

شہید الشہدا نے راہ حق میں کیسے کیسے مصائب اٹھائے صبر و ثبات استقلال رواداری اور ایثار کی وہ مثال پیش کی جسکی مثال نہیں ملتی اُن سے جو کچھ ہوا کیسے نہ ہوتا آخر کس کے بیٹے تھے اور کس کے نواسے۔



"جان کا صدقہ مال ہے اور ایمان کا صدقہ جان" اس مقولے پر دنیا نے بہت دنوں عمل کیا اور ایسے ایسے سر فروش پیدا کئے جن کے نام صفحۂ ہستی سے کبھی نہ مٹیں گے مذہب کا جذبہ ہی کچھ ایسا ہے کہ تمام جذبوں پر غالب ہے خود بخود اس کے نام پر مٹنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسی آگ ہے جو کبھی نہیں بجھتی۔

اے ایمان پر مرنے والوں کا تماشہ دیکھنے والو یورپ کے اسٹیج کی طرف نظریں اٹھاؤ۔ یہ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کے جھگڑوں کو دیکھو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ مذہب کی ایک چنگاری کہاں تک آگ لگا سکتی ہے۔ تم اسے جنون کہو یا وارفتگی سودا کہو یا عقیدہ حقیقت یہ ہے کہ ایسا عبرتناک منظر کبھی نہ دیکھو گے۔

تخت انگلستان پر ملکہ میری جلوہ گر ہے۔ پاپائے روم کا اثر ملک میں از سر نو پھیل رہا ہے۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کے پیرو ہزاروں کی تعداد میں قتل ہوئے ہزاروں کو نذر آتش کیا گیا، ان میں سے دو کا حال سنو ان کی ہمت جرأت اور قربانی کا اندازہ کرو خدا دنیا میں ویسا برا وقت نہ لائے۔ پادریوں کا افسر اعلیٰ کرینمر جو نئے مذہب کا پیرو تھا اس نے پہلے تو میری کے کہنے سے پاپا کو اپنا مذہبی رہنما تسلیم کر لیا لیکن بعد کو اُسے پشیمانی ہوئی اعتقاد تبدیل کرنے کے بعد ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب آدمی اپنے ماضی اور حال پہ غائر نظر ڈالتا ہے کبھی وہ اپنے جدید خیال میں مستحکم ہو جاتا ہے اور کبھی اسے ندامت ہوتی ہے

اپنی کمزوری کا احساس ہوتا ہے اور اس کی تلافی کے لئے وہ بہت کچھ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔

کرینمر بھی اپنے مذہب پر جان دینے کو تیار ہو گیا جب اس کے جلانے کے لئے آگ روشن کی گئی تو یہ کہکر کہ "اس نکمے ہاتھ نے معافی کے لئے معروضہ لکھا تھا" اس نے اپنا سیدھا ہاتھ شعلوں میں جلا ڈالا اور بعد کو خود بھی خوشی خوشی جلکر خاک ہو گیا، آگ کو وہ گلشن ابراہیم سمجھا اور کیوں نہ سمجھتا موجودہ زندگی حقیقی زندگی نہیں اگر اسے چھوڑکر دائمی حیات ملے تو کون ہے جو انکار کرے، خیر خواہان قضاء و قدر مسکرائے اور آپس میں مبارکباد دی کہ اب انسان زندگی کی حقیقت کو سمجھنے لگے ہیں۔ ملکہ میری کا مذہبی تعصب اپنے انتہائی جوش پر تھا نئے مذہب والے سیکڑوں کی تعداد میں روزانہ قربان ہو رہے تھے۔ مصیبت کا وقت ایک بڑے امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ انسانی طبائع اور سیرتوں کا اندازہ اسی وقت پورے طور پر ہوتا ہے جو لوگ طبیعت کے کمزور ہوتے ہیں ہاتھ پاؤں ڈالدیتے ہیں مضبوط دل والے مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں ان کا قول ہوتا ہے کہ چاہے جان جائے آن نہ جائے

ملکہ میری جبراً مذہب تبدیل کرانا چاہتی تھی لوگ کیسے مان لیتے اتنی قربانیوں کے بعد بھی مطلب خاطر خواہ پورا نہ ہوا اور آخر جس مذہب کے مٹانیکی کوشش کی جارہی تھی وہی غالب ہوا، یہ نتیجہ تھا اس تمام ایثار کا جو ایسے وقت میں ہر فرد سے ظاہر ہوا۔ بچوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ وہ شمع سے ہاتھ جلا جلا کر کہتے تھے کہ ہم آگ میں اس طرح جلیں گے۔ جوان بوڑھے مسکراتے ہوئے آگ میں کود پڑتے تھے۔

لیٹمر نے جلتے وقت جو پرجوش الفاظ کہے تھے آجتک انگریزی قوم کو یاد ہیں۔

"میرے دوستو مردانگی دکھانا ہم خدا کی مہربانی سے آج ایسی شمع روشن کریں گے جو کبھی خاموش نہ ہوگی"

رولنڈ ٹیلر کا حال سنو یہ شخص سفوک کے ایک گرجے میں ملازم تھا۔ ملکہ نے حکم دیا کہ اس کو جلد از جلد سزا دیجائے ایک روز جب کہ ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی رولنڈ ٹیلر قید خانہ سے باہر لایا گیا اور چند کانسٹیبلوں کے ہمراہ سفوک روانہ ہوا۔ راستہ میں اسکی بیوی بچے اس کے گذرنے کے منتظر تھے ایک لڑکی چلا اٹھی" اماں اماں وہ دیکھو ابا کو

سپاہی پکڑے لئے جارہے ہیں۔ ماں نے بغور دیکھا تو شوہر پہ نظر پڑی۔ قیدی نے تھوڑی دیر بیوی بچوں سے گفتگو کرنے کی اجازت مانگی جو اسے مل گئی۔ رولینڈ نے اپنے بال بچوں کے ساتھ پتھروں پر بیٹھکر درگاہ خداوندی میں کچھ اس طرح سے دعا مانگی کہ سرکاری سپاہی بھی بغیر متاثر ہوئے رہ نہ سکے

چلتے وقت بیوی بچوں کی گریہ وزاری کا بیٹلر پر کچھ اثر نہ ہوا اس نے بہادرانہ الفاظ میں بیوی کو نصیحت کی "ہمت ہرگز نہ ہارنا۔ آج سے خدائے تعالی تمہارے بچوں کی خبرگیری کریگا۔" رولینڈ سفوک پہونچ گیا اس کے جلانے کے لئے ہیزم کا انبار موجود تھا۔ اس نے ذری بھی ہمت نہ ہاری وہ پھانسی کے کھمبے سے باندھ دیا گیا۔ بدذات جلاد نے شرارتاً اس کی طرف ایک لکڑی پھینکی۔ رولینڈ کو غصہ نہیں آیا بلکہ ہنسی آئی اس نے کہا "اے میرے دوست خدا کا قہر میرے لئے کافی ہے تم نے لکڑی پھینکنے کی بیکار تکلیف کی" لکڑی کے انبار میں آگ لگادی گئی اور چند لمحوں میں رولینڈ کا جسم جلکر خاک ہو گیا اس طرح ان جانبازوں نے اپنی زندگی کا مقصد پالیا' دنیا سے بامراد گئے' مرتے ایک روز ضرور لہذا اس طرح کیوں نہ مرتے کہ دنیا میں ایک غیرفانی نام باقی رہ جاتا!

راجپوتوں کی بہادری اور کارناموں سے تاریخ کے صفحات بھرے ہیں یہ قوم نہ صرف جنگ کے وقت بہادری دکھاتی تھی بلکہ اس کا ہر فعل بہادرانہ ہوتا تھا۔ ہمارے لئے ممکن نہیں کہ اس مختصر مضمون میں پورے طور پر ان کے حالات پر روشنی ڈالیں صرف ایک ہی مثال پیش کرتے ہیں جو ان کے کارناموں کی نمائندگی کریگی اور اسی مثال سے واضح ہو جائے گا کہ ہم کن لوگوں کو اپنی بزم ایثار میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔

اکبر کے پاس دو راجپوت سوار آتے ہیں دریافت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فوج میں ملازمت کے خواستگار ہیں اکبر کی زبان سے نکلتا ہے کہ کچھ بہادری کے جوہر بھی تمہیں معلوم ہیں

یہ الفاظ نشتر بنکر راجپوتوں کے سینوں میں لگے راجپوتی غیرت کو حرکت ہوئی دونوں نے اپنے نیزے ایک دوسرے کے سینوں میں مار اور وہیں ختم ہو گئے۔

اکبر کو راجپوتی آن کا تجربہ پہلے بھی ہو چکا تھا اس مرتبہ محو حیرت رہ گیا خود بھی بہادر تھا ایک جوش اٹھا نیزے کو دیوار میں نصب کر کے چاہا کہ خود بھی یہی جوہر دکھائے نمکخوار لپٹ گئے اور باز رکھا۔

ایک انگریز مورخ کا بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ کے پیرو بُرے وقت میں اپنے پیغمبر کا ساتھ نہ دے سکے اور الگ ہو گئے لیکن محمد صلعم کے ساتھیوں نے جس خلوص اور محبت سے آپکا ساتھ دیا اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس قول کے ثبوت کے لئے واقعات کے دفتر موجود ہیں۔ ہمارے مضمون سے جس واقعہ کا تعلق ہے اس کی اہمیت یہی ہے کہ ایک محبت کی قربانی ہے جس سے شیدائیانِ اسلام کی اس وقت کی حالت کا پتہ چلتا ہے۔

عضل اور قارتہ کے قبیلوں کے لئے دربار نبوی سے دس آدمی اس لئے روانہ کئے گئے کہ ان کو راہ ہدایت پر لائیں۔ مقام رجیع پر قبیلہ بنو لحیان سے مقابلہ ہو گیا دس میں آٹھ اسی وقت شہید ہو گئے اور دو غلام بنائے گئے ان دو میں ایک حضرت خبیب تھے اور دوسرے زید خبیب کو جب قتل کیا جا رہا ہے تو آپ نے نماز پڑھنے کی اجازت مانگی قاتلوں نے اجازت دی انہوں نے دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد کہا "دیر تک نماز پڑھنے کو جی چاہتا تھا لیکن تم کو خیال ہو گا کہ موت سے ڈرتا ہوں" پھر چند اشعار پڑھے جس کا مطلب یہ تھا۔

"جب میں اسلام کے لئے قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھکو اس کی پروا نہیں کہ کس پہلو پر قتل کیا جاؤنگا یہ جو کچھ ہے خالصتاً خدا کے لئے ہے اور وہ چاہے گا تو جسم کے ان پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکت نازل کریگا۔" الفاظ ابھی ختم نہ ہوئے تھے کہ جام شہادت نوش فرمایا۔

دوسرے صاحب زید تھے ان کو صفوان بن امیہ نے قتل کے ارادہ سے خریدا تھا قتل کے وقت قریش کے معزز سردار تماشہ دیکھنے آئے جن میں ابو سفیان بھی تھے جب قاتل نے تلوار ہاتھ میں لی تو ابو سفیان نے کہا سچ کہنا اس وقت تمہارے بدلے محمد صلعم قتل کئے جاتے تو کیا تم اس کو اپنی خوش قسمتی نہ خیال کرتے بولے "خدا کی قسم میں تو اپنی جان کو

اس کے برابر بھی عزیز نہیں رکھتا کہ رسول اللہ صلعم کے تلووں میں کانٹا چبھ جائے" صفوان کے غلام قسطاس نے آپ کا سر مبارک کاٹ لیا۔ زید دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کے الفاظ ہمیشہ کے لئے رہ گئے۔ آج بھی ان کے نام میں وہی شان ہے وہی دبدبہ ہے۔

عباسی خلفائے اہلبیت کے نام سے فائدہ اٹھایا خلافت پر متمکن ہونے کے بعد انھوں نے پورے طور پر بنی امیہ کا خاتمہ کر دیا لیکن علوی خاندان ابھی موجود تھا جسکو فنا کر دینا ان کے اختیار سے باہر تھا پھر بھی دل کے پھپھولے وقتاً فوقتاً پھوٹتے رہے خاندان علوی کا سب سے بڑا دشمن متوکل تھا جس نے کربلا کے تمام مزارات منہدم کرادئے لاشوں کو نکلوا کر پھکوا دیا، برسوں مزارات کی جگہ نہریں رواں رہیں اور کاشت ہوتی رہی۔ ایسے ظالم بادشاہ کے دربار میں بھی حق گو اشخاص کی کمی نہ تھی ایک روز اس نے ایک عالم ابن سکیت سے دریافت کیا کہ بتاؤ میرے بچے اچھے ہیں یا حضرت علی کے ابن سکیت کے منہ سے وہی نکلا جو اس کا ضمیر کہہ رہا تھا۔ اس نے جان کی پروانہ کی اور صاف کھدیا کہ وہ حضرت علی کی اولاد کو ترجیح دیتا ہے، متوکل نے اسے قتل کرا دیا۔ حق بات ہمیشہ ناگوار گذرتی ہے لیکن خون ناحق بھی ضرور رنگ لاتا ہے۔ دیکھا گیا کہ باطل کو حق پر ترجیح دینے کے لئے ہمیشہ خون کے دریا بہائے گئے لیکن جتنا خون بہایا گیا اسی قدر جلدی حق کی فتح ہوئی متوکل کو بھی اپنے اعمال کی سزا ملی اور خود اس کے بیٹے نے سازش میں شرکت کر کے اسے قتل کرا دیا۔

حق بات پر جان دینے والوں میں سرٹی سن مور کا درجہ بہت بلند ہے اس کے قتل میں ایک خاص شان نظر آتی ہے، وہ ایک غیر متعلق بات کے لئے صرف ہاں لکھدینے سے نہ صرف اپنی جان بچا سکتا تھا بلکہ دنیاوی اعزاز میں بھی ترقی ہو سکتی تھی لیکن اس نے وہ نہیں کہا جس پر اس کو دل کی ملامت سنی پڑتی۔

ہنری ہشتم نے اپنے بھائی کی بیوی کیتھرائن سے شادی کرلی تھی کچھ روز ہنسی خوشی گذرے لیکن تھوڑے کے عرصہ میں ہنری کا دل اس کی طرف سے ہٹ گیا اس نے چاہا کہ

اسے طلاق دے لیکن پوپ نے اجازت نہیں دی اس پر کرنمیر نے انگلستان کے گرجے کا اعلیٰ افسر ہونیکی حیثیت سے خود مقدمہ ہنری کی موافقت میں فیصل کر دیا۔
اب ہنری نے سب لوگون سے اس بات کی قسم لینی شروع کی کہ کھتر ائن کے ساتھ جو شادی ہوئی تھی وہ ناجائز تھی سرٹامس مور سے بھی قسم کھانے کو کہا گیا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس انکار پر کچھ دنون اسے قید کی سزا ملی اور کوشش کی گئی کہ وہ اپنی زبان سے کہدے کہ ہنری کا طرز عمل بجا اور درست تھا لیکن اس نے نہیں کہا۔ آخر اسے پھانسی کی سزا دی گئی اس نے قتل کے وقت مسکرا کر جلاد سے کہا "مجھے مہربانی کر کے اوپر چڑھا دو نیچے میں خود چلا آونگا تمھیں تکلیف کرنی نہ پڑیگی" جب سر کٹنے کا وقت آیا تو اس نے پھر ہنسکر کہا کہ ذرا مجھے ڈاڑھی اتار لینے دو اس نے کوئی قصور کسی کا نہیں کیا اس کے ساتھ ہی گردن جسم سے کٹ کر دور جا گری۔
ایسے مرنے والے دنیا میں کا ہیکو پیدا ہوں گے' حق کی قوت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ بزدل کو بھی طاقتور بنا دیتی ہے انسانون کے جینے جینے میں فرق ہے اور مرنے مرنے میں فرق ہے ایسے بھی ہیں جن کو نہ مرنا آتا ہے نہ جینا وہ ہماری بزم ایثار سے خارج ہیں لیکن جن کو صحیح طور پر مرنا آتا ہے ان کا کیا کہنا۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زمان از غیب جانِ دیگراست

دیوان غالب قلمی ۱۲۳۷؁ ہجری

مترجمہ
جناب سید محمد صاحب ایم اے مددگار سٹی کالج

ادبستان ہند میں مرزا غالب اور ان کی اردو شاعری کے متعلق آج تک اتنا لکھا گیا کہ ان مضامین کے مجموعے سے کچھ اور نہیں تو نہیں کم سے کم منکرین پر اردو شاعری کی فضیلت نہایت آسانی کے ساتھ ثابت کر دی جاسکتی ہے، ہمارے ملک کی ایک مستند ہستی ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب بی اے، پی، ایچ، ڈی پروفیسر ادبیات انگریزی عثمانیہ یونیورسٹی نے غالب پر غالب کے نام سے انگریزی زبان میں ایک مقالہ لکھا ہے اس کے ساتھ ہی غالب کے اردو کلام کی جدید طور پر ترتیب بھی شروع کر دی ہے، مقالہ انگریزی میں ہونے کے باوجود غالب کے دیوان کو ہندوستان عشرت نشان کی "الہامی" کتاب سمجھنے والی جماعت اتنی "برگشتہ" معلوم ہوتی ہے کہ الامان والحفیظ!

یہ مقالہ دیوان کے ساتھ ترجمہ ہو کر طبع ہوگا تو اس وقت اس کے اصلی جوہر کھلیں گے، مسلم ریویو میں ڈاکٹر صاحب ممدوح نے دیوان غالب جدید (نسخۂ حمیدیہ) بھوپال پر ایک مختصر سا تنقیدی مضمون سپرد قلم کیا ہے جس کی اہمیت آپ کو "مترجم" کے نوٹ سے معلوم ہوگی، نسخۂ حمیدیہ کے اضافات کلامی اور ان کے تعلیقات علمی پر اگر غور و توجہ سے کام لیا جائے تو بہت سی باتیں محل نظر بن جاتی ہیں کہ خود غالب نے اپنے احباب باصواب کے اصرار پر اپنے کلام کا جو انتخاب کیا تھا وہ کیا ہے؟

اس پر نوٹ لکھتے ہوئے ہماری نظر نسخۂ حمیدیہ کے صفحہ ۳۱ پر پڑتی ہے نشستن، گسستن کے قافیہ کے ساتھ رفتن، کا بھی ایک قافیہ ہے۔ علامت مصدر "تن" کے پہلے نشس، گسس، رف، کیا غالب کی شاعری کے آپس میں قافیے ہیں؟

ہمارے ایک محترم دوست نے ہم سے بیان کیا کہ غالب نے اپنے دکنی شاگرد مولوی حبیب اللہ ذکا کے پاس تحفتہً اپنا اردو دیوان بھیجا تھا، شاگرد نے اس کا انتخاب کر کے

فارسی میں دیباچہ بھی لکھا ہے۔ یہ دیوان ان کے پاس آیا اور انہوں نے نسخۂ حمیدیہ سے مقابلہ بھی کیا، بعض بعض دیفون میں کئی کئی غزلیں زائد ہیں، اب ان کے پاس سے یہ دیوان واپس ہوگیا ہے ہمارے اصرار پر پھر منگوانے کی کوشش میں ہیں، اگر یہ دیوان ہمارے قبضے میں آجائے تو ممکن ہے کہ کچھ اور بھی حقیقت کھل جائے۔ (مجلۂ مکتبہ)

"مندرجہ ذیل مضمون جو کلکتہ کے انگریزی سہ ماہی مسلم ریویو بابتہ جنوری ۱۹۲۹ء سے ترجمہ کیا گیا ہے، ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب بی اے پی ایچ ڈی پروفیسر ادبیات انگریزی جامعہ عثمانیہ کی دقیقہ رس طبیعت اور فاضلانہ تحقیق و موشگافی کا نتیجہ ہے۔ مفتی انوارالحق صاحب مدیر نسخۂ حمیدیہ نے بھوپال کے مخطوط دیوان غالب کی نسبت اپنے نظریہ سے جو عجیب ادبی غلط فہمی پیدا کر دی تھی یقیناً اس کا اندفاع ڈاکٹر صاحب جیسے نکتہ رس محقق ہی کا کام تھا۔ کلام غالب کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کے لیے ڈاکٹر صاحب کی یہ سعی انکی کتاب غالب سے کچھ کم موجب تشکر نہیں البتہ ایسے پرستاران غالب جو ہر رطب و یابس کو مقدس سمجھتے ہیں اس ہندی کی چندی کو بے مزا سمجھیں گے مگر طالبان تحقیق کے نزدیک یہ مختصر مضمون کئی بے خودانہ محاسن سے بہتر ہے۔ س۔م

راقم الحروف جن دنوں غالب کی اردو نظموں کو تاریخی سلسلہ سے ترتیب دے رہا تھا مرزا غالب کے اس مخطوط دیوان کو دیکھنے کا موقع ملا جو ۱۲۳۷ھ م ۱۸۲۱ء کا لکھا ہوا ہے اور حکومت بھوپال کی عنایت سے مجھے مستعار ملا تھا[۵۱]۔ جس وقت یہ دیوان قلمی ہوا مرزا غالب کی عمر (۲۴) برس کی تھی اور اگر ہم یہ باور کریں کہ مرزا نے (۱۵) برس کے سن سے ریختہ یا اردو غزل گوئی شروع کی تو اس مخطوط دیوان میں ان کی شاعرانہ زندگی کے دس برس کا سرمایہ مندرج ہونا چاہیے[۵۲]۔

---

۵۱ یہ دیوان زیر طبع ہے عنقریب شایع ہوگا۔

۵۲ غالب از مولوی سید عبداللطیف حیدرآباد دکن ۱۹۲۸ء صفحہ ۲۱ نیز نسخۂ حمیدیہ صفحہ ۱۴ یادگار غالب کریمی پریس لاہور ۱۹۲۲ء صفحہ ۹۸، ۹۹

یہ قلمی دیوان ریاست بھوپال کے شاہی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ میں اس عنایت پر کہ یہ نسخہ میرے مطالعہ کیلئے حیدرآباد بھیجا گیا اظہار امتنان کرتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس کو اچھی حالت میں نہیں رکھا گیا ہے۔ اس کی جلد اس قدر فرسودہ ہوگئی ہے کہ اوراق نہایت آسانی سے علحدہ کئے جا سکتے ہیں۔ اس کی موجودہ جلد صرف یہ بتاتی ہے کہ کبھی یہ مجلد تھا۔

مفتی انوار الحق صاحب ساکن بھوپال کا جنہوں نے کلام غالب کے ایک جامع ایڈیشن میں اس نسخہ کی تمام نظمیں شریک کرلی ہیں[۵] یہ بیان ہے کہ یہ نسخہ ابتداً میاں فوجدار محمد خاں رئیس بھوپال کے لئے لکھا گیا تھا۔ یہ بیان بظاہر مندرجہ ذیل عبارت پر مبنی ہے جو ایک سادہ ورق پر متن کے آغاز میں جلد بندی کے کچھ دن بعد لکھی گئی ہے۔

"دیوان ہذا من تصنیف مرزا نوشہ، دہلوی المتخلص بہ اسد، از کتب خانہ سرکار فیض آثار عالیجاہ، عالم پناہ، میاں فوجدار محمد خاں بہادر دام اقبالہٗ قلمی خوش خط"

اس عبارت کے بالمقابل ایک اور ملحقہ ورق پر میاں فوجدار محمد خاں کی مہر مورخہ سال ۱۲۶۱ھ ثبت ہے۔ اس سے زیادہ جو بات اخذ کی جا سکتی ہے۔ یہ ہے کہ یہ قلمی نسخہ ۱۲۶۱ھ میں میاں فوجدار محمد خاں کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ یہ نسخہ اس تاریخ سے کوئی (۲۴) برس پہلے ان کے لئے قلمی ہوا تھا۔

نسخہ کا متن (۷۵) اوراق ($11\frac{1}{2}" \times 7"$) پر مشتمل ہے اور اس کے ہر دو جانب چار چار ورق اسی قسم کے کاغذ کے جو متن کا ہے اور ہندوستان ہی میں ہاتھ کا بنایا ہوا معلوم ہوتا ہے موجود ہیں۔ ان چار ورقوں کے علاوہ ہر ایک جانب دو دو ورق انگریزی کاغذ کے ہیں۔ ابتدا میں یہ ورق اوراق ۳ اور ۴ کے درمیان اور آخر میں اوراق ۲ اور ۳ کے درمیان ہیں۔ متن کے ہر صفحہ پر ۱۰ سے (۱۱) تک ابیات صاف نستعلیق خط اور چینی روشنائی میں لکھی گئی ہیں۔ سب سے پہلے چار قصیدے ہیں پھر غزلیات ہیں جن کی تعداد (۲۷۶) ہے۔ آخر میں (۱۱) رباعیات درج ہیں۔ قصیدوں اور غزلوں کے لئے علحدہ علحدہ دو لوحین ہیں جو سنہری کام سے مزین ہیں۔ سارا متن بھی سنہری حاشیہ کے خط سے

---

۵ نسخہ حمیدیہ

آراستہ ہے۔ متن کے آخر میں کاتب نے اپنا اختتامی نوٹ اس طرح لکھا ہے۔

"دیوان من تصنیف مرزا صاحب وقبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلمہم ربہم علی ید العبد المذنب حافظ معین الدین۔ بتاریخ شہر صفر المظفر سنہ ۱۲۴۷ من الہجرہ النبویہ بہ صورت انجام یافت"

متن کا حاشیہ گوناگون اصلاحوں اور اضافوں سے مملو ہے۔ بعض جگھوں پر نئی غزلیں جو متن میں شریک نہیں درج کی گئی ہیں چند جگھوں پر کئی غزلیں متن سے دوبارہ نقل کی گئی ہیں۔ حاشیہ کی تحریریں بعض خوشنما نستعلیق خط میں ہیں اور بعض شکستہ خط میں۔ حاشیہ پر متعدد جگھوں پر فوجدار محمد خاں کی ایک چھوٹی مہر مورخہ ۱۲۴۸ھ (۲۶۶ سم × ۱۶۸) ثبت ہے۔

متن کے ورق سے پہلے سادہ اوراق میں سے ورق ۱ الف کے بائیں گوشہ کے سرے پر ق ۶۶۶ درج ہے۔ اس سے ایک حرف نیچے سرخی سے ادب اردو ۱۱ اور پھر کچھ نیچے ۴۵۸ اور اس کے قریب ہی شکستہ خط میں (محمد حسین) لکھا ہوا ہے اوراق ۱ ب، ۲ الف اور ۲ ب خالی ہیں۔

ورق ۳ الف پر غالب کا ایک مکتوب (؟) بے نقط فارسی میں کسی قدر ناصاف شکستہ خط میں درج ہے۔ یہ مکتوب ورق ۳ الف پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ورق ۳ ب تک مسلسل ہے اور وہاں محمد اسد واللہ کے ساتھ ختم کیا گیا ہے۔ یہاں نام میں حرف و کا اضافہ قابل غور ہے جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے اوراق ۳ و ۶ کے درمیان دو ملحقہ ورق ہیں یہ جلد کے متصل ورقوں سے چسپاں کر دئے گئے ہیں یہ ورق کب شریک کئے گئے اور کس نے شریک کئے معلوم نہیں ہو سکتا ان ورقوں میں سے جو ۴ اور ۵ کہلائے جا سکتے ہیں ۴ الف اور ۵ ب بالکل خالی ہیں ۴ ب پر صاف نستعلیق خط میں وہ عبارت درج ہے جو ہم نے ابتدا ہی میں نقل کی ہے۔

ورق ۶ الف پر فوجدار محمد خاں کی بڑی مہر (۵۶۸ سم × ۴۶۵) ثبت ہے اور انگریزی کے چکنے کاغذ سے محفوظ کی گئی ہے۔ یہی مہر آخر کے ملحقہ ورقوں میں سے ایک پر بھی ثبت ہے۔ متن کے بعد جو چار سادہ ورق شریک ہیں ان پر غالب کی کئی غزلیں جو متن میں شریک نہیں درج کی گئی ہیں اور ان کے اختتام پر کاتب نے رسمی طور پر بتایا ہے کہ اس کا کام انجام کو پہنچا

نسخۂ حمیدیہ کے مدیر مفتی انوار الحق صاحب کا استدلال ہے کہ یہ نسخہ وقتاً فوقتاً غالب کے ہاں ان نظموں کے اندراج کے لیے روانہ کیا جاتا تھا جو ۱۲۳۷ھ کے بعد لکھی گئی ہیں۔ مگر مفتی صاحب اس استدلال کے لیے کوئی سند اور ثبوت پیش نہیں کرتے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ حاشیہ کے اضافے اور اصلاحیں خود مرزا غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ راقم الحروف نے سرکار عالی کے محکمۂ اسناد تاریخی میں ماہرین کی مدد سے نہایت احتیاط کے ساتھ ان کی تنقیح کی اور غالب کے اصلی خطوط سے مقابلہ کیا اور ان اصلاحوں اور اضافوں کو اصل خطوط سے ذرا بھی مشابہ نہیں پایا۔ علاوہ ازیں جگہ جگہ املا کی سخت غلطیاں ہیں۔ یہ اغلاط غالب جیسے محتاط مصنف سے کسی طرح منسوب نہیں کی جاسکتیں۔ اس کے سوا کاتب نے حاشیہ پر غزلیں نقل کرتے ہوئے نہایت بے پروائی کے ساتھ دوسری غزلوں کی بیتوں اور مصرعوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ کئی غزلیں باوجود متن میں مندرج ہونے کے ایک سے زیادہ مرتبہ لکھی گئی ہیں۔ نیز کئی ابیات کے آگے طفلانہ رائیں بھی درج ہیں۔

ان واقعات کے پیش نظر راقم ہرگز اس نظریہ کو باور کرنے تیار نہیں جو نسخۂ حمیدیہ کے مدیر نے قائم کیا ہے۔ حاشیہ کے اضافے یقیناً غالب کے خط میں نہیں بلکہ یہ دو مختلف ہاتھوں کے ہیں بعض غزلوں کے آخر میں جو صاف نستعلیق خط میں ہیں اسی خط میں عبد العلی کا نام لکھا ہوا ہے شکستہ خط کی غزلیں محمد حسین کی دستخط سے جو ابتدائی سادہ ورق ۱۔الف پر ثبت ہے بہت ہی مشابہ ہیں۔

یہ دونوں کون تھے معلوم نہیں شاید میاں فوجدار محمد خاں کے اتالیق یا ادبی مددگار ہونگے جنھوں نے غالب کی تازہ غزلیں جیسے ہی وقتاً فوقتاً ملتی گئیں حاشیہ پر درج کر دیں۔ یہ یقینی ہے کہ ۱۲۴۸ھ میں جو فوجدار محمد خاں کی چھوٹی مہر کا سنہ ہے، غالب نے اپنی غزلیات کا ایک انتخاب مرتب کیا اور اس پر فارسی میں دیباچہ بھی لکھا ہے۔ یہ ناممکن نہیں اگر حاشیہ کی غزلیں اسی انتخاب مرتبہ ۱۲۴۸ھ کے کسی نسخہ سے نقل کی گئی ہوں۔

باقیاتِ فانی

از جناب ابو العظم مولوی محمد احمد صاحب فانی مرحوم المخاطب نواب احمد نواز جنگ بہادر
سابق معتمد کمیٹی صرفِ خاص مبارک

اب اپنے دل سے پوچھیے کس پر فدا ہے یہ
ہم کو جو نام رکھتے تھے اس کی سزا ہے یہ

اک دھوم تھی جارسے تڑپنے کی زیرِ بام
تم نے ذرا نہ جھانک کے دیکھا کہ کیا ہے یہ؟

لکھے ہوئے ہیں کب کے امیر و گدا کے نام
اللہ کس غضب کی پرانی سرا ہے یہ!

کہتا ہوں ایک بات مگر اس قرار پر
پھر مجھ سے یہ نہ پوچھنا "کس سے سنا ہے یہ"؟

گھبرا گئی ہو یاس و تمنا سے جانِ زار
دی عشق نے ندا کہ ابھی ابتدا ہے یہ

ایک بے خودی سی چھا گئی پوچھا جو اس نے حال
نکلا نہ میرے منہ سے مرا مدعا ہے یہ

غیروں نے چھیڑچھاڑ تو کی بزم میں کچھ آج
شاید سمجھ گئے تھے کہ بگڑا ہوا ہے یہ

ساقی کو پوچھتا ہوں کبھی جام کو کبھی
شب کا سماں نگاہوں میں چھایا ہوا ہے یہ

میں تو فقط صنم ہی سمجھتا ہوں اس کو شیخ
تو دیکھ لے تو بول اٹھے بیشک خدا ہے یہ!

واعظ کا کچھ کلام ہے رندوں کا کچھ بیان
اللہ جانتا ہے کہ سچ وہ ہے یا ہے یہ

دل سے زیادہ آنکھ تمہاری ہے مہربان
اس کو سراہتے تھے ہم اس سے سوا ہے یہ

کہنا وہ نامہ بر کا کچھ آہستہ کان میں
وہ میرا اضطراب کہ کس سے سنا ہے یہ

رکھا ہے فانی اپنا تخلص اسی لئے
تا لوگ سمجھیں عشق پر اس کے فنا ہے یہ

پردہ

نتیجۂ فکر مولانا میرزا علی رضا صاحب ماہر لکچرار فارسی سٹی کالج

عرض و جوہر کا ہے شرعاً جو نگہبان پردہ
دیکھو کرتے ہیں انساں سے بنی جاں پردہ

پردے سے دولتِ امکان نے خصوصیت برتی
سروساماں ہے ہوا بے سروساماں پردہ

شعلۂ عشق ار و پا نہ گر بر خیزد
اس لیے کرتے ہیں غیروں سے مسلماں پردہ

بے حجابی کے جو عادی ہیں مبارک ان کو
نہیں اُلٹے گا کوئی صاحبِ عرفاں پردہ

ناطقِ وحی کے احکام کا گر عامل ہے
شرطِ ایماں ہے کرے صاحبِ ایماں پردہ

پردۂ شرم سے ہوتی نہ زلیخا باہر
رکھتے جائز جو کبھی یوسفِ کنعاں پردہ

بے نقابی میں فسادوں کی ہوا ہے مضمر
سچ اگر پوچھو تو ہے ماحیِ عصیاں پردہ

لے اُڑی چادرِ مشرق کو ہوائے مغرب
پھرتا موٹر میں ہے اب با سرِ عریاں پردہ

بات پردہ کی ہے اب شرم خدا ہی رکھے
دستِ تہذیب سے ہے دستِ گریباں پردہ

حامیِ شرع ہیں اللہ سلامت رکھے
لازمی جانیں نہ کیونکر شہ عثماں پردہ

بے خطر کہہ دو حسینانِ جہاں سے ماہر
صاحبِ عفت و عصمت کے ہے شایاں پردہ

تنقیدیں

غالب

مصنفہ ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب بی اے پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر جامعہ عثمانیہ

مجلد ضخامت (۱۰۴) صفحات قیمت (۳؎) پتہ دفتر مجلۂ عثمانیہ، عثمانیہ یونیورسٹی کالج

ڈاکٹر لطیف صاحب کی یہ انگریزی کتاب جس کا دنیائے ادب میں ایک عرصہ دراز سے انتظار تھا اور جس پر موافق و مخالف ہر قسم کی رائے رکھنے والوں کی نظریں لگی ہوئی تھیں بالآخر زیور طباعت سے آراستہ ہو کر پبلک کے آگے آگئی۔ ڈاکٹر صاحب ادبیات کے بلند پایہ عالم ہیں اور آپ کی اصابت رائے اور دقیقہ رس طبیعت اور باریک نظر سے اردو کی خوش قسمتی کہنا چاہیئے کہ اس کو استفادہ کا موقع نصیب ہوا۔ اس سے ایک عرصہ قبل ڈاکٹر صاحب کا فاضلانہ مقالہ "اردو ادب پر انگریزی ادب کا اثر" اہل اردو کے سربرآوردہ حلقوں میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی تنقیدی قابلیتوں سے اردو کی نہایت شاندار خدمات انجام دے رہے ہیں۔ محولہ بالا مقالہ میں اردو کے بعض مصنفین اور ادیبوں کی نسبت ڈاکٹر صاحب نے جو تنقیدی خیالات ظاہر کئے ہیں وہ خاص و عام ہر طبقہ میں نہ صرف مقبول ہوئے بلکہ ان سے تنقید نگاروں کی وسیع رہنمائی بھی ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب خدانخواستہ غالب کی شاعرانہ عظمت کے سرے سے منکر نہیں ہیں اور نہ ہی آپ اپنی رائے کو قول فیصل کی طرح تسلیم کرنے پر ہر شخص کو مجبور کر رہے ہیں۔ "غالب" میں آپ نے نہایت باقاعدہ طریقہ پر کلام غالب کے مطالعہ کے بعد اپنے تاثرات اور اصول تنقید کے تحت شاعر کے کلام سے اس کے نظریہ حیات اور اس کی شاعرانہ قدر و منزلت کے تعین کی مبارک کوشش کی ہے "غالب" کے سات ابواب ہیں۔ پہلے باب میں آپ نے غالب کے سوانح نگاروں میں دو ممتاز ہستیوں مولوی حالی اور ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری کے نتائج تحقیقات کی توضیح کی ہے۔ اس میں آپ نے بلا رو رعایت مولوی حالی اور ڈاکٹر بجنوری کے طریقہ کار کی غلطی بتائی ہے اور اس کے ساتھ ہی دوسرے باب میں غالب کی زندگی، نثر و نظم دونوں کی ترتیب مطالعہ کا وہ صحیح اور اصولی طریقہ پیش کیا ہے جس کی عمدگی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اور غالب اور حالی کی کورانہ پرستش کرنے والے بھی اس کا کوئی جواب سوائے ناک بھوں چڑھانے کے نہیں رکھتے اور ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے بعد بھی کوئی سقم نہیں نکال سکے۔ تیسرے

باب میں غالب کے کلام نظم و نثر کی تاریخی ترتیب کی کوشش کی ہے اور اس خصوص میں یہ جز تمام اردو دان اور قدردانان کلام غالب کے لیے موجب مسرت ہوگی کہ ڈاکٹر صاحب نے دیوان غالب کو تاریخی ترتیب سے مرتب کیا ہے اور یہ دیوان زیر طبع ہے۔ قریب میں شایع ہوگا اس باب میں خطوط غالب کو بہ لحاظ تاریخ و اسم مکتوب الیہ سائنٹیفک طور پر ترتیب دیکر یہ بتایا ہے کہ کس شخص کو غالب نے کتنے خطوط لکھے اور یہ خطوط کس سال سے کس سال تک لکھے گئے اس سے مطالعہ کنندگان خطوط غالب کی لائف میں بڑی مدد لے سکتے ہیں چوتھے باب میں مطالعہ غالب کے مسائل اور پانچویں باب میں غالب کے نظریہ حیات کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے سے اس خصوص میں بعض لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے اور یہ ضرور نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے جو نظریہ حیات غالب سے منسوب کیا ہے وہ قطعی اور یقینی ہی ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی رائے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے اور مستحکم دلائل و براہین پر مبنی ہے۔ اگر کوئی ایسے ہی غور و فکر سے کام لے اور اصولی طریقہ پر مطالعہ کرکے کوئی اور نظریہ حیات ثابت کرے تو اس کے قبول کرنے کے لیے کسی کو انکار نہ ہوگا اور ہم سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب بھی اس کی واقعی قدر کرنے تیار ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اردو کے ملبند بانگ مفکر ایسی کوشش کے لیے آمادہ ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ اس کتاب کی تصنیف سے ڈاکٹر صاحب کا مقصد اول اردو دانوں میں صحیح تنقیدی ذوق پیدا کرنا اور انھیں شاعری اور اس کے مطالعہ کا اصولی طریقہ بتانا ہے ایک اصول و نظام سے ڈاکٹر صاحب نے کلام غالب کا مطالعہ کیا اور اپنے نتائج مطالعہ سپرد قلم کر دیئے۔ اسی طریقہ پر دوسرے شاعروں کے کلام اور ان کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو اردو میں بہت جلد نہایت اعلیٰ درجہ کا تنقیدی ادب پیدا ہو جائے گا اور خالی واہ واہ کی بجائے تنقید و تبصرہ کا شوق انگریزی کی طرح اردو میں عام ہو سکیگا۔ آخری دو باب میں ڈاکٹر صاحب نے شاعری میں عظمت و بلندی پیدا کرنے والی کیا چیزیں ہیں ان پر فاضلانہ بحث کرکے غالب کی شاعری کو انہی اصول پر دیکھا ہے۔ اس خصوص میں ان کی بعض رائیں تو ایسی صاف اور سنجیدہ ہیں کہ ہر شخص بلا کسی مخالفت کے قبول کرلیگا۔ بعض اشعار کی نسبت ان کے خیالات سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر ان میں بھی ان کے اعتراضات کی واہمیت تسلیم کرنی ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب شستہ اور بلیغ انگریزی میں ہے۔ اس سے کلام غالب کے ایسے

مطالعہ کرنے والے جو انگریزی زبان جانتے ہیں اچھی طرح محظوظ ہو سکتے ہیں البتہ انگریزی نہ جاننے والے اس کے اعلیٰ خیالات سے محروم ہیں۔ ہم نے نہایت مسرت سے سنا کہ ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی تیار ہو گیا ہے اور زیر طبع ہے۔ اس کا ترجمہ شاعری اور اعلیٰ شاعری کے ترجمہ سے کم نہیں۔ اگر اردو ترجمہ شایع ہو جائے تو بہت اچھا ہے اس سے قدر دانان و پرستاران غالب بہت محظوظ ہونگے اور عام اردو دانوں کی اچھے تنقیدی ذوق کی طرف رہنمائی ہوگی۔ ہم ڈاکٹر صاحب کی اس ادبی کوشش کو اردو کے تنقیدی ادب میں ایک معرکتہ الارا اضافہ اور ایک اہم رہنما سمجھتے ہیں۔ اب تک بدقسمتی سے ان یونیورسٹیوں میں بھی جہاں اردو ادب اعلیٰ جماعتوں میں شریک نصاب ہے تنقیدی مطالعہ کا قطعاً رواج نہیں۔ زیادہ سے زیادہ مقدمۂ حالی موازنہ شبلی اور آب حیات کی پرانی لکیروں کو پیٹا جاتا ہے اور ان سے ایک انچ آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اگر اردو کے بڑے بڑے مدعیان ترقی اس خصوص میں توجہ سے کام لیکر ریسرچ اور تنقید کا ذوق جیسا کہ اس کتاب سے متصور ہے پیدا کرنے کی کوشش کریں تو اردو کی حقیقی معنوں میں بڑی خدمت ہوگی۔ (س۔م)

قوم پرست طالب علم

مصنفہ مولوی عبدالغفار صاحب حیدر آبادی مدرس مدرسہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی قیمت (۴) (۱) مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی (۲) قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور (۳) مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن اور (۴) اہل بک ڈپو پرنس بلڈنگ بمبئی سے مل سکتی ہے۔

مدرسہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ایک حیدر آبادی معلم کی یہ علمی کوشش قابل قدر ہے۔ اس میں مصنف نے ڈرامہ کے ذریعہ طلبا میں ہندو مسلم اتحاد اور حقیقی قوم پرستی کی موثر تعلیم دی ہے چونکہ یہ ڈرامہ خاص طلبہ ہی کے لئے ہے اس کی زبان بالکل صاف اور سلیس ہے کمسن بچوں اور مدارس تحتانیہ کے طلبہ کو اس کا مطالعہ کرایا جائے۔ جن مدارس میں اس کو اسٹیج کرنے کی سہولتیں ہوں وہاں اس کا اسٹیج کرنا بھی نہایت دلچسپ اور موثر چیز ہوگا۔

فہرس مضامین مجلۂ مکتبہ

(جلد دوم)

۱- سائنس

۲- فلسفہ اور مذہب

۳- تاریخ و معاشیات

۵- زبان و ادب

۵- افسانے

۶- دکھنیات

۷- متفرقات

سفرنامہ مصر جدید — ملا رموزی

سر فریدون الملک آنجہانی — مدیر

۸- منظومات

دور افتادہ — محشر عابدی

نوحۂ غم — ابوالافتخار فخر

ریختی — عابد مرزا بیگم

احساسات — پروفیسر ظفر تاباں

خیالات آزاد — محمد حسین آزاد

کلام الملوک ملوک الکلام — اعلیحضرت سلطان العلوم

فکر عالیہ — ابو محمد ثاقب

آمد شاہ — پرنسپل عبدالرحمن خاں

عمل — علامہ نواب ضیا یار جنگ بہادر

عشق — عبدالقادر وفا

امداد باہمی — صفی اورنگ آبادی

جذبات حبیب — حبیب سانپوری

عید کی تمنا — میر ثامن علی بیسان

جواب دیا — قادر حسین قادر

ماضی و حال — عمر عبدالکریم گل

تاثرات لطیف — جوش حیدرآبادی

غزل — شاہ عبدالعزیز عزیز

نغمۂ آزادی — سید علی شبیر شبیر

مائدۃ الاسلام — ابوالسخا سالار

رباعی — مولانا ابوالاعظم امجد حیدرآبادی

باقیات فانی — احمد نواز جنگ فانی مرحوم

پردہ — مرزا علی رضا ماہر

۹- تنقیدیں

تندرستی

حمایت المصلین

حمایت العقائد

جیون چرتر

عروج عثمانی

انشائے جدید

شیب و شباب

العراقی

رسالہ کیمیا ماہوار

مبادی نباتات

مقنن

کلیات وطن

شہنشاہ دوجہان

رسالہ ارشاد

رپورٹ مسلم لیڈیس کانفرنس

غالب

قوم پرست طالب العلم

۱۰- تصاویر

مولانا وحید الدین سلیم

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

علامہ جمال الدین نوری

اعلیحضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ

سر فریدون الملک بہادر آنجہانی

حضرت مفتی اعظم علی شائق

~~نواب امین جنگ بہادر~~

~~نواب سرور جنگ بہادر~~ صدر اعظم بہادر

راجہ مرلیدھر بہادر

اورینٹل کالج میگزین

اغراض و مقاصد۔ اس رسالہ کے اجراء سے غرض یہ ہے کہ احیا و ترویج علوم مشرقیہ کی تحریک کو تا حد امکان تقویت دی جاوے اور خصوصیت کیساتھ اُن طلبہ میں شوق تحقیق پیدا کیا جائے جو سنسکرت عربی۔ فارسی اور دیسی زبانوں کے مطالعہ میں مصروف ہیں ؛

کس قسم کے مضامین کا شائع کرنا مقصود ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ اس رسالہ میں ایسے مضامین شائع ہوں گے جو مضمون نگاروں کی ذاتی تلاش اور تحقیق کا نتیجہ ہوں۔ غیر زبانوں سے مفید مضامین کا ترجمہ بھی قابل قبول ہوگا۔ اور کم ضخامت کے بعض مفید قلمی رسالے بھی باقساط شائع کئے جائینگے ؛

رسالے کے دو حصے۔ یہ رسالہ دو حصوں میں شائع ہوتا ہے۔ حصہ اول عربی۔ فارسی اردو اور پنجابی (بحروف فارسی) حصہ دوم سنسکرت ہندی اور پنجابی (بحروف گورمکھی) ہر ایک حصہ الگ الگ بھی مل سکتا ہے ؛

وقت اشاعت۔ یہ رسالہ بالفعل سال میں چار بار یعنی نومبر۔ فروری۔ مئی اور اگست میں شائع ہوگا ؛

قیمت اشتراک۔ سالانہ چندہ مکمل رسالہ کے لئے ۸ عہ۔ ہر حصے کے لئے عہ ؛

خط و کتابت و ترسیل زر۔ خرید رسالہ کے متعلق جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر پرنسپل اورینٹل کالج لاہور کے نام ہونی چاہئے۔ مضامین کے متعلق جملہ مراسلات چیف ایڈیٹر کے نام بھیجنے چاہئیں ؛

محل فروخت۔ یہ رسالہ اورینٹل کالج لاہور کے دفتر سے خریدا جا سکتا ہے ؛

قلم تحریر۔ چیف ایڈیٹر کے فرائض پروفیسر محمد شفیع ایم۔ اے اورینٹل کالج سے متعلق ہیں حصہ عربی و فارسی و اردو ڈاکٹر محمد اقبال۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی اعانت سے مرتب ہوتا ہے ؛ حصہ سنسکرت و ہندی کے ایڈیٹر لکشمن سروپ ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی اور حصہ پنجابی کے بھائی بے انت سنگھ بی۔ اے ہیں

المعلن۔ مینیجر اورینٹل کالج میگزین اورینٹل کالج لاہور

افتخار الحکماء نواب حاذق جنگ مرحوم سابق افسر الاطباء فرماتے ہیں

میں نہایت مسرت و بڑی خوشی کے ساتھ محض بیماروں کی شفا کی غرض سے چند سطور سپرد قلم کرتا ہوں۔ برص منشہ (یعنی کوڑھ اور سفید داغ) کا علاج نہایت مشکل ہے یہ مرض عموماً بڑھتا ہی جاتا ہے۔ حکیم مولوی محمد عبدالقادر صاحب مددگار صدر مخزن الادویہ یونانی سرکار عالی و رکن دار التشخیص انجمن اطباء یونانی حیدرآباد دکن خصوصاً علاج برص میں ید طولیٰ رکھتے ہیں صاحب موصوف نے اکثر مریضان برص کا علاج بہت ہی کم مدت میں نہایت قابلیت سے کیا اور بفضلہ کامیاب ہوئے ہیں میں نے بچشم خود مریضان برص کا معائنہ کیا ہے۔ بعد علاج جسم بالکل اصلی حالت پر ہو جاتا ہے۔ حکیم صاحب موصوف کی بہترین قابلیت اور تجربہ کا اثر ہے میں حکیم صاحب موصوف کو ایسے کٹھن مرض کی دوائے مجرب کی ایجاد پر مبارکباد دیتا ہوں اور پبلک سے زور کے ساتھ سفارش کرتا ہوں کہ وہ برص کے مریضوں کو حکیم صاحب موصوف کے پاس رجوع ہونے کی ہدایت کریں اور مریضان برص کو چاہئے کہ وہ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر حکیم صاحب موصوف سے علاج کرائیں اور اس مرض منحوس سے غافل نہ رہیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

شرحہ دستخط (افتخار الحکماء حاذق جنگ)

ویجیٹال بام

بیرونی استعمال کی پر تاثیر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزا سے مرکب اور بالکل بے ضرر ثابت ہو چکی ہے۔ جو اقسام کے اعصابی و اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے۔ اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پر اثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے۔ کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نقرس وجع مفاصل۔ درد سر، درد سول۔ بچھو کے زہر کے لئے زخم کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال۔ تھوڑی دوا لیکر دن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افاقہ نہ ہو تو دوا کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعصاب کو بھانپ دیں اور صاف کریں جو اصحاب بغرض امتحان دوا طلب فرمائیں بخوشی تعمیل کی جائے گی۔

نوٹ۔ ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت مہیا رہتا ہے۔ اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔

المشتہر۔ جیمس اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کیمسٹ اسٹیشن روڈ قریب محکمہ مالگذاری حیدرآباد دکن

مطبوعاتِ مکتبہ

دکن میں اُردو ۔ مولفہ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب منشی فاضل

جنوبی ہند میں اردو کی ابتدائی تاریخ قطب شاہی عادل شاہی و آصف جاہی دوران میں اردو نظم و نثر کی حالت اور شعرائے اردو کا تذکرہ معہ نمونہ ضخامت ۵۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا بار دوم قیمت عللہ

خیابانِ اردو ۔ مرتبہ جناب محمد عارف صاحب حیدرآبادی ہندوستان کے ممتاز اردو انشا پردازوں اور نامی گرامی شعراء کے نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو مدارس کے تعلیمی نصاب کیلئے نہایت موزوں ہے ضخامت تقریباً ۵۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد عللہ

روحِ تنقید ۔ مصنفہ مولوی ابو الحسنات سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے فن تنقید کے متعلق اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں ماضی حال کے علمائے یورپ کی تنقیدی اصول بیان کیے گئے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں مثنوی سحر البیان پر باقاعدہ تبصرہ کیا گیا ہے ضخامت ۲۵۰ سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ بار دوم قیمت عہ

تنقیدی مقالات ۔ مصنفہ زور صاحب ۔ یہ روح تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روح تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں انگریزی فارسی اور اردو زبانوں کے مشہور اہل قلم کی قلمکاریوں پر تنقید کرکے اصولوں کا استعمال دکھلایا ہے اور نیز بعض مشہور اردو انشاپردازوں کے طرز تحریر پر تبصرہ کرنے کے خاص خاص اصول بیان کئے گئے ہیں ضخامت ۲۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ چکنا لکھائی وغیرہ عمدہ مجلد ساڑھے ۲ ر

اردو کے اسالیبِ بیان ۔ مصنفہ زور صاحب نثر نگاری کی ابتدائی کیفیت ابتدا سے لیکر آجتک کے نثر نگاروں کے طرز تحریر و انداز بیان کا تذکرہ ۔ خاص طرز تحریر کے اردو انشا پردازوں کے اسالیب بیان پر تبصرہ ضخامت ۳۰۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد سات عہ

سلطان محمود غزنوی کی بزمِ ادب ۔ مصنفہ زور صاحب سلطان محمود غزنوی سے پہلے اور بعد کے علم و ادب کے حالات سلطان محمود غزنوی کے علمی و ادبی کارنامے ترتیب کتاب میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران سے استفادہ کیا گیا ہے ضخامت ۱۲۰ صفحے ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲ ر

دنیائے افسانہ ۔ مصنفہ مولوی محمد عبد القادر سروری ایم اے ایل ایل بی افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ ۔ اور افسانہ نویسی کے اصول و مبادیات اردو زبان میں اپنے مضمون کی پہلی کتاب ہے ضخامت ۲۱۸ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہترین قیمت عہ

مبادیِ فلسفہ ۔ مولفہ مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی ڈاکٹر اے ایس رایوبرٹ پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی پرائمر آف فلاسفی کا ملخص بامحاورہ اور عام فہم اردو ترجمہ ضخامت ۱۳۶ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۱۲ ر

اربابِ نثر اُردو ۔ مصنفہ مولوی سید محمد صاحب قادری ایم اے ۔ فورٹ ولیم کالج کے اردو اہل قلم کے تحقیقی حالات اور ان کے مصنفات پر تنقید و تبصرہ ۔ انیسویں صدی عیسوی کی اردو نثر نگاری کی تاریخ ضخامت ۲۴۰ صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت علل

آثار الکرام جلد اول ۔ مصنفہ شمس المورخین جناب حکیم سید شمس اللہ قادری ام ار اے ایس ۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے علمی و ادبی کارناموں کی محققانہ تاریخ ضخامت ۱۴۴ صفحے ۔ سائز ۲۲×۱۸/۱۶ کاغذ چکنا ۔ لکھائی چھپائی خاصی قیمت ۱۲ ر

جواہرِ کلیاتِ نظیر ۔ منتخبہ جناب مولانا ذہین و سید مختار احمد نظیر اکبر آبادی کے کلیات سے اخلاقی ۔ ادبی نصیحت آمیز ظرافت آمیز اور دلنواز نظموں کا مجموعہ ضخامت ۲۰۰ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی خاصی قیمت عہ

عقائدِ امام ۔ مترجمہ مولوی محمد عبد الغفور عابدی صاحب فقہ اکبر کا عام فہم اور بامحاورہ اردو ترجمہ قیمت ہم ر

اسوۂ حسنہ ۔ مصنفہ مولوی احمد عبد اللہ مسدوسی بی اے اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کے سامنے کیسی زندگی پیش کی تھی ضخامت (۸۰) صفحے سائز پاکٹ ایڈیشن کاغذ چکنا لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۸ ر

دکنی لغت ۔ مولفہ مولوی سید شعار احمد شعار ہاشمی ۔ اردوئے قدیم یعنے دکنیات کا لغت جس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کی تشریح کی گئی ہے ضخامت ۱۲۰ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا ۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت مجلد ۸ ر

شاہ رفیع الدین قندھاری ۔ مرتبہ مولوی محمد عبد اللہ صاحب عابدی ۔ دکن کے ایک مشہور صاحب دل صوفی عالم کے سوانح حیات ضخامت ۴۸ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن ۔ کاغذ چکنا ۔ لکھائی چھپائی عمدہ قیمت ۵ ر

خزینۂ اخلاق ۔ مصنفہ مولوی سید عبد الصمد صاحب مرحوم اخلاقی و ادبی نظم و نثر کا مجموعہ ۔ ضخامت ۶۴ صفحے ۔ سائز پاکٹ ایڈیشن قیمت ۲ ر

سیرتِ خیر البشر ۔ سیرت مبارک مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالے جس میں آنحضرت صلعم کے مکارم اخلاق بیان کیے گئے ہیں ۔ قیمت ار

نیک بی بی ۔ مصنفہ مولانا ذہین منظوم رسالہ جس میں بتلایا گیا ہے ۔ نیک خو بی بی کس طرح اپنے بدخو شوہر کو ٹھیک کرسکتی ہے ۔ قیمت ۲ ر

چھوٹا شیطان ۔ مصنفہ مولانا ذہین منظوم اخلاقی رسالہ قیمت ار

ملنے کا پتہ ۔ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ روبروئے محکمہ مالگذاری اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

مطبوعہ مطبع مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن باہتمام رام کرشن لتھوگرافر منیجر مطبع

کتب خانہ

جامعہ عثمانیہ

۱۔ اراکین مجلس اعلیٰ، مجلس [illegible] و مجلس
مجالس تعلیمات و نصاب پانچ کتابیں ایک ماہ کے لئے اپنے پاس رکھ سکیں گے۔

۲۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ و کلیہ جات ملحقہ و عہدہ داران [illegible] ایک ماہ کے لئے اپنے پاس رکھ سکیں گے اور [illegible]
اراکین دارالترجمہ [illegible] کتابیں [illegible] ہاتھوں سے

۳۔ طلباء ایم اے، ایل ایل بی و [illegible] کتابیں اپنے پاس رکھ سکیں گے
طلباء [illegible] کتابیں دو ہفتہ تک اپنے پاس [illegible] اور طلباء [illegible] حساب
طلباء [illegible] کتابیں [illegible]

۴۔ مدت مقررہ پر کتابیں واپس نہ کی جائیں تو [illegible] فی کتاب [illegible]
ایک آنہ یومیہ فی کتاب [illegible] لیا جائے گا۔

۵۔ بشرط موقع کتابیں مکرر جاری کی جا سکیں گی [illegible]
کتب خانہ میں کتاب کا لانا لازم ہے۔

۶۔ کتابیں گم ہو جائیں یا خراب ہو جائیں تو مستعیر ذمہ دار ہوگا۔

۷۔ کتابوں پر کسی قسم کا نشان بنایا [illegible]
[illegible] جائے۔

۸۔ قلمی نسخے اور نادر کتابیں جاری نہ کی جا سکیں گی۔ فقط